# خدا بخش لائبریری
# جرنل

۳۷ ۳۸ ۳۹

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

# خدابخش لائبریری

# جرنل

پٹنہ



۳۷ ۳۸ ۳۹

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۳۳۳۲۲/۷۷

سینتیسواں
اڑتیسواں } شمارہ ۱۹۸۶ء
انتالیسواں

قیمت ۴۵ روپے

قیمت : فی پرچہ ۱۵ روپے

سالانہ : ۶۰ روپے (ہند)
: ۱۲ ڈالر (ایشیا)
: ۲۴ ڈالر (دیگر ممالک)

محبوب حسین نے اردو حصہ چشمہ لیتھو پریس ار رمنا لین پٹنہ اور انگریزی حصہ لبرٹی آرٹ پریس دہلی سے چھپوا کر خدابخش لائبریری سے شائع کیا

ــــــ ایڈیٹر : عابد رضا بیدار

# ہندستانی مسلمان

## عصری دستاویزات کے آئینے میں

## علی گڑھ تحریک

۱۸۷۵ء — ۱۹۰۰

# فہرست

# پیش گفتار

عصری اسلام یا دوسرے لفظوں میں اپنے عہد کے اسلامیوں کی فکری دستاویزات کی پیشکش کے منصوبے کے تحت ہندی فکر کو اولین ترجیح دینے کا خیال اس لیے آیا کہ:

اسلامیانِ عالم کی فکر کا انعکاس عالمِ اسلام کی جن پانچ اہم زبانوں میں ہوتا رہا ہے ان میں عربی اور ایک حد تک فارسی میں جو کچھ چھپتا ہے وہ موجودہ عالمی افکار کا جزو بنتا جاتا ہے۔ لیکن انڈونیشی، ترکی اور اردو کو ذریعۂ اظہار بنانے والوں کی نمائندگی بیرونی حلقہ بہت کم ہو پاتی ہے۔ حالانکہ یہ تینوں زبانیں فکری سطح پر ہی نہیں عددی اعتبار سے بھی عربی فارسی سے کسی طرح دبتی ہوئی نہیں ——— اور تینوں میں اردو کا درجہ تو خصوصی امتیاز رکھتا ہے کہ وہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کی فکری زبان ہے جن کی مجموعی تعداد کو نہ ترک پہنچتے ہیں نہ ایرانی نہ تورانی، نہ انڈونیشی ——— اور نہ عرب۔

عہدِ جدید کے برصغیر میں اسلام کی دو فکری زبانیں رہی ہیں۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان دونوں زبانوں "انگریزی اور اردو" کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا؛ انگریزی فکر کو کم، کہ عالمی علمی حلقہ تک اس کی پہنچ ہے، اردو فکر کو زیادہ کہ مرحوم عزیز احمد کے بعد اس کی طرف بھرپور توجہ دلانے والے کم ہی ہیں۔

برصغیر کی اتھل پتھل کے "اس سیاست زدہ دنیا میں" تناسب سے زیادہ اہمیت اختیار کر جانے کے سبب، سینتالیس (۱۹۴۷ء) تک کے افکار کی نمائندگی تو خاصی ہو لی۔ لیکن:

آزاد ہوئے ہمیں چالیس سال ہونے کو آئے، اس عہد کو اس طور سے سمیٹنا، کہ اس فکر میں آئینۂ ایام سے آنکھیں چار کرنے کی سکت بھی آ سکے، اور آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر بھی دکھائی دینے لگے: یہ کام کسی مستشرق کے لیے چھوڑ دینے سے نوعیت ہی بالکل بدل جاتی ہے ـ وہ تو تاریخ کی گزری ہوئی ایک رَو کے طور سے اپنی تقویم کا ایک باب بنا کے ہمیشہ کے لیے بھول جائے گا؛ گو کبھی فتراک میں اس کے کوئی نخچیر بھی تھا! لیکن ہندی مسلمان کے لیے تو یہ ایک زندہ، متحرک، اس کے وجود سے جڑی ہوئی حقیقت ہے ——— اس کا درد! اس کے خواب!!

عصری ہندستانی اسلام یا زیادہ واضح الفاظ میں ہندستانی مسلمان کے بارے میں ابتک جو مغربی یا مشرقی ریسرچ ہوتی رہی اس کا رخ ان کی سیاسیات کی جانب رہا۔ اور اس لیے ان کی فکر کی نمایندگی جہاں کہیں ہوئی سارا زور سیاسی افکار ——— بلکہ اعمال (بے روزگاری یا روزگار کے معاملے میں امتیازی برتاؤ، فرقہ وارانہ فسادات، اردو، علی گڑھ کا اقلیتی کردار ——— اور مسلم پرسنل لا) پر رہا۔ ان میں سے کچھ مسائل تہذیبی ہوتے ہوئے بھی سیاسی بنائے جاتے رہے کہ انھیں الجھانے اور سلجھانے والوں دونوں کے خیال میں یہ سیاست سے جڑے ہوئے تھے۔

ہندستانی مسلمان کی مذہبی فکر، اس کی تہذیبی فکر، اس کی سماجی اور معاشی فکر، اس کی تعلیمی فکر یہ سامنے آنکھ اخباروں اور رسالوں میں، کتابوں میں، محفلوں میں، جلسوں میں تحریر و تقریر کی صورت میں سامنے آتے رہے لیکن ان کی لے اتنی مدھم تھی کہ سیاست کے دھول پر جو شور مچتا رہا اس میں دب کر رہ گئی۔

اس کا ایک افسوسناک پہلو یہ رہا کہ جاندار افکار کا دھارا جس سے خود سیاست کو توانائی ملتی جس سے باعزت جینے کا حوصلہ ملتا جس سے فرد اور ملت کے، ملت اور قوم کے اور پھر قوم اور بین الاقوام کے رشتوں کو راسخ بنیادیں ملتیں، جس سے ناک کے آگے دیکھنے کی نظر ملتی، وہ سب پس منظر میں چلا گیا۔ ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ ہم اپنے قد کی بہ نسبت بونے کا امیج پیش کرتے رہے اور اس کے نتیجے میں عوام میں احساس بیچارگی اور ذہین طبقے میں احساس کمتری بڑھتا گیا ——— اور نئی نسل میں جاندار فکر کا بہاؤ کم ہوتا گیا۔

سیاست کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن سیاست پوری زندگی تو نہیں۔ مذہب، تہذیب، تاریخ اور معاشرہ یہ سب بھی سوچتے ہوئے ذہن کے محور بن سکتے ہیں، بنتے ہیں۔ ان سے متعلق افکار کی نمائندگی نہ ہو پائے تو ادھوری تصویر اکثر گمراہ کن ہوا کرتی ہے۔ فکری دستاویزات کا یہ سلسلہ ہندستانی مسلمان کی تصویر کو اس کے صحیح چوکھٹے میں رکھ کے دیکھنے کی ایک مختصر کوشش ہے۔

سینتالیس سے پچاسی تک ہندی مسلمانوں کی فکری دستاویزات پیش کرتے وقت علیگڑھ کو اولیت دینے کے لیے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں ہے، کہ علی گڑھ فکری سطح پر ہمیشہ کی مانند آج بھی اسلامیان ہند کے دل کی دھڑکن ہے، اور ضمیر کی آواز۔

آزادی کے بعد علی گڑھ نے جو سفر طے کیا وہ واضح طور سے تین حصوں میں منقسم ہے: تشکیلی عہد، جسے ذاکر صاحب کا عہد بھی کہہ سکتے ہیں، جس کا مومینٹم ان کے علی گڑھ چھوڑنے کے بعد بھی پانچ

سات سال تک چلتا رہا، یعنی کرنل زیدی اور ان کے بعد طیب جی تک! اور پھر عبوری عہد ہے، جو علی یاور جنگ کے زمانے سے دورِ خسروی تک چلا۔ اور پھر پچھلے پانچ سال اور ان کا تسلسل سید حامد اور سید هاشم علی کا عہد۔

علی گڑھ کی فکری دستاویزات کا آغاز ہم نے اس کے آخری دور سے کیا ہے۔

سیّد احمد سے سیّد حامد تک ۱۸۷۵ سے ۱۹۸۵ تک، علی گڑھ تحریک نے ڈوبتے اچھلتے، دس اوپر سو برس پورے کرلیے۔ اچھے بُرے دونوں وقت آتے رہے اس پر: بُرے زیادہ، کہ ہر تحریک کا سرنوشت میں یہ اس کی تقدیر بن کے شامل رہا ہے شاید اس لیے کہ تحریک کی آبیاری کے لیے یہ ناگزیر ہے۔ لیکن تحریک پر ایمان رکھنے والے صورتِ خورشید اِدھر ڈوبے ہیں کہ اُدھر نکل آتے ہیں۔ ایقان اور ایمان کے مقابلے کی طاقت سائنس بھی ابتک پیدا نہیں کر سکی ہے۔ آگ میں کود پڑنے والوں کو کون زیر کر سکا ہے! سیدِ اعظم نے اپنی زندگی میں اپنی تحریک کو پروان چڑھتے دیکھ لیا تھا۔ ان کے لبذا انہیں جیسے مخلص ساتھی محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، چراغ علی، عزیز مرزا اور ادارہ اور تحریک کے دونوں شمعوں کو دونوں ہاتھوں میں منوّر کیے رہے۔ پھر سیّد کی تربیت گاہ کے پروردہ آفتاب احمد خاں، مزمل اللہ خاں، ضیاءالدین، راس مسعود، اور دوسرے اپنے اپنے طریق پر اور درسگاہ کی خدمت کرتے رہے تا آنکہ سن سینتالیس آگیا: یہ امتحان کی گھڑی تھی: جس ادارے نے بیک وقت پاکستان کے لیے، ہونے والا وزیرِ اعظم (لیاقت علی خاں) اور ہندستان کے لیے ہونے والا وزیر یا تدبیر (رفیع احمد قدوائی) پیدا کیا ہو ——— ہونے والا صدرِ پاکستان (ایوب خاں) اور ہونے والا صدر جمہوریہ ہند (ذاکر حسین) بنایا ہو، اس ادارے کے لیے سخت گھڑی تھی یہ۔ بڑی قومیں جتنے کڑے امتحان سے دوچار ہوتی ہیں اتنا ہی بڑا آدمی بھی کاڑھ لیتی ہیں: آزاد ہندستان کا علی گڑھ جتنی بڑی آزمائش سے دوچار تھا اس سے نبٹنے کیلیے اس نے اسی بار اتنا ہی بڑا آدمی پیدا کر دیا: ذاکر صاحب علی گڑھ کو محض ادارہ ہونے سے بچا لے گئے اور جاتے جاتے ایسا زبردست مومنٹم (Momentum) دے گئے جو اتنی ہی مدت مزید چلتا گیا۔

مومنٹم (Momentum) ختم ہوا تو علی گڑھ کے ساتھ چلنے والے کم، زمانے کے ساتھ چلنے والے زیادہ نظر آنے لگے۔ سردارِ قافلہ، قافلہ کا مزاج متعین کرتا ہے: سودہ کرتا رہا؛ نتیجہ میں ایک فرزند علی گڑھ کو دونوں ہاتھوں سے لکھنا پڑا:

## پانچ

"اس ادارے نے جو عملہ پیدا کیا، روشنی بخشی، اس نے ایسے فرزندوں کو جنم دیا جو ملک و ملت کے لیے سرمایۂ افتخار بنے۔ جو کچھ روشنی ہم ہندوستانی مسلمانوں میں دیکھتے ہیں وہ بڑی حد تک اسی ادارہ کی دین ہے۔

لیکن آگے چل کر.....

"... یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ کی تعداد، اس کی عمارتوں اور ساز و سامان، اس کے بجٹ میں غیر معمولی اضافہ ہوا... لیکن اس دارالعلوم میں وہ روح پلٹ کر نہ آئی جس نے اسے تعلیم و تہذیب کی ایک بڑی تحریک بنا دیا تھا۔ اس کے فرزند اس اعتماد اور ولولے سے محروم ہیں جو ان کی پہلی پیڑھی کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھوں نے ریاضت سے دامن بچایا، مقابلے سے آنکھ چرائی، مقدار کو معیار کا بدل سمجھا... انجام کار یونیورسٹی عام یونیورسٹیوں کی صف میں بیٹھ گئی... اور ایک جیتا جاگتا امنگوں، خوابوں اور زندگی سے بھرپور ادارہ صابو آسائش، بے آہنگی اور معیار فراموشی کے شکنجے میں جکڑ گیا۔"

اسی لے، اسی ردیف و قافیہ میں، جلتے سلگتے ذہن کے ساتھ، علی گڑھ کے ایک اور عاشق کے قلم سے لفظ آنسوؤں کے ٹپک پڑے:

"شروع میں... معمولی درجہ کی سہولتیں بھی حاصل نہیں تھیں، عمارت پختہ نہیں تھی، اساتذہ کے لیے آرام دہ مکانات نہیں تھے، چمن بندی نہیں تھی... لیکن اس پورے ماحول میں کوئی بے چینی نہیں تھی۔ طلبا اور اساتذہ میں باپ بیٹوں کا سا تعلق تھا۔ سب ایک دوسرے کے ہمدرد و مونس و غمخوار تھے۔ کسی کو کسی سے شکایت نہیں تھی۔ لیکن اب صورتِ حال بہت بدل گئی ہے!

"اب اپنے گھروں پر تنگی اور دشواریوں کی زندگی گزارنے والے بھی یہاں اس طرح آتے ہیں جیسے داماد سسرال میں ——— شریف داماد تو سسرال والوں کا معاون اور ہمدرد ہوتا ہے لیکن یہاں صرف خامیوں پر نظر رہتی ہے اور صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس طرح کی فضا پیدا کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے... کیا یہ ان خوابوں کی صحیح تعبیر ہے جو جامعہ کے بانیوں نے دیکھا تھا؟ کیا اسی طرز کے کردار کے لیے انھوں نے اپنی نیندیں حرام کی تھیں اور در در کی بھیک مانگی تھی... وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہاں صرف وہ لوگ آئیں گے جن کے سامنے دنیوی وجاہت اور ترقی کے سوا کوئی اور مقصد ہی نہ ہوگا! انہیں صرف مراعات کی ضرورت ہوگی... یہ اساتذہ اور ملازمین اچھی تنخواہوں اور ہر قسم کی رہائشی اور دوسری سہولتوں کے

باوجود ہر دن کسی کا شکوہ کریں گے، اور ایسے فرزندانِ قوم آئیں گے جو ہر دن مراعات کا مطالبہ کریں گے: امتحان کی چھوٹ، عمارتوں کا مطالبہ، کھانے کا مطالبہ، داخلوں کا مطالبہ، اساتذہ کے خلاف ہنگامہ آرائی، ماں بہن کی گالی سے لیکر ہر قسم کے القاب سے خطاب، اساتذہ اور انتظامیہ کی تضحیک، بم، چھری، چاقو، پستول کی دھونس: اس کام کے لیے ادارہ کی ضرورت نہیں تھی! اس کے لیے تو پڑھا لکھا ہونا بھی شرط نہیں! اس کے لئے مسلمان ہونے کا بھی شرط نہیں!!!

"مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی سب سے بڑی خوبی انکا خلوص اور ادارہ اور طالب علموں کے ساتھ ان کی وابستگی رہی ہے۔ اچھے طالب علموں کی تلاش، ان کی سرپرستی اور اکثر اپنی آمدنی کا بڑا حصہ ان پر لگا دینا، ان کے کردار کا وہ سب سے نمایاں اور روشن پہلو ہے جس نے اس ادارہ کی انفرادیت کو باقی رکھا۔ ان کا ایثار ان کی زندگی میں ایسا رچا بسا تھا جو بادِ سحر کے نم کی طرح نئی کلیوں میں جذب ہو جاتا اور انہیں کھلے ہوئے پھولوں میں تبدیل کر دیتا! دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ ایسے لوگوں کا تناسب گھٹ رہا ہے اور ان لوگوں کا تناسب بڑھ رہا ہے جو محض ملازمت اور اپنی آمدنی کی خاطر یہاں آ گئے ہیں اور خود انکو بہتر مواقع کہیں اور نظر آئے اور انھوں نے علاحدگی کی۔ یہاں تو لوگ کشتیاں جلا کے آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ادارہ تاریخ سے نہیں تحریک سے چلتا ہے!!"

۱۹۸۰ء میں ایک بار پھر ادارہ 'تحریک' میں تبدیل ہونے لگا۔ ادارہ کو جامد کرنے والی قوتوں اور تحریک بنانے والی قوتوں میں گھمسان کا رن پڑا جو پورے پانچ سال چلتا رہا۔ اس بار تحریک کے احیا کا شرف سید حامد کے حصے میں آیا۔ وہ ذاکر صاحب اور رشید صاحب کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے، خود اسی مادرِ درسگاہ کے فرزند تھے، اعلیٰ انتظامی امور میں طویل تجربہ کے مالک تھے، دردمند دل اور کھلے دماغ کے ساتھ اپنے پر ایقان تھا اور رایت پیدا کرنے والا پیمانہ مگر اس نے جو شن دیا ہے اُسے پورا کرنے کا حوصلہ بھی بخشے گا اور راہیں بھی نکالے گا۔ دینے والے نے لینن اور ماؤ کی طرح سیف و قلم دونوں کی صلاحیتوں سے اپنا کام لینے کے بقدر پوری طرح نوازا تھا، صورتِ حال کے اس فرق کے ساتھ کہ یہاں رزم آرائی پرایوں سے نہیں اپنوں سے تھی — اور یہ مرحلہ زیادہ کڑا ہوتا ہے!

سید احمد پر ایک بار یہ گزر چکی تھی: جنھوں نے ایک طرف ادارہ کے در و دیوار سجائے، اس میں نقش و نگار بھرے، تعلیم دی، تربیت کی ——— تو دوسری طرف زبان اور قلم سے ادارہ کو تحریک بنانے کا کام بھی انجام دیتے رہے۔ پچھلے پانچ سال میں یہ دو محاذی مورچہ، ان کی تربیت گاہ کے پروردہ یافتہ سید حامد نے اسی خوش اسلوبی سے سر کیا جیسے سید اعظم اس وقت رہتے تو کرتے۔

سید احمد کی طرح سید حامد نے تحریک کو اس کا ایک آرگن بھی دیا۔ سید کے تہذیب الاخلاق کا احیا کر کے سنہ عہدی علی گڑھ تحریک کے سنبھالکوں نے اپنے پرچے کا نام تہذیب الاخلاق رکھ کے علی گڑھ کی کتاب ماضی کے آخری ورق سے اپنا رشتہ استوار کر لیا۔ اور حسب کی طرح اب بھی سوچنے والوں کا ایک حلقہ ایک بار پھر تہذیب الاخلاق کے گرد جمع ہوتا گیا اور روشنی پھیلتی گئی۔ سید حامد اور نئے 'تہذیبی' حلقہ کے یہ افکار اس دستاویزی پیش کش کا جزو اعظم ہیں۔

یہ دستاویز پچھلے پانچ چھ سال میں لکھی گئی علی گڑھ کے زائیدہ و پروردہ یا علی گڑھ سے وابستہ اُن اہل قلم کی تحریروں کا مجموعہ ہے جو اپنے ذہن سے سوچتے ہیں، اور براہ راست یا گھوم پھر کے، کسی نہ کسی طور جنکی فکر کا محور و مرکزی نقطہ رہتا ہے جسے ڈاکٹر عابد حسین نے ہندستانی مسلمان کی تقدیر (Destiny) سے تعبیر کیا ہے: ہندستانی مسلمان آئینۂ ایام میں!

پچھلے پانچ چھ سال میں لکھی گئی تحریروں کے ساتھ ساتھ، اسی عرصے میں علی گڑھ کی فکر کی ترجمانی تہذیب الاخلاق میں سرسید اور سرسید کے زائیدہ (اگر ملیح آبادی کی زبان ہوتا اس راز کو خود فاش نہ کر دیتے تو یہ راز راز ہی رہ جاتا) ابوالکلام آزاد کی جن تحریروں یا تقریروں کو خصوصی اہمیت کے ساتھ منتخب کیا گیا انھیں بھی اسی دستاویز میں اس لیے شامل رکھا گیا ہے کہ اندازہ ہو سکے کہ ۱۹۸۰ - ۱۹۸۵ء کے علی گڑھ کے ذہن نے ان دو بڑے مفکروں کو اپنا سرچشمۂ فیضان تسلیم کرتے ہوئے ان کی کس قسم کی تحریر یا تقریر پر زور دیا۔

نئی علی گڑھ تحریک نے اپنا رشتہ اپنے قد آور بانی سے جوڑے رکھا ہے جس نے مذہب، تہذیب، تاریخ، تعلیم اور ہندستان کے لے بھلے سیکولر مزاج سب کے حقوق ادا کیے۔ سرسید کو پڑھتے ہیں تو لگتا ہے

۱۸۷۰ سے ۱۹۸۵ تک ۱۱۵ سال کا طویل سفر طے کر لینے کے باوجود اسلامیانِ ہند کے بنیادی مسائل میں کوئی قابلِ لحاظ تبدیلی نہیں آئی ہے۔ آج بھی اُن مسائل کے حل کی تلاش میں سید کے نقوش یا خاصی رہبری کر سکتے ہیں۔

سید نے کہا تھا:

—— "غدر کے بعد خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اسی تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں: نہیں، اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے، اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے کی ہمت باندھی ہے۔"

—— "بہت سی باتیں خود ہماری طبیعتوں یا ہماری غلط فہمیوں نے پیدا کی ہیں جو در حقیقت مذہب اسلام میں نہیں ہیں؛ اور اسی سبب سے مسلمانوں کی عجیب حالت ہو گئی ہے اور یہی باعث ہے کہ غیر قومیں ہماری اس ہیئتِ مجموعی پر خیال کر کر اس مجموعے کو مذہب اسلام قرار دیتی ہیں اور اس کی نسبت حقارت کی رائے رکھتی ہیں ... لیکن اب کیا یہ غیرت کی بات نہیں ہے کہ ہم غیر قوموں سے ایسی حقارت کے الفاظ اپنی نسبت اور اپنے روشن اور سچے مذہب کی نسبت سنیں، اور اپنی تہذیب اور تربیت اور شائستگی کی طرف متوجہ نہ ہوں۔"

—— "انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں؛ اور کوئی برائی نہیں جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو —— ہماری قوم کے جوان لڑکے انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ از راہ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہیں اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں! اس لیے ایسی قسم کی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔"

—— "میری رائے میں ضروری ہے کہ ہندستان میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ایسے ہی ہوں جو لامذہب ہوں۔ جب مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ بستے ہوں تو مذہبی آدمی کا افسر تعلیم ہونا اکثر دفعہ بے تعصب تعلیم کا مانع ہو جاتا ہے۔"

ستاون کے بعد سینتالیس ایک اور جوئے خوں تھی جو اس قوم کے سر سے گزر تو گئی مگر اس طرح گزری کہ خاصا بے حال کر گئی۔ سرخیلِ قبیلہ کی ذمہ داریاں اس بار ابوالکلام آزاد کے حصے میں آئی تھیں اور علیگڑھ

کے نہ ہوتے ہوئے بھی سیّد اعظم کو اپنا پہلا استاد مانتے تھے) پچھلے پانچ سال میں مولانا کی جو نمایندہ تقریریں علی گڑھ کے آرگن کے ذریعہ قندِ مکرر کے طور پر پیش کی گئیں وہ علی گڑھ تحریک کے مزاج کی پوری ترجمانی کرتی ہیں۔ اور یہ مزاج کچھ وقتی جوش کا نتیجہ ہو جو اس ہیجان اور ہنگامہ کو دیکھ کر مسجد شاہجہانی کی اس تاریخی تقریر میں ابل پڑا ہو، ایسا نہیں ہے۔ یہ مزاج تو آزادی سے برسوں قبل رام گڑھ کانگریس کے صدارتی خطبہ میں بھی اسی تیور کے ساتھ موجود تھا جب مولانا نے لکھا تھا:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے، اور، میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے، میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن، ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے: میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں، اور میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

"ہندوستان کے لیے قدرت کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور، پھر ایک کے بعد ایک یہ سلسلہ جاری رہا، اور اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی، اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ انہیں قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا، اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کا ملاپ تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے دور دور بہتے رہے لیکن، پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم پر مل جانا پڑا! ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع

کردیا اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کردی، اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی، ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہنچایا۔

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ کو گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک ملی جلی تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا مذاق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر اب ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی نہیں شروع ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب اور معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی یہی کہوں گا کہ وہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے ——

—— اب یہ سانچا ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی، ہم پسند کریں یا نہ کریں۔"

سر سید اور آزاد کے ساتھ ساتھ معاصر علی گڑھ کے لیے تیسرا فیضان اقبال رہے ہیں۔ جب تہذیب الاخلاق (جدید) ۱۹۸۲ء میں علی گڑھ کا ترجمان بن کر نکلا تو سر سید اور آزاد کے علی الرغم اس کی تقریب رونمائی اقبال کی ایک غزل سے شروع ہوئی۔ نئے علی گڑھ کے امین نئے ترجمان کے مقاصد کے پیش نظر دیکھئے تو اس آغاز میں کیسی ڈرامائیت ہے اور کس طور پر رمز جاگ اٹھتا ہے:

میر سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیر نیم کش، جس کا نہ ہو کوئی ہدف

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا، اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگار دیر میں خون جگر نہ کر تلف

کھول کے کیا بیاں کروں، سر مقام مرگ و عشق
عشق ہے مرگ باشرف، مرگ حیات بے شرف

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اور آزادی کے بعد انسپریشن بنے ذاکر صاحب! نئی علی گڑھ تحریک کا تنہا انسپریشن!! ذاکر صاحب نے علیگڑھ آنے سے پہلے پوری قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا، مقام اور موقع تھا کاشی ودیا پیٹھ بنارس کا کانووکیشن ایڈریس:-

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کردوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں تنگ نفسی، خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں بھی یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا:

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے

تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملّی وجود کو خود اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندستانی قومیت کے لیے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندستانی قوم کا جزو بننے پر فخر کرتے ہیں، مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں انکی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی، اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے، نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے"۔

پھر علی گڑھ آنے کے بعد انھوں نے اپنی اس فکر کا مرکز علی گڑھ کو بناتے ہوئے اس کی تشریح کی:۔

"میرا تو یقین ہے کہ علی گڑھ کو قومی زندگی میں بڑا کام انجام دینا ہے، وہ کام ہندستانی تدبر اور ہندستانی تعلیم و فن کا بنیادی کام ہے، یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چار کروڑ مسلمان شہریوں کا حصّہ اور مقام۔ کتنا بڑا کام ہے، اور کیسا دل کش کام! مختلف تمدنی و تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین و جمیل کل کی تشکیل میں مدد دے! ماضی کے سارے خزانوں کو چاہے کہیں سے آئے ہوں ہر ہندستانی کی مشترک میراث بنا دینا، کہ سب ہمارے ہی گمشدہ لعل ہیں، سب کو ایک مشترک ماضی سے مالامال کرنا، سب کو مستقبل میں ایک جد و جہد کا ولولہ بخشنا ———— اس عزیز وطن کے ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ ان کا دین اور ہندستانی زندگی کو صالح بنانے میں ان کا مخصوص منصب، یہ ان پر ذمہ داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں اور خدمت کا ایک نادر موقع پیش کرتے ہیں، یہ بے وفائی یا بے اعتنائی کا بہانا نہیں ہیں۔ کیا چھوٹا کام ہے یہ؟

"علی گڑھ جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ جس اسلوب پر سوچے گا، علی گڑھ ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے خدمت کی جو پیش کش دے سکے گا اس سے متعین ہو گا ہندستانی قومی زندگی میں علی گڑھ کا مقام! اور ہندستان جو سلوک علی گڑھ کے ساتھ کرے گا اس پر ہاں اسی پر بڑی حد تک منحصر ہو گی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی"۔

○

علی گڑھ تحریک ایک تعلیمی تحریک تھی، یہ اس کی محض ایک جہت ہے۔ ادبی، مذہبی اور تہذیبی فکر میں بنیادی تبدیلی لے آنے والی، اور زندگی کی طرف پورا اندازِ نظر ہی بدل دینے والی تحریک کو محض تعلیمی تحریک کہہ کر گزر جانا اس کی پوری تاریخ کو نظر انداز کر جانا ہے۔

یہ تو بنیادی طور پر پوری زندگی کو ہدف بنائے ہوئے ایک منصوبہ بند تحریک ہے، تعلیم جس کا ایک وسیلہ تھی۔ اسی طرح ایمرجنسی میں بھلے ہی یہ 'اعتماد کی بازیابی' کی تحریک رہی ہو، مگر اس کی منصوبہ بندی میں سماجی خدمت، مذہبی روشن خیالی، معاشی خوش حالی سب کچھ شامل رہا کیے ہیں۔

اس کا تذکرہ کرنے کے لیے علی گڑھ کی ایک تعریف (یا تنقیص) یہ بھی کی گئی کہ یہ پاکستان ساز تحریک تھی؛ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ تحریکِ پاکستان کو سب سے بڑی کمک اور رسد علی گڑھ سے ملی: پاکستان کا پہلا وزیر اعظم اور اہم ترین صدرِ مملکت علی گڑھ ہی کے زائیدہ تھے!

لیکن یہ محض ایک پہلو ہے: دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ ہندستان کا وہ تنہا وزیر باتدبیر جسے عوام آج تک پیار کے ساتھ یاد کرتے ہیں (رفیع احمد قدوائی) اور وہ صدرِ جمہوریہ حزبِ مخالف بھی جس کی عزت کرنے پر مجبور تھا (ذاکر حسین) علی گڑھ ہی کے فرزند تھے۔ اور وہ بھی علی گڑھ کے فرزند تھے (محمد علی، شوکت علی) جنھوں نے گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے 'سرکاری' درسگاہ کا بائیکاٹ کرکے جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی تھی؛ انھیں پورے دیش کا باپو بنا دیا تھا، اور ان کی تحریک کو ایک ملک گیر تحریک! علی گڑھ اگر مسلم لیگ کا قلعہ تھا تو کانگریس کا بھی اتنا ہی بڑا گڑھ تھا، یہاں بھی علی گڑھ نے اپنا وہ مخصوص کردار دکھایا کہ دو الگ الگ بلکہ متضاد خیالات بھی ایک ادارہ میں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں، بس خلوصِ فکر شرط ہے۔

سچ یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک ایک زاویۂ نظر ہے، اعتدال، شرافت، رواداری، روشن خیالی اور جرأت مندی جس کے بنیادی عنصر ہیں۔ یہ انسانی سماج کو، اور اس لیے اس کے پانچویں حصے کی نمائندگی کرنے والے ہندستانی سماج کو، 'ایک کل' کی حیثیت سے دیکھتی ہے۔ مسلمان ہندستانی جس کا ایک جز ہے۔ اس کی فکر کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ کل کمزور ہوتا جائے گا اگر کسی سبب کوئی ایک جز دوسرے اجزا کے شانہ بشانہ کل کی پرداخت کے لیے اپنا استحقاقی رول ادا نہ کر پایا۔ ہر جز کی ہمہ جہتی ترقی میں کل کی ترقی پوشیدہ ہے۔ مسلمان ہندستانی ترقی کرے گا، آگے بڑھے گا تو ہندستان ترقی کرے گا اور اگر وہ گرے گا تو اسی نسبت سے یہ بھی

گرتا جائے گا، کہ وہ اتنی بڑی اقلیت ہے جیسے یہ نام دینا بھی اس لفظ پر ظلم کرنا ہے کہ دراصل وہ تو اس ملک کی "دوسری بڑی اکثریت" ہے جس کا اس ملک کی ہمہ گیر اور ہم آہنگ تہذیبی زندگی کی تشکیل و ترقی کے لیے ــــــ اور ایک منصفانہ، ترقی پذیر روشن خیال، باعزت، اور امن پسند معاشرے کے قیام و استحکام کے واسطے بڑا رول ہے۔ اس رول کے لیے اسے اپنے کردار پر نگاہ دینا ہے اس طرح کہ اقتدار کی چاکری، بالآخر اسے خادم سے مخدوم بنا دے۔

اقتدار کی چاکری کرنے والوں میں اختلاف تو ہوتا ہے لیکن پرخلوص، نیکوکار، سماج کے خدمت گزار باہمی اختلاف کا احترام کرتے ہوئے بھی کلمۃ سواء بیننا و بینکم پر اتفاق کر کے صلاح کی تعمیر میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ اختلاف جتنا بھی ہو، ہو، لیکن انسانیت اور شرافت کے جامے کے اندر ہوگا۔ علی گڑھ اور اس کی سربلندی اور نیک نامی اس کے ہر فرزند کے لیے اعلیٰ ترین قدر ہوگی جس محور کے گرد اس کے سارے اعمال گردش کریں گے؛ وہ عیار اور کسوٹی جس پر وہ اچھائی اور برائی کو کسے گا!

کوئی بھی نصب العین جس کے لیے جیا بھی جا سکے اور ضرورت پڑے تو مرا بھی جا سکے، سماجی خدمت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی ایک بڑے کام کی درجہ پا سکتا ہے بشرطیکہ اس کا حق ادا کیا جائے، کوئی کام نہ چھوٹا ہوتا ہے نہ بڑا، کام کو کرنے کا طریقہ یا سلیقہ اسے چھوٹا یا بڑا بناتا ہے۔ کام چھوٹا ہو یا بڑا سب اس کے کام ہیں جس نے ہمیں ان پر مامور کیا ہے؛ پھر تیغ کیا اور راویخ کیا۔

اقتدار کی چاکری؟ ہرگز نہیں لیکن مضبوطی کے ساتھ اپنے چاکر کو اپنے مواسب سے وابستہ کر دیتی ہے: شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق!

ناوابستگی علی گڑھ تحریک کا ایک امتیازی وصف ہے جس میں انگریزی اصطلاح مستعار لی جائے تو لبرل اور ماڈریٹ دونوں رول مل گئے ہیں۔ گہری مذہبیت ہوتے ہوئے بھی اس تحریک کی مذہبیت کٹرپن کے بجائے وہ سچی مذہبیت ہے جو خون میں پہنچتی، روح کو نکھارتی ہے، اس کے نزدیک مذہب خدا اور بندہ کے درمیان سب سے پاکیزہ، سب سے محبوب رشتہ ہے۔ محبوب میں شرکت نہیں ہوا کرتی۔ درود ے اس رشتہ کو یہ تحریک سیاست کے ساتھ ملوث کرنا صحیح نہیں سمجھتی۔ صحیح اس کو سمجھتی ہے کہ اپنے اپنے مذہب پر چلتے ہوئے، ایک بہتر و برتر سماج کی، ہر روز روز گزشتہ سے حسین تر، تخلیق کرتے رہیں۔

مذہبی معتقدات کی طرح سیاسی معتقدات میں بھی اس کا یہی ناویۂ نظر کارفرما رہتا ہے: اختلاف بھی ہو تو اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہنے کے ساتھ دوسرے کے طرزِ فکر یا طریقِ کار کو پوری توجہ سے پوری ہمدردی سے سننا اسے Appreciate کرنا اور کسی بھی قسم کی جارحانہ یا مفسدانہ روش اختیار کیے بغیر، شرافت کے ساتھ اپنے اختلاف کا اظہار کر دینا اس تحریک کے وابستگان کی پہچان ہے۔

O

علی گڑھ تحریک کی پیش کش کا یہ ایک Non-Conformist (رسم و رہِ عام سے ہٹا ہوا) انداز ہے ملگتا ہے کہ دنیا بھر کے (متعلق و غیر متعلق) موضوعات کو اس عنوان سے جمع کر دیا گیا ہے!

لیکن تھوڑے سے تامل کے بعد آپ کو یہ سب تحریریں ایک رشتے میں پروئی نظر آئیں گی اور وہ رشتہ ہے ایک بہتر و برتر، شستہ و شائستہ، خوش دل و خوش اطوار معاشرہ برپا کرنا۔ ہندستانی مسلمان جس کا ایک باعزت عنصر ہو اور جس کی تعمیر و ترقی میں اس کا حصہ کسی سے کم نہ ہو۔ ہر تحریر میں آنکھ مچولی کرتی یہ موج تہ نشیں، آپ کے سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ یقینی چلی جائے گی۔

چند مثالوں سے اسے واضح کرنا بہتر ہوگا:

مقصدِ حیات محض جیے جانا نہیں؛ مقصد ہے اقدار کی چاکری اور انسان کی خدمت میں زندگی گزارنے کو ایک — اور حیاتِ باشرف کی طرف سفر، اس عزم کے ساتھ کہ آگے چلیں گے دم لیکر! اطمینان، زر پرستی کی بے لگام دوڑ میں لچھمی کی اندھی پوجا نے ایک بڑے طبقہ سے شاید ہمیشہ کے لئے چھین لیا ہے۔ کیا ایسا ہی ہو، اس کے لیے ایک سمجھاؤ ایک بظاہر غیر متعلق تحریر میں ملے گا جو اس دستاویز میں شامل ہے جہاں لکھنے والے نے لکھا ہے:

"گھروں اینٹ کی بلند حویلیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارے گاؤں جو تہذیب کا مرکز تھے آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں... فارغ التحصیل طلبا شہری مشین کا پرزہ بننے سے پہلے ایک بار اپنے گھروں کی طرف بھی دیکھ لیا کریں۔ شہروں میں معمولی نوکری کرنے کے بجائے اگر پرانے گھروں میں رہ کر پیشہ کمائیں تو زیادہ مطمئن زندگی بسر کر سکتے ہیں، ہم وطنوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں... کہ وہ کوچہ روکشِ جنت ہو گھر ہے گھر پھر بھی۔ اعلیٰ ملازمت سے جو فیض حاصل ہو اسے اپنے آبائی گھر کو سجانے میں استعمال کریں"

(جوش فرید آبادی اردو)

اسی طرح کی ایک اور تحریر بھی اس مجموعہ میں شامل ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ:

"زر کسی معبود کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ مشترک ناصیہ لیکر اس کے حضور نہیں جا سکتے۔ زر جہاں ایک دروازہ سے داخل ہوا سادگی، معصومیت، پاکیزگی، خدا کا خوف، رسول کی محبت، انسان دوستی، دردمندی، اخوت، مساوات، غرض کہ ساری صالح قدریں دوسرے دروازے نکل گئیں...

"زر سیال نے عرب کو ارب پتی بنا دیا، دنیا کے ترقی یافتہ ممالک عربوں کے دست نگر بن گئے، لیکن نتیجہ کیا نکلا... عرب اپنی روحانی طاقت لیکر اٹھے، دنیا پر چھا گئے، انسانیت کو سنوار گئے۔ مادی طاقت ہاتھوں میں آئی تو ایک چھوٹے سے ملک سے نبرد آزما اور عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ زر کے لیے ہاتھ خالی کرنا تھا، میراث کو ہاتھ سے گرا دیا۔" (ساری بحر کوئی...)

ہر قوم سے، ہر ملک سے، ہر شخص سے وہ سب کچھ سیکھنا چاہیے جو باعزت جینے کے بہتر مواقع فراہم کر سکے۔

جاپان کا ذکر ہوگا تو محض تعارفاً یا تفنناً نہیں بلکہ اس لیے کہ آج دنیا میں پچھڑے ممالک کے لیے یورپ اور امریکا نہیں جاپان مشعل ہدایت ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کو جاپان کا طریقہ کار اپنانا چاہیے تاکہ بیکاری سے نجات پا کر ہندستان کے مجموعی معاشرہ کو اونچا اٹھا سکیں۔ یہ ملک قرآن کے احکام پر بلا اعلان کیے عامل ہے۔ دوسری طرف عرب ممالک کے شیوخ ہیں جو اعلان کر کے بھی اس سے میلوں دور ہیں۔ کم از کم ہندستانی مسلمان اس سے کچھ سیکھیں۔ یہاں علی گڑھ تحریک کا یہ بنیادی پہلو پیش نظر ہے کہ علم جہاں بھی ملے حاصل کر لو کہ علم تو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے۔

بہترین راستہ بیچ بیچ 'اعتدال' کا، 'توازن' کا راستہ ہوتا ہے، نہ اس سرے پر نہ اس سرے پر کسی بھی مفید نظریہ یا انسان دوست تحریک کو گالی سے نہیں دلسوزی سے مفاہمت کی اسپرٹ کے ساتھ خوش آمدید کہنا چاہیے۔ سمجھنے سمجھانے کی فضا ہونی چاہیے:

مارکسزم ہر طرح سرمایہ داری سے بازی لے گیا ہو ایسا نہیں ہے، کئی کھانچے ہیں۔ تاہم مذہب

اندر مارکسزم میں جو بیر پیدا کر دیا گیا ہے وہ غلط فہمی کی بنا پر ہے ۔۔۔۔ اور یہ کہ اگر کچھ برائیاں ہوں اور اس کے ساتھ کچھ اچھائیاں بھی ہوں، تو کم سے کم ان اچھی باتوں سے اتفاق کر لیا جائے

”مارکسزم بہرحال انسانی دماغ کا نتیجہ ہے ... اس کی اچھی باتوں سے اتفاق کرنا چاہیے اور غلطیوں کی مخالفت ... کسی زمانے میں مسلمانوں نے یونان کے فلسفہ سے استفادہ کیا تھا؛ وہی فائدہ مارکس سے کیوں نہ حاصل کیا جائے؟“

یہ اقتصادیات کے ایک ماہر علیگ کا بیان ہے اس لیے کچھ نہ کچھ غور کا تقاضا کرتا ہے۔

علی گڑھ تحریک نے خوردوں کی عزت کے ساتھ بزرگوں کا احترام سکھایا تھا کہ ان کے تجربات سے روشنی اور ان کی شفقت سے گرمی حاصل کر کے ہم سماج میں زیادہ بہتر طور سے حصہ لے سکتے ہیں ۔۔۔ اور انھیں نظر انداز کر کے نہ صرف اپنے بچوں کے سامنے ایک غلط مثال قائم کر دیتے ہیں بلکہ اس بصیرت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں جو ایک عمر کا تجربہ ہمیں شفقت کے چند لمحوں میں مفت فراہم کر سکتا ہے

(سماج میں بوڑھوں کی ضرورت)

کل عیسائیوں سے صلیبی جنگیں لڑتے گزری، پرسوں یہود پر لعنت بھیجنے، اور آج ہندو سے نفرت کرتے: بس اس لیے کہ وہ جو ہم سے نفرت کرتے رہے ہیں۔ نفرت صرف نفرت کو جنم دے سکتی ہے۔ کیا دوسرا راستہ کبھی نہیں آزمایا جا سکتا۔ محبت نہ سہی دوستی ہی سہی، دوستی بھی نہ سہی مفاہمت ہی سہی: وہ کون ہیں یہ بات اپنوں کو، اور ہم کون ہیں یہ بات ان کو مشفقانہ، مخلصانہ اور ہمدردانہ انداز میں سمجھانا!

مسائل درپیش ہوں، اور چیخ چیخ کے اپنے عنوان بتاتے ہوں، تو ان سے آنکھیں موند لینا سادہ لوحی بھی ہے، بزدلی بھی۔ علی گڑھ زندہ سوالوں کو حل کرنے کے لیے ان سے آنکھیں چار کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

’بین مذہبی مناکحت‘ کے عنوان سے جو مسئلہ چھڑ گیا ہے آج کے ملے جلے ہندوستانی سماج میں یہ محض ایک نظریاتی بحث نہیں، ایک زندہ سوال ہے۔ اکبر کے دور سے یہ سوال اٹھ چکا تھا جب راجپوتوں کے ساتھ شادی بیاہ کا سلسلہ چھڑا تھا لیکن مدت تک علما نے اس سوال کو جواب دینے کے لیے درخور اعتنا نہیں سمجھا، جیسے وہ جواب نہیں دیں گے تو سوال کا وجود ہی مٹ جائے گا۔ ڈیڑھ صدی بعد مظہر جانجاناں نے اس کا

جواب دیا کہ ہندو اہلِ کتاب ہیں۔ پھر ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ تا آنکہ اقبال نے "گایتری" کا ترجمہ کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ "ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گرداننا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا"۔

جب محمد بن قاسم نے انھیں اہلِ کتاب تسلیم کیا ہو، اورنگ زیب نے جزیہ لے کر انھیں اہلِ کتاب مانا ہو، مظہر جانجاناں نے ان کی کتابوں کو الہامی کتاب قرار دیا ہو، اور اقبال تک انھیں مشرک قرار دینے سے انکار کیا ہو تو ہم غور کیوں نہیں کر سکتے کہ ہندو شبہ اہلِ کتاب کے حکم میں داخل ہو سکتے ہیں۔

مسئلہ اور اس کی صفائی اپنی جگہ پر، لیکن یہ امر بھی پوری صفائی کے ساتھ اظہار میں آنا ضروری ہے کہ آزادی کے بعد کی نصف صدی میں جو بڑا حصہ گزر گیا، اس کی روشنی میں اب چھوٹا حصہ گزر رہا ہے، اور حقائق آنکھیں دکھا کر گزر رہا ہے۔ حقائق یہ ہیں کہ احیاء پسندوں نے سیکولر طاقتوں سے ہر محاذ پر شکست کھانے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف فسادات کا جو ایک سلسلہ دراز کر رکھا ہے اور نفرت کی جو آگ بھڑکائی ہوئی ہے اس کی موجودگی میں اسلامیانِ ہند کا اپنے تشخص پر اصرار ناگزیر ہو جاتا ہے، اور اسی کے ساتھ پھر یہ بھی لازم آتا ہے کہ بین مذہبی مناکحت، اہلِ کتاب اور شبہ اہلِ کتاب کے ساتھ درست ہونے کے باوجود حالاتِ موجودہ مناسب یقیناً نہیں ہے۔ کم سے کم اس صدی کے باقی ماندہ [illegible] برسوں میں تو امید نہیں کہ حالات کوئی ایسی انقلابی کروٹ لے سکیں گے کہ احیاء پسند اپنا موقف چھوڑ کر انسانی زبان کو اپنا سکیں۔ اور جب تک فساد کا ماحول تبدیل نہیں ہوتا مسلمانوں کا احساسِ کمتری اتنی تیزی سے کم نہیں ہو سکتا جیسا کہ چاہئے۔ احساسِ کمتری کم ضرور ہو رہا ہے خاص کر بنگلہ دیش کی تشکیل کے بعد جو پاکستان کا المیہ بنا، حالانکہ واقعہ وہ بھی صرف اتنا ہی ہے کہ ایسا ہونا ہی تھا، اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نجات کی راہ کھل گئی، لیکن محبت کے راستے سے نہیں نفرت کا جواب نفرت سے دے کر: فسادیوں سے نمٹنے کے لیے زیادہ بے کس ہو کر اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر، اس ماحول کے ساتھ بین مذہبی مناکحت کی کوئی بھی بات احساسِ زیاں کو ابھار سکتی ہے جس سے پوری قوم کا نقصان ہے۔ ایسی صورت تیوہاروں کی ہے جنھیں مل جل کے منانے کو جی چاہتا ہے، ہولی کی خوش رنگی اور دیوالی کی جھلملاتی روشنیوں میں نہا جانے کی کس کو خوشی نہیں ہوتی! بہن بھائی کے ہاتھ میں راکھی باندھتی تو کس بھائی کے دل میں محبت کا سمندر نہ ابلتا ——— لیکن ابھی کچھ نہیں ہو سکتا! کچھ نہیں ہو سکتا!! فسادیوں نے اور احیائیوں نے ہمارے ہاتھ قلم کر رکھے ہیں۔ ہولی کی خوش رنگ پچکاری کے اندر سے سیکولرزم کی اقدار کا خون نکلتا ہے، دیوالی کے دیوں سے وہ آگ نکلتی ہے جو دکانوں اور مکانوں

کو مجسم کرتی جاتی ہے۔ راکھی باندھنے والی بہن کی دوسرے بھائی وزدہ مارڈے، منھ بولے بھائیوں کے سامنے آبرو ریزی کر ڈالتے ہیں! نفرت کی اس آگ میں سب کچھ جل گیا ہے۔ مصنوعی کوششیں فضول ہیں۔ کوشش، مشترکہ تہواروں سے پہلے اور بین مذہبی مناکحت سے قبل اُس شر انگیز نفرت کے زہر کو دور کرنے کے لئے کرنا ہے جو ماؤں کے دودھ میں رَل مِل کر بچوں کی کتابوں میں گھل کے، سیاست کاروں کے اقوال و اعمال میں شامل ہو کے جسم و جاں کا ایک اٹوٹ حصہ بنتی جاتی ہے اور وطنِ عزیز کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہے۔

اختلاف اپنی جگہ، لیکن ——— ہمیں خوشی ہے کہ بین مناکحتی مسئلہ اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر جو کچھ سوچا گیا ہے اُسے اخلاص کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جرأت مندی کے ساتھ سب کے سامنے پیش تو کر دیا گیا ہے۔ پچھلی صدی میں سر سید نے کچھ ایسی ہی صورت میں بھی اسی انداز پر سوچا تھا اور پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی جرأت مندانہ فکر کو بالکل اسی بے لاگ انداز پر پیش کر دیا تھا۔ یہ جرأت مندانہ خلوص علی گڑھ تحریک کا ایک امتیازی نشان رہا ہے۔ اور ہم اسی کی تجدید کے طور پر اس تحریر کو شامل کر رہے ہیں، اختلافی نوٹ کے ساتھ اگر آپ کے جی میں اس امر کے بارے میں علی گڑھ تحریک کا عملی زاویۂ نظر کیا ہوگا۔

○

تو مسائل کی طرف سے آنکھیں موند لینے سے مسائل حل نہیں ہو جاتے، آنکھیں موند لینے والوں کو وہ خود حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ علی گڑھ نے ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھنا سکھایا ہے۔ [illegible] سے پورا اعتماد حاصل کرتے ہوئے یہ تحریک ہر موجود سے آنکھیں چار کرتی چلتی ہے اور اسی لئے یہ کبھی اپنی ہمہ جہتی کو لفظوں میں اسیر نہیں کر سکتی کہ ہر خلاف [illegible] اور ہے [illegible] نئی برقی تجلی، نئے تجربے میں مرحلۂ شوق کبھی طے ہی نہیں ہو پاتا۔ یہ تو ہر نئے عہد کو خوش دلی سے قبول کر کے نئی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے نئے توانا تر اصول وضع کرتی ہوئی اپنی توسیع کرتی چلی جاتی ہے۔ اس رسائیت سے جیسے توسیع کی ہر نئی جہت خود اس کے اندر ہمیشہ سے موجود رہی ہو۔

○

علی گڑھ تحریک جو ہمیشہ اپنے زمانے کی سب سے بڑی ترقی پسند تحریک رہی ہے، ایک جاری تحریک ہے، اس زندہ احساس اور توانا شعور کے ساتھ کہ: حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری + بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی۔ ماضی کے پورے احترام کے ساتھ اس کی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہی ہے۔

قومی یکجہتی اس کے خمیر میں داخل رہی ہے لیکن یہ عزتِ نفس کے ساتھ کسی قیمت پر سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ وطنِ عزیز کی سربلندی کے لیے اس نے ہمیشہ سر کی بازی لگائی ہے۔ اس لیے یہ صرف سر اٹھاکے اور آنکھ ملاکے بات کر سکتی ہے، آنکھ جھکاکے یا جھپکاکے بات کرنے کا سلیقہ اسے کبھی آیا ہی نہیں ——— اور یہ اس لیے کہ یہ اپنے لیے کبھی کچھ نہیں مانگتی، یہ صرف فرائض کی بات کرتی ہے، حق کا لفظ بزدلی اور منافقت کے الفاظ کی مانند اس کی ڈکشنری میں سرے سے ہے ہی نہیں ——— یہ تو بس اپنا ایک حق مانگنا سیکھی ہے: خدمت کا حق!

کبِیرا کھڑا بجار میں مانگے سب کی کھَیر

اس توانا فکر کی جھلکیاں ان تحریروں میں بکھری مل جائیں اور اس جھلملی روشنی میں ملت، قوم، برصغیر اور بنی نوع کے حال کو بہتر و برتر مستقبل میں ڈھالنے کے چند ایک خواب بھی میسر آجائیں، تو یہ دستاویزی پیش کش ناکام نہیں رہی!

——— عابد رضا بیدار

اس ترتیب میں دو تحریریں توجہ طلب ہیں اور توجیہ طلب بھی:

اس پانچ چھ سال کے عرصے میں، اب جو علیگڑھ کا سب سے بڑا فرزند ہمارے درمیان بچا تھا وہ اللہ کو پیارا ہوا۔ ان کی یاد ضروری تھی کہ اپنے اکابرین کو دہرانا خود اپنی بازیافت کا وسیلہ ہے، ماں کی عظمت اور محبت میں ڈوبے کے لائق باپ کے لائق بیٹے نے یہ کہانی ہمارے لیے تاریخ کی ہے: نواب چھتاری کی کہانی نواب زادہ ابن سعید خاں کی زبانی

گیانی ذیل سنگھ نے صدر جمہوریہ کی حیثیت سے علیگڑھ کی پہلی وزٹ کے موقع پر جو تقریر کی اس کا بھی علیگڑھ سے ہمیشہ کے لیے ایک رشتہ جڑ گیا ہے۔ اس تقریر کو اس مجموعہ کا نحو لعنوت دیباچہ سمجھا جا سکتا ہے۔

**معذرت:** یہ دو سال کی محنت و محبت کا حاصل ہے پھر بھی اسمیں اغلاط اتنے ہی ہوں گے جتنے اردو لیتھو کی کسی بھی دوسری کتاب میں! حتیٰ کے ناموں میں بھی کسی کو عالی مقام کسی کا خالی نام، کچھ کے تعارف میں ایک صفحہ کچھ کو ایک سطر بھی نہیں۔ تاہم اب زیادہ تاخیر کی جگہ یہ معذرت ہی بہتر سمجھی جا رہی ہے۔

اس مجموعہ کی شکل میں سجائی ہوئی محفل میں شہ پارے لکھنے والوں کے ہم شکر گزار ہیں۔ ان اداروں کا شکریہ بھی ہم پر واجب ہے جن کے رسالوں یا ٹیپ ریکارڈوں سے یہ مواد اخذ کیا گیا ہے۔

یونیورسٹی گزٹ، خدا بخش لائبریری ریکارڈ، اعظم گڑھ اور دوسری کانفرنسوں کے ریکارڈ کے علاوہ مستقل بالذات کتابچوں، خطبوں سے اور تہذیب الاخلاق (جدید) سے سب سے زیادہ کہ یہ اس دور میں اس تحریک کا سب سے بڑا ترجمان رہا ہے ـــ جہاں جہاں بھی پچھلے پانچ چھ سال میں متعلقہ مواد ملتا گیا وہ ریزہ ریزہ جمع کیا جاتا رہا ـــــ جن کا انتخاب پیش خدمت ہے۔

مشتملات میں ۱-۳، ۷-۱۰، ۱۲-۱۵-۱۷-۲۲، ۲۴، ۲۶، ۲۸ تہذیب الاخلاق (جدید) سے ۵، ۶ ندائے ملت سے ۱۰، ۲۵ کشمیر سیمینار ۱۶ اشیروانی پریس ریلیز ۲۳ بوائے اسکاؤٹ میگزین ۲۵ جامعہ ۲۷ ہندوستان کدھر سے ۲۹، ۳۰ خدا بخش لائبریری ریکارڈ سے لئے گئے اور ۳۱-۳۳ کتابچوں سے تہذیب الاخلاق سے، یونیورسٹی گزٹ اور رودادوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔

ـــــ ادارہ

# گیانی ذیل سنگھ

## صدر جمہوریہ کی تقریر: علی گڑھ میں

پیارے بھائیو اور پیاری بہنو: آج مجھے اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ اس کانفرنس کے لیے جو موضوع آپ نے چنا ہے اس کے لیے میں آپکو مبارکباد دیتا ہوں۔ جو سلم اور دانشور اس میں شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں، ان کا میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ کانفرنس مسلم یونیورسٹی میں ہو رہی ہے، اس بات کی اور بھی زیادہ اہمیت ہے۔ یہ یونیورسٹی ہمارے دیش کی تمام یونیورسٹیوں میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ سر سید احمد خاں نے یہ تعلیمی ادارہ قائم کر کے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی۔ پھر ان کے جانشینوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ جنھوں نے یہاں تعلیم پائی، وہ زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب ہوئے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی اور تسلی ہوتی ہے۔

قرآن شریف پڑھ کر اس کانفرنس کا ادگھاٹن کیا گیا ہے۔ قرآن شریف علم حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں خداوند کریم ان کی حفاظت کے لئے دو فرشتے مقرر فرما دیتا ہے۔ طالب علموں سے ہماری بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ مستقبل کے معمار اور آنے والے بھارت کے معمار ہیں۔ طلبا کو سیاست داں گمراہ کرتے ہیں، ان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ضروری ہے کہ آپ طالب علم، دانشوروں سے رشتہ جوڑیں۔ سیاست دانوں کا تو یہ حال ہے کہ:

نہ پتہ ہے راستوں کا، نہ خبر ہے منزلوں کی
مگر اس پہ یہ گماں ہے کہ ہمیں رہنما تو ہم ہیں

یہ یونیورسٹی مسلمانوں نے قائم کی تھی۔ اب اس کا اقلیتی کردار بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہاں مسلمان ہی پڑھیں گے۔ اس کے بانی نے اس کے دروازے ہر ایک پر کھلے رکھے تھے۔ مسلمان، خدا کو رب العلمین مانتے ہیں۔ حضرت محمدؐ ساری دنیا کے لئے محبت و رحمت بن کر آئے تھے، تو ہمارے دلوں میں بھی ایک دوسرے کے لئے محبت ہونی چاہیئے۔ طالب علموں کو چاہیئے کہ سیاست دانوں سے دامن چھڑائیں اور اپنے استادوں کا دامن تھامیں، ان کا ادب و احترام کریں۔ استادان سے پیار کریں، انھیں اپنی اولاد جانیں۔ ہمارے بچے بہت غلطیاں کرتے ہیں، شرارتیں کرتے ہیں، مگر ہم انھیں گھر سے نکال نہیں دیتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑکے اس سے غلط فائدہ اٹھانے لگیں۔

اس یونیورسٹی میں اردو کی طرف خاص دھیان دیا جاتا ہے۔ یہ عمدہ بات ہے۔ اردو دیش کے دلوں میں بسی ہوئی

ہے۔ جبھی تو یہ ہوا کہ راکیش شرما سے ہماری وزیر اعظم نے پوچھا کہ اتنی اونچائی سے ہندوستان کیسا لگتا ہے، تو اس کے منھ سے فوراً نکلا "سارے جہاں سے اچھا"۔ اردو اور ہندی کی بات یہ ہے کہ اردو کو ہندی لپی میں اور ہندی کو اردو خط میں لکھا جا سکتا ہے، اگر دلوں میں پیار تو ہو :

بجھ رہے ہیں چراغ دیر و حرم
دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے

آخری بات یہ کہ خدا نے تو ہمیں انسان بنا کر بھیجا ہے، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی نہیں بنایا؛ وہ ہم خود بنے۔ ہمیں انسان رہنا چاہیے :

تم کو خدا کہوں کہ خدا کو خدا کہوں
دونوں کی سمت ایک ہے، کس کو جدا کہوں

••

# سرسیدؒ

اِس پرچہ میں صرف مضامینِ مفیدہ جو مسلمانوں سے متعلق ہیں چھاپے ہوتے ہیں۔ اور اس سبب سے اخبار امصار و دیار اس میں مندرج نہیں ہوتے۔ مقصود اس پرچہ کے اجراء سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی حسنِ معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور جو غلط اوہام مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں اور درحقیقت وہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں وہ بھی مٹائے جاویں۔

(سر سیّد) از تہذیب الاخلاق ۱۸۷۰ء

# تمہید

(تہذیب الاخلاق" مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء۔ مطابق ۱۲۸۷ھ)

---

اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے، تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں اُن کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔

سویلزیشن انگریزی لفظ ہے، جس کا تہذیب ہم معنی ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہیں انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔

یہ بات نہایت سچ ہے کہ کسی قوم کے مہذب ہونے میں اس قوم کے مذہب کو بھی بڑا دخل ہے۔ بیشک بعضے مذہب ایسے ہیں کہ وہ تہذیب قوم کے بڑے مانع ہیں، پس اب دیکھنا چاہیے کہ کیا مسلمانی مذہب بھی ایسا ہی ہے۔

اِس باب میں مختلف رائیں ہیں۔ ایک عیسائی متعصب مؤرخ نے ٹرکی یعنی روم کی سیر کے بعد اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ترک جب تک مذہب اسلام کو نہ چھوڑیں گے، مہذّب نہ ہوں گے۔ کیونکہ مذہب اسلام انسان کی تہذیب کا مانع قوی ہے۔

سلطان عبدالعزیز خاں سلطان روم کو جو بالفعل بادشاہ ہے، اسبات کی تحقیقات منظور ہوئی کہ درحقیقت مذہب اسلام مانع تہذیب ہے یا نہیں؟ اور چند علما اور عقلا اور وزرا کی کونسل اس امر کی نسبت رائے لکھنے کو مقرر کی جس کا افسر فواد پاشا تھا۔ اس کونسل نے جو رپورٹ لکھی اس کے دو فقروں کا ترجمہ اس مقام پر لکھا جاتا ہے:

"اسلام میں وہ سچی باتیں ہیں جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی اور انسانیت اور تہذیب اور رحمدلی کو کمال درجہ پر پہنچانے والی ہیں۔ مگر ہم کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانے میں مفید تھیں، مگر حال کے زمانے میں نہایت مضر ہوگئی ہیں، چھوڑنا چاہیے۔"

اب دونوں رایوں میں سے کسی ایک رائے کا سچ کر دکھا دینا مسلمانوں کے اختیار میں ہے اگر وہ اپنے عملی کاموں سے مثل اور دنیا کی مہذب قوموں کے اپنے تئیں بھی مہذّب کر دکھاویں گے، تو فواد پاشا کی رائے کی تصدیق کریں گے، ورنہ ازخود اس پہلی رائے کی تصدیق ہوگی۔

ایک اور انگریزی مؤرخ ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ حالت کی نسبت یہ لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے مسلمان ذلیل ترین امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہیں اور قرآن کے مسئلوں اور ہندوستان کی بُت پرستی سے مل ملا کر ان کا مذہب ایک عجیب مجموعہ ہوگیا ہے۔"

ہماری سمجھ میں فواد پاشا کی رائے اور اس پچھلے انگریزی مورخ کا بیان بالکل درست ہے۔ ہم مسلمانوں میں بہت سے پُرانے قصّے یہودیوں کے اور بہت سی باتیں اور خیالات اور اعتقادات رومن کیتھولک کے جو ایک قدیم عیسائی فرقہ ہے اور جو مدت سے عرب میں بھی موجود تھا، اور بے انتہا رسمیں اور عادتیں ہندوؤں کی مل گئی ہیں اور مزید برآں بہت سی باتیں خود ہماری طبیعتوں یا ہماری غلط فہمیوں نے پیدا کی ہیں جو درحقیقت مذہب اسلام میں نہیں ہیں اور اسی سبب سے مسلمانوں کی عجیب حالت ہوگئی ہے۔ اور یہی باعث ہے کہ غیر قومیں ہماری اس ہیئت مجموعی پر خیال کرکے اس مجموعہ کو مذہب اسلام قرار دیتی ہیں اور اس کی نسبت نہایت حقارت کی رائے رکھتی ہیں۔ جیساکہ انگریزی مؤرخ نے مفصلہ ذیل رائے لکھی ہے:— "عیسائیت اس بڑی سے بڑی

خوشی کے جو قادر مطلق نے انسان کو دی ہے صرف موافق اور مطابق ہی نہیں ہے، بلکہ اس کو ترقی دینے والی ہے۔ اور برخلاف اس کے اسلام اس کو خراب کرنیوالا اور ذلت میں ڈالنے والا ہے۔

پس اب کیا یہ غیرت کی بات نہیں ہے کہ ہم غیر قوموں سے ایسی حقارت کے الفاظ اپنی نسبت اور اپنے روشن اور سچے مذہب کی نسبت سنیں اور اپنی تہذیب اور تربیت اور شائستگی کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ ہم فواد پاشا کی رائے کو جو بڑے بڑے عقلا اور علما کے اتفاق سے لکھی گئی ہے اختیار کریں اور بخوبی ہوشیار ہو کر نیک دلی اور غور سے اپنی حالت پر خیال کریں اور جو رسوم و عادات اب ہم میں موجود ہیں اور جو مانع تہذیب ہیں ان کو دیکھیں کہ وہ کہاں سے آئیں اور کیونکر ہم میں مل گئیں اور یا کیونکر خود ہم میں پیدا ہو گئیں اور اُن میں سے جو جو ناقص اور خراب اور مانع تہذیب ہوں اُن کو ترک کریں اور جو قابل اصلاح ہوں ان کی اصلاح کریں اور ہر ایک بات کو اپنے مذہبی مسائل کے ساتھ مقابلہ کرتے جاویں کہ وہ ترک یا اصلاح موافق احکام شریعت بیضا کے ہے یا نہیں۔ تاکہ ہم اور ہمارا مذہب دونوں غیر قوموں کی حقارت اور ان کی نظروں کی ذلت سے بچے کہ اس سے زیادہ ثواب کا کوئی کام اس زمانہ میں نہیں ہے۔

یہی ہمارا مطلب اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اسی مقصد کے لئے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچہ کے جہاں تک ہم سے ہو سکے ان کے دین دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقصان ہم میں ہیں گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں اُن کو بخوبی دیکھتی ہیں۔ ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں اُن میں ہیں ان میں ترقی کرنے کی اُن کو رغبت دلاویں۔ واللہ ولی التوفیق۔

السعی منی والاتمام من اللہ اللھم آمین ثم آمین

راقم سید احمد

"آہ! اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی و افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں، ان کو بے عزتی کے کام سمجھیں۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقعہ کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں۔ مگر اپنی بدصورتی اور دل کی بُرائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسے بے شرمی اور بےحیائی سے کام کرے جن سے بے شرمی اور بےحیائی بھی شرما جائے، لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفرین کا کام سمجھے۔" (سرسید)

(علی گڑھ نمائش میں تقریر)

"جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود، عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا تو مجھے ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ جہاں تک ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا، سب سے اوّل یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھ ایک مدرستہ العلوم قائم کیا جائے۔" (سرسید)

"مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیمی تنزل کا لحاظ کر کے اور اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی تعلیم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال ان اُمور پر غور کرنے کے لیے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے جو "محمڈن ایجوکیشنل کانگریس" کے نام سے موسوم ہو۔ یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہوگا۔ بلکہ ہر سال کسی ایسے مقام میں جہاں کے لوگ اس جلسہ کے منعقد ہونے کی خواہش کریں گے اور اس کا انتظام فرمادیں، منعقد ہوا کرے گا۔"

"جس جس ضلع میں لوکل اسٹینڈنگ کمیٹیاں قائم ہوتی جائیں، ان سے درخواست کی جائے کہ اپنے ضلع سے دس روپیہ ماہوار کا چندہ جس طرح ہو سکے ایک مسلمان طالب علم کی اسکالرشپ کے لیے جو کسی کالج کے کلاسوں میں پڑھتا ہو یا پڑھنا چاہے اور ذہین اور لایق اور قابلِ امداد ہو وصول کریں اور جس کالج میں وہ پڑھنا چاہے پڑھے اور لوکل اسٹینڈنگ کمیٹی اس بات پر غور کرتی رہے کہ وہ بہ محنت اور بہ کامیابی اپنی تعلیم میں مصروف ہے یا نہیں۔"

سرسیدؒ

○

"یاد رکھو کہ میں یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اگر اور چند روز تم اسی طرح غافل رہے، تو ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ تم چاہو گے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دو، ان کی تربیت کرو، مگر تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ مجھ کو کچھ کہو کافر، ملحد، نیچری، میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا، میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لئے کہتا ہوں۔ تم انھیں پر رحم کرو اور ایسا کچھ کرو کہ آئندہ کو پچھتانا نہ پڑے ...."

سرسیّد (لکچروں کا مجموعہ ص ۱۵۹)

○

"سب (ترقی) کی جڑ یہی ہے کہ سب سے پہلے علم کے خزانوں کو اپنے قابو میں کر لو۔"

سرسیّد (لکچروں کا مجموعہ ص ۲۸)

"ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لئے جاری کرنا میں نے تجویز کر لیا ہے اور "تہذیب الاخلاق" اس کا نام فارسی اور انگریزی میں محمڈن سوشل ریفارمر رکھ لیا ہے۔ اس کا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے اور یہ سب چیزیں یہاں سے بذریعہ جہاز بادبانی روانہ کر دیں کہ میرے وہاں پہنچنے تک پہنچ جاویں گی۔ خرچ ماہواری اجراے اس اخبار کا سو روپیہ ہوگا۔ ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ مہینہ کر کر کے دیں گے اور اخبار مفت میں بانٹیں گے اور بقیمت بھی بیچیں گے۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے اور کچھ نہیں ہونے کا۔ اگر صلاح ہوگی تو منشی ذکاء اللہ صاحب کو اور منشی نجم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر کو بھی آرٹیکل لکھنے میں شریک کریں گے۔"

••

مکتوب سرسیّد

بنام سیّد مہدی علی (نواب محسن الملک)

(۲۷ مئی ۱۸۷۰ء۔ مکتوبات سرسیّد۔ مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی مطبوعہ لاہور)

••

میں روز و شب تحریر کتاب سیرِ مصطفوی صلعم میں معروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔ اِدھر فکرِ ترتیبِ مضامینِ کتاب اُدھر فکرِ جوابِ اعتراضات۔ اِدھر فکرِ تنقیح و تصحیحِ روایاتِ صحیح میں مبتلا رہتا ہوں اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہوگیا ہے۔ اِدھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آویگا۔ مسلمان البتہ آستین چڑھا کر اس باب میں تو لڑنے کو تیار ہوں گے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاؤ مگر جب کہو کہ مذہبی تائید میں کچھ روپے خرچ کرو تو جان بچائیں گے۔

دوسرا باب جس میں عرب کا جغرافیہ اور وہاں کی قوموں کا اور حضرت اسمٰعیل ؑ کے وہاں آکر آباد ہونے کا ذکر ہے، چھپ رہا ہے۔ عرب میں ایک کتبہ نکلا ہے، جو یہاں کے برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ وہ کتبہ آنحضرت صلعم سے بہت پہلے کا ہے اور اس سے حضرت ہودؑ کا عرب میں پیغمبر ہونا اور قوم عاد کے مکانات کا وجود بخوبی ثابت ہوتا ہے، چنانچہ وہ کتبہ بعینہٖ اسی خط میں مع ترجمہ میری کتاب میں مندرج ہوگا ——— میری دانست میں نہایت خیر خواہی اسلام کی اور سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں چھاپی جائے۔ اس لئے انگریزی چھاپنا شروع کر دیا اور اُردو ابھی ملتوی ہے۔ علاوہ اس کے انگریزی عبارت لکھنے والے عمدہ اور کم قیمت پر، بہ نسبت ہندوستان کے کم قیمت پر ملے ہیں، ہندوستان میں ممکن نہ تھا۔ جو شخص کہ میری کتاب انگریزی میں لکھتا ہے اس کی لیاقت کا کوئی نہیں ہے۔ پس ایسا شخص ہندوستان میں کہاں ملتا؟ اگر میری یہ کتاب تیار ہوگئی جس میں دس باب ہیں، تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا۔ خدا قبول کرے۔ آمین۔

(خط بنام محسن الملکؒ از لندن)

••

"انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے، جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے۔ اور جو بات کہ از راہِ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لئے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا، جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو، نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔۔۔"

(لندن سے محسن الملک کے نام ایک خط میں)

"اگرچہ بعض وجوہات سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مذہب میں نہایت پختہ یا متعصب ہیں؛ مگر متعصب ہونے کا خیال میرے دل میں مطلق نہیں ہوا کیونکہ میں ان کو نہایت مہذب اور با اخلاق آدمی خیال کرتا ہوں اور ہر ایک کے اپنے مذہب میں پختہ ہونے کو نہایت عمدہ جانتا ہوں۔ مگر تعصب کو نہایت برا اور ایک بڑا نقص اخلاق انسانی میں اور نیچر یعنی حکومت الٰہی کے برخلاف سمجھتا ہوں۔ تو ایسے اچھے آدمی میں جیسے کہ میجر ڈاڈھا صاحب ہیں، میں ایسا نقص کیونکر خیال کرسکتا تھا۔ مگر ایک دن اتفاقیہ یہ ذکر آیا کہ فلاں شخص باوصف بڑی لیاقت کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن اس لئے نہیں ہوا کہ وہ شاید لامذہب اور کسی مذہب کے سچے ہونے کا یقین نہیں رکھتا۔ میں نے کہا کہ "میری رائے میں ضرور ہے کہ ہندوستان میں ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ایسے ہی ہوں جو لامذہب ہوں۔" ـــــ کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا:

"جب ہندوستان میں مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ بستے ہوں، تو مذہبی آدمی کا افسر تعلیم ہونا اکثر دفعہ بے تعصب عام تعلیم کا مانع ہو جاتا ہے۔"

یہ بات سن کر متعجب سے ہو کر خاموش ہو رہے۔ درحقیقت میری رائے یہ ہے کہ جیسا خدا بے تعصب ہے، مشرک، بت پرست، خدا پرست سب کو برابر پرورش کرتا ہے، اسی طرح گورنمنٹ اور افسر تعلیم کو بے تعصب ہو جانا چاہیے؛ تبھی گورنمنٹ ظل اللہ اور افسر تعلیم معلم صفت من صفات اللہ ہو سکتا ہے۔

(انتخاب از مسافرانِ لندن)

[یوپی کے لفٹننٹ گورنر، سر ولیم میور نے یورپین مصنفین اور عیسائی پادریوں کی تقلید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات اور حضور علیہ السلام کے کارناموں پر ایک تنقیدی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے نام سے چار جلدوں میں جس میں جگہ جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک اور بے عیب زندگی پر ناواجب اور نامناسب الفاظ میں اعتراضات کیے جنھیں دیکھ کر سرسید کی دینی غیرت اور مذہبی حمیت سخت جوش میں آئی اور انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اس کتاب کا مکمل، مدلل اور تشفی بخش جواب دیا جائے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کا جواب دینے کے لئے جن مستند کتابوں کی ضرورت تھی، وہ ہندوستان میں ناپید تھیں اور صرف یورپ میں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یا انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں میں محفوظ تھیں۔ اس لئے ضروری ہوا کہ کتاب کا حوالہ لکھنے کے لئے انگلینڈ کا سفر کیا جائے اور وہاں بیٹھ کر ان کتابوں سے فائدہ حاصل کرنے کے بعد سر ولیم میور کی کتاب کا جواب تیار کیا جائے۔

سفر کی تقریب کس طرح پیدا ہوئی؟ اس سفر کی تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ اتفاق سے ان ایام میں انگریزی حکومت نے ہندوستان کے ہونہار اور ہوشیار طلبا کو انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے چھ چھ ہزار کے ۹ وظیفے دینے منظور کیے۔ اس کے علاوہ ہر طالب علم کے لئے تین ہزار روپے اخراجات کے آمد و رفت بھی منظور کیے۔ چنانچہ ہر صوبے کی گورنمنٹ نے اپنے ہاں کے لائق طلبا کو اس سرکاری عطیہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے انتخاب کیا۔ اس سلسلہ میں یوپی گورنمنٹ نے سرسید کے فرزند سید محمود کو اس وظیفے کے لئے موزوں سمجھا اور ان کو اس کی اطلاع دے دی۔

اس خلاف توقع امداد سے سرسید کے ارادے کو زبردست تقویت پہنچی اور یہی سرکاری عطیہ اس بات کا باعث بن گیا کہ وہ سید محمود کے ساتھ خود بھی عازم ولایت ہوں اور لندن پہنچ کر اپنی پرانی آرزو پوری کریں۔

مگر دقت یہ تھی کہ یہ روپیہ جو گورنمنٹ نے دیا تھا، خود سید محمود کی تعلیم کے لئے بھی کافی نہ تھا۔ سرسید کی پوری کس طرح پڑتی؟ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ سوچا کہ سخت ایثار سے کام لیتے ہوئے اپنے نایاب اور قیمتی کتب خانے کو کوڑیوں کے مول بیچ ڈالا، اپنے آبائی اور جدی مکان کو رہن رکھ دیا، اپنی تنخواہ وصول کی اور سب کچھ لے کر سفر پر روانہ ہو گئے ——— (وہاں سے جو خط لکھے، درد دل کے کچھ ٹکڑے صفحہ ۹-۱۰ پر نقل کیے گئے)]

"محبت کے بے شمار درجے ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ اور افضل درجہ یہ ہے کہ تمام موجوداتِ عالم کو ہم حقیقت کی آنکھ سے دیکھیں۔ یعنی اگر ہمیں نظر آئے کہ ایک گھانس کے تنکے کو ناحق توڑا گیا ہے تو ہمارے دل میں ایسا درد پیدا ہو کہ گویا ہمارے ہاتھ اور پاؤں کے ناخنوں میں سے ایک ناخن کاٹ ڈالا گیا ہے۔ مگر محبت کا یہ درجہ اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ خداوند عالم اپنی رحمت کا دروازہ کسی پر نہ کھولے۔"

سرسید

(۱۶ اکتوبر ۱۸۶۳ء بمقام کلکتہ)

"ایک مدت دراز سے ہماری قوم کی ترقی مثل ایک ایسی بند جھیل کے ہو گئی تھی جس کا نہ کوئی پانی بہتا ہو اور نہ اس میں کوئی حرکت ہو اور نہ اس میں کسی اور طرف سے پانی آتا ہو۔ تُند ہوا کے جھونکوں اور آفتاب کی گرمی سے اس کا پانی روز بروز خشک ہوتا جاتا ہو۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ چند سال سے اس بند پانی میں کچھ حرکت آئی ہے۔ تمام ممالک میں، کیا بنگال، کیا ہندوستان، کیا پنجاب، کیا دکن، سب کی زبان پر، سب کے قلم پر، یہ بات جاری ہے کہ مسلمانوں کی حالت خراب ہے۔ وہ روز بروز تنزل کرتے جاتے ہیں۔ ان کو کچھ کرنا چاہیے۔ وہ لوگ صرف کہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کچھ کچھ کرتے بھی جاتے ہیں۔ جابجا انجمنیں قائم ہوتی ہیں۔ اخباروں میں آرٹیکل پر آرٹیکل لکھے جاتے ہیں۔ مدرسہ اور اسکول بنتے ہیں۔ یہ نہایت عمدہ نشانیاں ہیں۔ جس قوم کو یہ خیال ہوا کہ ہم تنزل کی حالت میں ہیں اور اس کے ساتھ اس میں کچھ تحریک بھی پیدا ہوئی تو پہلی سیڑھی ترقی کی ہے۔ ایسی حالت میں یہ امر بھی لازمی ہے کہ ترقی کرنے والوں کے خیالات مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی کچھ کرنے لگتا ہے، کوئی کچھ۔ اپنی قوتوں کو بغرض اس کے کہ ایک جگہ جمع کر دیں، پریشان کر دیتے ہیں۔ جو کام اصلی ہے، اُس کو چھوڑ دیتے ہیں اور جو اس کی طرح ہے اس کو اختیار کرتے ہیں جس کے سبب سے کسی میں بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ اس زمانہ میں یہی حال ہماری قوم کا ہے۔

مگر پانی کا خاصہ ہے کہ جب وہ بہتا ہے تو چاروں طرف پھیلتا ہے، پھر رفتہ رفتہ جو ٹھیک راستہ ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے ہم کو اپنی قوم سے امید ہے کہ رفتہ رفتہ وہ بھی ٹھیک راستہ قومی ترقی کا پائے گی۔ اور تمام مختلف خیالات ایک اصلی مرکز کی طرف جمع ہوں گے۔"

(لکچر بمقام لدھیانہ
۲۴ جنوری ۱۸۸۴ء)

"بایں ہمہ مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں عام مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھ کو نجات نہ ملے گی۔ عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے، کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح "تثلیث" کے مسئلہ کا قائل نہیں ہوں، اس لئے کہ میں انجیل میں اس مسئلہ کی تائید یا وجود پاتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ مذہب اسلام صحیح ہے اور اس کی صحت اور وجوہ دونوں انجیل سے ثابت ہیں۔ اس لئے مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش کروں۔ میں حق پر ہوں اور اس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو سب کو ایک دن جانا ہے۔"

"اے حضرات! گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے، مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے اس لئے اس کا گیت گایا جاتا ہے، ورنہ اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسے اپنے عزیزوں سے۔"

"غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لُٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا!... جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے.... یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروّتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں، اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دُور کرنے میں ہمّت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا... میرے غمخوار مجھ کو اس کے مانع آئے تھے اور میرا دل اُن سے کہتا تھا:

حریفِ کاوشِ مژگاں خوں ریزم نئ ناصح
بدست آور رگِ جانی و نشتر را تماشا کن"

"میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزّت ہم کو اُس وقت تک حاصل نہیں ہونے کی، جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے۔ گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔"

"جو شخص سچے دل سے اور نیک نیتی سے کسی کام کو کرتا ہے اس کو بُرا کہنے والوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اس کو خدا سے غرض ہوتی ہے۔ اور جب خدا سے غرض ہے تو لوگوں کے بُرا کہنے سے اس کے دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا بلکہ اُن لوگوں کے ساتھ اس کی محبت بڑھتی جاتی ہے اور وہ زیادہ کوشش کرنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچانے اور سمجھانے کے لئے زیادہ کوشش درکار ہے۔ اور جوں جوں مخالفت بڑھتی جاتی ہے، اس کی کوشش بھلائی کے واسطے ترقی کرتی جاتی ہے۔"

"میں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں ہوں جس قدر ہندوؤں کا ہوں جنھوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی۔ مدرسہ کی عمارات کی دیواروں اور محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں، جس سے ہمیشہ کو یہ یادگار قائم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے درماندہ مسلمان بھائیوں کی کس فیاضی سے مدد کی تھی۔"

○

"مسلمانوں کی رائے اور اُن کے خیالات، ہر ایک میں تقلید کرتے کرتے اور رسومات کے پابند رہتے رہتے ایسے پست اور پامال ہو گئے ہیں، جن کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔ جب تک کہ رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہوگی، اُس وقت تک اُن میں تہذیب نہ آئے گی۔"

○

"... دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور دشمن عیبوں کو، اِس لیے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب اُن عیبوں کو چھوڑ دیا تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق اُستاد سے ملنا چاہیے تھا۔"

●●

# مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ

افسوس ہے کہ جناب ممدوح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا۔ لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلّی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف و مشہور تھے ایسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بے مثل تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی اسحاق کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل ایک اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے۔

ابھی بہت سے لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی محمد قاسم کو نہایت کم عمری میں دلّی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔ انھوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع و اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا:

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا۔ اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک عالی رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پابند سنت و شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ باایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا ان کو خیال تھا۔ ان

ہی کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے اسلامی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر و مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزار ہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا و مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور بہتر سمجھتے تھے، اس کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے۔ مسئلہ حب اللہ اور بغض للہ ظاہر ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔ اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو، بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم (رح) دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلوماتی علم میں شاہ عبدالعزیزؒ کے کچھ کم ہو۔ الّا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی، نیکی، اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ وہ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے آدمی کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت اور افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں، یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کر لیں، بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جائے۔ ●●

# ابوالکلام آزاد

# دہلی کی مسجدِ شاہجہانی میں آزادی کے فوراً بعد پہلی تقریر: ۱۹۴۷ء

عزیزانِ گرامی!

آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہجہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں بھی کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد تھا۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں، تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔

تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں یہیں سے پکارا، اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دئے، میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں کاٹ دئے، میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی، حتی کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست، جو تمہیں داغِ جدائی دے گئی ہے اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا، بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم، کہ آج اُن ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے، جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھئے تو اب میں ایک جمود ہوں، یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے چن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لئے ہیں، یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوت زندگی نہیں اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا؟ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے کہا تھا کہ دو قوموں کی حیاتِ معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ

رکھتا ہے اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسا کیا ہوا ہے، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سُنی ان سُنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔

تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسا تھا وہ تمھیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں، وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت میں مشیت کی منشاء سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی تمھارے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف اُلٹ گئی اور رہنمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کیے تھے وہ بھی دغا دے گئے، حالانکہ تُم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بُتوں کی پوجا میں تمھاری زندگی ہے۔

میں تمھارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمھارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمھارے لیے بہت سی گرہیں کھُل سکتی ہیں۔

ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا:

> "جو ہونے والا ہے، اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں بھی سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حرّیت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطّل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مؤرخ لکھے گا کہ:— 'تمھارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویّہ اختیار کیا، جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے'۔"

اور آج ہندوستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعہ کی دیوار پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے وقار سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اُڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق کروٹ نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے اور تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شئے چھن گئی اور اس کی جگہ بُری شئے آ گئی ہے۔

ہاں تمھاری بے قراری اس لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں ابھی نئے کے لئے تیار نہیں کیا تھا اور بری شئے ہی کو مادی وسیلہ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے، جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمھاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ اِدھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور اُدھر گمراہی کا خطرہ بھی پیش آگیا ہے۔

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاسیات کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے اور کبھی اس پُرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ لیکن آج مجھے جو کچھ کہنا ہے، میں اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔

مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات پر ابھی تک لپے ہیں۔

پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو سیلاب آیا ہے، وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔ یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لئے تو موجب حیرت ہو سکتا ہے لیکن میرے لئے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پہلے دن ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔ اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے اندازِ فکر میں سوچ سکتے ہیں یا نہیں! اسی خیال سے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دیئے گئے ہیں۔ ہراس کا یہ موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔

میں نے تمھیں ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر بھی غور کرو۔ تمھیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو، اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو! مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے

قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرلو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بیجا تھا اسی طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے ۱۳ سو برس پہلے عرب کے ایک امّی کی معرفت فرمایا تھا:

| | |
|---|---|
| إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ | "جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے، تو پھر اُن کے لئے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم" |

ہوائیں آتیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں۔ لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ نہیں بدلا اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہو تو پھر اس طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔

آج بھی کہ ہم ایک دورِ انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان ہی صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی

کی وہی زندگی اختیار کرو، جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اُجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انہیں بھلاؤ نہیں انہیں چھوڑو نہیں، اُن کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔

آؤ عہد کریں کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیروں سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اُجالا تھا۔ یہ بادلوں کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو اُن پر مسکرا دیئے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اٹھی تو رُخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو اُن سے کہا کہ تمہارا یہ راستہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبانوں کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ ۱۴ سو برس پہلے کا پرانا نسخہ ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان : وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ۝

آج کی صحبت ختم ہو گئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کے ساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دوں، یہ تو دل کی دکان ہی سے اعمالِ صالحہ کی نقدی پر دستیاب ہو سکتی ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

زبان ز نطق فرو ماند و راز من باقی است
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقی است

••

## علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں خطبۂ تقسیم اسناد: ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء

... موجودہ زمانے میں جب کہ مغربی علوم کی تعلیم ہندوستانی زندگی کی ایک عام حقیقت بن گئی ہے اور ہم تعلیم کے لفظ کا اطلاق صرف اس تعلیم پر کرنے لگے ہیں، بہت کم لوگ اس جدّوجہد کی دشواریوں کا صحیح اندازہ کر سکیں گے، جو آج سے سو برس پہلے نئی تعلیم کے حامیوں کو پیش آئی تھیں۔ انھیں صرف ایک نیا راستہ ہی نہیں دکھانا تھا، اس راستہ میں قدم قدم پر لڑنا تھا۔ ان کی راہ قدامت پرستی کی بےشمار قوتوں سے رُکی ہوئی تھی جو ہمیشہ نئی تبدیلیوں کی راہ روکنا چاہتی ہیں۔

... دراصل یہ جنگ فکرِ انسانی کی تاریخ کا ایک عالمگیر خاصہ تھی۔ یورپ میں یہ کشاکش سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ہوئی اور مشرقی ممالک کا اس سے سامنا انیسویں صدی میں ہوا۔ ہندوؤں میں یہ جنگ جلد شروع ہوئی اور جلد ختم ہو گئی۔ مگر مسلمانوں میں اس نے بہت زیادہ وقت لیا۔ بالآخر وہی ہوا، جو ہمیشہ ہوا ہے۔ وقت کے تقاضے فتحمند ہوئے اور قدامت پرستی کو اپنی ہار مان لینی پڑی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے بلا خوف و ڈر کہا جا سکتا ہے کہ اس فیصلہ کُن جنگ کا مردِ میدان وہی شخص تھا جو اس یونیورسٹی کے ایک گوشے میں مدفون ہے۔ یہ جنگ اسی علی گڑھ میں لڑی گئی اور یہی علی گڑھ اس کی فتح مندی کا یادگاری منارہ ہے۔

زمانۂ حال کے بعض اہلِ قلم نے سرسیدؒ مرحوم کو راجہ رام موہن رائے سے تشبیہ دی ہے اور یہ بہت حد تک صحیح ہے۔ راجہ رام موہن رائے نے جو کام بنگال میں کیا، وہی ان سے چالیس۴۰ برس بعد سرسید نے شمالی ہند میں کیا اور خاص طور پر مسلمانوں میں کیا۔

... یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگرچہ سرسید مرحوم نے ملک کی سیاسی تحریک کی مخالفت کی تھی لیکن ان کی مخالفت میں ہندو مسلم سوال کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی مخالفت کی سرگرمیوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو یکساں طور پر شریک کیا تھا۔ وہ مدت العمر ہندو مسلم یگانگت کے حامی رہے اور ہمیشہ ایسی باتوں کی مخالفت کرتے رہے جس سے دونوں جماعتوں کے باہمی اتفاق و یکجہتی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں بار بار یہ خوبصورت استعارہ دہرایا تھا کہ مادرِ ہند کی دو آنکھیں ہیں، ایک ہندو، ایک مسلمان۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک آنکھ بھی بگڑ جائیگی تو اس کے چہرے کا سارا حسن بگڑ جائے گا۔

..... مرحوم سر سید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک سکول ہی قائم نہیں کیا تھا، بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالے نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے کہ "تہذیب الاخلاق" سے مرتب ہوئے۔ یہ رسالہ انھوں نے انگلستان کی سیاحت کے بعد نکالا تھا اور اس میں ان کے حلقہ کے رفیقوں کے مضامین نکلا کرتے تھے۔ فی الحقیقت جدید اردو علم و ادب کی بنیادیں اسی رسالہ نے استوار کیں اور اسے اس قابل بنا دیا کہ آج ہر طرح کے علمی و ادبی مطالب ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر اہلِ قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقے کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اسی حلقے کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں۔

..... انیسویں صدی کا آخری نصف حصہ اکثر مشرقی ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی ایک طرح کا انتقالی دور تھا۔ اس دور میں ملک کی دماغی زندگی کے پرانے سانچے ٹوٹ رہے تھے اور نئے سانچے ڈھلنا شروع ہو گئے تھے۔ پرانے ہندوستان کی مٹی ایک نئے ہندوستان کا ڈھانچا تعمیر کر رہی تھی اور پرانے موسم کا اختتام ایک نئے موسم کی آمد کا اعلان تھا۔ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، کہا جاتا ہے کہ اس انتقالی دور کا سب سے زیادہ موثر عمل یہیں انجام پایا۔

..... آپ کے اسٹریچی ہال کی دیواروں پر جو کتبے کندہ ہیں، ممکن ہے کہ وہ کسی وقت مٹ جائیں، لیکن آپ کی درسگاہ نے زمانے کے لازوال صفحوں پر جو کتبے ثبت کر دیے ہیں وہ کبھی مٹ نہیں سکتے وہ ہمیشہ باقی رہیں گے اور ہندوستان کے آنے والے مورخ ان سے اپنی کہانیوں کے لیے مواد حاصل کریں گے۔

ایک ایسا تعلیمی ادارہ جو اپنی ماضی کی ایک ایسی شاندار داستان رکھتا ہو، قدرتی طور پر اس کا مستحق ہے کہ ایک شاندار مستقبل اپنے سامنے دیکھے۔ مجھے معلوم نہیں اس وقت آپ کے احساسات کیا ہیں۔ آپ اپنے مستقبل کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو وہ کس رنگ و روپ میں آپ کے سامنے آتا ہے؟ آپ کو دروازوں کے بند ہونے کی آواز سنائی دے رہی ہے یا کھلنے کی؟ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی نگاہیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ لیکن میں آپ کو بتلا سکتا ہوں کہ میری نگاہیں کیا دیکھنے لگی ہیں۔ آپ شاید دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے پرانے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت سے نئے دروازے کھل گئے:

تفاوت ست میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

••

قاضی معزالدین احمدؔ

جناب قاضی معز الدّین احمد (پ ۱۹۱۲ تقر) علیگڑھ کے گریجویٹ، آزادی کے بعد پہلے اَدبی ناشر (آزاد کتاب گھر، دہلی)۔ مدت تک روسی سفارت خانے کے شعبۂ اطلاعات سے وابستہ رہے۔ علیگڑھ کنونشن والوں کا ساتھ ایک عرصے تک نبھایا۔ "تہذیب الاخلاق" کے احیاء نو میں اور مدیر مسئول کے طور سے ستمبر ۸۳ء تک سیّد حامد صاحب کے شریک کار رہے سفارت خانے کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد علیگڑھ میں قیام ہے۔

••

(۱)

## میلادالنبیؐ کی تقریب

میلادالنبیؐ کی تقریب نہ معلوم دنیا کے کسی دوسرے ممالک میں منائی جاتی ہے یا نہیں۔ ہندوستان میں وہ دلچسپ صورت اختیار کرتی جارہی ہے اور آہستہ آہستہ ہندوستان کے مزاج کے مطابق ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ میں اس محفل میں ولادت نبویؐ کے بارے میں بہت سی روایات بیان کی جاتی تھیں۔ وہ سبق آموز خواہ نہ ہوں، عوام کے دلوں کو خوب گرماتی تھیں۔ الحمد للہ وہ دور ختم ہوگیا۔ لیکن اب قومی لیڈر، سیاسی کارہنما، پارلیمنٹ کے ممبر، سوشل ورکر، شہر کے خوش پوش اور خوش باش معززین، مسلمان اور ہندو اور عیسائی سب ہی مدعو کیے جاتے ہیں۔ ان محفلوں میں شرکت کے بعد بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ محفل میں کوئی ایک آدھ مقرر ہی ہوتا ہے، جو سیرت پر کچھ کہتا ہو۔ وہی بیچارہ سب سے زیادہ مظلوم ہوتا ہے اور اُس کو بہت کم وقت ملتا ہے۔ تمام وقت لیڈران تقاریر کرتے رہتے ہیں۔ سننے والا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بارے میں کوئی رائے قائم کرسکتا ہے۔ نہ اسلام کے بارے میں۔

اب یوم النبیؐ کے سلسلہ میں جلوس نکلنا بھی شروع ہوگیا ہے۔ امسال غالباً رامپور کے ایسے ہی جلوس کی تصویر اخبار میں دیکھی۔ جلوس کیا نکلتا، ایک صاحب عربی لباس پہن کر اونٹ پر بیٹھ کر نکلے، گویا دورِ نبویؐ سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو وہ دن جلد آئے گا جب روضۂ اطہر کاغذ کا بنا کر اور اس کو اونٹ پر رکھ کر نکالا جائے گا اور خدا پرست موحد اس کو بوسہ دیں گے۔ اس اونٹ کے نیچے بیماروں اور بچوں کو نکالا جائے گا، منتیں مانی جائیں گی اور وہ سب ہوگا جو ماہ محرم میں تعزیہ داری کے دوران ہوتا ہے۔

(۲)

## فلم بینی

کچھ عرصہ ہوا اخبارات میں یہ خبر دیکھی تھی کہ مہاراشٹر کے کسی مقام پر عورتوں نے سینما دیکھنا ترک کردیا ہے۔ یہ تحریک تیزی سے پھیلی اور بہت کامیاب ہوئی۔ پھر خواتین کے ایک حلقے میں یہ تحریک ان کی حق تلفی کے مترادف خیال کی گئی۔ اس حق کی بحالی کے لئے تعلیم یافتہ خواتین نے آواز اٹھائی اور احتجاج کیا۔ عورتیں پھر سینما دیکھنے لگیں اور حق تلفی کی شکایت کا تدارک ہوگیا۔ مسلم اخبارات نے اس تحریک کو مبارک خیال کیا تھا اس کے خلاف آواز اٹھانے والے ترقی پسندوں کے جرم اور آزاد خیال لوگوں کی بے راہ روی پر محمول خیال کیا۔

بہر حال خواتین کا سینما دیکھنے کے خلاف اقدام اور پھر اُن کی آزادی کا مطالبہ اور ان کی حق تلفی کے خلاف جد وجہد، سبھی باتیں دلچسپ ہیں اور آپ کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں۔

سینما خود بُری چیز نہیں ہے۔ یہ اصلاح اور ترقی کا ایک ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب لوگ جلبِ منفعت کے لئے فلم بناتے ہیں تو ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائیں، ظاہر ہے یہ مقصد اسی وقت پورا ہوتا ہے جب عوام میں فلم مقبول ہو۔ مقبولیت کے لئے آسان ذریعہ یہی ہے کہ فلم میں خوب مار دھاڑ ہو اور جنسی بے راہ روی کی نمائش ہو، نیم عریاں لباس میں عورتیں دکھائی جائیں۔ گویا فلم سازوں کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ فلم میں جنسی اور حیوانی جذبات کو اپیل کر کے عوام میں مقبول بنایا جائے اور نام فن کاری اور آرٹ کا لیا جائے۔

فلم عورتوں سے زیادہ مردوں کی بے راہ روی کا ذریعہ ہوتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ مرد عورتوں کو تو فلم بینی سے روکیں اور خود فلم دیکھنے میں دلچسپی لیں۔ حال ہی میں مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ کا بیان "قومی آواز" ۲۸ فروری ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ مدھیہ پردیش میں ہر آٹھ گھنٹے میں ایک عورت کی آبرو ریزی ہوتی ہے۔ ہر بارہ گھنٹے پر ایک عورت خود کشی کرتی ہے۔ ہر تیسرے دن ایک عورت کو قتل کیا جاتا ہے۔ وزیر اعلیٰ ارجن سنگھ نے ۱۹۸۱ء کے اعداد وشمار اس طرح پیش کئے ہیں۔ ۱۰۵۹ عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی، ۳۹۰ عورتوں نے خود کشی کی، ۱۳۰ کو خاندانی جھگڑوں کی بنا پر اور ۹ کو آبرو ریزی کے بعد قتل کر دیا گیا۔ یہ داستان تو آپ کی ایک ریاست کی ہے، اگر یہی حال دوسری ریاستوں کا ہوا اور یقیناً ایسا ضرور ہوگا تو پھر سوچئے کہ پورے ملک کا کیا حال ہو رہا ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں جو انتشار ہے اس سے کون واقف نہیں۔ جنسی بے راہ روی عام ہے اور روز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس طرح پر لوٹ مار کو فروغ حاصل ہے۔ رشوت سے کون بچا ہوا ہے۔ شاہ و گدا دونوں اس کے مجرم ہیں۔ پس ہم بربادی کے اس غار کی طرف تیزی سے دوڑ رہے ہیں جس میں گر کر اپنا حال و مستقبل دونوں تباہ کر دیں گے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اور ہماری حکومت دونوں کا نہ کوئی مسلک ہے، نہ زندگی کا کوئی مقصد۔

کسی سماج میں رسم ورواج اور زندگی کے مشاغل داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے خلاف آواز اٹھانا آسان ہو، ان کا ترک دشوار ہو جاتا ہے۔ ان سے بچنے اور اُن کو ترک کرنے کے دو ہی طریقہ ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ معاشرہ کے ذمّہ دار خود قدم اٹھائیں اور اصلاح کے خواہش مند ہوں۔ ایسی صورت میں قانون کی مدد بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت رائے عامّہ کی تبدیلی ہے اور لوگوں کی توجہ ہٹانا ہے۔ اگر مسلمانوں میں اچھی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو جائے تو سینما بینی کا شوق کم ہو جائے گا۔ دیکھیں گے بھی تو اس کے بُرے اثرات ان پر کم پڑیں گے۔ لیکن اگر فحش اور عریاں ناول اور افسانے قصّے اور کہانیاں پڑھیں گے، تو سینما سے دلچسپی اور گہری ہوگی اور فلم لوگ جنسی تسکین کے لئے دیکھیں گے۔ جنسی خواہش، آپ ایک وقت دبا سکتے ہیں لیکن وہ کسی وقت بھی اُبھر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل جنسی بے اعتدالی کے واقعات کثرت سے ہوتے رہیں۔ یہی صورت قتل کی وارداتوں، اغوا کے واقعات، چوری اور ڈکیتی کی ہے۔ آپ کے تحت الشعور میں جو بات محفوظ ہو جائے گی وہ کسی وقت بھی رنگ لا سکتی ہے۔ اس لئے انسان کے لئے اچھا ماحول، اچھی صحبت اور اچھے ادب کا مطالعہ شخصیت کی تعمیر کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اچھے ادب سے مراد یہ نہیں کہ آپ صرف مذہبی کتابیں پڑھیں، معیاری ناول اور افسانے، تاریخ، تہذیب، سیاسی کتب وغیرہ سب ہی اچھے ادب میں شمار ہوتی ہیں اور ان سب سے اچھے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور ان ہی سے شخصیت بنانے میں اور ترقی کرنے کا جذبہ پرورش پاتا ہے اور جیسا کہ ایک نوجوان اپنے بارے میں سوچتا ہے ویسی ہی اس کی زندگی بنتی جاتی ہے۔

(۳)

## یہ ہماری زبان اُردو

ایک زمانہ تھا کہ اُردو تمام ملک کی زبان تھی۔ لکھی، پڑھی اور بولی جاتی تھی۔ پھر وہ فرقہ وارانہ اختلاف پیدا کرنے کا ذریعہ تجویز کی گئی، بقول پنڈت سندر لال ایک قدیم متروک رسم الخط کو زندہ کیا گیا، آزادی کے بعد ہندی قومی زبان قرار دیدی گئی۔ اُردو کو بھی ہندی کہا گیا اور دیکھا یک اردو اپنے وطن میں اجنبی ہوگئی۔ اُردو میں درس تدریس ترک کی گئی، اس کو دفاتر سے خارج کیا گیا، تو اُردو والوں نے آہ و بکا شروع کر دیا، شکوہ بیخی اور شکایت ہونے لگی۔ بحث و تکرار ہوئی تو دل کی بھڑاس نکل گئی۔ اُردو کے بارے میں مطالبات شروع ہوئے لیکن اس کو زندہ رکھنے کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ اُردو والے شر قالین ہمیشہ سے لیے ہیں، بس ان کا یہی کردار غالب رہا۔

ملک میں ہر سال اُردو کانفرنس ہوتی ہے، تجاویز پاس ہوتی ہیں۔ حکومت سے مطالبات کئے جاتے ہیں، لیکن اُردو زبان کو زندہ رکھنے کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھتا۔ کچھ ہوتا ہے تو بہت محدود پیمانے پر۔ حیات اللہ انصاری صاحب نے "دس دن میں اردو" کا قاعدہ مرتب کیا، بیگم حیات اللہ نے بہت سے لوگوں کو سکھلایا ہوگا، کتنوں نے اُردو زبان و ادب میں دلچسپی لی ہوگی۔ یو، پی میں اردو کے مدرّسوں کا تقرر بھی ہوا، لیکن اردو زبان کا انحطاط نہ رُکا۔ اب جو اردو جاننے والے نوجوان ہیں، اُن میں بہت کم ایسے ہیں جو اُردو زبان میں اظہارِ خیال پر قدرت رکھتے ہوں، جن اسکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے ان کے طلبا مشکل سے اُردو کے چند جملے صحیح لکھ سکتے ہیں اُردو کے شاعر تو بہت ہیں۔ شعر فہمی بہت کم ہے۔ نثر نگار بھی مل جائیں گے۔ صاحبِ طرز ادیب شاید ہی کوئی نیا پیدا ہوا ہو۔

اُردو کی گزشتہ ۳۰ سال کی تاریخ پر نظر ڈالیئے اُردو کے سب ناشر بدحال ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کاروباریوں نے اُردو کی کتابیں فروخت کرنے کا کام ترک کر دیا ہے۔ بہت سے مشہور کاروبار بند ہو گئے ہیں۔ اُردو والوں کو اور اُردو کے ادیبوں اور تحریک کے لیڈروں کو بھی اُردو کتاب خرید کر پڑھنے کی عادت نہیں۔ اگر ایک نے کتاب خریدی تو دس اُس کو مانگ کر پڑھتے ہیں اور اسی دوران کتاب گم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان بھر میں اردو کی نصابی کتب دستیاب نہ ہوتی تھیں۔ اُردو تحریک کے لیڈر دس برس سرکار سے درخواست کرتے رہے کہ نصابی کتب شائع کرے، اُردو کے کسی ناشر نے یہ نہ کیا کہ ان نصابی کتب کی اشاعت کا اہتمام کرتا۔

اب بھی اُردو کی نصابی کتب ہر ریاست میں آسانی سے نہیں ملتیں۔ لیکن چھاپے کون اور نقصان کون برداشت کرے؟ مسلم درسگاہوں کی حالت اور بُری ہے۔ دس دس سال سے نصابی کتابیں چل رہی ہیں۔ سُنا ہے کہ بچے اب بھی یہی پڑھتے ہیں کہ "نہرو وزیر اعظم ہیں"۔

اب ذرا دیکھئے کہ اُردو کی کیسی کتابیں شائع ہوتی ہیں؟ کلام کے مجموعے، عام تنقیدی اور "تحقیقی" کتب اور عام ناول وغیرہ۔ کیا وہ زبان جس میں ایسی کتب شائع ہوں اِس دَور کے نوجوانوں کو وقت کے تقاضوں سے آگاہ کر سکتی ہیں؟ اور اُن کے مستقبل کی طرف رہنمائی کر سکتی ہیں؟ کیا وہ کتب جو اِس وقت اردو میں شائع ہوتی ہیں، افیون کی حیثیت نہیں رکھتیں؟ سوچیے کہ اُردو والوں کا پھر کیا مستقبل ہوگا۔ کب زندگی کے میدان کارزار میں سربکف اُترنے کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کب اُردو، اُردو ہوگی اور ایک زندہ قوم کی زبان ہوگی۔

ضرورت ہے کہ اردو کے جتنے بھی سرکاری اور نیم سرکاری ادارے ہیں، اُن کے کارکن اور اُردو تحریک کے لیڈر سر جوڑ بیٹھیں اور اُردو کے ترقی کے مسئلہ پر غور کریں۔ ایسی کتابیں اُردو میں شائع کریں (ترجمہ کر کے) جو اُن میں دنیا کو

حالات سے واقفیت اور بیداری پیدا کریں اور اردو دنیا سے اپیل کریں کہ لوگ کتابیں خرید کر پڑھیں۔

اردو لیڈر ایک مہم چلائیں، سربکف نکلیں، جلوس نکالیں، جلسے کریں، خود کتابیں خریدیں اور اداروں کو خریدنے پر آمادہ کریں۔ تب کہیں اردو زبان زندہ ہوگی اور زندہ رہے گی۔ ●●

(۴)

## مسلم کانفرنس

جب سے ہندوستان آزاد ہوا ہے، آل انڈیا مسلم اجتماعات تقریباً ہر سال ہوئے ہیں۔ ان میں تقاریر ہوتی ہیں اور تجاویز پیش کی جاتی ہیں اور متفقہ آرا سے وہ سب پاس ہوتی ہیں، لیکن پھر کچھ نہیں ہوتا۔ نہ کوئی تنظیم قائم ہوئی، نہ کسی تجویز پر عمل ہوا۔ خدا کرے بہرائچ کا اجتماع کامیاب ہو اور ملت کی مشکلات کا کچھ مداوا ہو سکے۔ مسلمانوں کا ایک گروہ دست کار ہے۔ انگریزوں کی حکومت کے دور میں ملک کی دست کاری کو بہت نقصان پہنچا، بہت کم دست کار ایسے تھے جو کچھ پیدا کرتے ہوں اور خوش حال ہوں۔ لیکن آزاد ہندوستان میں صورت دوسری ہے۔ دست کاری کو بڑا فروغ ہوا ہے اور کاروبار کو بھی ترقی ہوئی ہے۔ مسلم دست کاروں اور کاروباری لوگوں کی حالت پہلے کے مقابلہ میں بہت بہتر ہے اور یہ سب خوش حال ہیں اور باوجود اس کے کہ ان کی ترقی اور خوشحالی کچھ لوگوں کو پسند نہیں اور یہ فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہوتے رہتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کی ہمت اور جرأت قابل داد ہے۔ یہ اجڑتے ہیں اور بستے ہیں اور یہی ایک موقر کا کردار ہے۔

مسلمانوں کے مسائل چند بہت اہم ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ بے روزگاری کا شکار ہے اور اسی سبب سے مسلمانوں کی پستی اور افلاس کا نعرہ دیتا رہتا ہے۔ مسلمانوں میں سب سے بڑا گروہ ان عوام کا ہے، جو دیہات میں آباد ہیں۔ ان کا نہ کوئی والی ہے نہ وارث ہے۔ وہ سب سے زیادہ پامال بھی ہے۔ ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنا ہے تو ان ہی دونوں گروہوں کے سوالات کو سامنے رکھنا ہوگا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے گروہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس نے تعلیم کبھی سنجیدگی سے حاصل نہیں کی۔ اس کی تعلیم محدود، صلاحیت محدود، اس کی حالت یہ کہ وہ نہ کسی زبان سے واقف ہے نہ کسی علم سے۔ اس کی اصلاح کے لئے ضرورت ہے کہ اس میں مطالعہ کی عادت ہو، اپنا مطالعہ وسیع کرے اور محنت کے خوگر بنے۔

ایک زمانہ میں جدید تعلیم یافتہ گروہ انگریزی سے واقف ہوتا تھا۔ آج بدقسمتی سے وہ نہ انگریزی جانتا ہے، نہ اردو اور نہ ہندی۔ پھر بھی اگر وہ خود کوشش کرے تو ایسی قابلیت اور صلاحیت پیدا کر سکتا

ہے کہ معاشرہ میں اپنی کوئی جگہ بنا سکے۔ رہا ہماری دیہاتی آبادی کا بڑا طبقہ، اس کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ ہندوستان ترقی کرے اور دیہاتی لوگوں کا مستقبل روشن ہو تو پھر اُن کی بھی کوئی جگہ ملک میں ہو سکتی ہے۔ ہمارے شہری لیڈران کی اقتصادی ترقی کے سلسلے میں مشکل ہی سے کچھ کر سکیں گے، البتہ اگر مسلم نوجوانوں میں خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا ہو اور وہ دیہات کے لوگوں کی خدمت کریں، تو دیہاتی مسلمانوں کو کم از کم دینی تعلیم دے سکتے ہیں اور اُن کو کسی دستکاری میں لگا سکتے ہیں۔ مسلم نوجوانوں کو دیہات میں سماجی کام کرنا چاہیے اور دیہات کی ہندو مسلم آبادی کی خدمت کرنی چاہیے۔ یہ کام ہر اعتبار سے قومی اتحاد کے لئے مفید ہوگا۔ ●●

## (۵)

## بونڈیڈ لیبر

آپ نے اخبارات میں "بونڈیڈ لیبر" کی بپتا پڑھی ہوگی۔ نہ معلوم آپ نے کبھی یہ تکلیف گوارا کی ہوگی کہ یہ سوچیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ ان کی بپتا کی نوعیت کیا ہے اور آپ کا کیا فرض ہے۔

بدقسمتی سے یہ وہ لوگ ہیں جن کو اپنے وطن اور اپنے گھروں سے اغوا کیا جاتا ہے، یا لالچ دیکر غریب دیہاتوں کو فریب کے جال میں پھنسایا جاتا ہے اور کہیں لا کے ایک حلقہ میں قید رکھا جاتا ہے۔ ان کو دو وقت کا کھانا ملتا ہے اور وہ بھی ایسا کہ جس کو ایک مجرم قیدی بھی نہ کھائے۔ اُن سے روزانہ سولہ گھنٹے کام لیا جاتا ہے۔ اُن میں سے کچھ جوانی ہی میں مرجاتے ہیں، جو بچ جاتے ہیں وہ جب تک زندہ رہتے ہیں اپنے آقا کی گرفت میں رہتے ہیں اور ہمہ وقت اُن کے کام کاج کے لئے تیار رہتے ہیں۔

حکومت اُن کو اسی وقت آزاد کر سکتی ہے جبکہ اُن کی روزی کا بندوبست کرے اور اُن کو اپنے وطن پہنچائے۔ سوچنا یہ ہے کہ اس سلسلے میں ایک مسلمان کا کیا فرض ہے۔ وہ نہ بونڈیڈ لیبر سے واقف ہے، نہ اس ذمہ داری سے آگاہ جو دین نے اس پر عائد کی ہے۔ ضرورت تو یہ ہے کہ جہاں جہاں اس قسم کے لوگ مقید ہوں مسلمان اُن کا پتہ چلائیں اور ان کی آزادی کے لئے حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں فرمایا تھا کہ "یہ غلام، یہ غلام، جو تم کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ۔ جو خود پہنو، وہ ان کو پہناؤ۔ ان کی خطاؤں سے درگزر کرو۔ آخرت میں ان کے بارے میں تم سے سوال ہوگا۔" انسان کے گناہوں کا کفارہ اسلام میں سب سے بڑا یہی بتایا ہے کہ وہ غلام آزاد کرے۔ کیا "بانڈیڈ لیبر" اسی طبقہ

میں نہیں آتے اور کیا اُن کی حالت سے بے تعلق رہنا مسلمانوں کو زیب دیتا ہے ؟

بس صورت یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ اُن پر شہری ذمّہ داریاں کیا ہیں اور ان پر پڑوسی کے کیا حقوق ہیں۔ دینی تعلیمات سے ہر آدمی واقف نہیں ہوتا لیکن عقل سلیم کے بھی کچھ مطالبات ہوتے ہیں اسی کی روشنی میں ذمّہ داریاں ادا کی جائیں تو معاشرہ کی اصلاح و ترقی کی راہیں کھل سکتی ہیں اور سماج کا وقار بلند ہو سکتا ہے۔ ••

(٦)

## ہماری شہری ذمّہ داریاں

لندن کے کسی اسٹیشن پر ایک ہندوستانی ایک ملاقاتی ٹرین کے منتظر کھڑے تھے۔ ٹرین پانچ منٹ لیٹ ہوگئی۔ جب ٹرین پہنچی تو اسٹیشن ماسٹر نے مائک پر بہت عاجزانہ انداز میں مسافروں سے ٹرین کے لیٹ ہونے پر معافی مانگی۔ ہندوستانی مسافر کو تعجب ہوا کہ یہ کون سا معافی مانگنے کا موقع تھا۔ دریافت کرنے پر اس کو بتایا گیا کہ انگلستان میں گاڑیاں لیٹ نہیں چلتیں، اس لئے جب گاڑی لیٹ ہو جاتی ہے، تو ریلوے کے ذمّہ دار افسران مسافروں سے اسی طرح معافی مانگتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ جاپان کی راجدھانی ٹوکیو میں ہوا۔ ٹرین صرف دو منٹ لیٹ تھی۔ ہندوستانی بھائی جو پلیٹ فارم پر ٹرین کا انتظار کر رہے تھے انھوں نے دیکھا کہ اسٹیشن ماسٹر پلیٹ فارم پر آکر کھڑا ہو گیا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین جب اسٹیشن پر پہنچی تو اسٹیشن ماسٹر اس کے سامنے کود پڑا اور خودکشی کرلی۔ ہندوستانی مسافروں کو بہت افسوس ہوا لیکن جاپانیوں نے اس حادثہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ایک آدمی آیا۔ اس نے لاش اُٹھائی، جگہ صاف کی اور چلا گیا۔ ہندوستانی سے جاپانیوں کی یہ بے رخی دیکھی نہ گئی۔ اُس نے اسٹیشن کے ملازمین سے سوال کیا۔ اس کا جواب ملا کہ گاڑی دو منٹ لیٹ تھی اسٹیشن ماسٹر اس کا ذمّہ دار تھا، اُس نے محسوس کیا چونکہ ٹرین دو منٹ لیٹ ہوگئی اور مسافروں کو دو منٹ انتظار کرنا پڑا، ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے کسی کا کوئی نقصان بھی ہوا ہو، اس لئے اُس نے اپنے کو سزا دینے کے لئے اپنی جان بادشاہ پر قربان کردی اور اس طرح غلطی کا کفارہ ادا کیا۔ یہ تو ارتکاب جرم کا انتہائی اور سخت کفارہ ہے جو ایک مجرم خود ادا کرتا ہے، لیکن یہ بھی دیکھئے کہ جب گاڑی آپ کے ملک میں لیٹ ہوتی ہے تو لوگوں کو کتنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا سبب اکثر یہ ہوتا ہے کہ لوگ زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لیتے ہیں، اس طرح ہر گاڑی لیٹ

ہو جاتی ہے اور مسافروں کی پریشانی کا سبب بنتی ہے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک ٹرین لیٹ ہو گئی اور برابر لیٹ ہوتی چلی گئی۔ ایک صاحب کو ہندوستان سے باہر جانا تھا، ہوائی جہاز میں ان کی سیٹ بک ہو چکی تھی، وہ سخت پریشان تھے کہ کیا کریں اور کیسے وقت پر دلی پہنچیں، اب دیکھئے ان کا کتنا نقصان ہوا ہوگا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے مسافر ہوں گے جن میں سے کسی کا مالی نقصان ہوا ہوگا، کوئی اپنے عزیز قریب سے ملنے سے رہ گیا ہوگا اور ایسی ہی بہت سی پریشانیوں میں لوگ گرفتار ہوئے ہوں گے۔

ذرا دیکھئے ایک آدمی اپنے آرام کے لئے دوسروں کو کتنی تکلیف پہنچاتا ہے۔ آپ اپنا احتساب کیجئے اور دیکھئے کہ کہیں آپ نے تو اپنے فائدے کے لئے کسی دوسرے کو پریشان تو نہیں کیا۔ ●●

۷

## دارالمصنفین

۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی عیسوی میں دنیا اور خصوصاً ہندوستان میں اہم سیاسی تبدیلیاں ہوئیں۔ اس زمانہ میں مغربی یورپ کا عروج شروع ہوا۔ اس کا بہت گہرا اثر مسلمانوں پر پڑا۔

مسلمانوں کی عہد وسطیٰ میں سیاسی اور تہذیبی اہمیت رہی ہے۔ لیکن ۱۸ ویں صدی اور ۱۹ ویں صدی میں ان کا زوال ہوا اور وہ فکری علمی اور عملی اعتبار سے مغلوب ہو گئے، اور یورپ کی ترقیات سے اتنے مرعوب ہوئے کہ اپنا ماضی خود ان کی نظروں میں دورِ تاریکی ہو گیا۔ مسلمانوں کو اس ذہنی غلامی سے آزاد کرنے کے لیے جو کوششیں ہوئیں، ان میں دارالمصنفین کا حصہ بہت اہم اور بنیادی ہے۔

یہ اکادمی مولانا شبلی نعمانی نے قائم کی۔ شبلی جدید دور کے سیاسی اور تہذیبی تقاضوں سے واقف تھے انھوں نے مسلمانوں کو یورپ کی ذہنی غلامی سے آزاد کرنے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کو یہ بتایا کہ ان کا ماضی کا دور، دورِ تاریکی نہیں بلکہ سیاسی اور علمی ترقیات کا ایک روشن مینار ہے اور یورپ نے جو علمی ترقیات کی ہیں، ان کا سرچشمہ وہ علوم ہی ہیں جو قرطبہ اور غرناطہ کی راہ یورپ پہنچے۔

خوش قسمتی سے شبلی کو سلیمان ندوی جیسے شاگرد بھی مل گئے۔ سید سلیمان ندوی نے شبلی کے مشن کو کامیاب بنایا اور اسلام اور مسلمانوں پر ایسے مضامین لکھے جن کی قدر مسلم ممالک کے اہلِ دانش نے بھی کی اور ان کے ترجمے دوسری زبانوں میں بھی شائع ہوئے۔

آزادیٔ ہند اور تقسیم ہند کے بعد مولانا سید سلیمان ترک وطن کر گئے۔ دارالمصنفین سے ان کی علیحدگی اور

پھر ترک وطن سے اس اکادمی کو بہت نقصان پہنچا۔ دار المصنفین کی مطبوعات کا وہ معیار تحقیق نہ رہا، جو سلیمانی دور میں تھا۔ بہرحال پھر بھی یہ اکادمی علمی خدمات کرتی رہی اور تاریخ ہند اور تاریخ اسلام پر ان کی مرتب کردہ کتب شائع ہوتی رہی ہیں۔

شبلی علیہ الرحمہ کے سامنے مسلمانوں کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ آج اس کی ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے سلسلے میں وقت کے تقاضوں سے آگاہ ہوں۔ ایک معاشرے کے لوگوں کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اجداد کے کارناموں سے واقف ہو، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنا مستقبل بنانے کے لیے وقت کے مطالبات کو پورا کرے۔ اس مقصد کا حصول اسی طرح ممکن ہے کہ مسلمان ان سماجی علوم و افکار سے واقفیت رکھتے ہوں جن کا تعلق سماج کی تبدیلیوں اور ترقی کے سوالات سے ہے۔ افسوس ہے کہ اردو سماجی علوم اور جدید افکار کی کتب سے بالکل تہی دامن ہے اور اردو کے اہل قلم کی تحریریات یہ ظاہر نہیں کرتیں کہ مسلم اکابر نئے زمانہ کے مسائل کی نوعیت سے آگاہ ہیں۔ راقم کو اپنی کم مائگی کا احساس ہے اور ملت کے دانش وروں کے بارے میں لب کشائی کے اس انداز سے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن بعض موقعوں پر بے باکی سے اظہار خیال، بشرطیکہ مقصد تعمیری ہو ضروری ہو جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ دار المصنفین سماجی علوم خصوصاً سماجیات اور اقتصادیات پر کتابیں شائع کرے۔ ان کے لکھنے والے مترجم نہ ہوں بلکہ مرتب ہوں۔ تاکہ ان کا کتب کا مطالعہ بارگراں نہ ہو جائے اور اردو کی کتابیں پڑھنے والے آسانی سے ان کو پڑھیں بھی اور ان سے استفادہ بھی کریں۔

حال ہی میں دار المصنفین میں ایک ملی بین الاقوامی اجتماع ہوا۔ ایسے اجتماعات بہت مبارک ہیں۔ یہ جہاں علمی تحقیقات کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں وہاں ان اجتماعات سے وحدت فکر بھی پیدا ہوتی ہے۔ جو کسی ملی مسئلہ پر غور و فکر میں مدد کرتی ہے لیکن عام طور پر مسلم دانش ور جب بھی قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا موضوع بحث دور ماضی کا کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف اور تالیفات دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ حال و مستقبل کے مسائل ان کا کم ہی موضوع ہوتے ہیں اور کم ہی حال و مستقبل کے مسائل پر ان کی بحث تکرار ہوتی ہو۔

●●

## (۸)

## ہم کدھر جا رہے ہیں؟

آپ نے حال ہی میں ہندوستان ٹائمز میں ایک تصویر دیکھی ہوگی۔ اس میں دو پولیس کے سپاہی دو نوجوانوں کو اپنی حراست میں لیے جا رہے ہیں۔ نوجوان اپنے چہروں پر کپڑا ڈالے ہوئے ہیں۔ غالبًا اپنے کیے پر پشیمان ہیں، یا گھر والوں کی بدنامی کے خیال سے منھ چھپایا ہے۔ تصویر سے متعلق جو خبر ہے اس میں لکھا ہے کہ دو نوجوان ڈاکو جنھوں نے دہلی کے ایک بینک میں ڈاکہ ڈالا تھا ایک دولت مند خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ خبر سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ سب ہی ڈاکو نوجوان ہیں، تعلیم یافتہ ہیں اور خوش حال ہیں، مفلوک الحال نہیں، غریب نہیں، نادار نہیں کہ ڈکیتی پر مجبور ہو گئے ہوں۔

بینکوں میں ڈاکے اکثر پڑتے رہتے ہیں اور یہ ڈاکو عام طور پر کھاتے پیتے گھرانوں کے تعلیم یافتہ نوجوان ہوتے ہیں۔ ایک بار تو ایک نواب صاحب کے نورِ نظر ڈاکوؤں کے سرغنہ تھے۔ اخبار میں لکھا تھا کہ نواب صاحب نے فرمایا کہ اگر اتنے روپے یہ لڑکا مجھ سے مانگتا تو میں انکار نہ کرتا۔ حال ہی میں دو ڈاکے ٹرین میں بھی پڑے۔ یہ ڈاکو بھی نوجوان تھے۔ ممکن ہے تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور روز بروز ایسے واقعات کیوں بڑھتے جا رہے ہیں۔ اُن کا سبب اگر غربت و افلاس ہوتا تو خیر بات سمجھ میں آتی۔ لیکن اگر یہ صرف خطر پسند طبیعتوں کی جولانی کا اظہار ہے تو پھر یہ بات سوچنے کی ہے اگر فرسٹریشن ہے تو پھر یہ نفسیاتی بیماری کیوں پھیل رہی ہے؟ ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ حکومت کا نظام درست نہیں ہے۔ نوجوانوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے اس لیے وہ ذہنی انتشار کا شکار ہیں اور اپنے مستقبل کے بارے میں مایوس ہیں۔ یہ خوب دلیل ہے اور اس کا کیا خوب ردِ عمل ہے۔ یہ بھی تو ایک سبب ہو سکتا ہے کہ نوجوانوں میں جوش ہوتا ہے، ولولہ ہوتا ہے۔ ان کی خطر پسند طبیعت کو تسکین فراہم ہوتی ہے۔ ڈاکہ زنی، اغوا، ان کے جوش کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ آخر مایوسی ہو یا جذبات کی تسکین مقصود ہو، اس کے لیے ڈاکہ زنی، قتل و غارت گری، اغوا، آبرو ریزی کیوں ہو؟ یہ سوالات ہمارے قومی لیڈروں کے سوچنے کے لیے ہیں، ماہرینِ تعلیم کے غور و فکر کے ہیں، ملک کے دانش وروں کی بحث مباحثوں کے لیے ہیں۔ جس قدر جلد یہ سب حلقے مل جُل کر سوچیں اور ان نوجوانوں کی بے راہ روی کا علاج تلاش کریں، اسی قدر اچھا ہو، ورنہ رات کا چین اور دن کا سکون خطرے میں ہوگا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سینما نے یہ سبق عام کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سینما نے جرم کے ذوق کی پرورش کی ہے۔ لیکن یہ کہنا کافی نہ ہوگا۔ اگر واقعہ یہ ہے تو اس کا تدارک ممکن

کیوں نہیں؟ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے اور ان کا علاج تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک زمانہ میں کچھ اخلاقی قدریں تھیں ان کا احساس کسی نہ کسی قدر سب کو ہوتا تھا۔ لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کو توڑنے میں شرم محسوس کرتے تھے۔ اب وہ دَور گیا۔ اخلاقی قدروں سے انکار ایک عام بات ہے۔ ان کی اہمیت سے عوام بھی منکر ہیں اور دانشور بھی۔ اخلاقی قدریں کچھ ہی ہوں ان کی اہمیت آپ تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ بات ہر شخص کو تسلیم کرنی پڑے گی کہ ایک شہری کو دوسرے شہری کا خیال ہونا چاہیئے۔ یہ اگر نہ ہوگا تو پھر معاشرے میں امن و سکون کیسے رہے گا۔ بالکل سیکولر نقطۂ نظر سے اس مسئلے کو دیکھیے۔ بھائی، بہن، عزیز، اقربا، پڑوسی راہ گیر کا ہر شخص اگر کچھ نہ کچھ خیال نہ رکھے تو معاشرے کی عمارت منہدم ہوجائے گی۔ سڑکوں پہ بے روک ٹوک جھگڑے ہوں گے، کسی کی جان کے تحفظ کا سوال ہی باقی نہ رہے گا۔ ہر شخص ایک دوسرے کی جیب کترے گا اور اپنی مقصد براری کے لئے ہر کام کرنے کے لئے تیار رہے گا۔

اسلام نے شہری حقوق کو خاص اہمیت دی ہے اور ان کا تحفظ ہر مسلمان پر لازم قرار دیا ہے۔ شہری حقوق ایک جدید اصلاح ہے۔ اس کا مطلب ماں، باپ، بہن، بھائی، پڑوسی راہ گیر سب ہی ہیں۔ ہماری حکومت سکولر ہے، گویا قومی معاملات میں کسی خاص مذہب کی پاسداری نہیں کرتی۔ حقوق کے مسئلے کو آپ بچوں کو سکولر نقطۂ نظر سے ذہن نشیں کراسکتے ہیں۔ بنیادی بات یہی ہے کہ آپ اخلاقی قدروں کو اہمیت دیں۔ اُن کا احترام کریں۔ جس قدر ان اقدار کی اہمیت آپ کریں گے ملک میں جرائم کا ارتکاب کم ہوگا۔ لیکن اگر آپ اخلاقی قدروں کو اہمیت نہیں دیتے تو کوئی اور راہ تجویز کیجئے جس سے ملک میں جرائم کم ہوں اور ہندوستان کے شہری پُرسکون زندگی بسر کرسکیں۔

●●

## (۹)

## نشہ آور چیزوں کا استعمال

چند روز ہوئے ہندوستان ٹائمز میں امریکہ کے جو دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند اور ترقی یافتہ ملک شمار کیا جاتا ہے، موٹر کے حادثوں میں مرنے والوں کے اعداد شمار شائع ہوئے تھے اور اس کی وضاحت کی گئی تھی کہ یہ حادثے شراب کے نشے میں بدمستی کے عالم ہوتے ہیں۔ اس خبر کی تفصیلات دیکھ کر ہمیں یہ ڈر ہوا کہ کہیں ہندوستان بھی چند سال میں امریکا کا ساتھی نہ ہوجائے اور اس کو مات دیکر اس سے آگے نہ بڑھ جائے۔ انسان خراب، سگریٹ اور نشہ آور چیزیں غالباً اس لیے استعمال کرتا ہے کہ وہ اس دنیا کی کشمکش کی زندگی کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ اور تکان اُتارنے کے لئے وہ نشہ آور چیزیں خصوصاً شراب پیتا ہے اور چند

گھنٹے کے لیے دنیا کے کاروبار کے بوجھ کو بھلا کر تسکین حاصل کرتا ہے۔ مذہب نے دنیا کی ان الجھنوں اور بوجھ کو بھلانے کے لیے عبادت کا تصور پیش کیا ہے اور عبادت کرنے کی تعلیم دی ہے۔

عبادت کا یہ ایک اہم فائدہ ہے کہ انسان جو دنیا کی بہت سی الجھنوں میں پھنس کر بہت سی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اس سے بچنے کے لیے ان علائق کو بھول جائے اور خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ خدا پرستی اور عبادت سے زندگی کی کشمکش بھلانا ممکن اس وقت ہوتا ہے جب عبادت خلوص اور سنجیدگی سے ہو، ورنہ یہ ایک بے لطف رسم ہو کر رہ جاتی ہے۔ البتہ اگر کوئی اس کو جاری رکھے تو زندگی کے ایک دَور میں سکون حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری صورت میں زندگی کی کشمکش خودکشی تک انسان کو لیجا سکتی ہے۔

زندگی میں نشہ آور کھانے پینے کی چیزوں کا عادی ہونا ایک متوسط طبقہ کے آدمی کو مالی مشکلات میں ڈال دیتا ہے جس سے زندگی کی تلخی اور بڑھ جاتی ہے اور سماجی زندگی میں انتشار اور پیدا ہو جاتا ہے۔ خانگی زندگی کی خوشیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ میاں بیوی کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی الجھنوں سے سکون حاصل کرنے کا یہ طریقہ زندگی کو اور تلخ کر دیتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ آدمی عبادت کے ذریعہ زندگی کی تلخیوں کو بھلانے کی کوشش کرے۔

شراب نوشی مسلمانوں میں بھی خاصی مقبول ہوتی جارہی ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح کی طرف مذہبی تنظیمیں بھی کم ہی متوجہ ہیں۔ واعظ اپنی شعلہ بیانی کی داد حاصل کرنے کا زیادہ خواہش مند ہوتا ہے عوام کی اصلاح کی طرف کم متوجہ ہوتا ہے۔ مذہبی تنظیمیں کتابیں لکھنے اور چھاپنے میں زیادہ دلچسپی لیتی ہیں اور یہ نہیں دیکھتیں کہ کتنے لوگ ان کو پڑھتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ راقم کے خیال میں ہونا یہ چاہیے کہ چھوٹے چھوٹے رسالے نشہ آور چیزوں کے استعمال کے خلاف لکھے جائیں اور اُن میں دینی نقطۂ نظر سے بحث کے ساتھ سماجی اور طبی نقطۂ نظر سے بھی بحث ہو، تاکہ جذبات، ایمان اور عقل سب کو اپیل کیا جائے۔ غیر مسلموں کے لیے بھی رسائل مرتب کیے جائیں۔ ان میں صرف طبی، سماجی اور اقتصادی پہلو سے بحث کی جائے۔ یہ کتابچے بطور ایک تحریک کے سب میں بانٹے جائیں اور تقریریں بھی کی جائیں اور پسماندہ لوگوں کی نشہ آور چیزوں کی عادت چھڑانے کی کوشش کی جائے اور ایسے ہی غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کیا جائے جو نشہ آور چیزوں کے استعمال کے خلاف کام کر رہی ہوں۔ یہاں سوال ہندو مسلمان کا نہیں، سوال ہندوستانی معاشرہ کا ہے۔

●●

(۱۰)

## خطبۂ جمعہ

ایک مسلمان صحافی کا کسی غرض سے علی گڑھ آنا ہوا۔ اس روز جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز انھوں نے یونیورسٹی کی مسجد میں ادا کی تو دیکھا کہ امام مسجد نے خطبہ عربی میں پڑھا۔ ان کو خطبہ سُن کر تعجب ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اب تک مسلمانوں کی اِس عظیم دانش گاہ میں عربی خطبہ لوگوں کو ہر جمعہ کو سُنایا جاتا ہے، کس کی سمجھ میں کیا آتا ہوگا؟

سُنا ہے کچھ عرصہ ہوا حجاز سے عرب علمار کا ایک وفد ہندوستان آیا۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں امام کو عربی کا خطبہ پڑھتے سُنا تو اپنے ہندوستانی رفقار سے تعجب سے پوچھا کہ یہ عربی کا خطبہ لوگوں کو کیوں سنایا جاتا ہے؟ ان کے رفقا کیا جواب دیتے۔ اُن سے یہی کہتے بنا کہ امام مسجد عام طور پر کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور ہر جمعہ کو اپنے مقتدیوں کو خطاب نہیں کر سکتے۔ حجازی وفد کے لوگ متعجب ہوئے۔ لیکن خاموش ہو گئے۔

عرصہ ہوا دینی حلقوں میں یہ سوال زیرِ بحث رہا تھا کہ جمعہ کا خطبہ 'اُردو' میں ہونا چاہیے' عربی میں نہیں۔ حسبِ دستور اس کے جواز اور عدم جواز پر بحث چھڑی اور بے نتیجہ رہی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ جو لوگ اُردو میں خطبہ دینے کے موید تھے انھوں نے جمعہ کے خطبے اردو میں طبع کرا کر تقسیم کیے اور یہ اپیل کی کہ جمعہ کے دن پہلا خطبہ ان خطبات میں سے پڑھ دیا جائے۔ ایک سلسلہ یہ بھی شروع ہوا کہ خطبہ کی اذان سے قبل پانچ دس منٹ پہلے ایک مختصر وعظ ہو جائے۔ مسئلہ کا یہ حل کچھ مقبول ہوا لیکن زیادہ نہیں۔ مسلمانوں میں، کوئی دینی انجمن ایسی نہیں ہے۔ جو ان کے اصلاحی کاموں میں دلچسپی لے، اصلاحی اقدامات کرے اور وہ مسلمانوں کو قبول بھی ہوں۔ علما کی ایک تنظیم ضرور ہے لیکن وہ دینی خدمات سے زیادہ سیاسی اور سماجی کام کرتی ہے اور وہ بھی گاہے گاہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، جن کو مسلمان ابھی بھولے نہ ہوں گے، بڑے روشن خیال اور بڑے روشن ضمیر عالمِ دین تھے۔ انھوں نے اردو میں خطبہ کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ عیدین کی نماز کلکتہ کے مشہور میدان میں پڑھایا کرتے تھے اور خطبہ اردو میں دیتے تھے۔ یہ سلسلہ برسوں رہا۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں مولانا نے اپنے محلہ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھانے اور خطبہ اردو میں دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا پہلا خطبہ اردو میں دیتے تھے۔ حمد و ثنا کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ خطبہ کا وقت کم ہوتا ہے۔ یہ فرما کر وہ ہمیشہ شب و روز کے معاملات میں سے کسی مسئلہ کا انتخاب کرتے اور بڑی خوبی سے اس کی وضاحت چند منٹ میں کر دیتے۔ وہ سیاسی لیڈر تھے

لیکن جمعہ کے خطبہ میں کبھی کوئی سیاسی مسئلہ نہ چھیڑتے، نہ کسی اختلافی پر بولتے۔ افسوس کہ یہ سلسلہ مولانا کی صحت کی خرابی اور سیاسی مصروفیات کی بنا پر پابندی سے جاری نہ رہا۔

مولانا نے جس مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھانی شروع کی وہ ان کے مکان کے بہت قریب تھی اور اس علاقہ میں ایک ہی مسجد تھی۔ مسجد کے امام کا بیان ہے کہ ایک بار مولانا جمعہ کے روز نماز جمعہ کے لیے تشریف لائے، مسجد کے امام نے اُن سے نماز پڑھانے کی درخواست کی تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

جس روز مولانا نے پہلی بار وہاں نماز پڑھائی، مسجد میں بہت تھوڑی تعداد میں نمازی تھے۔ لیکن یہ خبر کہ مولانا نماز پڑھاتے اور خطبہ اردو میں دیتے ہیں مسلم محلوں میں پھیل گئی اور پھر نمازیوں کی تعداد بڑھنی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ سڑک پر صف بندی کی نوبت آگئی۔ لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ جلد منقطع ہو گیا۔

مسلم معاشرہ کی بنیاد گو ایک دین پر ہے، لیکن مسلمانوں کی زندگی پر —— اثرات عہد وسطیٰ کی قوموں کی تہذیب کے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ لوگ دین کی روح اور مقصد کو اہمیت کم دیتے ہیں اور اس جمود کا شکار رہتے ہیں، جو اس عہد کی خصوصیت ہے اور زندگی میں تبدیلی اور اصلاح آسانی سے قبول نہیں کرتے۔

دین زندگی کو بدلنا چاہتا ہے۔ تہذیب و معاشرت کی عادتیں جمود پیدا کرتی ہیں۔ مسلم معاشرہ میں یہ کشمکش صدیوں سے جاری ہے۔ عربوں میں اب تک قومی عصبیت ہے، دین کی تعلیم خواہ کچھ ہی ہو۔

ہندوستان میں مائکروفون کا استعمال شروع ہوا۔ لیکن یہ آلہ مسجد میں برسوں داخل نہ ہوا۔ اب صرف اذان کے لیے مائک کا جواز ہے۔ نماز مائک پر ادا کرنا اب بھی ناجائز ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں نماز ادا کرنے کے دوران بھی مائک استعمال ہوتا ہے۔ نمازی امام کی آواز سنتے ہیں تو کچھ نہ کچھ استفادہ بھی کرتے ہیں۔ خطبہ جمعہ عبادت کا جز ہے، اس کا مقصد نمازیوں کی اصلاح ہے۔ لیکن اس مقصد کی اہمیت کا احساس ہی نہیں۔ توجہ ایک رسم ادا کرنے کی طرف ہے، وہ ہوتی جاتی ہے: ع "خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات" اقبال نے کس زندگی کو کہا ہے!!

●●

# مولانا محمد اسمٰعیل شہید کا ایک واقعہ

[ ہندوستان میں آٹھ سو سال مختلف مسلم خاندانوں کی حکومت رہی ہے۔ شاہی دربار میں علما بھی ہوتے تھے ان کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فتوے دیتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس وقت بڑے حق گو علما بھی ہوتے تھے وہ عام طور پر دربار سے دور رہتے تھے اور اگر دربار سے ان کا تعلق ہوتا تھا تو بھی حق گوئی سے وہ کبھی گریز نہ کرتے تھے۔ مغلیہ حکومت کے آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندان کی نمایاں حیثیت تھی۔ شاہ اسماعیل شہید کا اسی خاندان سے تعلق تھا۔ شاہ صاحب بالاکوٹ کی سرحد پر شہید ہوئے۔

( قاضی معز الدین احمد ) ]

حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید جامع مسجد دہلی میں مع اپنے عقیدت مندوں و شاگردوں کے وضو کے لیے حوض کے پاس تشریف رکھتے تھے کہ اتنے میں "اکبر شاہ ثانی" کی زیارت کے لیے جامع مسجد کے ایک گوشے سے کچھ چیزیں تبرکات کے نام پر برآمد کی گئیں۔ ان غیر مستند تبرکات کو مجاورین ایک مقدس نمائش کی شکل سے لال قلعہ میں زیارت کے لیے ہمیشہ لے جایا کرتے تھے چونکہ ان تبرکات کی کوئی حقیقت حدیث سے ثابت نہ تھی اس لیے باوجودیکہ لوگ سروقد باادب کھڑے ہوئے مگر حضرت مولانا مع اپنے حلقہ ارادت کے اسی حوض پر بدستور بیٹھے رہے۔

مجاورین ان رسمی تبرکات کو لے کر اکبر شاہ ثانی کے حضور میں پہنچے۔ شاہ اور دربار کے وزرا و امرا نے اگر سروقد باادب ہوکر تعظیم کی اور زیارت سے مشرف ہوئے۔ اسی اثنا میں مجاورین نے شاہ کی عقیدت مندی کے پیش نظر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ بادشاہ نے جب دریافت کیا کہ آپ لوگ کیوں روتے ہیں، کیا معاملہ پیش آیا؛ تو اور بھی بناوٹ کے ساتھ رونا شروع کیا۔ آخرش بادشاہ کے دوبارہ سہ بارہ سوال پر بتلایا کہ حضور بادشاہ سلامت! ان تبرکات کی تو از حد توہین ہوگئی۔ پوچھا کہ وہ کیسے؟ مجاورین نے کہا کہ جب تبرکات آپ کے حضور میں لائے جا رہے تھے تو ساری خدائی نے تعظیم دی مگر شاہ عبدالعزیز کے خاندان میں ایک شخص مولوی محمد اسماعیل نامی ہیں؛ نہ انھوں نے تعظیم دی نہ اُن کے ساتھ بیٹھے ہوئے ان کے شاگردوں نے تعظیم دی۔ بادشاہ نے مجاورین کو تسلی دی کہ اس معاملہ کو سمجھ کر اس کا تدارک کیا جائے گا۔ چنانچہ بادشاہ نے شاہی ہرکارہ کے ذریعہ

خط بھیج کر مولانا کو طلب کیا۔ جس وقت دربار میں سے طلبی کا خط چوبدار کی معرفت آیا تو خاندان والوں نے باہم مشورہ کیا کہ اس کی اطلاع انگریزی ریزیڈنٹ کو کر دی جائے تاکہ بادشاہ کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ کیونکہ اس زمانہ میں اس کی سلطنت برائے نام تھی اور انگریزی کمپنی کے ریزیڈنٹ عملاً حاکم تھے۔ بنا بریں بادشاہ کسی کو قتل کرنے یا پھانسی دینے یا کسی کو جاگیر و وظیفہ دینے کے اہم معاملے میں تنہا مختار نہ تھا۔ مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اس کی اطلاع کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ آیت کریمہ تلاوت کی: قُل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا وعلیہ فلیتوکل المومنون ٥ (توبہ) یعنی جس قدر ضرر و تکلیف مقدر ہے وہ پہنچ کر رہے گی۔ وہ ہم سب کا آقا ہے اور اس پر ایمان والوں کو بھروسہ اور توکل کرنا چاہیئے۔ چنانچہ مولانا نے بلا کسی اطلاع کے شاہی دربار کی حاضری کو منظور فرما کر شاہی چوبدار کو خط کا جواب دیا۔ اس میں یہ بھی لکھا کہ شاہی آداب و قیود کی پابندیوں سے معافی چاہتا ہوں۔ صرف اسلامی طریقہ پر سلام مسنون پر اکتفا کروں گا۔ یہ خط روانہ کر کے مولانا تھوڑی دیر بعد لال قلعہ میں تشریف لے گئے۔ بادشاہ اس وقت دربار برخاست کر چکے تھے۔ اندر آپ نے اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ بادشاہ نے وہیں خلوت خانہ میں طلب فرمایا۔ مولانا نے اسلامی طریقہ پر السلام علیکم فرمایا۔ اس کے بعد ہی بادشاہ کے پاس ایک صوفے پر تشریف فرما ہو گئے۔ بادشاہ نے اول تو تشریف آوری پر اظہار خوشی فرمایا۔ اس کے بعد کہا کہ میں جناب کی زبان مبارک سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب سننا چاہتا ہوں۔ آپ نے حکم شاہی کی تعمیل کی اور اس سوز جگر اور گداز قلب کے ساتھ وعظ فرمایا کہ اکبر شاہ ثانی بہت متاثر ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علمی فضائل اور عملی مجاہدات پر بے اختیار رونے لگا۔ ہر چند چاہتا تھا کہ نہ روئے اور رونے کی آواز پیدا نہ ہو سکے لیکن یارائے ضبط باقی نہ رہا۔ جب بادشاہ رو دھو کر خاموش ہوا تو اس نے کہا کہ مولانا جب حضرت رسالتمآب کے فضائل و محاسن آپ کے قلب مبارک میں اس قدر ہیں کہ آپ خود بھی ان کے اثر سے روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتے ہیں تو پھر آپ نے حضور کے تبرکات کی تعظیم کیوں نہیں کی؟ فرمایا وہ چیزیں سرے سے تبرکات ہی نہیں ہیں۔ بادشاہ اس پر بہت چکرایا اور کہنے لگا کہ یہ کس طرح؟ فرمایا بخاری شریف اور قرآن شریف منگوا لیجیے۔ جب دونوں چیزیں بادشاہ کے حضور میں لا کر رکھ دی گئیں، تو مولانا نے فرمایا غور فرمائیے کہ وہ تبرکات یعنی نعلین مبارک یا موئے مبارک وغیرہ کے نام سے جو چیزیں آپ کے سامنے ملاحظہ کے لیے آئی ہیں اور وہ حضور کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اول تو ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ وہ واقعی حضور ﷺ کی

علیہ وسلم کی ہی چیزیں ہیں، یا محض رسمی طور پر کمانے کھانے والوں نے حضورؐ کی طرف منسوب کر کے ظاہر پرستوں سے فائدہ اٹھانا چاہا ہے۔ دوسرے اگر آپ خود بھی دراصل ان کو تبرکات سمجھتے ہوں اور زیارت کے قابل گردانتے تو خود جا کر زیارت کرتے۔ یہ چیزیں آپ کی زیارت کے لیے جامع مسجد سے اٹھا کر نہ لائی جاتیں۔ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں آتا۔ تو اگر زیارت کی پیاس اور حقیقی اشتیاق تھا تو آپ جامع مسجد جا کر خود زیارت کر لیتے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ بخاری شریف رسول اکرمؐ کی قولی فعلی و تقریری احادیث کا صحیح ترین مجموعہ ہے۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان فرمودات کی نسبت حقیقتاً بلا شک و شبہ درست ہے اور اسی طرح کلام پاک واقعتہً حق تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں ایک ذرہ برابر شک نہیں۔ لیکن آپ نے بخاری شریف اور قرآن کریم کی آمد پر کوئی تعظیم نہیں کی۔ نہ سروقد کھڑے ہوئے اور نہ اس کی زیارت کے لیے کوئی آداب بجا لائے۔ پس حقیقی اور واقعی چیزوں کی تعظیم آپ نے نہیں کی۔ لیکن جو چیزیں بال و نعلین وغیرہ ایسی ہیں کہ ان کا حضورؐ سے واقعی تعلق ہونا ثابت نہیں کیا جا سکتا، ایسی جعلی و رسمی چیزوں کی آپ نے تعظیم کی۔

بادشاہ نے ان باتوں کو غور و توجہ سے سنا اور بڑا متاثر ہوا۔ آخر میں مولانا نے بادشاہ کو ایک اور منکر امر کی طرف توجہ دلائی کہ آپ نے سونے کے کنگن اپنے ہاتھ میں کیوں پہن رکھے ہیں؟ حالانکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اظہار بیزاری فرمایا ہے اور مردوں کے لیے سونا استعمال کرنا حرام ٹھہرایا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ حضرت مولانا! میرے دربار میں بہت سے علما ہیں مگر آج تک کسی نے یہ فرمان نبویؐ مجھ کو نہیں سنایا۔ اچھا مولانا! اب میں اس کو نکالتا ہوں اور نکالنے میں آپ بھی میری مدد کریں۔ دونوں کنگنوں کو بادشاہ نے نکال کر فرش پر رکھ دیا۔ جب کنگن علیحدہ ہو چکے تو بادشاہ نے فرمایا کہ ان کنگنوں کو اپنے ہمراہ لیتے جائیے اور غریبوں میں تقسیم کر دیجیے۔ حضرت مولانا نے ارشاد فرمایا کہ آپ کے دربار کے علما امیر کہیں گے کہ اسماعیل آیا تھا اور شاہی کنگنوں کو اینٹھ لے گیا۔ آپ خود جن کو مناسب سمجھیں انھیں تقسیم کرا دیجیے۔ چنانچہ مولانا ایک پر وقار حالت میں لال قلعہ سے نکلے اور شاہی سواری پر سوار ہو کر مکان پہنچے۔ اس کے بعد بادشاہ نے ایک پر تکلف خوان اور کپڑوں وغیرہ کے تحائف کو چوبداروں کے ذریعہ سے حضرت مولانا کے مکان پر بھیجا۔

مولانا شہیدؒ اپنے اوصاف کی روشنی میں مولانا سے زیادہ ایک سپاہی، ایک مجاہد معلوم ہوتے ہیں جو ہمہ وقت قرآن اور تلوار گلے میں حمائل رکھتے تھے۔ آپ کے ایمان افروز بدعت شکن مواعظ سے دہلی اور مضافات دہلی میں ایک غلغلہ گونجا ہوا تھا۔ آپ نے کتاب و سنت اور توحید و رسالت کی صحیح عظمت و محبت سے سب کو آشنا کیا۔ آپ کے دلکش بیانات اور متواتر مواعظ سے فضائے ہند کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا۔ آپ نے توحید و رسالت کی صحیح عظمت و محبت سے سب کو آشنا کیا۔ آپ کی دلکش تعلیمات کا ایک مجموعہ "تقویۃ الایمان" موجود ہے جس نے نذر و نیاز اور قبر پرستی وغیرہ سے سب کو روک کر "توحید و رسالت" کے عقائد صحیحہ کی طرف پوری دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے۔

●●

# روزگار اور مسلم نوجوان

مسلم نوجوان کی بیروزگاری کا مسئلہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کی توجہ اس کا حل کرنے کی طرف کم اور اس کو الجھانے کی طرف زیادہ ہے۔

ہندوستان میں بیروزگاری کی شکایت عام ہے۔ مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندو نوجوان بے روزگار ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مسلم نوجوان اپنے بیروزگاری کے مسائل حل کرنے کی طرف متوجہ نہیں، ہندو نوجوان متوجہ ہیں اور محنت کر کے اس کو حل کرنا چاہتے ہیں۔

یہ تو حقیقت ہے کہ سرکاری دفاتر میں، پرائیوٹ کاروبار میں، بینکوں میں مسلمان بہت کم لیے جاتے ہیں اور قابل مسلمان مل جائیں تو بھی ان کو نہیں لیا جاتا، اور چونکہ بہت کم لیے جاتے ہیں اس لیے وہ مایوس بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ ان حالات میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ مسلمان محنت کریں اور حصولِ معاش کے لیے جدوجہد کریں۔ مایوس نہ ہوں اور شکایت کرنے کی عادت نہ ڈالیں۔ اسی طرح ایک نوجوان نفسیاتی الجھنوں سے آزاد رہ سکتا ہے اور اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ حال ہی میں انگریزی کے اخبارات میں عرب ممالک میں ملازمتوں کا اشتہار نظر سے گزرا۔ اس میں ٹائپسٹ اور مختصر نویس کی ملازمت سے لگا کر معمولی مستری کی ملازمت تک متعدد جگہوں کے لیے درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ ان جگہوں کے لیے مسلمان درخواست کنندگان بہت کم تھے۔ بیشتر غیر مسلم ہی تھے۔ ٹائپسٹ اور مختصر نویس کی ہر دفتر میں ضرورت ہوتی ہے اور ہمیشہ ہندوستان میں اور عرب ممالک میں ان کی بہت ضرورت رہے گی۔ لیکن مسلمان نوجوان اس کام کو بہت کم سیکھتے ہیں حالانکہ تھوڑے عرصہ میں یہ کام سیکھا جا سکتا ہے اور معقول آمدنی کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح بجلی کے مختلف قسم کے کاموں سے واقفیت رکھنے والوں کی ضرورت ہر جگہ ہے۔ مسلمانوں کی اس میدان میں بھی بہت کمی ہے۔ مسلمانوں کی مالی حالت اتنی خراب نہیں جتنی کہ خیال کی جاتی ہے۔ مسلمان دستکار ہیں اور دسیوں قسم کے کام کرتے ہیں اور بہت پیسہ پیدا کر لیتے ہیں۔ دہلی میں مسلمان کاریگر ٹی وی سیٹ بناتے ہیں اور دسیوں ٹرانزسٹر بناتے ہیں۔ بجلی کے پنکھے بناتے ہیں اور دسیوں چھوٹی موٹی چیزیں بنا کر پیسہ پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ میں کاریگر مسلمان ہیں اور

کاروباری، تانگا کا کارخانہ، بڑے بڑے تاجر بھی بہت سے مسلمان ہیں۔ البتہ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ایسا ہے جس کو بیروزگاری کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور وہ پریشان حال رہتا ہے۔ اس گروہ کے نوجوانوں کو ملازمت کی تلاش کی جگہ دستکاری کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

ایک دوست نے اپنا ایک قصہ سنایا وہ آپ کی دلچسپی کے لیے یہاں لکھتا ہوں۔ یہ صاحب مسلم یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں اور معقول تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کا ایک قریبی عزیز دستکار ہے اور کاروبار کرتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ایکبار ان کے عزیز نے ان سے پوچھا کہ ان کی ماہانہ آمدنی کیا ہے؟ انھوں نے اس کو اپنی تنخواہ بتائی تو وہ ہنسا اور بولا، اتنی تو میں ایک دن میں پیدا کر لیتا ہوں۔

دراصل ہمارا نظام تعلیم اصلاح طلب ہے۔ ہر شخص کو اعلیٰ تعلیم کی طرف رخ نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ ثانوی تعلیم کے بعد روزگار کے لیے کوئی کام سیکھنا چاہیے۔ پھر اگر کالج کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر لی ہو، تو بھی دستکاری اور کاروبار کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ ملازمت سے ایک نوجوان کو جو آمدنی ہوگی اس سے کہیں زیادہ کاروبار سے ہو جائیگی۔

مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں میں دستکاری عام ہے۔ پھر آزادیٔ ہند کے بعد ایسے گھرانوں کے نوجوانوں نے تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم تک پہنچ گئے۔ بی اے کیا۔ ایم اے بھی کیا اور پھر گھر کے کاروبار میں لگ گئے۔ اب ان میں بہت سے کھپ چکے ہیں اور ملازمت پیشہ "بابو" صاحبان کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دہلی میں ایک نہیں دسیوں لوگ ایسے ہیں جو یوپی یا بہار کے کسی مقام سے آئے۔ پہلے کسی دوکاندار کے ہاں ملازمت کر لی۔ پھر خود کاروبار کرنے لگے اور خوشحال ہو گئے، اور دہلی ہی نہیں ایسے نوجوان ہر جگہ ہیں۔

مسلم نوجوانوں کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔ ملازمت کی طرف رخ نہ کرنا چاہیے۔ ملازمت کرنا ہو تو پھر مقابلہ کے امتحان میں محنت کر کے شریک ہونا چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ کاروبار اور دستکاری کی طرف رجوع کیا جائے۔

مسلمانوں میں اپنی کم مائیگی اور پسماندگی کا بڑا احساس ہے۔ لیکن اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں۔ لیڈر صاحبان جو ایم پی یا ایم ایل اے ہیں وہ بھی تعمیری کاموں میں اپنا وقت صرف نہیں کرتے۔ چھوٹے موٹے کاموں میں الجھے رہتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہر ریاست میں کم از کم ایک صنعتی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے۔ جس میں وسطی درجوں تک پڑھے لکھے نوجوانوں کو صنعتی تربیت دی جائے۔ اگر ایسے دو چار انسٹی ٹیوٹ بھی قائم ہو گئے، تو بہت سے مسلمان نوجوانوں کے روزگار کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

○○

# شیخ صاحب کی یاد میں

شیخ محمد عبداللہ نے ۸ ستمبر کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ شیخ صاحب کے انتقال سے ملک میں ایک خلا پیدا ہو گیا جس کو مستقبل میں بہت محسوس کیا جائے گا اور ہر مشکل کے موقع پر وہ یاد آئیں گے۔ اب کوئی باوقار اور جرأت مند رہنما ایسا نہ رہا جو ان کے معاملات پر بے خوف اظہارِ خیال کرے اور جس کی آواز میں طاقت ہو اور جس کو دنیا سننے کے لیے تیار بھی ہو اور مجبور بھی۔

ہمارے دل میں ترکمان دروازہ دہلی کی یاد ابھی تازہ ہے۔ اس علاقہ کے مظلوموں کی آہیں اب بھی فضا میں گونج رہی ہیں۔ یہ شیخ عبداللہ ہی تھے جن کی للکار نے بلڈوزر کا رخ پھیر دیا تھا اور دہلی والوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ شیخ صاحب مرحوم کی تمام زندگی ملک، مسلمانوں اور جموں و کشمیر کے عوام کی خدمت کرنے میں گزری۔ وہ اپنے وطن کے عوام کے حقوق کے تحفظ کے لیے انگریزوں کی حکومت کے دور میں ریاست کے مہاراجہ کی سرکار سے لڑتے رہے اور آزاد ہندوستان میں جموں و کشمیر کے عوام کی ترقی اور ریاست کے تحفظ میں مصروف رہے اور ہزاروں تکلیفیں برداشت کیں اور ایک غلط فہمی کی بنا پر جیل کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔

گو شیخ عبداللہ کی زندگی جموں و کشمیر کے لوگوں کی خدمت کے لیے وقف رہی، لیکن مسلمانوں کا جب بھی کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تھا، اس کو حل کرنے میں شیخ صاحب مدد کرتے تھے۔ شیخ صاحب ایک خوش عقیدہ، دین دار آدمی تھے، لیکن سیاسی مسائل پر سیکولر نقطۂ نظر ہی رکھتے تھے۔

شیخ عبداللہ کے رگ و ریشہ میں کشمیری خون دوڑتا تھا۔ وہ یہ نہ بھولے تھے کہ ماضی میں جموں و کشمیر کے عوام کے ساتھ کتنا ظالمانہ سلوک روا رکھا گیا تھا اور ان غریبوں نے برہا برس کس غربت و افلاس میں زندگی گزاری تھی اور اب بھی گزار رہے ہیں اور ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ کشمیر کا مستقبل اسی وقت روشن رہے گا جب وہ ہندوستان جیسے وسیع اور طاقت ور ملک کا جزو رہے گا۔

آزاد ہندوستان میں اس کے امکانات بہت تھے کہ ملک کے تاجر اور سرمایہ دار ریاست جموں وکشمیر کی طرف متوجہ ہوں، وہاں کارخانے قائم کریں اور تجارت کریں۔ ایسا ہوتا تو ملک کے سرمایہ دار تو اور دولتمند ہو جاتے، غریب اور پسماندہ جموں اور کشمیر سے غربت و افلاس کا دور ختم نہ ہوتا۔ اسی بنا پر شیخ صاحب نے وہ تمام اقدامات کیے جو ریاست کی ترقی میں معاون ہوں اور ان تجاویز کی مخالفت کی جو جموں وکشمیر کے لوگوں کی فلاح و بہبود کی رفتار میں رکاوٹ پیدا کریں۔ جموں وکشمیر کی ہندوستان میں ایک مخصوص حیثیت، ریاست کی سیاسی تنظیم نیشنل کانفرنس کو باقی رکھنے پر اصرار اور بہت سی پابندیاں جو جموں اور کشمیر کی حکومت نے لگائیں، اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ جموں اور کشمیر کے لوگ خود اس قابل ہو جائیں کہ اپنے کارخانے کھولیں، خود تجارت کریں اور ریاست کی قدرتی و معدنی دولت سے خود استفادہ کرنے کے قابل ہو جائیں اور ملک میں فرقہ وارانہ فضا نہ رہے، تب کہیں وقت آئے گا کہ ہندوستان میں وہ اپنی مخصوص حیثیت ترک کریں؛ اس سے پہلے نہیں۔

شیخ صاحب رہائی پاکر دہلی میں ایوانِ غالب کے قریب مقیم رہے۔ اس دور میں انھوں نے مسلم رہنماؤں سے گفتگو کی اور مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود کے مسئلہ پر ان سے تبادلۂ خیال کیا۔ یوسف صدیقی صاحب مرحوم جو انگریزی کے "ریڈینس" ہفت روزہ کے ڈائرکٹر، ایڈیٹر اور بڑے سرگرم ملی کارکن تھے، انھوں نے مسلم مجلس مشاورت کا جلسہ بلانے کے لیے دہلی کے کارکنوں کو شیخ صاحب کی کوٹھی پر مدعو کیا۔ شیخ صاحب نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بڑے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ ملک میں مسلمان خاصی بڑی تعداد میں ہیں، ان کا ایک شاندار ماضی رہا ہے، ان کی عظیم تہذیب رہی ہے، ان کی کافی بڑی تعداد اس ملک میں آباد ہے، ہر اعتبار سے وہ ملک میں ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی ایسا مرکز نہیں، جہاں سے ان کے مسائل کے بارے میں، ان کی تاریخ کے بارے میں اور تہذیب و تمدن کے بارے میں اگر کوئی معلومات حاصل کرنا چاہے، تو حاصل کر سکے۔ اس مرکز کی ایک وسیع عمارت ہو، وہاں ایک لائبریری ہو۔ مہمانوں کے لیے ایک مہمان خانہ ہو۔ طلبا کے لیے ایک ہوسٹل ہو۔ وسیع ہال جلسوں کے لیے ہو۔ اور ایک دفتر ہو جہاں سے مسلمانوں کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل ہو سکے۔ شیخ صاحب مرحوم نے مختصر تقریر میں اس اسلامی مرکز کی تفصیلات پر روشنی ڈالی۔ شیخ صاحب کی تقریر نے سب کو متاثر کیا۔ شیخ صاحب نے حاضرین کو اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: شیخ صاحب! یہ اسکیم تو بہت اچھی ہے،

لیکن اس کو عملی جامہ کون پہنائے گا؟ آپ خود اس کام کو ہاتھ میں لیجیے۔ دہلی میں قیام کیجیے اور مسلمانان ہند کی رہنمائی کیجیے۔

شیخ صاحب نے فرمایا کہ "جو کام میرے ذمہ ڈالا جائے گا، وہ ضرور کروں گا، لیکن اس کام کو عملی شکل آپ لوگ دیجیے"۔ شیخ صاحب نے مسلمانوں کی تعلیم اور مالی پسماندگی پر بھی اظہار خیال کیا اور چند نام اس سلسلہ میں بھی لیے گئے۔ چند روز بعد مسلم مجلس مشاورت کا اجتماع شیخ صاحب مرحوم کی صدارت میں بچوں کے گھر میں ہوا۔ تقاریر ہوئیں، تجاویز پاس ہوئیں، کمیٹیاں بنیں اور وہی ہوا، جو مسلمانوں کی دوسری تحریکات کے سلسلہ میں ہوتا رہا ہے۔ شیخ صاحب مرحوم کشمیر چلے گئے اور وہاں کشمیر کے مسائل میں منہمک ہو گئے۔ انھوں نے چند بار کوشش ضرور کی کہ یہ کمیٹیاں اپنا کام شروع کریں اور اسلامی مرکز کے قیام کے لیے فضا پیدا کی جائے، لیکن وہاں کون سرگرم تھا کہ جو اسلامی مرکز کے قیام کے خواب کو عملی جامہ پہناتا! ●●

# یہ فسادات آخر کب تک؟

فرقہ وارانہ فسادات نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی ہے۔ جواہر لال نہرو کا خیال تھا کہ ایک آزاد ملک میں فسادات کیسے برداشت کیے جا سکتے ہیں؟ آزاد ہندوستان کی حکومت میں فسادات نہ ہوں گے، حکومت ان کا تدارک کرے گی۔ لیکن آزاد ہندوستان میں فسادات اور بڑھ گئے، اور اب تو فسادات نے بہت ہی خطرناک شکل اختیار کر لی ہے۔ تصور کیجیے کہ ایک شخص کسی ضرورت کے تحت کہیں جا رہا ہے، وہاں فرقہ وارانہ فسادات کا ہنگامہ ہے، مفسد اس مسافر پر ناگاہ حملہ آور ہوتے ہیں اور وہ مارا جاتا ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس کے کیا حالات تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ماں کا اکلوتا بیٹا ہو اور بھرے گھر کا واحد سہارا ہو۔ اس کے بچے کم عمر ہوں، جوان بیوی ہو۔ ایک دو روز کے لیے وہ گھر سے نکلا ہو اور وہ واپس نہ پہنچے۔ اس کا گھر پر انتظار ہو۔ اس کے گھر والوں پر کیا گزرے گی جب وہ گھر واپس نہ پہنچے گا۔ اس کا انتظار دو چار روز ہوگا، پھر گھر والے پریشان ہوں گے، چند روز تک یہ پریشانی مایوسی تک پہنچ جائے گی۔ بیوی، بچے اور بیوہ ماں روتے روتے بدحال ہو جائے گی۔

یہ ایک خیالی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے اور ہر فساد کا شکار اجنبی بھی ہوتے ہیں اور ان کے گھر برباد ہوتے ہیں۔

ہم تو بڑے انسان دوست ہیں۔ ظلم و ستم کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر آخر یہ فسادات کیوں ہوتے ہیں؟ انسان کے خون کی پیاس ہم کو کیوں بے قابو رکھتی ہے؟ ہم تو عظیم تہذیبوں کے وارث ہیں۔ ہم کو تو یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے سائے میں شیر اور بکری ایک گھاٹ میں پانی پیتے ہیں۔ پھر یہ کیا ہے کہ مختلف خیالات اور عقائد کے لوگ ایک ساتھ ہمارے سائے تلے نہیں رہ سکتے اور مخالف کو نیست و نابود کرنے کا جذبہ ہماری رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہ زمانہ جمہوریت کا ہے۔ دنیا انصاف اور امن کی طالب ہے۔ دنیا میں کہیں لڑائی ہوتی ہے تو ہم طرفین کو مطعون کرتے ہیں۔ پھر آخر یہ کیا ہے کہ اپنے ملک میں اپنے ہمسایہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔

حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ آخر یہ فسادات کب تک جاری رہیں گے۔ یہ سلسلہ اب اس منزل میں ہے کہ اگر بند نہ ہوا تو یہ دنیا بھول جائے گی کہ اس ملک میں گاندھی اور بڑے بڑے صوفیا اور رشی پیدا ہوئے تھے۔

فرقہ وارانہ فسادات نے شدت اختیار کی تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پارلیمنٹ کے تمام ممبران سر جوڑ کر بیٹھتے اور فسادات کے ہر پہلو پر غور کرتے اور ملک میں خوشگوار فضا پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ لیکن ہوا یہ کہ صرف مسلمان ممبران پارلیمنٹ نے احتجاج کیا اور سب خاموش رہے۔ پارلیمنٹ کے ممبران تو مصلحت بیں ہوتے ہیں۔ تعجب صحافیوں پر ہے جو آزاد خیال اور آزاد منش ہوتے ہیں، وہ بھی غیر جانبدار بنے رہے۔

اب تو ضرورت اس کی ہے کہ ہر انصاف پسند ہندوستانی، صحافی، ادیب و شاعر اور سب ان فسادات کے خلاف آواز اٹھائیں اور ہر فرقہ کے لیڈر بالکل صفائی کے ساتھ اپنے اپنے تاثرات بیان کریں۔ اگر ہندوؤں کو مسلمانوں سے شکایات ہوں، تو وہ صاف طور پر بیان کی جائیں۔ اور مسلم اکابر سے ہندو رہنما تبادلہ خیال کریں، اور اسی طرح مسلمان بھی ہندوؤں کے خلاف اپنی شکایات پیش کریں۔ اور دونوں فرقوں کے لیڈر ایک دوسرے کا بیان سن کر آپس کے اختلافات ختم کریں، تاکہ اس برصغیر میں امن و سکون قائم ہو، اور لوگ چین کی زندگی گزار سکیں۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ ہندو مسلم اختلافات کی بنیاد ہندوستان کی ماضی کی تاریخ ہے، جس کے واقعات کو انگریزوں نے مسخ کر کے لکھا ہے اور تاریخ کی کتابیں اسکول کے نصاب میں داخل کر کے ہندو مسلمان بچوں کے دلوں میں نفرت کا بیج بو دیا ہے۔ لیکن آخر یہ احساس کیوں نہیں ہے کہ دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو، جہاں وہی لوگ آج بھی آباد ہوں، جو روز اول سے وہاں بستے تھے۔ یا ہزاروں سال بعد وہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ہر آبادی کے حکمراں ہوس کا شکار رہے ہیں۔ یہ پڑوس کی آبادی پر، اگر وہ کمزور ہوتی، تو حملہ کر کے قابض ہو جاتے تھے۔ بادشاہوں، راجاؤں، حاکموں کا یہ دستور ہزاروں برس رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اب بھی دنیا میں ایسی قومیں ہیں جن کے منہ کو انسانی خون لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے کمزور پڑوسی کو ہی نہیں، ہزاروں میل دور بسنے والی مخلوق کو بھی غلام بنا لیتی ہیں۔ ان کی دولت پر ان قوموں کی نظر ہوتی ہے۔ عہد وسطیٰ میں تو جمہوری حکومت نہیں، شخصی حکومت ہوتی تھی۔ حاکم وقت سیاہ و سفید کا مالک ہوتا تھا، جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ مجرموں کو ہی نہیں اپنے مخالفوں کو سخت سے

سخت سزا دیتا تھا۔ کس حاکم وقت نے مخالفوں پر ظلم نہیں کیا؟ ان کی سرکوبی نہیں کی؟ مسلم حاکم وقت نے اپنے مسلمان مخالف کو کب بخشا تھا جو کسی اور کو بخش دیتا۔ پھر حاکم وقت جہاں مخالف کی سرکوبی کرتا تھا وہاں خوش ہونے پر انعام واکرام کی بارش بھی کرتا تھا۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندو مسلم مخالفوں کی سرکوبی بھی کی ہے اور انعام واکرام کی بارش بھی ان پر کی ہے۔ اب گزرے زمانے کے زخموں کو کریدنے سے کیا فائدہ؟ وہ زمانہ پھر واپس نہ آئے گا۔ لیکن اگر زخموں کو کریدنے میں ہی مزہ آتا ہے، تو پھر عطر محبت کی ان شمیم انگیزیوں کو بھی تو یاد رکھئے جن کے سبب آٹھ سو سال ایسے بادشاہوں نے حکومت کی ہے جن کا دین اسلام تھا۔

ظلم وستم قومیں زیادہ عرصہ برداشت نہیں کرتیں۔ انگریز جیسی ترقی یافتہ قوم کو ہندوستان نے دو سو برداشت نہیں کیا۔ پھر آٹھ سو سال مسلمان یہاں کیسے حکومت کرتے رہے؟ اور یہ دونوں فرقے کیوں شیر وشکر رہے؟ کیا ظلم کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

زمانہ جمہوریت کا ہے، عدل وانصاف کا ہے، مساوات کا ہے۔ اس دور کی خصوصیات کی عادت ڈالئے اور جمہوری صنعتی دور کی عینک سے دنیا کو دیکھئے۔ پھر دل کی سب کدورت دھل جائے گی۔ اور پھر ہم سب ایک خوشگوار دور میں داخل ہو جائیں گے۔

کسی قوم و ملک کی ترقی کے لئے تعمیری فکر، بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔ تخریب پسند فکر کسی قوم اور ملک کی ترقی کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ ۳۵ سال کی تاریخ سامنے رکھئے، دیکھ لیجئے ہمارے ملک کی کیا حالت ہے! دوسری قوموں کی ترقی کے اسباب کا مطالعہ کیجئے تو یہ حقیقت اور واضح ہو جائے گی۔

آیئے ہم سب مل کر نیا ہندوستان بنائیں، جس میں سب کی توجہ تعمیر کی طرف ہو، تخریب کی طرف نہیں۔ اتحاد کی طرف ہو، انتشار کی طرف نہیں۔

شکتی بھی، شانتی بھی، بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی، پریت میں ہے

●●

# تہذیب الاخلاق کے بارے میں

کوشش یہ کی جائے گی کہ رسالہ میں ایسے علمی مضامین کا اضافہ ہو جو ہمارے فکر اور عمل کی اصلاح کا ذریعہ ہوں اور زندگی کے مسائل کو جذبات کے تحت نہیں علم کی روشنی میں ہم دیکھنے کے عادی ہو جائیں۔ سرسید نے سائینٹفک سوسائٹی قائم کی تھی، وہ جدید علوم کو اردو کے ذریعہ ہندوستانیوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ لیکن انگریز اس تحریک کے مخالف تھے اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی جدید افکار سے آگاہ ہوں۔ وہ اس سوسائٹی کی ترقی میں رکاوٹ بنے۔ اب ملک آزاد ہے۔ جدید علوم کی تعلیم ہر یونیورسٹی میں ہوتی ہے۔ اب یہ پڑھنے اور پڑھانے والوں کا کام ہے کہ وہ اس دور کے علوم سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ علم کی روشنی میں ہم اپنے فکر و عمل کی اصلاح کریں۔ اس دور میں سائینٹفک سوسائٹی کا راقم کے خیال میں یہ مقصد ہونا چاہیے کہ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ اور کام کرنے کا طریقہ بدلے اور ہم جذبات سے کم اور عقل سے زیادہ کام لینے کی عادت ڈالیں۔

ہندوستان ایک بہت وسیع ملک ہے۔ اب بھی اس ملک میں ایسی آبادیاں ہیں جہاں ہزاروں برس پرانی تہذیب کے خط و خال ہی نہیں دیکھے جا سکتے۔ بلکہ اس دور کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور ہزاروں سال پرانی تہذیب اور معاشرت کا آپ نمود دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری عام زندگی اور تہذیب و معاشرت پر عہد وسطیٰ کی چھاپ صاف نظر آجاتی ہے اور شہروں میں بھی ہماری زندگی میں اس دور کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس قدیم میں جدید کی روح پھونکنے کی ضرورت ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم جدید تہذیب کی نقالی کریں اور اس نقالی کو ایک مقصد بنا لیں۔ ہمیں نقالی کی عادت ترک کر کے جدید افکار سے استفادہ کرنا چاہیے تاکہ وہ ہمارے معاشرہ کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ ہو۔ گزشتہ سو سال میں ہم نے جدید تعلیم صرف حصولِ معاش کے لئے حاصل کی، جدید علوم سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے نہیں۔ اسی بنا پر ہم میں ذہنی غلامی بدستور ہے اور اس بھنور سے نکلنا ہمارے لئے دشوار ہو گیا ہے۔ یہی ہماری ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس مرض کے علاج کی طرف آج ہم قدم اٹھا رہے ہیں۔ آئیے ہم سب مل کر اس کوشش کو کامیاب بنائیں اور ترقی کی اس راہ پر چلنا سیکھیں جس سے ہم دنیا میں باعزت زندگی بسر کر سکیں۔

••

# ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی

علی گڑھ کے مشہور اولڈ بوائے اور لکھنؤ کے
ہردلعزیز ڈاکٹر، علی گڑھ کنونشن کے روحِ رواں

# مسلم یونیورسٹی، دیوبند اور جامعہ ملّیہ میں انتشار

اتنی بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ یہ تینوں ادارے مخصوص حالات میں انتہائی مخلص لوگوں نے قائم کئے تھے۔ ان کے ارادے، اور عزائم بہت واضح تھے۔ انھوں نے ملّتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی اور ملّی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ان عظیم اداروں کو بنایا اور سنوارا تھا۔ شروع میں جو اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے لوگ ان اداروں سے نکلے ان کو معمولی درجہ کی سہولتیں بھی حاصل نہیں تھیں۔ عمارت پختہ نہیں تھی۔ روشنی کا انتظام نہیں تھا۔ کھانے کے لیے ڈائننگ ہال نہیں تھا۔ اساتذہ کے لیے آرام دہ مکانات نہیں تھے۔ بجلی نہیں تھی۔ غرض کہ راحت و آرام و آسائش کی وہ تمام چیزیں جو آج فراوانی سے مہیا ہیں اس وقت ان کا تصور بھی مشکل تھا۔ لیکن اس پورے ماحول میں کوئی بے چینی نہیں تھی۔ طلباء اور اساتذہ میں باپ بیٹوں کا سا تعلق تھا۔ سب ایک دوسرے کے رفیق، ہمدرد و مونس و غمخوار تھے۔ کسی کو کسی سے شکایت نہیں تھی۔ لیکن اب صورتِ حال بہت بدل گئی ہے۔

دوسری یونیورسیٹیوں اور کالجوں کی دیکھا دیکھی اِن اداروں میں بھی مطالبات کی کثرت، خامیوں کی نشاندہی اور بات بات پر اُلجھنے کا مزاج بن گیا ہے۔ بلکہ عملی طور پر اس کا رواج ہو گیا ہے۔ یہ احساس ہی رخصت ہو گیا ہے کہ اس کا کوئی اخلاقی جواز بھی ہے۔ مطالبوں کے بھی حدود ہیں اور مطالبوں کو پیش کرنے کا بھی ایک معیار ہے۔

اپنے گھروں پر تنگی اور دشواریوں کی زندگی گزارنے والے بھی یہاں اس طرح آتے ہیں جیسے داماد سسرال میں۔ شریف داماد تو سسرال والوں کا معاون اور مددگار ہوتا ہے۔ لیکن یہاں صرف خامیوں پر نظر رہتی ہے اور صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس طرح ٹکراؤ کی فضا پیدا کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کیا ان اداروں میں طلبہ کی یہ روش حقیقت پسندانہ ہے؟ کیا یہ ان خوابوں کی صحیح تعبیر ہے، جو اس کے بانیوں نے دیکھا تھا۔ کیا اسی طرز کے کردار کے لیے انھوں نے اپنی نیندیں حرام کی تھیں، اور در در کی بھیک مانگی

تھی؟ کیا اسی لیے انھوں نے انتہائی تقویٰ اور عسرت کی زندگی گزاری تھی؟

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہاں صرف وہ لوگ آئیں گے جن کے سامنے دنیاوی وجاہت اور ترقی کے سوا کوئی اور مسئلہ ہی نہ ہوگا؛ انھیں صرف مراعات کی ضرورت ہوگی۔

ان اداروں کی تعمیر میں حصہ لینے والوں نے تو ایسی مثالیں قائم کیں جن کا اس وقت تصور بھی مشکل ہے۔ اگر بیوی نے موٹر استعمال کی ہے تو پٹرول کا حساب لگا کر وہ رقم ادارہ کے حساب میں داخل کرا دی۔ تندور کی آنچ سے سالن گرم کر کے کھالیا تو بعد میں اس کے پیسے بھی داخل کر دیئے۔ ذاتی کام کے لیے الگ قلم اور کاغذ اور ادارہ کے کام کے لیے قلم اور کاغذ علیحدہ۔ مہینوں چولھا نہیں جلا، چنوں پر گزر کر لی۔ اگر گھنٹہ نہیں لیا تو حساب لگا کر تنخواہ کٹوا دی۔

اس احتیاط سے کام کرنے والے کبھی سوچ سکتے تھے کہ یہاں ایک ایسا دور آئے گا جب اساتذہ اور ملازمین اچھی تنخواہوں اور ہر قسم کی رہائشی اور دوسری سہولتوں کے باوجود ہر وقت کمی کا شکوہ کریں گے اور ایسے لائق فرزندانِ قوم آئیں گے، جو ہر وقت مراعات کا مطالبہ کریں گے۔ امتحان کی چھوٹ، حاضری کی چھوٹ، عمارتوں کا مطالبہ، کھانے کا مطالبہ، داخلوں کا مطالبہ، اساتذہ کے خلاف ہنگامہ آرائی، ماں بہن کی گالی سے لیکر ہر قسم کے القاب سے خطاب، اساتذہ اور انتظامیہ کی تضحیک، قرآن و حدیث کے طلبا کا بسوں میں بیٹھ کر سرکاری افسران کے سامنے مظاہرہ، بلم، چھری، چاقو، پستول کی دھونس! اس کام کے لیے ادارہ کی ضرورت نہیں تھی؛ اس کے لیے تو پڑھا لکھا ہونا بھی شرط نہیں!! اس کے لئے مسلمان ہونے کی بھی شرط نہیں!!!

بہرحال یہ واقعہ پیش آ رہا ہے اور بہت سے لوگ مختلف طریقوں سے اس کی حمایت بھی کر رہے ہیں۔ لیکن کیا یہ صورت حال ان اداروں کو باقی رہنے دیگی؟ کیا اس کے نتائج انتہائی سنگین اور بھیانک نہیں ہوں گے؟ کسی ادارے کی ضمانت نہ اس کا بجٹ ہے، نہ عمارتیں، نہ طلبا، نہ اساتذہ کی تعداد۔ کوئی چیز اگر واقعی ضمانت ہو سکتی ہے تو وہاں کے اندر کا ماحول، طلبا اور اساتذہ کا تعلق اور بڑے مقصد کے لیے پوری ہم آہنگی، اس کے لیے ایثار، قربانی اور ہر قسم کی تکلیف اٹھانے کا جذبہ!

اگر یہ نہیں ہے تو مطالبوں کی فہرست طویل ہوتی جائے گی اور جو قدم اٹھے گا وہ تباہی و بربادی کی طرف بڑھے گا اور ایک دن ایسا آئے گا جب یہ چمن فتنوں کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گا۔

●●

# ادارہ تاریخ سے نہیں، تحریک سے چلتا ہے

ہر اولڈ بوائے اپنے پرانے دور کو موجودہ دور سے بہتر سمجھتا ہے ۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شجرِ سایہ دار زوال پذیر ہے ۔ اپنی وسعت اور ہر قسم کی ترقی کے باوجود کوئی ایسی چیز ضرور ہے، جس نے اس کی قوتِ نمو کو متاثر کر رکھا ہے ۔

جن اساتذہ اور کارکنوں سے یہ دانش گاہ عبارت ہے کیا وہ حقیقت پسندی سے اس صورت حال کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے اور وہ خود اس ضرورت کو کس حد تک پورا کر رہے ہیں اور کہاں تک اس مشن کی تکمیل میں جا سکتے ہیں ۔

مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی سب سے بڑی خوبی ان کا خلوص اور ادارہ اور طالب علموں کے ساتھ ان کی وابستگی رہی ہے ۔ اچھے طالب علموں کی تلاش انکی سرپرستی اور اکثر اپنی یافت کا بڑا حصہ ان پر لگا دینا، ان کے کردار کا وہ سب سے نمایاں اور روشن پہلو ہے جس نے اس ادارہ کی انفرادیت کو برقرار رکھا ۔ ان کا ایثار ان کی زندگی میں ایسا رچا بسا ہوا تھا جو بادِ سحر کے نم کی طرح نئی کلیوں میں جذب ہو جاتا اور انھیں کھلے ہوئے پھولوں میں تبدیل کرتا ۔

دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ ایسے لوگوں کا تناسب گھٹ رہا ہے اور ان لوگوں کا تناسب بڑھ رہا ہے جو محض ملازمت اور اپنی آمدنی کی خاطر یہاں آ گئے ہیں اور ذرا ان کو اس سے بہتر مواقع کے آثار کہیں نظر آئے اور انھوں نے طوطا چشمی کی ۔ یہاں تو لوگ اپنی کشتیاں جلا کر آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے!

ادارہ تاریخ سے نہیں، تحریک سے چلتا ہے ۔ مسلم یونیورسٹی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ پورے ملک سے وابستہ تھی ۔ ہندوستان کے اہم مقامات پر اس کے اجلاس ہوتے تھے ۔ اس کے نتیجے میں پورے ملک میں ایک ساکھ قائم تھی ۔ لیکن مسلم ایجوکیشنل تحریک کے ختم ہونے کے نتیجہ میں زبردست خلا ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم یونیورسٹی پر ہاتھ ڈال دیا گیا اور ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ کب تک یہ دست درازی جاری رہے گی ۔ سر سید کے تعلیمی مشن کو پورا کرنے کے لئے داخلی طور پر مسلم یونیورسٹی کے ماحول اور اس کے نصاب کو از سرِ نو تشکیل دینے کی اور پورے ملک کی سطح پر رابطہ قائم کرنے کے لئے مسلم ایجوکیشنل تحریک کو نئے سرے سے متحرک کرنے کی ضرورت ہے ۔

# یونس قاضی

• جناب محمد یونس قاضی : پ یکم جولائی ۱۹۱۴ء علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں بحیثیت لکچرر وابستہ رہے۔ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء حکومت ہند کے پلاننگ کمیشن (ب) کے ڈائریکٹر رہے۔ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۶۱ء اکنامک کمیشن برائے یورپ، اقوام متحدہ، جنیوا سے منسلک رہے۔ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۶ء اقوام متحدہ کی جانب سے کابل میں حکومت افغانستان کے مشیر برائے پلاننگ اور ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۴ء حکومت ہند کی جانب سے ہند جاپان کمیٹی (پلاننگ کمیشن) کے سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ آپ کا میدان معاشیات بالخصوص پلاننگ (منصوبہ بندی) رہا ہے۔ ••

# مارکسزم پر ایک منصفانہ نظر

انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم اس مضمون کا آغاز مارکس کے اس مقولے سے کریں جس کے بموجب سرمایہ دارانہ نظام میں غیر جانبداری اور انصاف (کم از کم جہاں تک مزدور طبقہ کے مفاد کا تعلق ہے) مفقود ہیں۔ پورا کا پورا نظام خواہ وہ عدلیہ ہو یا مذہبی، ڈنڈی مارنے اور محنت کشوں کے خلاف جھوٹی شہادت دینے کے لیے تلا رہتا ہے۔ مارکس کی یہ شکایت بیجا نہیں ہے۔ ہر دولت پرست اور اخلاق سے مبرا نظام میں جہاں "اے ایمان والو انصاف کی گواہی دینے کے لیے اللہ کے واسطے تیار ہو جایا کرو، کسی قوم کی دشمنی کی بنا پر انصاف کو نہ چھوڑو، بلکہ انصاف سے (ہر حال میں) کام لو" کی تعلیم پر عمل نہیں ہوتا، کمزور کو انصاف مشکل سے ملے گا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان محض مادی ماحول کا نتیجہ ہے (جیسا کہ مارکس کا نظریہ ہی یہی بات کہ مارکس نے اپنے زمانہ کے برطانوی فیکٹری انسپکٹروں کی غیر جانبداری کا اعتراف کیا ہے، مارکسسٹ نظریہ کے خلاف جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ برطانوی عمال حقیقت کو چھپاتے، حکمراں طبقہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے!

میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ مارکس مفکر کم تھے اور وکیل زیادہ۔ ایک حساس اور خدا ترس! جی ہاں، خدا ترس (اپنے غیر محتاط لمحات میں مارکس نے "The Truth" (حق) "The consciecnce" (ضمیر) "free scieutific enquary" کا ذکر کیا ہے) فرد کی حیثیت سے انھیں اپنے زمانہ کے مظلوم اور بد حال محنت کش طبقہ سے دلی ہمدردی تھی اور ان پر ظلم کرنے والوں سے سخت نفرت۔ انھوں نے حالات کا مطالعہ کیا اور مزدور طبقہ کی طرف سے ایک ایسا استغاثہ تیار کیا جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور انسانی طرز فکر ہی کو بدل ڈالا۔ اپنا کیس (case) مضبوط کرنے کے لئے انھوں نے اپنے دشمنوں ہی کے ہتھیار یعنی کاروباری انسان (Economic man) کے تخیل کا استعمال کیا اور نہایت کامیابی سے کیا مگر جو "ماڈل" (Model) یا جو استغاثہ انھوں نے تیار کیا وہ بظاہر جتنا مضبوط تھا اتنا ہی وہ کمزور بھی تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ تمام تر ۱۹ ویں صدی کے حالات پر مبنی تھا۔ مزدور طبقہ کی حالت اس وقت واقعی ناگفتہ بہ تھی۔ دوسرے یہ کہ اپنے عہد کے معاشرتی

مسائل پر لکھنے والوں کی طرح انھیں یہ بھی شوق اور زعم تھا کہ وہ ایسے سوشل قوانین کا پتہ چلائیں جو طبعی قوانین کی طرح اٹل ہوں اور افراد کی مرضی اور خوشی و ناخوشی کے محتاج نہ ہوں۔ یہ امر ان کے لیے اس لیے اور بھی ضروری ہے تاکہ مزدور طبقہ کے حقوق کو آئندہ کوئی جھٹلا نہ سکے اور سرمایہ دار طبقہ کی ناانصافی پر پردہ نہ ڈال سکے!

مارکس اور ہم سب کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان کی اپنی زندگی میں کسی ملک میں بھی سوشلسٹ نظام قائم نہ ہوا اور اس طرح وہ اپنے نظریات کو تجربہ کی روشنی میں پرکھنے اور ان پر نظر ثانی کرنے سے قاصر رہے۔ اسی لیے ان کا پورے کا پورا ماڈل فیز آز سودہ اور ایک معنی میں خیالی (Utopian) ہے۔ آج جب ہم ان کے نظریات کو ان کی اپنی ہی بنائی کسوٹی (یعنی زندگی) سے جانچتے ہیں تو ان کی کئی اہم تعلیمات کے "دقیانوسی پن" کا احساس ہوتا ہے اور ان کا سائنٹیفک سوشلزم "کچھ کچھ غیر سائنٹیفک جوتش" معلوم ہونے لگتا ہے۔ آج کے جوتشی یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ ان کا علم رجحانات کا پتا دیتا ہے اور خطرہ کے نشان کے مترادف ہے۔ ایسا خطرہ جس سے بچا جا سکتا ہے۔ مغربی ممالک کے سرمایہ دار کو اب عقل آگئی ہے۔ (گو، پسماندہ ممالک میں اب بھی ذہنیت نہیں بدلی) ایک اور بدمذاقی تاریخ کی طرف سے یہ ہوئی کہ انقلاب روس جیسے ملک میں آیا۔ خود روسی کمیونسٹ (سوائے ٹراٹسکی کے) اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے اور ان کی توقعات بورژوا انقلاب سے آگے دتھیں۔ روسی انقلاب نہ عوام کی مرضی اور نہ ہی مادی حالات کی بنا پر آیا۔ بہت سی زیادتیاں اور گناہ جو روس میں موجود ہوئے وہ مارکسزم کے کھاتے میں ڈال دیئے گئے۔

اینگلز (Engels) کو اپنے رفیق کے فلسفہ تاریخ کے غلو کا پورا پورا احساس تھا جس کے بموجب تمام تاریخ صرف طبقاتی جنگ ہے اور معاشی حالات کی پیداکردہ اور ٹھیک اس طرح جیسے بچوں کی مشہور مٹھائی بڑھیا کا کاتا قند اور رنگ سے بنتی ہے، تاریخ مادی حالات کا نتیجہ ہے۔ ایک خط میں انہوں نے صاف اور کھلے طور پر کہا ہے کہ معاشی حالات ہرگز ہرگز تاریخ کا واحد محرک اور سبب نہیں ہیں۔ تاریخ بنانے میں بنانے والے شخص کا حصہ ہے اور اس کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے فرد کے رول کی چھاپ رہتی ہے اور جم غفیر (Masses) کے کارناموں میں مدغم نہیں ہو جاتا۔ اینگلز نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ مارکس کن حالات میں لڑ رہے تھے اور یہ کہ ان کی جنگ ایسے لوگوں سے تھی جو معاشی اسباب کو کوئی مقام دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے ان نوآموز مارکسسٹوں کو ڈانٹا ہے جو بغیر پورے طور پر سوچے

بجھے نظریات کو روزمرہ کی زندگی پر چسپاں کرتے رہتے ہیں اور بنا ہلدی کے ٹکڑے کے اپنے کو پنساری تصور کرنے لگتے ہیں۔

مارکسزم کا شہرہ اس قدر ہے کہ لوگوں کو اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوست دشمن سب ہی کے لیے دروازہ کھلا ہے کہ جو چاہے مارکس اور اینگلز سے منسوب کردے۔ مثلاً روسی عمال نے "مزدور طبقہ کی آمریت" کے تصور کو استبداد میں تبدیل کرڈالا۔ حالانکہ مارکس کے نزدیک پرولتاری ڈکٹیٹرشپ وہ نظام تھا جو سولہ آنے جمہوری تھا۔ مارکس کے ذہن میں پیرس کمیون (Paris commune) کا نمونہ تھا جس میں ہر بالغ کو ووٹ کا حق تھا۔ ایڈمنسٹریشن کا اساس بلدیہ تھا۔ پولس مقامی تھی اور بلدیہ کے ماتحت۔ انسانِ بلدیہ کا انتخاب (ELECTION) ہوتا تھا، تقرر نہیں اور ان کی تنخواہ ایک عام مزدور کی تنخواہ کے برابر تھی وغیرہ وغیرہ۔ مارکس کو ریاست (National State) سے سخت نفرت تھی۔ وہ تو سوسائٹی (society) کے قائل تھے جس کا ہر فرد فیصلوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ فیکٹری میں مزدور، بلدیہ میں تمام شہری وغیرہ وغیرہ۔ موجودہ کمیونسٹ ممالک کے نظام کو انھوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ مارکس کے مخالفین نے ان کے متعلق یہ غلط فہمی پیدا کی کہ وہ ذاتی ملکیت کے خلاف ہیں۔ حالانکہ وہ صرف ذرائع پیداوار میں ذاتی ملکیت کے خلاف تھے۔ ان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ ذاتی ملکیت کا قلع قمع سرمایہ داری نے کیا، جب سرمایہ دار نے کسان سے اس کی زمین اور کاریگر سے اس کے اوزار لے کر محنت فروش اور فاقہ زدہ میں تبدیل کردیا۔ جو حقیقت بھی ہے!! (علی گڑھ شہر کے وہ بسکٹ بنانے والے آج کہاں ہیں؟)

**۲**

اب ہم مارکسزم کے بنیادی نظریات پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔

لینن نے (Lenin) نے مارکسزم کے تین عنصر بتائے ہیں:

(۱) مادیت: جیسا کہ اوپر کی سطور میں ذکر ہوچکا ہے، مارکس ایک نہایت کامیاب وکیل تھے۔ اور اس لیے اپنے مؤکل کو جتانے کے لیے ڈنڈی مارنے سے احتراز نہیں کرتے تھے۔ چونکہ آگے چل کر انہیں انسان کو مادی حالات کا مطیع ثابت کرنا تھا، اس لیے انھوں نے انسان کو اشرف المخلوقات نہیں کہا۔ ان کے نزدیک انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ وہ اپنی روزی کے ذرائع کو دہراتا اور توسیع

دیتا ہے! انھوں نے جان بوجھ کر نہ پوچھا کہ حیوان کے مقابلہ میں یہ برتری کہاں سے حاصل ہوئی؟ جو جواب ملتا وہ ان کے پورے گھروندے کو مسمار کر دیتا۔ وہ تو عدالت کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ انسانی فہم کی اپنی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں ہے۔ فریق مخالف کا منھ بند کرنے کے لیے انھوں نے یہ پیش بندی کی کہ مادہ (Matter) کو تفکر (Thinking Matter) کی قوت عطا کر دی۔ اگر یہ الف لیلہ نہیں تو اور کیا ہے۔

**(۲) معاشیات:-** مارکسسٹ معاشیات کی جان اس کا اپنا (Surplus value) کا نظریہ ہے جس کے بموجب مزدور کی اجرت اس دولت سے بہت کم ہے جو وہ اپنے زور بازو سے پیدا کرتا ہے۔ دونوں یعنی مزدور کی اجرت اور پیداشدہ دولت میں جو فرق ہے وہ مالک کے قبضہ میں چلی جاتی ہے اور مالک اس دولت کو پھر سے بزنس میں لگا دیتا ہے اور اس طرح دولت کی افزونی (اور غربت کی بہتات) کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے جو اسی وقت ٹوٹتا ہے کہ جب فاقہ زدہ محنت کش تمام ذرائع پیداوار کو اپنے تصرف میں لے لیں اور سرمایہ داری کو ختم کر دیں۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اس نظریہ میں بڑی جان ہے اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں شاید ہی ایسا معاشرہ ہو جو پکار پکار کر اس کی شہادت نہ دے رہا ہو۔ دور کیوں جایئے، لکھنؤ کی چکن کی صنعت علیگڑھ کے تالے کے کارخانے کی سیر کر لیجیے اور جب بارہ برس کے رکشا چلانے والے کو دیکھیں، جو جان بیچ کر اپنا، اپنی بیوہ ماں اور یتیم بہن بھائیوں کا پیٹ بھرتا ہے، تو مارکس کے اس نظریہ کو یاد رکھیے۔ جہاں جہاں محنت کش طبقہ اپنے حقوق کے لیے نہیں لڑ رہا ہے، جہاں جہاں اس کی اپنی یونین نہیں ہے، مزدور کو صرف اتنا ہی ملتا ہے کہ وہ اور اس کا خاندان کم از کم فی الحال نہ مرے۔ مگر مغربی ممالک پر یہ چسپاں نہیں ہوتا۔ وہاں عام طور سے نہ صرف ٹریڈ یونین ہیں، مزدوروں کی حکومتیں بھی بنتی ہیں۔ مارکس کے زمانہ کی حالت اب نہیں ہے۔

آج ایک ایسا مسئلہ درپیش ہے جسے مارکس نے نہیں سوچا تھا۔ ان ممالک میں بھی جہاں ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت میں نہیں، مزدور کو اس کی پیدا کردہ دولت کا پورا حصہ نہیں مل رہا۔ قومی پیداوار کی تقسیم میں اس کا اپنا ہاتھ نہیں ہے۔ کچھ اوپر کے لوگ اس کے نام پر فیصلہ کر دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ "کمیونزم" اور "کمیونسٹ ریاست" ایک چیز نہیں۔ اور مارکس کے یہاں "سوسائٹی" (ملت) ہے مگر "سلطنت" نہیں۔ مگر اس جواب سے تشفی نہیں ہوتی۔ بالآخر فیصلہ چند ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا اور

اگر وہ "ضمیر" سے بری ہیں اور خوفِ خدا سے آزاد تو ہم کس طرح توقع کریں کہ وہ انصاف کریں گے؟ دوسری جنگِ عظیم کے دوران فاتح فوج کو برلن میں داخل ہونے سے پہلے اعلان کرنا چاہیئے تھا کہ "جو شخص ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے یا اپنے گھر کے دروازے بند کرلے یا مسجد حرام میں چلا جائے وہ مامون ہے" (محمد علیم)

(۳) **طبقاتی جنگ** :- چونکہ حکمراں سرمایہ دار طبقہ خود سے مزدور کے ساتھ انصاف نہیں کرے گا۔ اس لیے لازم ہے کہ اس کے خلاف مستقل جہاد کیا جائے اور اس سے تمام طاقت لے لی جائے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اصلاح کے ذریعہ بھی وہی مقصد حاصل ہو سکتا ہے، سراسر خود فریبی ہے۔ یہ ہے طبقاتی جنگ کے جواز کا لب لباب۔ اگر ہم ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی کے آغاز تک کے حالات لیں تو اس نظریہ میں صداقت نظر آئے گی۔ مگر پہلی جنگ عظیم کے بعد حالات بدلنا شروع ہو گئے، اور سرمایہ دار طبقہ کو عقل آگئی۔ دوسرے یہ کہ یورپ میں مزدوروں کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا اور بغیر "طبقاتی جنگ" کے انھیں مفت علاج تعلیم، سالانہ تعطیلات، پانچ دن کام کا ہفتہ وغیرہ ـــ (جو مارکس کے زمانہ میں ممکنات نہ تھے) مل گئے۔ آج سرمایہ دار کے مزدور کا معیارِ زندگی اشتراکی نظام والے مزدور کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔

البتہ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے اور وہاں برابر مزدور طبقہ کی لڑائی جاری ہے اور قرائن بتا رہے ہیں کہ اشتراکی ممالک میں بھی مزدور خوش نہیں ہیں۔ اور کہیں کھلے طور پر اور کہیں خفیہ طور پر حکومتِ وقت سے برسرِ پیکار ہیں۔

تجربہ نے یہ بھی بتایا کہ سوشلسٹ نظام میں بھی طبقات قائم رہتے ہیں، گو ان کے نام بدل جاتے ہیں اور مالک کی جگہ "پارٹی" لے لیتی ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ سوشلسٹ نظام میں بھی ہاتھ کے کام کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ ساتھ کے ساتھ مزدوروں کو حقوق کے لیے لڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ مارکس کا یہ خیال کہ سوشلزم میں مزدور سر اونچا کر کے چلے گا، غلط ثابت ہوا۔ آج تو سرمایہ پرست مغرب میں مزدور سر اونچا کر کے چلنے کا عادی ہے۔

اس مضمون کے دو مقاصد تھے۔ مارکسزم سے کچھ واقفیت پیدا کرانا اور جو بیکار کی چپقلش مذہب اور مارکسزم کے درمیان پیدا کر دی یا کرا دی گئی ہے۔ اس میں کمی۔ اہل مذہب کی مخالفت توقف اور لاعلمی پر ہے اور انھوں نے میدان کمیونسٹ جہلاء کے لیے چھوڑ دیا ہے

"دشمن" اسی وقت زیادہ خوفناک معلوم ہوتا ہے جب تک اسے قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ مارکسزم بہرحال انسانی دماغ کا نتیجہ ہے اور حالات نے اس کی کمزوریاں اظہر من الشمس کردی ہیں۔ اس کی اچھی باتوں سے اتفاق کرنا چاہیے اور غلطیوں کی مخالفت۔ میدان کسی حالات میں بھی کمیونسٹ ملاؤں کو نہیں سونپنا چاہیے۔ کسی زمانے میں مسلمانوں نے یونان کے فلسفہ سے استفادہ کیا تھا۔ وہی فائدہ مارکس سے کیوں نہ حاصل کیا جائے؟

••

# دو عظیم ہستیوں کی یادیں

تقسیم ہند کے بعد شملہ مشرقی پنجاب کی صوبائی راجدھانی بن گیا اور وہاں اب ایسے لوگوں کا رہنا سخت ناخوشگوار ہو گیا تھا جو بربریت کو بربریت ہی کہیں خواہ وہ اپنوں کی ہو یا پرایوں کی۔ ایک غیر مسلم دوست نے جو میرے حالات سے باخبر تھے مشورہ دیا کہ تبادلہ کرا لوں اور اس کے لیے دہلی جا کر قدوائی صاحب (رفیع احمد قدوائی اس زمانہ کے مرکزی وزیر مراسلات) سے ملوں۔ میں ایک تو ہمیشہ کا گھر گھُسنا اور بڑے لوگوں سے ملنے کے آداب سے قطعاً ناواقف۔ اُدھر سے یہ ڈر کہ کہیں اس سودے میں بقول شخصے "عزت سادات" بھی ہاتھ سے نہ چلی جائے۔

کوئی ایک سال کے پس و پیش کے بعد ایک دن دہلی پہنچ ہی گیا۔ اتنی تو ہمت نہیں تھی کہ ایکا ایکی قدوائی صاحب کی کوٹھی میں داخل ہو جاؤں، اس لیے قریب کے ٹریفک کے گول چبوترے پر جا کر بیٹھ گیا، تھوڑا دم لینے اور جرأت پیدا کرنے کے لیے۔ کچھ دیر بعد چار پانچ آدمیوں کا گروپ آیا اور بغیر کسی توقف و تردد کے کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کوٹھی کا کمپاؤنڈ بہت بڑا تھا اور اسے طے کرنے میں کافی وقت لگا۔ جوں ہی ہال میں داخل ہوا جہاں ملاقاتی بٹھائے جا رہے تھے، میری تمام ذہنی پریشانیاں کافور ہو گئیں۔ ملاقاتیوں میں مجھ سے کم درجے کے لوگ بھی تھے۔ پہاڑی علاقے کے ہرکارے مع اپنے بلم (گھنگھرو دار) ایک باوردی ڈاکیے وغیرہ وغیرہ۔ یقین آ گیا کہ نکالے نہیں جائیں گے۔ جب پیشی ہوئی تو میں نے عرض مدعا کیا

"تبادلہ چاہتے ہیں کہ کچھ اور بھی؟"

"صرف تبادلہ"

"کہاں کا"

"ہو سکے تو دہلی کا"

"اپنا بایوڈیٹا (Biodata) میرے پرائیوٹ سکریٹری کو دے جائیے۔ اس میں یہ بھی بڑھا دیجیے کہ کن دفتروں میں آپ کی کھپت ہو سکتی ہے؟"

گفتگو کے دوران قدوائی صاحب نے صرف ایک مرتبہ نظر اٹھاکر مجھے دیکھا۔ اس لیے میں کچھ اندازہ نہ لگا سکا کہ ان کا رویہ ہمدردانہ ہے کہ نہیں اور آیا کام ہو جائے گا یا نہیں۔ پہلے سے مجھ کو کوئی واقفیت تھی نہیں۔ صرف یہ سُنا تھا کہ نہایت لائق ایڈمنسٹریٹر ہیں۔

عرضداشت کی کارروائی کے بعد یکایک بھوک کی شدت کا احساس ہوا اور میں نہایت تیزی سے کناٹ پلیس کے ارادہ سے باہر نکلا۔ صدر دروازہ پر پہنچا ہی چاہتا تھا کہ چپراسی دوڑتا ہوا آیا اور راستہ روک کر کہنے لگا: "صاحب کہہ رہے ہیں کہ کھانا کھاکر جایئے"۔ میں قتل و غارت اور بہیمیت کا عادی ہو چکا تھا یقین نہ آیا۔

"کسی اور کو بلایا ہوگا۔ وہ مجھ سے واقف تک نہیں ہیں"۔

"ارے صاحب آپ ہی کو بلایا ہے۔ آپ شملہ سے آئے ہیں نا؟"

"اس ملک سے انسانیت ابھی ختم نہیں ہوئی ہے"۔ بے اختیار میرے منھ سے نکلا اور میں بڑی طرح رونے لگا۔ وہ آنسو میرے نہ تھے، اس بدنصیب "ہاتو" (قلی) کے تھے جسے میں نے ذبح ہوتے دیکھا تھا، اس سفید ریش گرینڈ ہوٹل میں کام کرنے والے کے تھے جو شملہ میں پیدا ہوا تھا اور جس نے شملہ سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا اور اس لیے یہ بتانے سے قاصر تھا کہ لاہور جانا چاہے گا یا کراچی۔ سونی پت کے اس ضعیف باپ کے تھے جس کی لڑکی کو اغوا کر لیا گیا تھا اور وہ اس کی بازیابی کے لیے کوشاں تھا، اسپیشل ٹرین کے چلے جانے سے پہلے۔

کھانے میں سالن، دال، چاول اور روٹی تھی۔ میرے اٹھنے سے پہلے قدوائی صاحب نے مجھے اشارہ کیا اور اپنے سکریٹری کو بلاکر کہا: "قاضی صاحب کو وہ والا لفافہ دیدو" اور جب وہ لفافہ آگیا تو مجھے ہدایت دی کہ شملہ جاکر اسے پوسٹ کردوں، "اگر تاریخ اور وقت پوسٹنگ بالکل صحیح درج کیجیے گا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شملہ سے دلی خط کتنے وقت میں پہنچتا ہے"۔ اس وقت تو میں نے دیکھا نہیں جب شملہ پہنچ کر لفافہ پر نظر ڈالی تو کسی غیر معروف انسان کا نام اور پرانی دلی کی کسی گلی کا پتہ نکلا۔ قدوائی صاحب کو کسی نے جو ہارون الرشید کا لقب دیا تھا، وہ یوں ہی نہ تھا۔

قدوائی صاحب کے انتقال کے کئی سال بعد ایک سرکاری کام سے بنگلور جانا ہوا۔ وہاں ریاست کے چیف انجینئر کے گھر پر ایک صحبت میں کسی نے قدوائی صاحب کا ذکر چھیڑ دیا۔ میزبان نے اپنے ایک عزیز کا ذکر کیا جو کسی زمانہ میں کانگریس کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام کر چکا تھا اور آزادی سے بہت پہلے معطل ہو گیا تھا۔ آزادی کے بعد قدوائی صاحب کا بنگلور آنا ہوا۔ انھوں نے اس شخص کا نام لیا اور کہا کہ

وہ اس سے ملنا چاہیں گے۔ چیف منسٹر نے اس کا سراغ لگوایا۔ قدوائی صاحب اس کے گھر گئے اور اس کی حالتِ زار دیکھ کر کہا: "تم نے یہ کبھی نہیں لکھا کہ اس حالت میں ہو۔" ان کے دہلی جانے کے بعد ہر ماہ اس شخص کو پانچسو روپے کا منی آرڈر آنے لگا۔ ہمارے میزبان کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ قدوائی صاحب نے ایسے شخص کی مدد کی جو ان کے کسی کام نہیں آ سکتا تھا جب کہ سیاسی لوگ صرف اس کا خیال کرتے ہیں جو الیکشن میں ان کے کام آ سکے۔

قدوائی صاحب کی سوجھ بوجھ اور انتظامی صلاحیتوں کے واقعات ہزاروں ہیں۔ میں صرف ان کا ذکر کروں گا جو میرے علم میں ہیں۔ انھوں نے (All-up Air Mail scheme) نکالی، تاکہ ہندوستان کے پانچ بڑے شہروں کے درمیان ڈاک اگلے دن پہنچ جایا کرے۔ ٹاٹا ایرویز نے سخت مخالفت کی اور اسکیم کو ناقابلِ عمل قرار دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس کی رائے میں ہوائی کمپنیوں کو جو ڈاک لے جانے کا معاوضہ دیا جا رہا تھا وہ کم تھا۔ معاملہ کابینہ کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ مگر معاملہ بغیر میٹنگ کے ہی طے پا گیا۔ ایک ڈیڑھ صفحے کا نوٹ وزارت مراسلات کی طرف سے آیا، جس میں ٹاٹا ایرویز کا کچا چٹھا تھا اور سفارش کی گئی تھی کہ جتنی رعایت حکومت کی طرف سے اسے ملتی ہے اس سے کم پر حکومت خود اپنی ایک کمپنی چلا سکتی ہے۔ وزارت سے ٹاٹا والوں نے معافی مانگی اور اس کا باقاعدہ اخبارات میں اعلان کیا۔

بحیثیت وزیر غذا قدوائی صاحب کنٹرول کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کنٹرول خود قلت کا باعث بن جائے گا۔ کابینہ کو ان کی رائے سے اتفاق نہ تھا۔ بلا ٹالنے کے لیے معاملہ کمیشن کے سپرد کر دیا گیا۔ مگر کسی کی ہمت نہ تھی کہ قدوائی صاحب سے ٹکر لے۔ دہلی کے ایک پروفیسر کو جو بیباکی اور زبان درازی میں ثانی نہ رکھتے تھے۔ پس پردہ تیار کیا گیا۔ جب میٹنگ ہوئی تو پروفیسر صاحب نے دھواں دھار تقریر کی اور کنٹرول ہٹا لینے کے خطرات سے آگاہ کیا۔ قدوائی صاحب نے صرف دو باتیں کہیں "پلاننگ کمیشن صرف دس آدمی ایسے دیدے جو کنٹرول کو ایمانداری سے چلا سکیں۔ رہا غریب آدمی کے مفاد کا سوال، اس کا انتظام کر لیا گیا ہے، اسے بھوکے مرنے نہ دیا جائے گا۔" اسی شام کو خبر آئی کہ مدراس کے چیف منسٹر نے شہر مدراس سے کنٹرول ہٹا لیا ہے۔ قدوائی صاحب نے پس پردہ تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے، لہٰذا حالات قابو میں ہے۔

قدوائی صاحب کی کامیابی کے وجوہات مختلف لوگوں نے مختلف بیان کیے ہیں۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ وہ عوام کے بہت قریب تھے۔ اس لیے انھیں حقیقت کا پتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ گورنمنٹ کی مشین کے قیدی نہ تھے، بلکہ ان پر حاوی تھے۔ فائلوں سے انھیں چڑ تھی اور وہ زبانی حکم صادر کرتے تھے، اور

روزمرہ کے کام کی رپورٹ سینیئر افسران سے زبانی ہی سُنتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ انھیں غلط رپورٹ دے۔

● دہلی آجانے کے بعد مجھے اجمل خاں صاحب کی ہمسائیگی کا فخر حاصل ہوا۔ وہ مولانا آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری تھے اور برسوں سے ان کے معاون۔ مولانا کے وہ بہت قریب تھے اور ان کی بے لوث خدمت کرتے تھے۔ مولانا کے یہاں سے ان کے اور ان کے بچوں کے لیے اکثر تحفے تحایف آیا کرتے۔ مگر ایک بات میرے لیے بڑے اچنبے کی تھی۔ وہ دفتر پیدل ہی آتے جاتے۔ حالانکہ وہ دیر سے کام سے واپس آتے اور کبھی کبھار تو رات کے بارہ بجے۔ یہ صحیح ہے کہ آزادی کے اس ابتدائی دَور میں سرکاری گاڑی کا استعمال اتنا عام نہ تھا جتنا کہ اب ہے، مگر وزرا کے پرسنل اسٹاف کو اجازت تھی اسٹاف کار سے آنے جانے کی۔

ایک دن اجمل خاں صاحب نے بتایا کہ مولانا نے مجھے یاد فرمایا ہے۔ مجھے خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔ مولانا طبعاً تنہائی پسند تھے اور اپنی مقبولیت کی کوئی تمنا نہ تھی جو عام طور سے تمام سیاسی لیڈروں کی ہوتی ہے۔ کانگریس میں بھی ان کے تعلقات صرف مہاتما گاندھی، جواہرلال نہرو، سی۔ آر داس، آصف علی اور بھولا بھائی ڈیسائی تھے۔ چند علمی لوگوں سے (مثلاً حبیب الرحمٰن خاں شروانی) سے بھی ان کے قریبی مراسم تھے۔ میں نے اجمل خاں صاحب سے بار بار کرید کر پوچھا کہ کس سلسلے میں میری طلبی ہوئی ہے۔ مگر انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور صرف اتنا کہا کہ ایک بار کسی موقع پر میرا تذکرہ ہوا تھا۔

میرے بڑے بھائی اور میرے دو بھائی مولانا کے بہت قائل تھے اور اُن سے میں نے مولانا کے علم و فضل اور خودداری کے واقعات سُنے تھے۔ انھیں کے طفیل میں نے الہلال کی پرانی کاپیاں دیکھی تھیں اور مولانا کی مشہور تصنیف 'ترجمان القرآن'۔ اس لیے مجھے بھی مولانا سے بڑی عقیدت تھی اور میں ان کے سیاسی موقف کو سولہ آنے صحیح سمجھتا تھا۔ میرے نزدیک یہ مسلمانوں کی بڑی کا بدقسمتی تھی کہ جذبات میں آکر انھوں نے غلط لوگوں کی قیادت قبول کر لی۔

مقررہ تاریخ اور وقت پر میں مولانا کے دولت خانہ پر حاضر ہوگیا۔ اجمل خاں صاحب نے مشایعت کی۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ مولانا تشریف لے آئے۔ بیٹھتے ہی وہ خاں صاحب سے مخاطب ہوئے اور کہا: خاں صاحب آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ششدر رہ گیا۔ خاں صاحب سے اتنے دیرینہ تعلقات۔ پھر یہ کہ ان ہی کے ذریعہ تو میرے وجود کا علم ہوا۔ پھر یہ کہ پرائیویٹ سکریٹری سے تو کوئی بات راز نہیں رکھی جاتی۔ میں حکومت میں کام کرتا تھا اور مجھے خوب معلوم تھا کہ وزیر کا پرسنل اسٹاف

بہت منھ چڑھا ہوتا ہے۔

خان صاحب کو رخصت کرکے مولانا میری طرف متوجہ ہوئے۔

"آپ، کابینہ کے دفتر میں کام کرتے ہیں؟"

"جی ہاں"

"ذرا یہ بتائیے کہ آپ کے دفتروں کے کاغذات کس طرح ٹائپ اور اسٹینسل (stencils) ہوتے ہیں اور فائل کیسے گھومتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہماری راز کی باتیں اخبارات میں آجاتی ہیں"

میں نے مولانا کے تمام سوالات کے مناسب جوابات دیئے۔ دوران گفتگو میں چائے آئی۔ ملازم نہایت تربیت یافتہ تھا۔ اس کے آنے کی کوئی آہٹ نہیں ہوئی اور اس کی موجودگی کا علم مجھے اس وقت ہوا جب اس نے چائے کی ٹرے، مولانا کے سامنے رکھی۔ چائے پہلے سے تیار نہ تھی۔ مولانا نے چائے کی پتی کیتلی میں ڈالی اور خود دو پیالی چائے انڈیلی۔ ملازم ٹرے رکھ کر چلا گیا تھا اور فرائض میزبانی خود مولانا نے انجام دیے۔

جب گفتگو ختم ہوگئی، تو مولانا اٹھنے لگے۔ مجھے یکایک یہ احساس ہوا کہ یہ موقع دوبارہ نہ ملے گا۔ اس سے کچھ فائدہ اٹھالو۔

"مجھے یہ شرف دوبارہ، تو حاصل نہ ہو۔ میرے ذہن میں کچھ سوالات ہیں اجازت ہو تو ... "

کوئی چوتھائی سکنڈ کے لیے مولانا کچھ ٹھٹکے۔ پھر نہایت شفقت سے بولے "پوچھیے"۔

"جب بھی کسی انقلاب کے بعد ایک نئی حکومت آتی ہے تو نوکر شاہی کو برخاست کر دیتی ہے اور اپنے مطلب کی سول سروس ٹرین کر لیتی ہے۔ انگریزوں کا چھوڑا ہوا نظام اسی طرح قائم ہے۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ مولانا تجاہل عارفانہ سے کام لیں گے اور چلتا ہوا سا جواب دیں گے۔ مگر جو جواب انھوں نے دیا وہ میری توقعات سے اس قدر بلند اور صادق تھا کہ دل ہی دل میں میں نے کہا "حرّی آواز ہے اور معنے جواب تھا":

بھائی میرے چاہے یہ سمجھو کہ ہم بڈھے ہو گئے، چاہے یہ سمجھو کہ ہمیں اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا۔ اس وقت کانگریس ہائی کمانڈ یہ محسوس کرتی ہے کہ اگر ایک اینٹ ہٹائی تو پوری عمارت نیچے آن گرے گی۔

دوسرا سوال یہ تھا: "آپ کی رائے میں تقسیم محض مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے صحیح ہوئی یا غلط":

"بھائی میرے، ۲۰ جون ۱۹۴۷ء کو مسلمانوں کی جو ساکھ اس برصغیر میں تھی وہ ختم ہوگئی اور تجربے نے یہ بتایا کہ ساکھ ہی ساکھ تھی اور کچھ نہ تھا۔ میں نے چاہا کہ وہاں تو ایک نقشہ بن ہی گیا، یہاں کا بھی بنا ہے۔

مسٹر جناح اور لیاقت علی خاں کو پیغامات بھجوائے، سب مسلم ملازمین کو مت لے جاؤ۔ مگر مجھ سے کہا گیا کہ کس منھ سے روکیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کم از کم فوج اور پولیس تقسیم نہ ہو مگر کامیابی نہ ہوئی۔

پاکستان بن گیا اور اس کی مخالفت کرنا بے سود ہے۔ اگر پاکستان کے لوگوں میں عقل ہے، تو انھیں چاہیے کہ ایک مضبوط معاشی بنیاد ڈالیں، اسی میں بقا ہے۔

مولانا کا ہر لفظ میرے دل و دماغ پر کندہ ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، تاریخ پکار پکار کر کہتی ہے کہ جو کچھ انھوں نے کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ آئندہ نسلوں کے سامنے یہ سوال بار بار اٹھے گا کہ تقسیم کے بُرے نتائج کا ازالہ کیا ہو؟ جس "منطق" پر تقسیم ہوئی اس کو خود مسٹر جناح نے ۱۴ اگست ۴۷ء والی تقریر میں جو انھوں نے بحیثیت گورنر جنرل پاکستان کی ان الفاظ میں رد کر دیا: "آج سے نہ مسلمان مسلمان ہے نہ ہندو ہندو ... ہم سب پاکستانی ہیں۔" بدیگر الفاظ انھوں نے مولانا آزاد کے موقف کی تصدیق کر دی کہ آزادی کے بعد سیاست اور سیاسی پارٹیاں مذہب پر مبنی نہیں، بلکہ اقتصادیات پر مبنی ہوں گی۔"

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اپنے آخری ایام میں مولانا کو اپنے سیاسی رفقاء کار سے شدید اختلاف ہو چلے تھے۔ اور اکثر اہم معاملات میں ان کا نفی کا ووٹ ہوتا تھا۔ انتقال بھی ناخوش گواری کی حالت میں ہوا۔ مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ ایسے ایک وزیر کو رخصت دیا جائے جس کی دیانت کے متعلق عام پبلک میں شبہات ہو چلے ہوں؟ مولانا اکیلے ایک طرف تھے اور ان کے تمام ساتھی دوسری طرف۔ رات کے بارہ ایک بجے تک بحث چلتی رہی اور بالآخر بادل ناخواستہ اکثریت نے ان کی رائے مان لی۔ میٹنگ سے واپسی پر مولانا کو دورہ پڑا اور مختصر علالت کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ دوران علالت ایک بار انھیں ہوش آیا اور جب انھوں نے وہ تمام آلات دیکھے جو اُن کی بازیابی صحت کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے تو صرف اتنا کہا: "اللہ پر چھوڑ دو۔"

ختم کرنے سے پہلے مولانا کے تدبر کا ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ مولانا پنجاب کی سیاست دیکھا کرتے تھے۔ ان کے رفقاء کو یہ شکایت ہوئی کہ مولانا ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ایجی ٹیشن سے نرمی کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ جب یہ خبر مولانا کو ملی تو انھوں نے وزیر اعظم سے درخواست کی کہ اب پنجاب کے معاملات کوئی اور دیکھے — ایک ہی ہفتہ میں یہ حالت ہو گئی کہ یا تو حکومت ہتھیار ڈال دے، یا پھر مارشل لا نافذ کرے۔ نہرو پنجاب کا فائل مولانا کو واپس کرنے آئے۔ فائل کو دیکھ کر مولانا نے مسکرا کر کہا یہ فائل تو جانا پہچانا ہے۔ نہرو خاموش رہے۔ چلتے وقت پوچھا: مولانا آپ کیا کیجیے گا۔ مولانا کا جواب یہ تھا: "بھائی میرے! اس فائل پر باسی پانی کا ایک چھینٹا ماروں گا اور اس میں جان آ جائے گی۔"

اگلی صبح تمام اخبارات نے جلی الفاظ میں یہ خبر شائع کی کہ ماسٹر تارا سنگھ نے ایجی ٹیشن واپس لے لیا۔ مولانا نے اپنے یہاں رات کی خاموشی میں بلوایا، انھیں قائل معقول کر دیا۔ فائل میں پھر سے واقعی میں جان آ گئی۔

# جاپان کے کچھ تأثرات

بچپن میں پڑھا تھا: دریا کی طرح جو چلتا ہے، چلتا ہی وہ رہتا ہے؛ کوہساروں کو، میدانوں کو خاطر میں کب لاتا ہے۔ مگر اس کے معنی برسوں بعد سمجھ میں آئے جب جاپان کی جیتی جاگتی مثال سامنے آئی۔

درس و تدریس کا سلسلہ ٹوکیو پہنچتے ہی شروع ہو گیا۔ دیکھا کہ ہوٹل کے سامنے والی سڑک بجلی کی روشنی سے جگمگ ہے اور آدمیوں اور مشینوں کی مدد سے قدِ آدم کھودی جا رہی ہے۔ صبح جب چہل قدمی کے لیے نکلا تو سڑک تیار ہو چکی تھی اور اس پر سے ٹریفک گزر رہی تھی۔ ملبہ تو کیا گرد تک کا نشان نہ تھا۔ خدایا! کیا ان لوگوں کے پاس علاؤالدین کا چراغ ہے؟

ایک بار کھانا کھانے ایسے وقت پہنچا جب بڑے ڈائننگ ہال کے اوقات ختم ہو چکے تھے۔ ہال میں کوئی نہ تھا صرف خزانچی (cashier) کاؤنٹر پر بیٹھی روپیہ گن رہی تھی۔ میں تذبذب میں تھا کہ کیا کروں اتنے میں خاتون کی نظر مجھ پر پڑی، مجھے اشارہ کیا اور پینٹری میں گئیں اور وہاں سے ویٹروں کا سفید براق ایپرن (Apron) لگائے آرڈر لینے آگئیں۔ آناً فاناً میز سجا دی اور کھانا لے آئیں اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوئیں۔ کچھ وقفے کے بعد پھر آئیں اور گلاس میں دوبارہ پانی بھرا اور پوچھ کر کہ کچھ اور تو نہیں چاہیے اپنی جگہ جا کر اپنے کام میں مشغول ہو گئیں۔ جوں ہی میں نے کھانا ختم کیا، بل لے آئیں۔ شاید مجھے یہ سبق دینا مقصود تھا کہ جاپان میں کام مقدس فریضہ ہے۔ میں ایسے ملک سے آیا تھا جہاں 'نیچ' کام 'نیچ' ہی لوگ کرتے ہیں۔ اور اگر گرمی کی شدت سے کوئی خاتون بمبئی کے کسٹم ہاؤس میں بے ہوش ہو جائے تو ہر شخص پانی پانی کی صدا لگاتا رہے گا مگر پانی اسی وقت آئے گا جب چپراسی آ جائے۔ مشہور مصنف نائی پال (Naipaul) نے اس واقعہ کو اپنی کتاب میں نہایت غصے سے درج کیا ہے۔

اگر یہ جاننا ہو کہ تاریخی عمارات کی کیسے دیکھ بھال کرنی چاہیے تو جاپان جایئے۔ ایک ہزار سال سے زیادہ عمر کی عمارات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بنی ہیں۔ بدھ مذہب کے ایک قدیم عبادت خانے کے کمپاؤنڈ میں دریا سے نکلے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پتھروں کا ایک 'باغ' ہے۔ پتھروں کو کسی راہب نے ایسا سجایا ہے کہ

جتنے غور سے دیکھیے نئے ڈیزائن بنتے چلے جاتے ہیں۔ گزشتہ نو سو سال میں کروڑوں بچوں اور بڑوں نے اس باغ کو دیکھا ہو گا مگر وہ جوں کا توں اپنی اصلی شکل میں قائم ہے۔ ہر عمارت پر بڑے بڑے الفاظ میں لکھا ہے "ہمارے بزرگوں نے ہمیں یہ عطا کیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کی دیکھ بھال کریں۔" کہاں جاپان اور کہاں ہم۔ لائبریری کی کتابوں کے صفحے غائب کرنے سے نہیں چوکتے۔

قرآن کریم میں حکم ہے کہ باہمی مشورہ سے کام کرو۔ ہمارا عمل اس کے بالکل برخلاف ہے۔ مگر جاپان میں اس قرآنی حکم کی پوری تعمیل ہوتی ہے۔ فیصلے رائے شماری سے نہیں اتفاق رائے سے طے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش ہوتی ہے اور اگر اختلاف بہت شدید ہو جائے تو کسی بزرگ کو بیچ میں ڈالا جاتا ہے۔ وہ مختلف نقطہ ہائے نظر میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور لوگوں کو ایک متفقہ فیصلے پر پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ وہ اپنا فیصلہ دوسروں کے سر نہیں تھوپتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طرزِ حکومت کچھ ہی ہو حکومت کسی بھی پارٹی یا دھڑے کی ہو، جاپان میں فیصلے باہمی مشورہ سے ہوں گے اور یہ کہنا مشکل ہو گا کہ وہاں امریکہ کی جمہوریت

پس پردہ حکمراں پارٹی میں خوب زوروں کی چلتی ہے اور ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے میں کوئی تکلف نہیں برتا جاتا۔ مگر کچھ کرسیاں ایسی ہیں کہ ان کے لیے نہیں لڑا جاتا۔ مثلاً ایک ہی شخص ہے جو کابینہ کی اقتصادی سب کمیٹی کا چیرمین ۱۹۴۵ء سے چلا آ رہا ہے۔ ایک ہی شخص ہے جو ۱۹۴۵ء سے وزیراعظم کا مشیر چلا آ رہا ہے۔ دونوں میں سے کوئی نہ پارلیامنٹ کا ممبر ہے اور نہ سیاست داں۔ اس تسلسل کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں حضرات معلومات کا خزانہ ہیں جو بڑھتا رہتا ہے۔ وہ اپنے عہدے سے اسی وقت ہی ریٹائر ہوں گے جب وہ کہیں کہ اب ہم کام کرنے کے قابل نہیں ہیں ہمیں رخصت کیجیے۔ پھر بھی انھیں مکمل طور پر جانے نہیں دیا جائے گا۔ ہفتہ دس دن میں ایک بار وہ خود اپنے دفتر مشورہ کے لیے آئیں گے یا لوگ ان کے پاس اسی غرض سے جائیں گے۔

جاپان میں تن آسانی حرام ہے اور "براہ راست برو اگرچہ دور است" پر عمل ہوتا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں سخت مالی بحران آیا اور کابینہ میں شدید اختلاف رائے ہو گیا کہ آیا بیرونی قرضہ لیا جائے، جیسا کہ ایک گروپ کا اصرار ہے۔ معاملہ بادشاہ کے سامنے رکھا گیا: "آج کی مشکلات ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ مگر ہمیں چاہیے کہ مستقبل کے نصب العین کی بھی سوچیں اور اس کے حصول کے لیے پوری جد و جہد کریں۔ ... میری مرضی تو یہی ہے کہ آپ سخت مشاقت کے رستے اقتصادی حل تلاش کریں۔"

بادشاہ کے اس فیصلے کے بعد نہ صرف مزید قرض نہیں لیا گیا بلکہ پرانے قرضوں کی بھی ادائگی کر دی گئی۔

جاپان کی اس خود اعتمادی ہی نے اسے بچا لیا۔ عین اس زمانہ میں جب ایشیائی ممالک یکے بعد دیگرے بیرونی طاقتوں کے غلام ہو رہے تھے، جاپان اپنی آزادی قائم رکھ سکا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی وہ اپنے زور بازو کو کام میں لایا۔ بجائے بنی بنائی ردی (Turnkey project) کے جس کو دیگر ایشیائی ممالک ترجیح دے رہے تھے، جاپان نے نہایت سستے داموں سکنڈ گریڈ کی ٹیکنالوجی خریدی اور اس کو بہتر سے بہتر بنایا۔ تھوڑے ہی دن میں اوّل گریڈ کی ٹیکنالوجی کے چشمے اُبلنے لگے اور یورپ اور امریکہ پیچھے رہ گئے۔ آج فولاد، المونیم بھاری کیمیات (Heavy chemicals) کے دنیا کے عظیم ترین کارخانے جاپان میں ہیں، یورپ اور امریکہ میں نہیں اور بجلی کے سامان (Electronics) اور ٹیکنالوجی میں جاپان سب سے آگے ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ چوٹی پر پہنچ جانا آسان ہے مگر وہاں ٹکے رہنا مشکل ہے۔ جاپان کو اس کا شدت سے احساس ہے۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے پاس نہ قدرتی وسائل (معدنیات وغیرہ) ہیں اور نہ امریکہ جیسا اندرونی مارکٹ۔ ہر خام مال باہر سے آتا ہے اور صنعتی پیداوار کا بیشتر حصہ باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں یہ مسئلہ سامنے آیا۔ ۱۹۷۰ء میں دانشور اس نتیجہ پر پہنچے کہ آئندہ کی سب سے بڑی صنعت "اطلاعات کی صنعت" ہوگی، جس کا کام دوسروں کی رہبری کرنا ہوگا۔ ان تمام صنعتوں سے دست بردار ہو جانا چاہیئے جن کا انحصار بیرونی خام مال پر ہے۔ اس مشورہ پر عمل شروع ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ جاپان متعلقہ کارخانے باہر کے ملکوں کو بھیج رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں ہے کہ ہندوستان میں بنی ٹیوٹا Toyota گاڑیاں امریکہ اور یورپ میں چل رہی ہوں گی۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ مروجہ نظریات کے بالکل برعکس جاپان میں جدید صنعت اور صنعتی انقلاب لانے والے سرمایہ دار نہیں، جاگیردارانہ نظام کے جنگجو خاندان (Samorai) تھے۔ جب ایڈمرل پیری (Admiral Perry) نے جاپان کے دروازے کھٹکھٹائے تو ملک میں ہنگامہ بپا ہو گیا۔ سمورائے نے چیلنج قبول کیا اور جدید صنعت قائم کی اور معاشرہ میں وہ سب تبدیلیاں کیں جو صنعتی انقلاب کے لیے لازمی تھیں (کاش کہ آج کے عرب ممالک کے شیوخ اور حکمراں اس سے نصیحت پکڑیں!) فرسودہ نظام جاگیرداری کے ادارے ختم کر دیئے گئے اور ضروری زرعی اور انتظامی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ آج کے سب سے بڑے بڑے جاپانی بین الاقوامی فرم (Firm) مثلاً متسوئی Mitsui، متسوبیشی (Mitsu-bishi) سمورائے خاندانوں کے نام ہیں جنھوں نے انھیں

قائم کیا۔ یہ سب ۱۹ویں صدی میں ہوا۔ ۲۰ویں صدی میں بھی اسی حقیقت پرستی سے کام لیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم میں ہارنے کے بعد سب سے اہم اور فوری مسئلہ غذا کا تھا طے پایا کہ غلہ کی تجارت ۱۰۰ سو فیصد حکومت کے ہاتھ میں ہوگی اور زمین کاشتکار کی ہوگی۔ تھوڑے ہی دن میں ملک نہ صرف خود کفیل ہوگیا بلکہ زائد غلہ رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ کسی نے اعتراض نہ کیا کہ "اشتراکیت" لائی جارہی ہے۔ حب الوطنی اور اجتماعی شعور (ہمارے مارکسسٹ اور غیر مارکسسٹ اصحاب نوٹ فرمالیں) ذہنی تعصبات اور ذاتی منفعت پر غالب آگئے! اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج جاپان ترقی یافتہ ممالک میں سرفہرست ہے۔ ایٹمی جنگ سے متاثر ہونے کے باوجود اس نے جدید ٹیکنالوجی حاصل کی اور اس میں مزید ترقی حاصل کی۔ ایک شکست خوردہ قوم کی طرح اپنے مستقبل کو تباہ نہیں کیا، بلکہ مستقبل کی تعمیر میں تن من دھن کی بازی لگادی۔

آج دنیا کے تمام پچھڑے ممالک کے لیے یورپ اور امریکہ نہیں جاپان مشعل ہدایت ہے۔ ہم ہندستان کے مسلمانوں کو جاپان کے طریقۂ کار کو اپنانا چاہیے تاکہ ہم بیکاری سے نجات پا سکیں۔

●●

# روزگار کا مسئلہ

خدا کا شکر ہے کہ علی گڑھ میں اب تعمیری کام کے لیے فضا پیدا ہو چلی ہے۔ سب سے اہم اور پریشان کن سوال روزگار کا ہے۔ اب تک ہماری توجہ سرکاری ملازمت اور مقابلے کے امتحانات پر رہی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم دیگر مواقع کی بھی سوچیں۔ مقابلہ کے امتحانات میں چند ہی لوگ کامیاب ہوسکتے ہیں اور ملازمتوں میں بھی ہر نوجوان کی کھپت نہیں ہوسکتی۔

اس وقت ہندوستان صنعتی دور سے گزر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ قدرت نے جو عظیم معدنی اور زرعی وسائل اسے عطا کیے ہیں انھیں کام میں لائے اور جلد از جلد خود کفیل ہو جائے۔ گزشتہ ۳۰ برس میں نت نئی صنعتیں قائم ہوئی ہیں اور بازار میں شاید ہی کوئی ایسی چیز ملے جو باہر کی بنی ہوئی ہو۔ صنعت سازی کے لیے حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ کم سرمایہ کے لوگوں کو بھی موقعہ دیا جائے اور ایسے شعبوں کا خاص خیال رکھا جائے جن میں انسانی محنت کی نسبتاً زیادہ کھپت ہو۔ انھیں دو اصولوں کے مدنظر کچھ شعبوں میں بڑے کارخانے کی اجازت نہیں ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ صنعت سازی وبا کی طرح پھیلتی ہے۔ جب بھی کہیں کوئی کارخانہ قائم ہوتا ہے تھوڑے ہی دن میں اس کے معاون کارخانے اور کاروبار وجود میں آجاتے ہیں۔ اگر شکر کی فیکٹری ہے تو اس کے شیرے کو کام میں لانے کے لیے کئی اور کارخانے کھل جائیں گے۔ کوئی اس سے الکوحل بنائے گا، کوئی موٹا کاغذ، کوئی کچھ اور۔ ہر نئے کارخانے کے لیے تربیت یافتہ انسانوں کی ضرورت ہے۔ علاوہ کارخانے کے اندر کام کرنے والوں کے ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو مرمت اور ملحقہ کاموں سے واقف ہوں۔

صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ زراعت کو بھی بہت فروغ ہوا ہے۔ زراعت میں مشین کا استعمال روز افزوں ہے۔ ساتھ کے ساتھ قصبات اور دیہات میں بھی بجلی آجانے کی وجہ سے بہت سی گھریلو صنعتیں قائم ہوگئی ہیں اور ہوتی جارہی ہیں۔ اب دیہات میں انجینئروں، مستریوں وغیرہ کی خاصی مانگ ہوگئی ہے۔ خوشحالی کی وجہ سے دیہات میں ایک ایسا متمول طبقہ وجود میں آگیا ہے جن کا معیار زندگی شہری معیار زندگی کے برابر ہے۔

اسے ڈاکٹروں کی ضرورت ہے اور اچھے گھریلو برتنوں، فرنیچر، ریڈیو وغیرہ کی بھی۔ بدیگر الفاظ جہاں تک اشیا کی مانگ کا سوال ہے، دیہات اب اچھا خاصا مارکٹ ہے۔

جب ہم روزگار کے مسئلہ کو اپنی معاشی ترقی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو ہمیں ان مواقع کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جو اس وقت موجود ہیں۔ ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک تو ہنر اور دوسرے جرأت رندانہ کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی ملازمت کے لیے نکلے گا تو دروازہ بند پائے گا۔ ہاں اگر وہ مخلوق کی خدمت کی خواہش رکھتا ہے تو شہروں کے بجائے قصبات اور دیہات کا رخ کرے، پیسہ اس پر برسے گا اور ساتھ کے ساتھ عوام کی محبت اور ان کا احترام بھی اسے حاصل ہوگا۔ کم و بیش یہی بات انجینیر پر بھی صادق آتی ہے۔

اس وقت ملک میں نوجوانوں کو خود کار بنانے کی سیکڑوں اسکیمیں ہیں جن پر ہر سال کروڑہا روپیہ صرف ہوتا ہے۔ مرکزی حکومت کا بجٹ علیحدہ ہے، صوبائی حکومتوں کا علیحدہ۔ مجھے نہیں معلوم کہ علی گڑھ کے طلبا نے ان سے کہاں تک فائدہ اٹھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ رہبری کی ضرورت ہے۔ علاوہ معلومات فراہم کرنے کے کچھ اور بھی چاہیے وہ کیا ہو؟ اس کا جواب سنجیدہ مطالعہ اور غور و خوض کے بعد دیا جا سکتا ہے۔ سردست یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں نصاب میں ان مضامین کو جگہ دینی ہوگی جن سے نوجوانوں کو خود کار بننے کی ترغیب ہو۔ اور اس کے لیے شعور پیدا ہو۔ انجینیرنگ، سائنس، معاشیات، کامرس، بزنس ایڈمنسٹریشن کے مضامین کے طلبا کے علاوہ ہر طالب علم کے لیے (Business enterprise) کا پرچہ لازمی ہونا چاہیے اور اس کی اہمیت وہی ہونا چاہیے جو مثلاً انگریزی زبان کی ہے۔

انجینیرنگ اور سائنس کے طلبا کے لیے اپنے اپنے میدان میں ایک ہنر سیکھنا لازم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ہمارے انجینیرنگ کالج اور پولی ٹکنیک کو وسیع کر کے انھیں (Industrial Estate) کی شکل دی جائے، جہاں طلبا مختلف چیزیں بنائیں/مرمت کریں۔ کوئی وجہ نہیں کہ یونیورسٹی کے چلائے ہوئے چھوٹے چھوٹے کارخانے یونیورسٹی اور علی گڑھ شہر کے لیے عام ضروریات کی چیزیں نہ بنا سکیں۔ اسی طرح یونیورسٹی مشینوں کی مرمت کے لیے گریجویٹ اور غیر گریجویٹ طلبا کی ٹیمیں تیار کر سکتی ہے اگر ان کا کام عام مستریوں سے بہتر اور سستا ہوگا تو بازار میں ان کی مانگ یقینی ہے۔

طلبا کو چھوٹے چھوٹے بزنس چلانے کی ترغیب نہایت مؤثر اور عملی طریقہ پر دی جا سکتی ہے۔ کیوں نہ کچھ جاندار اور معتبر طلبا کو رستوران، بساتی، پرچونیہ وغیرہ کی دکانیں کھولنے کی دعوت

دی جائے، ۲ ترغیب کے لیے کچھ سالوں کے لیے زمین / دوکان کا کرایہ معاف۔ یونیورسٹی میں جو رسالے ان کے ذریعہ آئے وغیرہ وغیرہ۔ ہر ہوسٹل میں چائے خانہ سابق گریجویٹ طلباء کو کھولنے کی اجازت دے دی جائے۔ شروع میں ان شقوں کو لیا جائے، جن میں کم سرمایہ لگے اور مانگ کافی اور دائمی ہو۔

جن حضرات کو ایک ہی طریقے پر سوچنے اور چلنے کی عادت ہے تو وہ مندرجہ بالا تجاویز کی مخالفت نہیں تو مذاق ضرور اڑائیں گے۔ ایسے لوگوں سے بحث جاحشہ بیکار ہے، ان کو دعوت دی جائے، کہ وہ کوئی بہتر اور زیادہ موثر کام شروع کر دیں۔ مگر جو حضرات مخالفت یا تضحیک محض اپنے نکمے پن کی وجہ سے کریں، انھیں پنشن دے کر باعزت طور پر رخصت کر دیا جائے!

●●

**توکل کا غلط مفہوم:** کچھ لوگ محنت و مشقت اور کام کاج سے بچنے کے لئے اس حدیث کا سہارا لیتے ہیں جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

"اگر تم خدا پر بھروسہ کرو، تو پرندوں کی طرح وہ تمھیں روزی عطا کرے گا، تم پرندوں کو دیکھتے ہو کہ صبح خالی پیٹ گھونسلوں سے نکلتے ہیں، لیکن شام کو آسودہ ہو کر واپس آتے ہیں"

ان لوگوں کی دانست میں حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا پر توکل کیا جائے تو روزی خود بخود مل جاتی ہے، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ یہی حدیث خود ان کے مفروضے کو غلط ثابت کرتی ہے اور حصولِ رزق کے لیے جد وجہد کرنے کی صاف طور پر دعوت دیتی ہے۔ اس لیے کہ یہ حدیث بتاتی ہے کہ پرندوں کا شکم سیر واپس ہونا اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب رزق کی تلاش میں وہ نکل کھڑے ہوتے ہیں اور دن بھر اسی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں گویا پرندوں کی دوا دوش ان کے لیے حصولِ رزق کا سبب ہے۔ (یوسف القرضاوی)

# محمد مجتبیٰ صدیقی

جناب محمد مجتبیٰ صدیقی : (پیدائش تقم)
۱۹۴۷ء میں آئی اے ایس (انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس) کا عہدہ سنبھالا۔ الہ آباد بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں ریٹائر ہو گئے، اس کے بعد تین سال تک ریاست جموں و کشمیر میں فنانشیل کمشنر رہے۔ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۵ء علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے۔ ڈاکٹر عبدالجلیل مرحوم کے روزنامہ "قائد" (لکھنؤ)، انگریزی روزنامہ نیشنل ہیرالڈ اور اسلام اینڈ موڈرن ایج میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ فی الحال علیگڑھ میں مقیم ہیں۔

# بین مذہبی مناکحت

ایک مشترک سول کوڈ کے اجراء کے لئے ملک میں آزادی کے بعد سے اکثر آواز اٹھائی جا رہی ہے ظاہر ہے کہ ایسا کوڈ قوانین شریعت کا پابند نہیں ہوگا۔ اس طرح کا ایک قانون یعنی اسپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ء میں بن چکا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس قانون کے تحت رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتا ہے، تو نکاح کے تمام ارکان و شرائط جو شریعت نے عائد کر رکھے ہیں نظر انداز ہو جاتے ہیں اور مہر، طلاق، وراثت، اولاد وغیرہ کے مسائل پر قوانین شریعت کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ تبنیت، جس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے کے متعلق بھی ایک ایسے قانون کا اجرا زیر غور ہے۔ گو اسپیشل میرج ایکٹ کا نفاذ لازمی طور پر مسلمانوں پر نہیں ہوتا اور نہ غالباً تبنیت کے مجوزہ قانون میں کوئی ایسی قرار داد ہوگی لیکن حق اختیار کے حاصل ہونے سے مسلمانوں کے لئے ان احکام شریعت سے جن پر چودہ سو سال سے عمل ہو رہا ہے، انحراف کا راستہ کھل جائے گا۔

اسپیشل میرج ایکٹ کو مسلمانوں نے ابھی اتنا نہیں اپنایا ہے کہ اس کے پس پشت جو خطرہ ہے وہ کھل کر سامنے آ جائے لیکن کچھ تعجب نہیں کہ مستقبل قریب میں یہ ایک وبا کی صورت اختیار کرلے۔ مسلمانوں کے ایسے خاندان جو خاندان کے باہر تک رشتۂ مناکحت استوار کرنا معیوب سمجھتے تھے (گویہ کوئی قابل تعریف بات نہ تھی) اب اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ عواقب کا لحاظ کئے بغیر ان کے نونہال ایکٹ میں دی ہوئی رخصت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خاندان کے افراد ان کی روک تھام تو در کنار، خود ان کی اس "خوشی" میں شریک ہوتے ہیں اور مذہبی غیرت و حمیت یا خاندانی عصبیت کوئی بھی اُن کا راستہ نہیں روکتی۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ شریعت کی رُو سے مسلمان مرد کا نکاح صرف مسلمان عورت سے اور مسلمان عورت کا نکاح صرف مسلمان مرد سے جائز ہے۔ کتاب اللہ میں مشرک سے نکاح کی ممانعت ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے:

"تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی شرک کرنے والی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام شرک کرنے والے سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے......" (۲:۲۲۱)

اس آیت میں مسلمان مرد اور مسلمان عورت دونوں کے لئے مشرک سے نکاح کی صریحاً ممانعت ہے۔ بلکہ میرے خیال میں یہ اشارہ کہ "یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں" ایک طرح سے وعید بھی ہے۔

اس ممانعت کا ایک نفسیاتی پہلو ہے۔ ازدواجی رشتہ ایک ایسا گہرا قلبی تعلق ہے جو اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جب اس کے ساتھ روحانی تعلق بھی شامل ہو۔ اگر دونوں فریقوں یا اُن میں سے کسی ایک، کو مذہب سے کچھ بھی لگاؤ ہے تو ایسے اہم مسئلہ میں اختلاف ہونا دونوں کی زندگیوں کے لئے اس سے زیادہ مضرت رساں اور [illegible] ہے جتنا کہ پیدائش، نسل، زبان یا دنیاوی حیثیت کا فرق۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ دونوں فریقوں کا اعتقادی نظریہ ایک ہونا چاہیے۔ اگر دو شخص ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں، تو دنیا کے اہم ترین مسائل میں اُن کے خیالات میں ایک حد تک ہم آہنگی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو ان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل دونوں میں آئندہ چل کر دشواریاں پیش آئیں گی۔

مسلمان مرد کو عورت کے مقابلہ میں ایک رخصت بھی دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"آج تمھارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمھارے لئے، اور تمھارا کھانا ان کے لئے اور محصنات (پاکدامن عورتیں) بھی تمھارے لئے حلال ہیں، خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ میں ہوں یا اُن قوموں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی ......" (۵-۶)

یہ سوال علیحدہ ہے کہ کن قوموں کا شمار اہل کتاب میں ہے۔ یہود و نصاریٰ کا ذکر بحیثیت اہل کتاب قرآن کریم میں ہے اور عام طور سے یہی لوگ اہل کتاب مانے جاتے ہیں۔ لیکن کتاب اللہ میں کئی مقامات پر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت کے لئے رسول بھیجے ہیں:

"ہر امت کے لئے ایک رسول ہے ....." (۱۰-۴۷)

"ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا ......" (۱۶-۳۶)

بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ اسی کی مقتضی بھی تھی کہ اس کا پیغام لانے والے صرف جزیرۃ العرب ہی کے لئے مخصوص ہو کر نہ رہ جائیں، بلکہ دنیا کی اور قومیں بھی ان سے فیضیاب ہوں۔ البتہ ان رسولوں کو کتابیں بھی دی گئیں تھیں یا نہیں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ لیکن اغلب ہے کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا دستور جزیرۃ العرب کے لئے تھا، ویسا ہی کرۂ ارض کے اور خطوں کے متعلق بھی رہا ہو اور کتابیں دی گئی ہوں، مگر غالباً وہ ضائع ہو گئیں۔ انجیل مقدس ہی کو لیجئے، حضرت عیسیٰ کے فوراً ہی بعد وہ ضائع ہو گئی اور اس کی جگہ اُن کے حواریوں کی تصنیف کردہ

کتابوں نے بے لی جن کو انجیل کے نام سے موسوم کیا گیا۔

ہندوستان کے ایک بہت بڑے صوفی بزرگ حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کا خیال ہے کہ یہ ملک بھی اس برکت سے محروم نہیں رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے رگ وید کی ایک مشہور دعا "گایتری" کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ تو بہتوں نے 'بانگ درا' میں پڑھا ہوگا۔ مگر علامہ نے اس پر جو شذرہ لکھا ہے اس کے ساتھ اگر نظم پڑھی جائے تو اس کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ شذرہ چونکہ 'بانگ درا' کے عام ایڈیشنوں میں نہیں ملتا اس لئے ہم اس کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرتے ہیں:

"ذیل کے اشعار 'رگ وید' کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو 'گایتری' کہتے ہیں۔ یہ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا ان تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظام عالم کے حیرت ناک مظاہرہ کے مشاہدہ سے اوّل اوّل انسان ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا ..... یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے ..... حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے ... اصل سنسکرت میں لفظ "سوتر" استعمال کیا گیا ہے، جس کے لئے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ "آفتاب" رکھا ہے۔ لیکن اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے مادی آفتاب کسب ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیائے اسلام نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"۔ اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں، لیکن وہ خود نظر نہیں آتا ....."

شذرہ کا اتنا ٹکڑا لکھنے کے بعد طوالت کے خوف کو نظر انداز کر کے نظم بھی ہم یہاں نقل کئے دیتے ہیں:

## آفتاب

اے آفتاب روحِ روانِ جہاں ہے تو ... شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا ... ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے ... ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے ... دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے ... چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو ... یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو

تیرا کمال ہستیٔ ہر جاندار میں　　تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو　　زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا تری، نہ کوئی انتہا تری　　آزاد قید اوّل و آخر ضیا تری

آپ دیکھیں گے کہ نظم کے ہر شعر سے وحدانیت پر ایمان کا اظہار ہوتا ہے، کہیں کوئی شائبہ شرک کا نہیں ہے۔

شذرہ کے آخر میں علامہ تحریر فرماتے ہیں: "پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔" بیشک نظم کے پڑھنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ علامہ کا خیال صحیح ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل ہندو مذہب کے معتقدات سے بہت مختلف ہو گئے ہیں۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جو رخصت مرد کو کتابیہ سے نکاح کرنے کی دی گئی ہے، وہ عورت کے لئے ممنوع کیوں ہے۔ میرے خیال میں اس میں ایک حکمت مضمر ہے۔ عورت کو مرد کے برابر درجہ دینے کی زمانۂ حال میں بڑی کوششیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں اور خالص نظری اعتبار سے برابری کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا گیا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور میدان عمل میں مرد کا تفوق بدستور قائم ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"۔۔۔۔ عورت کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے ۔۔۔۔" (۲ + ۲۲۸)

کوئی بھی ادارہ ہو، اس کو کامیابی سے چلانے کے لئے کسی ایک شخص کی سربراہی ضروری تسلیم کی گئی ہے۔ اگر ہر شخص کو برابری کا درجہ دیدیا جائے، تو جتنے منھ ہوں گے، اتنی باتیں، اور نتیجہ سوائے انتشار کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اسی طرح انسانی معیشت کو کامیابی سے چلانے کے لئے چھوٹی سے چھوٹی اکائی جو قائم کی گئی ہے، وہ خاندان ہے اور اس کا بھی ایک سربراہ ہونا چاہیئے۔ مرد ہی سربراہ ہے۔ ظاہر ہے کہ خاندان میں جس کو تفوق حاصل ہوگا اسی کے مذہب کو بالادستی بھی حاصل ہوگی۔ اس کے عقائد، عادات اور اطوار کا اثر اہلِ خاندان اور خاص کر اس کی اولاد اور زوج پر پڑے گا۔ اس لئے اگر شوہر غیر مسلم ہے اور بیوی مسلمان تو شوہر کے عقائد کا اثر اولاد اور بیوی پر پڑنا ضروری ہے۔ ملکی قانون اب یہ ہے کہ اولاد کا وہی مذہب ہوگا جو شوہر کا ہے۔ اسلامی شریعت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ جس ماحول میں کفر و شرک کا دور دورہ ہو، اس میں ایک مسلمان عورت نکاح کر کے مجبوری کی زندگی

بسر کرے اور اس کی اولاد دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے۔

لیکن اگر کوئی مسلمان ان واضح احکام کے ہوتے ہوئے ان کی خلاف ورزی کرے تو کیا صورت ہوگی؟ شیعہ فقہ میں تو ایسے نکاح باطل مانے جاتے ہیں۔ یعنی سرے سے ان کا انعقاد ہی نہیں ہوتا۔ اور یہی حکم مالکی، شافعی، اور حنبلی فقہ میں ہے۔ بہ الفاظ دیگر مرد اور عورت دونوں زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن حنفی فقہ میں ایسے نکاح باطل نہیں بلکہ فاسد سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی نکاح منعقد ہو جاتا ہے اور اس نکاح فاسد سے اگر اولاد ہوگئی تو اس کا نسب باپ سے ثابت مانا جاتا ہے۔ لیکن صاحبین (امام یوسف و امام محمد) کو اس سے اختلاف ہے اور وہ دوسری فقہوں کی طرح ایسے نکاح کو باطل کہتے ہیں۔ غالباً امام ابو حنیفہؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شریعت کی سخت ممانعت کے باوجود بھی اگر ایسے نکاح واقعتاً وقوع پذیر ہوتے ہیں تو ان کو باطل قرار دینے میں یہی نہیں کہ سماج میں ایک انتشار پیدا ہوگا، بلکہ والدین کے گناہ کی سزا اُن کی بے گناہ اولاد کو بھگتنا پڑے گی۔

لیکن اس رعایت کے باوجود فقہ حنفی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ فاسد نکاح قائم رہے۔ بلکہ قاضی کے لئے تاکید ہے کہ فریقین کو اپنے سامنے طلب کرے اور جس فرد سے نکاح ناجائز ہو اس کو اسلام لانے کی ترغیب دے۔ اگر وہ قبول نہ کرے تو فریقین میں علیحدگی کرا دے۔

یہاں تک تو اس مسئلہ پر مذہبی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی۔ اب اس کے سماجی پہلو کو دیکھئے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ مسلمان اس شخص سے رشتۂ ازدواج قائم کرنے میں احتراز کرتا تھا جس سے نکاح شرعاً ممنوع ہو۔ ایک مثال محمد علی جناح کی لے لیجئے۔ ان کو بھی مذہب کی پاسداری اس درجہ منظور تھی کہ انھوں نے ایک پارسی خاتون سے نکاح کیا تو ان کے اسلام لانے کے بعد۔ گو اس وقت اسپیشل میرج ایکٹ کا نفاذ نہیں ہوا تھا مگر ایک اور قانون موجود تھا جس کے تحت ایسے نکاح ہو سکتے تھے، مگر جناح نے مذہب ترک کرنا منظور نہیں کیا۔ لیکن اب یہ حالت ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں یا تو مذہب سے برگشتہ ہوتے جاتے ہیں یا مذہب پر صرف برائے نام قائم رہ کر اس کے احکام کی کھلے بندوں خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری مذہب سے ناواقفیت ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے متوسط طبقہ پر اکثریت کے مقابلے میں اس کی ذہنی مرعوبیت طاری ہوگئی ہے۔ عوام اس بات میں پڑھے لکھوں سے بہتر ہیں۔ اُن میں نہ دینی غیرت کی کمی ہے اور نہ اُن پر کسی کی مرعوبیت طاری ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اپنے مذہبی شعائر پر کاربند ہونے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا ذہنی ارتداد ہے جس کا ہمارا متوسط طبقہ شکار ہو رہا ہے۔ ناجائز نکاح اسی ارتداد کی طرف دوسرا قدم ہے۔ مسلمان عورت کے لئے

غیر مسلم معاشرے میں اپنے مذہب پر قائم رہ جانا ایک بہت مشکل کام ہے۔ مرد مسلمان ہو تو وہ بھی اپنی مشرک شریک حیات کے عقائد سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ممکن ہے ایسے نکاح اوّل اوّل کامیاب نظر آئیں مگر اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ کچھ عرصہ کے لیے جنسی تسکین حاصل کرنے کا ایک مشغلہ ہاتھ آجاتا ہے اور انسان ایک نئی دنیا میں پہنچ کر سب کچھ بھول جاتا ہے۔ لیکن بعد میں جب یہ جذبہ سرد پڑ جاتا ہے تو عواقب سامنے آنا شروع ہوتے ہیں۔ بیگم صالحہ عابد حسین نے اپنے ایک مضمون میں جو انھوں نے اس موضوع پر اخبار 'قومی آواز' میں کچھ دن ہوئے لکھا تھا اس مسئلہ کا جائزہ صرف سماجی نقطۂ نظر سے لیا ہے۔ انھوں نے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے نکاح عام طور سے کامیاب نہیں ہوتے۔ تعجب کی بات ہے کہ جس بات کی شریعت سختی سے مخالفت کرتی ہے اور جس کا عملی تجربہ سماجی نقطۂ نظر سے بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا، ہم اس کو اپناتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو ہم قرآن کریم کو خدا کا کلام مانتے ہیں لیکن دوسری طرف ہم اس کے احکام سے صرف لاپرواہی نہیں برتتے بلکہ عمداً ان کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں شریعت سے اس انحراف کی سب سے بڑی وجہ ہماری مذہب سے ناواقفیت ہے۔ بچے کا سب سے اوّل درجہ کا مدرسہ ماں کی گود ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ لڑکیاں شریعت کے احکام سے آشنا کی جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دینی تعلیم ضروری ہے کیوں کہ اُردو نہ صرف ہماری مادری زبان ہے بلکہ ہمارا سارا مذہبی لٹریچر اسی میں ہے۔

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ مذہبی تعلیم جس طرح ہم لڑکیوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، ویسے ہی لڑکوں کے لیے بھی ضروری ہے۔ مذہبی لٹریچر کو ہندی میں تبدیل کیا جا رہا ہے، یہ امر ضرور قابلِ ستائش ہے مگر اس میں اتنا وقت لگ جائے گا کہ ہماری نئی نسل مذہب سے بالکل بیگانہ ہو چکے گی۔ عربی خط سے اس قدر تو ہر مسلمان کو آشنا ہونا پڑے گا کہ کتاب اللہ کو اس کی اصلی زبان میں پڑھ سکے۔ عربی زبان کو بھی جہاں تک ہمارے محدود ذرائع اجازت دیں سیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جسٹس محمود عربی کے فاضل تھے، وہ قرآنی لٹریچر سے براہ راست استفادہ کر سکتے تھے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کے فیصلے آج تک نظیر مانے جاتے ہیں۔ ایک جج کی اُن کے متعلق رائے تھی کہ "اگر کسی خاص مذہبی حکم کی انھوں نے کسی خاص طریقہ سے تشریح کی ہے، تو ہمارے لیے اُس کو مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔" ان کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ ہندو شاستروں کے مقدمات فیصل کرنے کے لیے انھوں نے سنسکرت پر عبور حاصل کیا اور اس کے بعد شاستروں کی مروجہ تفاسیر کے اغلاط پر اُن کے ماخذ کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طلبا کو دینیات کی اعلیٰ تعلیم پی ایچ ڈی کی ڈگری

تک دی جاتی ہے' یعنی اس کے بعد ان کا شمار دین کے فضلا میں کیا جانا چاہیئے'، مگر تعجب ہے کہ اُن اونچے درجوں کے طلبا کے لئے عربی جماعات الٰہیات میں ہے۔ یہی نہیں بلکہ اساتذہ کے لئے بھی عربی جاننے کی قید نہیں ہے۔ دین کی ادھوری تعلیم سے دینی ذوق تو خیر کیا پیدا ہوگا، البتہ اس سے یہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کہ کہیں دین کے خلاف طلبا میں استہزا کے جذبات نہ پیدا ہو جائیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ہمارے علما اور دوسرے دیندار حضرات کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کی طرف خاص طور سے توجہ کرنا چاہیئے۔ سختی سے نہیں نرمی سے سمجھا کر۔ چور کو چور کہیئے تو گو آپ ایک حقیقت بیان کرتے ہیں مگر چور اپنی اس تعریف سے کبھی خوش نہ ہوگا اور نہ چوری سے توبہ کرے گا۔

معاشرے کی بہت سی برائیاں محض اس لئے فروغ پاتی ہیں کہ اُن سے کوئی منع کرنے والا نہیں ہوتا، اگر کوئی منع بھی کرتا ہے تو وہ دوزخ کے عذاب کی دھمکی دے کر۔ دوزخ کا عذاب حق ہے۔ مگر ایسے ناصح کو "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" کا ارشاد ربانی نہیں بھولنا چاہیئے۔

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ایسے ملکی قوانین کے خلاف جن کی زد براہ راست یا ضمنی طور پر قوانین شریعت پر پڑتی ہو، ہم کو مسلم معاشرے کو باخبر کرنا چاہیئے۔ اسپیشل میرج ایکٹ ہی کو لیجئے، ہمارے لئے کوئی امر اس آواز کے اٹھانے سے مانع نہیں ہے کہ ہم اس کی بخشی ہوئی آزادی سے محروم کر دیئے جائیں۔ اس کے لئے اگر دستور میں ترمیم کی ضرورت ہو تو وہ بھی کرائی جائے۔

●●

# ایک سچی کہانی

بات کچھ سو برس سے اوپر کی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کا جوشِ انتقام ٹھنڈا پڑا تو ان میں سے چند کو جن کا ضمیر بالکل مردہ نہیں ہو گیا تھا، یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ ان مظالم کی جو بے گناہ مسلمانوں پر توڑے گئے تھے، کسی طرح تلافی کی جائے۔ ایک صاحب نے مسلمانوں کی پس ماندگی دور کرنے کے خیال سے ایک مدرسہ قائم کرنا چاہا اور مدرسہ کے لیے اچھے اساتذہ کی تلاش میں وہ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی میں پہنچے۔ وہاں ایک مولوی صاحب کی لیاقت کی تعریف سن کر اُن کے مدرسہ میں گئے۔ مولوی صاحب اس وقت طلبا کو درس دے رہے تھے۔ ان سے اجازت لے کر یہ بھی وہاں بیٹھ گئے، کچھ دیر تک درس میں شرکت کے بعد (اس وقت اکثر انگریز اُردو اور فارسی زبان سے واقف ہوا کرتے تھے) انھوں نے اندازہ کیا کہ مولوی صاحب ان کے مدرسہ کے لیے بہت موزوں ہوں گے۔ چنانچہ درس ختم ہونے کے بعد انھوں نے سلسلۂ کلام یوں شروع کیا۔

انگریز: مولوی صاحب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو کیا مشاہرہ ملتا ہے۔

مولوی صاحب: جی مجھ کو دس روپیہ ماہوار ملتے ہیں۔

انگریز: میں قریب کے ایک شہر میں ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ وہاں چل کر تعلیم دینا پسند کریں گے۔ میں ۲۰ روپیہ ماہوار آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

مولوی صاحب: (کچھ پس و پیش کے بعد) آنجناب کا شکریہ۔ مگر یہاں مدرسہ میں 'بیر' کا ایک اچھا درخت ہے جس کے پھل بہ مجھے کھانے کو ملتے ہیں، دوسری جگہ وہ کہاں دستیاب ہوں گے۔

انگریز: میں اس کا بندوبست کر دوں گا کہ پھل آپ کے پاس پہنچ جایا کریں۔

مولوی صاحب: ان بچوں کا جو یہاں زیرِ تعلیم ہیں، کیا حشر ہو گا؟

انگریز: میں ان بچوں کو بھی لے چلوں گا اور ان کے تمام اخراجات کا کفیل ہوں گا۔

مولوی صاحب: مگر بچوں کے ماں باپ ان کو غیر جگہ بھیجنے پر کس طرح رضامند ہوں گے۔

انگریز: اگر آپ اس معاوضہ کو جو میں نے پیش کیا ہے، ناکافی سمجھتے ہوں تو میں

۵۰ روپے تک نذر کر سکتا ہوں، مجھے افسوس ہے کہ اس سے زیادہ معاوضہ دینے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔

**مولوی صاحب:** (آنکھوں میں آنسو بھر کر) یہ آپ کا کرم ہے۔ مگر جب آخرت میں اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال کریں گے کہ ہم نے تمہارے لیے دس روپے ماہوار کا انتظام کر دیا تھا جو تمہاری ضرورت کے لیے کافی تھا، لیکن تم نے ہم پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ لالچ میں پڑ کر دوسری جگہ چلے گئے اور اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی برتی، تو بتایئے کہ میں اس کا کیا جواب دوں گا۔" اس کا جواب انگریز کے پاس نہیں تھا۔

اساتذہ میں فرض شناسی اور توکّل کا یہ نمونہ پہلے وقتوں میں شاذ نہیں، بلکہ اکثر ملتا تھا۔ مگر اب شاذ ہی نظر آتا ہے۔ اس وقت توکّل کی جگہ شاد خوری نے لے لی ہے۔ ضروریاتِ زندگی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ دولت مند طبقہ کے افراد کی بات تو الگ ہی، اب متوسط طبقہ والوں کے پاس بھی ریڈیو ہونا چاہیے، ٹیلی ویژن ہونا چاہیے، ریفریجریٹر ہونا چاہیے، اور اس طرح کی اور کتنی چیزیں ہونا چاہئیں، جو آج ضروریاتِ زندگی میں شمار ہوتی ہیں مگر کل تک ان کے بغیر آرام سے زندگی بسر کی جاتی تھی۔ اس شاد خوری کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے اور ہر شخص کے پاس اس کی فراوانی نہیں۔ مجبوراً آمدنی بڑھانے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ پھر قیمتیں چونکہ آسمان تک پہنچ کر اور اوپر جانے کی کوشش کر رہی ہیں اس لیے اس تمام سامانِ تعیش کی فراہمی کے لیے اگر آج ہم کو ہزار روپے کی ضرورت ہے تو کل ڈیڑھ ہزار میں بھی کام نہیں چلے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بددیانتی کو اور بھی فروغ ہوگا۔

ایسے ماحول میں توکّل کا گزر کہاں ہو سکتا ہے۔

یہ اسی شاد خوری کا عطیہ ہے کہ ہندوستان میں سیکڑوں بےگناہ لڑکیاں کافی جہیز نہ لانے کی پاداش میں اگنی دیوتا پر بھینٹ چڑھادی جاتی ہیں۔ ماں باپ لڑکی کا "دان" تو کر دیتے ہیں مگر منھ مانگے جہیز کا دان ان کے بس کا نہیں ہوتا۔ جہیز پر روک لگانے کے لیے سخت سے سخت قانون بنائے جارہے ہیں، مگر سماجی برائی کے آگے قانون بے بس ہوتا ہے۔ قانون ایک طرف بنتا ہے تو دوسری طرف اس سے بچنے کے لیے سامان تیار کر لیے جاتے ہیں۔ ضرورت سماج میں تبدیلی لانے اور اپنی رہائش کے معیار کو کم کرنے کی ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف جَو کی روٹی اور پانی پر گزارہ کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے آرام و آسائش کے لیے جو بھی وسائل پیدا کیے ہیں ان سب سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ مگر چادر کو دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔ توکّل تو خیر بڑی چیز ہے اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ لیکن اگر انسان اتنا ہی کر سکے کہ

جو کچھ اپنے دست و بازو سے پیدا کیا ہے اس پر قناعت کرے اور قدرت نے اس کے پڑوسی کو جو کچھ دیا ہے اس پر دندان آز تیز نہ کرے، تو یہی بہت بڑی بات ہوگی۔

فرض شناسی ایک جوا ہے جو کندھوں پر رکھا ہوا ہے کہ انسان کو صحیح راستہ پہ چلائے۔ طلبا نے اس جوے کو اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا ہے۔ اس لیے بے راہ روی کا شکار ہو رہے ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب طلبا کھاتے پیتے گھروں سے آتے تھے اور ان کی تعلیم کا بار ماں باپ پر کچھ ایسا زیادہ نہیں پڑتا تھا۔ اب تو ماں باپ اپنا پیٹ کاٹ کر بچوں کو تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں، لیکن بچے یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ ان کا کام اب صرف ہنگامہ آرائی رہ گیا ہے۔ آج کسی استاد کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے، تو کل شیخ الجامعہ کی خبر لی جا رہی ہے۔ آج ان کے خیال میں اگر پرچہ مشکل آیا تو اسٹرائک ہو گئی۔ کل امتحان گاہ میں نگراں نے نقل کرنے سے روکا، تو غریب پٹتے پٹتے رہ گیا۔ علامہ اقبالؒ کے کلام کا آج کل ہر شخص شیدائی نظر آتا ہے۔ کاش ان کی عملی زندگی سے بھی کچھ سبق لیا جاتا۔ اپنے استاد میر سید حسن کا علامہؒ اس قدر ادب کرتے تھے کہ ان کے سامنے اپنے اشعار نہیں پڑھتے تھے کیونکہ اس سے ایک گونہ استاد برتری کا اظہار ہوتا تھا۔ پنجاب کے گورنر نے جب ان کو "سر" کے خطاب کی پیش کش کی، تو انھوں نے خطاب صرف اس شرط پر قبول کرنا منظور کیا کہ ان کے استاد نے عربی اور فارسی ادب کی جو خدمت کی ہے اس کا بھی اعتراف کیا جائے۔ گورنر نے جب دریافت کیا کہ ان کی کچھ تصنیفات ہیں تو علامہؒ نے جواب دیا وہ خود ان کی سب سے بڑی تصنیف ہیں۔ چنانچہ جب ان کو "سر" کا خطاب عطا ہوا، تو ساتھ ہی ساتھ میر سید حسن کو بھی "شمس العلما" کے خطاب سے نوازا گیا۔ اب نہ ایسے استاد ہیں، نہ ایسے شاگرد۔ صرف انکی یاد باقی رہ گئی ہے؛

ای ہمنفسان محفل ما     رفتید؛ ولے نہ از دل ما

طلبا میں درس سے غیر حاضری اب ایک وبائی شکل اختیار کر گئی ہے۔ پہلے تو بدشوق طلبا ہی درس سے غیر حاضر ہوتے تھے۔ مگر اب بہت کم طالب علم اس کو عیب سمجھتے ہیں۔ کاروباری دنیا میں تو بالا دست سے اپنا جائز حق لینے کے لیے کام سے غیر حاضر ہو جانا شاید ایک طرح سے جائز کہا جا سکے مگر علم و ادب کے سرچشمہ میں، جہاں ہر مسئلہ کو افہام و تفہیم کے ذریعہ سے حل کرنا چاہیے، اس حربہ کے استعمال کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کارخانہ سے مزدور اگر غیر حاضر ہو جائیں تو پیداوار میں کمی آجاتی ہے اور کارخانے کے مالک کا نقصان ہوتا ہے۔ مگر طلبا درجہ سے غیر حاضر ہو کر صرف اپنا نقصان کرتے ہیں۔ سال کے ۳۶۵ دنوں میں درس کے لیے

شاید نصف سے بھی کم دن مقرر ہیں۔ لیکن عملاً طلبا اس نصف کا بھی نصف کر دیتے ہیں۔ بدشوقی کا یہ حال ہو تو اچھے ادیب، ماہر سائنس داں، حاذق طبیب اور ہونہار انجنیر کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ سستی ڈگریاں ضرور مل جاتی ہیں۔ البتہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہم بھی زندگی کی دوڑ میں آگے ہیں، طوطے کی طرح رٹے ہوئے چند نام گنا دیئے جاتے ہیں کہ علی گڑھ نے شوکت علی، محمد علی، حسرت موہانی، ضیاء الدین، ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، پیدا کئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس فہرست میں آپ دو ایک نام کا اور اضافہ کر دیں، لیکن یہ سب گزرے ہوئے زمانے کے لوگ ہیں۔ آخر اب مادر درسگاہ سے ایسے مایہ ناز فرزند کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ صرف وجہ ایک ہی ہے کہ اب ہمارا مسلک سخت کوشی نہیں بلکہ تن آسانی ہے، جو ہماری رگ وپے میں سرایت کر گئی ہے۔ زندگی کی مہم تن آسانی سے سر نہیں ہوتی۔ زندگی نام ہے چٹانوں سے ٹکرانے کا، چاہے اس کا انجام پاش پاش ہو جانا ہو۔

بہرحال لڑکے پھر بھی لڑکے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اب اساتذہ نے بھی اپنے معاملات منظور کرانے کے لیے اس غیر معقول حربہ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ تنازعہ تو ان کا کسی دوسرے سے ہوتا ہے مگر اسٹرائک کر کے وہ طلبا کے حقوق کو پامال کرتے ہیں۔ دہلی میں اساتذہ کی اسٹرائک قریب دو مہینے سے جاری ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ طلباء کی تعلیم کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ خیریت ہے کہ علی گڑھ ابھی اس بلا سے محفوظ ہے مگر اس کی داغ بیل یہاں بھی پڑ گئی ہے۔ چند سال ہوئے ایک استاد نے شیخ الجامعہ کے گھر پر دھرنا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دھرنا طلباء کے جواب میں تھا۔ گویا طلبا اگر اپنے منھ پر سیاہی پھیر لیں تو استاد کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے:

گر ہمیں مکتب وہمیں مُلّا ... کارِ طفلاں تمام خواہد شد

ابھی حال میں ضلع کی انتظامیہ نے ایک استاد کا رہائشی مکان ناجائز طریقہ سے خالی کرایا تھا۔ اس کے خلاف اساتذہ کی طرف سے احتجاج کیا گیا جو بیشک مناسب تھا۔ مگر جس طریقہ سے احتجاج کیا وہ مناسب نہیں تھا۔ تمام اساتذہ نے ایک دن کے لیے اسٹرائک کر دی اور ایک جم غفیر کی شکل میں حاکم ضلع کے مکان پر جا وارد ہوئے۔ ایسا کرنا اساتذہ کے وقار کے منافی تھا۔ آخر کارخانہ کے مزدوروں اور دانش گاہ کے دانشوروں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے۔ کہا جاتا ہے کہ حاکم ضلع نے ان کے ساتھ وہ اخلاق بھی نہیں برتا جس کی ان سے امید کی جاسکتی تھی۔ لیکن جس کی نظر میں خود اپنی ذات قابل احترام نہ ہو، وہ

دوسرے سے کیوں امید رکھے کہ وہ اس کی عزت کرے گا۔

اساتذہ کی ایک دوسری اسٹرائک اس کے فوراً بعد ہی ہوئی۔ یہ اسٹرائک ایک مرکزی قانون کے خلاف تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس قانون سے یونیورسٹی کی حیثیتِ خود اختیاری مجروح ہوتی ہے۔ ہم بحث کے لیے اس اعتراض کو تسلیم کر لیتے ہیں مگر اس سے اسٹرائک کا جواز کسی طرح پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اس شکایت کو بھی افہام و تفہیم ہی سے طے ہونا چاہیے تھا۔ ان دونوں اسٹرائکوں کی وجہ سے طلبہ دو دن کے لیے درس سے محروم رہے۔ اس کی تلافی کس طرح سے ہوگی؟ یہ سننے میں نہیں آیا کہ اساتذہ نے یہ پیش کش کی ہو کہ وہ تعطیل کے دو دنوں میں درس دے کر اس کی تلافی کر دیں گے۔ اور اگر وہ کرتے بھی تو طلبا اس کو کب ماننے کے لیے تیار ہوتے۔

اساتذہ میں ہر مکتبِ خیال کے لوگ شامل ہیں۔ کمیونسٹ بھی ہیں اور جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے ہمدرد بھی، اور ایسے مسلم اساتذہ بھی جو کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے۔ کمیونسٹ فلسفہ میں تو شاید اس طرح اپنے کارِ منصبی سے غیر حاضر ہو جانا جائز سمجھا جاتا ہو مگر کیا ان اساتذہ کی نظروں میں جو اپنے کو اسلامی اقدار کا پیرو کہتے ہیں ایسی غیر حاضری جائز ہو سکتی ہے؟ ہماری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اگر ان دو دنوں کا مشاہرہ وہ یونیورسٹی سے لیں گے تو ان کے لیے اکلِ حلال کی تعریف میں نہیں آسکتا۔ اگر کچھ اساتذہ، چاہے وہ دو چار ہی کیوں نہ ہوں، ہمارے خیال سے متفق ہوں تو ہم ان سے امید رکھیں گے کہ وہ ان دو دنوں کا مشاہرہ یونیورسٹی کو واپس کر دیں۔ ایسا کر کے وہ دیانتداری کی ایک اعلیٰ مثال قائم کریں گے۔

اکلِ حلال کے متعلق علامہ اقبالؒ کے والد شیخ نور محمد کا ایک مثالی واقعہ ہمارے سامنے ہے۔ شیخ صاحب ایک بڑے زمیندار کے یہاں ایک معمولی سے کام پر تعینات تھے۔ کچھ دنوں آرام کرنے کے بعد ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ کام کی نوعیت دیکھتے ہوئے ان کو مشاہرہ زیادہ ملتا ہے۔ ایک دن خاموشی سے انھوں نے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ زمین دار کو تعجب ہوا کہ وہ ایسا کر رہے ہیں۔ جب اس نے وجہ پوچھی تو انھوں نے صحیح صورتِ حال گزارش کر دی کہ جو معمولی سا کام ان کے سپرد ہے اس کے لیے جو مشاہرہ ان کو دیا جاتا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ اس کا لینا ناجائز سمجھتے ہیں۔

مولوی صاحب یا شیخ صاحب کے معیار کو اس وقت کون پہنچ سکتا ہے مگر ایک نے پانچ گنا مشاہرہ بھی اسی لیے ٹھکرا دیا کہ جن بچوں کو وہ تعلیم دیتے تھے ان کا نقصان ہوگا اور دوسرے نے

ایک اچھی ملازمت سے اس لیے کنارہ کشی اختیار کر لی کہ کام کو دیکھتے ہوئے ان کو معاوضہ زیادہ ملتا تھا، جس کو لینا وہ ناجائز سمجھتے تھے۔ لیکن ہم اپنے اساتذہ سے اتنی امید تو رکھ سکتے ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے جو نعرہ ملک کو دیا تھا کہ "آرام حرام ہے" اس پر سو فیصدی عمل نہ کرتے ہوئے بھی وہ "آرام" کو "کام" سے نہ بدل دیں گے۔ ہم کو اس میں شبہ نہیں ہے کہ اساتذہ کی غالب اکثریت اپنے تعلیمی فرائض کو خوش اسلوبی سے ادا کرتی ہے۔ لیکن کیا کچھ اور کوشش کر کے "حالات" بہتر سے "بہتر تر" نہیں بنائے جا سکتے؟ مولوی صاحب کی کہانی میں ہمارے لیے فرض شناسی اور استغنا کا ایک بہت بڑا سبق ہے، بشرطیکہ ہم اس کو سیکھنے کے لیے تیار ہوں۔

●●

# پروفیسر مسعود حسین خاں

پروفیسر مسعود حسین خاں (پ ۱۹۱۸ء) پیرس سے ڈی لٹ، علی گڑھ کے طالب علم رہے اور پھر وہیں لکچرار اور ریڈر ہوئے! پھر لسانیات کے پروفیسر ہو کر عثمانیہ چلے گئے، جس کے بعد جامعہ کے وائس چانسلر ہوئے۔ علی گڑھ سے لسانیات کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہو کر کشمیر کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں وزٹنگ پروفیسر ہوئے۔ فی الحال ترقی اردو بورڈ لغت پروجیکٹ کے ڈائرکٹر ہیں۔

اہم تالیفات: (۱) رقعات رشید احمد صدیقی، (۲) اردو کا المیہ، (۳) قدیم اردو (تین جلدوں میں)، (۴) شعر و زبان، (۵) قصہ مہر افروز و دلبر از عیسوی خاں بہادر (۶) مقدمہ تاریخ زبان اردو، (۷) دکنی اردو کی لغت، (۸) دو نیم (کلام کا مجموعہ)، (۹) کوی مسعود کا گیت (ہندی میں کلام کا مجموعہ)، (۱۰) اردو کی لسانیاتی تاریخ: خدا بخش لکچر (زیر طبع)۔

# فکرِ اقبال

# اور

# آزاد ہندوستان کے مسلمان

اقبال کی اجتماعی فکر کا ہندی مسلمانوں کے لئے سب سے زندہ حصہ اجتہاد سے تعلق رکھتا ہے۔ میں اسکی فقہی باریکیوں میں پڑے بغیر یہ کہوں گا کہ اقبال کی فکر اس بارے میں جدید ہے اور غیر اسلامی ممالک کے مسلمانوں کے لئے اس پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے ترکی جمہوریہ کے رویے کو سراہتے ہوئے "اجتہاد کا حق" قانون ساز مجالس کے سپرد کر دیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں علما کی جانب سے سوءِ ظن سے کام لیتے ہوئے ان کی کسی علاحدہ اور با اختیار مجالسِ مشورت کی تشکیل کی مخالفت کی ہے، بلکہ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چونکہ مجالس سلطنت میں عام طور پر ایسے حضرات منتخب ہو جاتے ہیں جنھیں فقہ اسلامی سے بالکل مس نہیں ہوتا ہے، اس لئے علما کو بھی منتخب کیا جائے۔ (لیکن اس کی ذمّہ داری کون لے سکتا ہے) اور سب سے اہم یہ کہ ہمارے مدارس میں قانون کی تعلیم کی از سرِ نو تنظیم کی جائے جہاں اسلامی فقہ کے ساتھ مغربی قانون اور اس کے ارتقا پر درس دیے جائیں تاکہ اس بارے میں ذہن جدید ہو سکیں۔

ہندوستان کے موجودہ اسلامی سماج میں ہر قسم کے مسلمان پائے جاتے ہیں۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ غالب کی طرح سہل انگار ——" پر طبیعت ادھر نہیں جاتی" لبرل قوم پرست، دیوبندی، جماعتِ اسلامی کے پیرو، اشتراکی اور اشتراکی مسلمان (میں ایسے اشتراکیوں کو جانتا ہوں جو پنج وقت نماز پڑھتے ہیں) ان سب میں قدرِ مشترک مسلم تشخص کی تلاش اور تحفّظ ہے جو کبھی مخصوص تہذیبی عوامل سے ترکیب پاتا ہے، کبھی اردو زبان کے وسیلے سے اور کبھی مشترک تہذیبی روایات سے۔ یہ مجموعی طور پر اکثریت کے دائیں بازو کی جماعتوں کی زد کو محسوس کرتے ہیں اور خوف و خطر کے دائرے میں سمٹ کر ایک ہی ڈربے میں آجاتے ہیں۔

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز وطنیت سے کیا تھا۔ اس عہد کے تمام وطنی موضوعات کا عکس ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں ملتا ہے۔ وطن کے مناظر فطرت سے دلچسپی (ہمالہ) اشخاص واکابر قوم پر فخر (رام، نانک، سرسید، غالب) فرقہ پرستی کے خلاف انتباہ اور اس پر افسوس اور خاک وطن کے ہر ذرّے کو دیوتا سمجھنا۔ لیکن ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی کے بعد اور یورپ میں قومیت کے نام پر مغربی اقوام کی استیلا اور استحصال کی پالیسی کو دیکھ کر وہ وطنیت کے بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے مخالف ہو گئے۔ انھوں نے "قومیتِ اسلام" اور "قومیتِ مسلم" کی ترکیبیں وضع کیں اور : ع "اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے" کا نعرہ بلند کیا۔ قومیت اسلام کا یہ تصور اقبال کے سیاسی عقاید کا آخر وقت تک ساہم رکن رہا۔ ۱۹۳۸ء میں انتقال سے چند مہینے قبل جب وہ مولانا حسین احمد مدنی سے ملت اور وطن کی بحث میں الجھ گئے اس وقت بھی انھوں نے یہی دُھرایا : ع "بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست"

مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے خیالات کی توجیہ ملت کو قومیت کا مترادف نہ مان کر کی۔ اقبال نے جواباً تحریر کیا کہ : "حال کی عربی فارسی میں بہ کثرت سندات موجود ہیں کہ ملت قوم کے معنوں میں مستعمل ہے"

قومیت کے سلسلہ میں اقبال اور مولانا کے درمیان یہ علمی معرکہ موجودہ ہندی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پوری بحث سے ظاہر ہوتا ہے، اقبال قومیت اور "ملت" کے سلسلے میں اس وقت تک واضح تصورات نہیں رکھتے تھے اور اگر رکھتے تھے تو وہ ابھی تک ان خطوط میں محفوظ تھے جو انھوں نے ۱۹۳۷ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کو بصیغۂ راز لکھے تھے۔ ان کے خیال میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک سیاسی تصور کی حیثیت رکھتا ہے، جو اسلام سے متاثر ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ مولانا حسین مدنی نے اپنے اس بیان کی کہ یہ "خبر ہے منشا نہیں" مسئلے کو اپنے لئے اور موجودہ ہندی مسلمانوں کے لئے اسی قدر پیچیدہ بنا لیا، جس قدر اقبال نے "قومیت" کی بحث میں پڑ کر اپنے لئے بنا لیا تھا۔ قومیت کے باب میں اقبال کی سیاسی فکر

سے آج ہندی مسلمانوں کو کسی قسم کی رہبری نہیں مل سکتی، اس لیے کہ فوق اسلامی قومیت ہندوستان کے سیاق وسباق میں ایک سراب اور خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

موجودہ ہندوستانی قومیت ابھی تک عالم تشکیل میں ہے۔ اور تخلیق کے سارے کرب ضرب سے دوچار ہے۔ جواہر لال نہرو کی قیادت میں دستور ہند میں اس کی بنیادیں نہایت کشادہ اور گہری رکھ دی گئی ہیں۔ لیکن تاریخ کے کاکل بہت الجھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف ہندوازم کا گہرا ساگر ہے۔ ہزاروں سال کی قدیم روایات، توہمات اور معتقدات ہیں۔ ان معتقدات میں ایک قسم کی ہمہ گیریت ہے جس نے کسی مذہب کو نہیں، بلکہ ہندو زاویۂ نگاہ اور طرز حیات کو جنم دیا ہے۔ دوسری طرف اسلام کے نسبتاً جدید افکار اور عقاید ہیں۔ اولوہیت کا سلسلہ ہے۔ مذہبی فکر کی قطعیت ہے۔ تیسری جانب مغربی تمدن کی مادی و ثقافتی فتوحات کا سلسلہ ہے، جو ساری دنیا کو زیر و زبر کیے ہوئے ہے، اور جس کے ورطے میں ہم مکمل طور پر آچکے ہیں۔ ہندوستانی قومیت کا ان تینوں دھاروں میں نقطۂ توازن کیا ہوگا، یہ ابھی بطن ایام میں ہے۔ دیکھنا ہے کہ ہندو ہندوستان کی متحدہ قومیت کے لئے کیا تیاگ سکتا ہے، مسلمان اس کے لئے کیا ترک کر سکتا ہے اور مغربی تفکر کا اس کی تعمیر میں کیا حصہ ہوگا؟ یہ مسلّم کہ اس تاریخی لین دین میں ہم میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دینا ہوگا، کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا ہوگا۔ مثلاً ہندوازم میں غیر عقلی توہمات اور اساطیری عناصر کی کمی کرنا لازمی امر ہے۔ سماجی اونچ نیچ اور چھوت چھات کو قوم کے جسد سے فاسد مادے کی مانند خارج کرنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کے عہد کی تاریخ پر زیادہ ہمدردانہ اور مثبت نظر ڈالنی ضروری ہے۔ دوسری جانب ہندی مسلمانوں کو اپنے غیر ضروری مذہبی اور تمدنی تفاخر کو کم کرنا ہوگا۔ غیر اسلامی مذاہب کو ان کی عوامی سطح پر نہیں بلکہ فکری اور تاریخی سطح پر سمجھنا ہوگا تاکہ ان کے اندرون میں جو توانائی اور صلابت ہے، اس تک نظر جا سکے۔ اس لئے بھی کہ وحدت ادیان کا تصور بہترین اسلامی شعائر میں سے ہے۔

دستور ہند کی اساس جن تین بنیادوں پر قائم کی گئی ہے، ان میں جمہوریت خشت اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں جمہوریت کی جانب جو رویہ ملتا ہے، اس سے ان کے عقیدت مندوں میں خاصی غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اقبال جمہوریت

کے ناقد ہی نہیں بلکہ مخالف تھے۔ لیکن اگر تشبیہ و استعارے کے پردوں کو ہٹا کر سیاق و سباق کی روشنی میں دیکھا جائے تو اقبال غلط تصوف کی طرح اس غلط قسم کی جمہوریت کے خلاف تھے جو استعماریت کے مترادف رہی ہے اور جو بیسویں صدی کے پہلے دہے میں مغربی ممالک میں عام ہو رہی تھی۔ اس وقت جمہوریت کا پیکر خالص سیاسی تھا، جو فرد کی زندگی کے دیگر پہلوؤں کی خبر گیری کرنا فرض نہیں سمجھتی تھی۔ اب جمہوریت ایک طرزِ فکر اور طرزِ حیات بن چکی ہے۔ یہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور انسانی رشتوں کے پیچ در پیچ عمل میں انفرادی آزادی کی نگرانی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جمہوریت کا معاشی اور اصلاحی پروگرام سست گامی کے ساتھ انجام پاتا ہے۔ ہندوستان نے پچھلے ۳۰، ۳۵ سال میں اس کی بڑی قیمت ادا کی ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے ہماری قومی زندگی میں استحکام آیا ہے۔ اقلیتوں میں ساجھے داری کا اعتماد پیدا ہوا ہے اور ہندی مسلمان کو اسلامی نہیں، ایک سیکولر جمہوریت میں جینے کے آداب سیکھنے پڑ رہے ہیں۔

آب و رنگ شاعری سے قطع نظر، اقبال نے جمہوریت کے مسئلے پر جب بھی سوچا ہے اسے اسلام سے ہم آہنگ پایا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں "ہندوستان ریویو" میں اسلام کے اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جمہوریت اسلام کا بحیثیت ایک سیاسی نصب العین کے، اہم ترین پہلو ہے۔"

آج ہندی مسلمان کے لئے یہ نصب العین صرف سیاسی ہی نہیں رہا، ثقافتی اور قومی بھی بن گیا ہے۔ تفاوت رہ یہ ہے کہ ہندوستانی سیکولر جمہوریت کے علی الرغم نوزائیدہ اسلامی جمہوریتیں چند سال سے زیادہ نہ چل سکیں۔

سیکولرزم ہمارے دستور کا دوسرا بنیادی اصول ہے۔ جس ملک میں ایک سے زاید مذاہب رائج ہوں، اس کی بقا کے لئے یہ اصول ضروری ہے۔ لیکن سیکولرازم نہ تو لامذہبیت سے عبارت ہے اور نہ روحانی اقدار سے بے بہرہ ہونے سے۔ متحدہ ہندوستان میں اقبال کا انداز فکر بھی کم و بیش یہی رہا ہے۔ انھوں نے دوسرے مذاہب اور ان کے اکابرین کا احترام کیا ہے۔ جاوید نامے میں عارف ہندی کو "جہاں دوست" کا پیکر عطا کیا! اپنی برہمن زادگی پر وہ فخر کیا ہے کہ بعض اوقات گمان ہوتا ہے کہ اصل اقبال کہاں سے بول رہا ہے۔ لیکن جوں جوں ان کی سیاسی فکر "آزاد اسلامی مملکت"

کے سانچے میں ڈھلتی گئی، وہ اسلامی جمہوریت کی اصطلاح میں سوچنے لگے۔ اسلام نے اپنی اقلیتوں کا حل "ذمّی" کے تصور میں نکال لیا ہے، لیکن تاریخ میں مسلمانوں کو خود اقلیت بننے کا بڑے پیمانے پر پہلا تجربہ ہندوستان ہی میں ہوا تھا۔ ہندوستان کی سیکولر جمہوریت انھیں "ذمّی" کا درجہ نہ دیکر ساجھے دار کا حصہ دیتی ہے۔ آخر آخر میں اقبال کے ذہن کا تقسیم کے بعد باقی ماندہ مسلمانوں کی جانب جو رویہ رہا، وہ اس خط سے بخوبی ظاہر ہے جو انھوں نے قائد اعظم محمد علی جناح کو جون ۳۷ء میں لکھا:

"ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ اس وقت شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ یہی وہ بہترین راستہ ہے جو مسلم اکثریتی اور مسلم اقلیتی دونوں قسم کے صوبوں کے مفاد میں ہے۔"

ہم ہندی مسلمان اسی نظر انداز کردہ فاضلات میں سے ہیں اور ترانۂ ہندی والے اقبال کے الفاظ میں آج ان سے یوں شکوہ سنج ہیں: ؏ "معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا"

اقبال کی سیاسی فکر اپنا کام کر گئی۔ جو لے بھاگنا تھا وہ لے بھاگے؛ جسے چھوڑنا تھا، اُسے چھوڑ دیا! ہمیں جادہ پیمائی کے لیے اپنے کارواں کو از سر نو ترتیب دینا ہے۔ ایک سیکولر جمہوریت میں ایک باوقار اقلیت کے طور پر زندگی بسر کرنے کے آداب سیکھنے ہیں اور کینٹول اسمتھ کی اس پیشین گوئی کو پیش نظر رکھنا ہے کہ ایک اجنبی اور غیر اسلامی ماحول میں ہندی مسلمان زیادہ توانا، روشن خیال اور زرقی یافتہ بن جائے گا۔

ہندوستانی قومیت کے اجزائے ترکیبی کا تیسرا اہم جزو "سوشلزم" ہے۔ سوشلزم اب ایک کثیر المعنی لفظ بن چکا ہے۔ پچھلی صدی کے نصف اوّل تک اس سے مراد ایک ایسا نظام معیشت لیا جاتا تھا جس میں تمام وسائل پیداوار کی ملکیت پر اختیار، فرد کے بجائے جماعت کا ہو۔ مارکس اور اینگلز کی سائنٹفک سوشلزم یا کمیونزم کے نقطۂ نظر سے سوشلزم کی مذکورہ بالا شکل صرف عبوری قرار دی گئی۔ جمہوریت کو ایک بورژوائی تصور قرار دیا گیا اور انقلابی اندازِ کار اور پرولتاری قیادت کو منزلِ مقصود تک پہنچنے کا اصل وسیلہ ٹھہرایا گیا۔ رفتہ رفتہ دوسری جنگ عظیم کے بعد وسائل پیداوار کو مکمل طور پر قومی تحویل میں لینے کا خیال لے ترک کیا جانے لگا۔ جمہوریت کو ایک لائحۂ عمل اور منتہا و مقصود مان کر منصوبہ بندی اور قومی نگرانی

طریقے کو اقتصادی ترقی اور آمدنی کی منصفانہ تقسیم کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس طرح قومی اور نجی مساعی پر مبنی ملی جلی معیشت وجود میں آئی۔ ہندوستان نے اسی طریق کار کو اپنایا اور مخلوط معیشت اور جمہوری نظام حکومت کے ذریعے قومی فلاح و بہبودی کی ڈگر پر پنجسالہ منصوبہ بندیوں کی شکل میں قدم آگے بڑھایا۔

اقبال نے ابتدا سے اپنی معاشرتی فکر میں نظام معیشت کے اس توازن کو پالیا تھا۔ ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کو، جب خضر راہ اور پیام مشرق کی بعض نظموں کو پڑھ کر ایک دل جلے نے اقبال پر کمیونزم کے داعی ہونے کا الزام لگایا تو انھوں نے اخبار میں یہ تردیدی بیان شائع کیا:

"بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے ۔۔۔ میں مسلمان ہوں، میرا عقیدہ ہے ۔۔۔ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریقہ یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانون میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا انتظام کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے ـــــ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔"

اقبال کی اسی تعریف میں انفرادی ملکیت اور ملی جلی معیشت دونوں تصورات کی تہ نشینی ہے۔ ۱۹۳۶ء تک اقبال اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ "میں اسلام کو ایک قسم کی اشتراکیت ہی سمجھتا ہوں" اور اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے۔" لیکن یہ تشبیہ مؤکد ہے، یعنی ادات تشبیہ میں سے ایک "قسم" موجود ہے اور اسی قسم میں اسلامی سوشلزم کا تصور مکمل طور پر موجود ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ نے پاکستانی مؤرخ اے، کے بروہی کے ایک مضمون کے حوالے سے "اسلامی سوشلزم" کو "دو الفاظ غیر منطقی اختلاط" اور "دو غلط لفظ" کہکر جن شبہات کا اظہار کیا ہے، وہ صحیح نہیں۔ دونوں کا خیال ہے

کہ لفظ "اسلام" یا اسلام جیسا کہ اقبال سمجھتے تھے' کہنا اس کے لئے کافی ہے۔ لیکن یہ جذباتی ہیر پھیر کے
علاوہ اور کچھ نہیں۔ اقبال اپنے تصورِ سوشلزم کی تعبیر آخر وقت تک کرتے رہے۔ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک خط
میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کو لکھتے ہیں :- "یہ غیر اغلب ہے کہ مسلمان جواہر لال کی منکرِ خدا سوشلزم پر لبیک
کہہ سکیں"۔ اتفاق سے جواہر لال کی قیادت میں مرتب کردہ ہندوستانی دستور میں اس "الحادی سوشلزم"
کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکالی گئی اور اسے صرف معاشی فلاح و بہبود کے پروگرام تک محدود رکھا گیا۔

سوشلزم کے فلسفے کو اختیار کرنے کے لئے ہندی مسلمان کے پاس فکرِ اقبال کی ایک مضبوط اساس
موجود ہے۔ کمیونزم کی طرح سوشلزم کی بھی کئی شکلیں ہو گئی ہیں، جن میں قومی چھاپیں لگ گئی ہیں۔ ہندوستانی
سوشلزم بھی اپنی تنظیم و ترتیب کے لحاظ سے دیگر ممالک کے سوشلزم سے مختلف ہے۔ یہ ضروری نہیں
کہ اسلامی سوشلزم کے بارے میں جو اشارے فکرِ اقبال میں ملتے ہیں، یا دیگر اسلامی مفکرین نے جو اس
کی تفصیلات دینے کی کوششیں کی ہیں' وہ من و عن ہندی مسلمانوں کے لئے سازگار ہوں۔ ہماری جمہوریت
ایک اسلامی مملکت نہیں جہاں ہم اسلامی قوانین کا نفاذ کر سکیں۔ ہم نے پارلیمانی جمہوری نظام کو اپنے
لئے پسند کیا ہے۔ اس لئے اکثریت کے فیصلے' خاص طور پر معاش اور معیشت کے میدان میں ہماری
روایت سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ شریعت کے دائروں میں لا کر ان پر اڑنا بے معنی اور مضر دونوں
ثابت ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں تاویلاتِ اقبال ہماری تشفی کے لئے کافی ہیں۔

ہندوستان کی جمہوری، سیکولر، سوشلسٹ ریاست میں ہندی مسلمان کے تشخص اور تحفظ
کا مسئلہ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔ یہ تشخص ہندوستانی قومیت کی رنگا رنگی کے لئے ضروری ہے۔ قومیت
سازی کے اس نئے تجربے میں اکثریت کے ہمدردانہ رویے کی بھی ضرورت ہے۔ کشاکش جاری ہے
لیکن تاریخ ایک کشمیری ہنرمند کی مانند اپنی کشیدہ کاری میں مصروف ہے اور ہندوستانی
قومیت کا ڈیزائن بنتا جا رہا ہے۔

٭٭

پروفیسر ایم۔ وائی انصاری

# مسلمانوں کے علمی کارہائے نمایاں

مسلمانوں کے علمی کارہائے نمایاں اس قدر وسیع اور جامع ہیں کہ وہ نہ صرف علوم ہی ہیں، بلکہ وہ تعلیم و تربیت، تہذیب اور عام معلومات سب کو اپنے دائرے میں لے آئے ہیں۔ انھیں علوم کی پروردہ عظیم الشان ثقافت و تہذیب کو مسلمانوں کا "زریں دَور" تصور کیا جاتا ہے۔

اسی تعلیم اور تربیت نے سائنس، فنون لطیفہ، تہذیب و تمدّن، فن تعمیر اور دیگر علوم عقلیہ کو جنم دیا اور ان کی پرورش کی۔ یہی تعلیم و تربیت دنیا کے لئے سرمایۂ ناز بنی۔ تعلیم کی بدولت عرب کی ایک بدو اور ناخواندہ قوم نے جو مفکرین، فلسفی، مؤرخ، کیمیاداں، اطبّائے حاذق، علما، طبیعیات اور مہندسین پیدا کئے ان میں البیرونی، ابن خلدون، ابن سینا، خوارزمی، جابر بن حیان، ثابت بن قرہ، امام غزالی، شیخ سعدی وغیرہ چند نام ہیں۔ ان میں ابن رُشد و دیگر حضرات کی حوادثات زمانہ سے بچی کھچی چند تصانیف حال کی صدی تک یورپ کی مشہور علمی درس گاہوں کے نصاب میں داخل تھیں۔

ایک فنِ تعمیر ہی کے میدان میں عربوں نے نہ صرف ایک اچھوتے طرز تعمیر کی بنیاد ڈالی اور نئی اشیائے تعمیر دریافت اور استعمال کیں بلکہ نئے اصول تعمیر بھی وضع کیے۔ گو کہ عظیم عمارات کے بارے میں فنون لطیفہ کے نقطۂ نظر سے وافر اور معقول تحریری مواد ذخیرہ کی حد تک موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ بدقسمتی سے ابھی تک فنِ تعمیر و ساخت کو ذہن میں رکھتے ہوئے مسلمانوں کے ان تعمیری شاہکاروں کے طرز تعمیر، اصول تعمیر اور اسلوب تعمیر کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ محققین اسلامی فنِ ساخت اور اصولِ تعمیر کے اہم لیکن نظر انداز شدہ پہلوؤں کی طرف اپنی گراں قدر توجہ مبذول کریں۔ بلاشبہ ان کے کارہائے نمایاں کا راز اسلام اور مسلمانوں کے علمی ذوق، تجسّس اور غیر متزلزل قوتِ عمل ہی میں مضمر ہے۔ قرآن حکیم نے صریح و واضح الفاظ میں مسلمانوں کو مکمل ضابطۂ حیات عطا فرمایا۔ بلا تفریق مذہب، رنگ و ملّت اور فاصلوں و دشواریوں سے بے نیاز ہو کر حصولِ علم کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک اور متعدد احادیث نبوی میں علم، حصولِ علم اور فضیلت علم کے سلسلہ میں

عقلمند کی جا سکتے ہیں۔ امام غزالی نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک مفصل باب علم کی تعریف و علوم حصولِ علم، اساتذہ و طلاب کے فرائض پر مرتب کیا جو آج بھی ہماری رہنمائی اچھے طریقے پر کر سکتا ہے۔

**علم کا مفہوم :-** علم برائے علم نہ کہ برائے حصول دولت، عزت، شہرت اور شان و شوکت، مسلمانوں کا مطمع نظر رہا۔ مسلمانوں نے علم کو کبھی تحصیل دولت کے لئے نہیں حاصل کیا۔ نہ علما ہی کسی دور میں بہت دولت مند یا صاحبِ جاہ و منصب تھے۔

ابتدائے اسلام ہی سے قرآن اور پیشوائے اسلام کے احکام کے مطابق علم دوستی اور علم پروری مسلمانوں کا شیوہ اور تفریحی مشغلہ رہا ہے۔ چنانچہ علما کا ایک اہم فرض علمی اور مذہبی حوصلہ مندی ہے۔ اسی حوصلہ مندی کے زیرِ اثر محدثین نے ایک ایک حدیث کے لئے ہزاروں میلوں کا سفر کیا اور ہر قسم کی تکالیف سے دوچار ہوئے۔ اس حوصلہ مندی کا اثر تھا کہ اندلس کے طلبا ہندوستان میں حصول علم کے لئے آتے تھے۔ ابن بیطار نے نباتات کی تحقیق کے لئے اندلس سے چل کر یونان اور بحرِ روم کے جزائر کی خاک چھانی۔ جغرافیہ کی تحقیق کے لئے علامہ بشاری نے ۲۸ برس دنیا کے سفر میں صرف کئے۔ علم کی خاطر ابوالفرج اصفہانی نے ۵۰ برس صرف کر کے اپنی کتاب "الاغانی" تصنیف کی اور علم ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔

نویں صدی عیسوی میں ابن حائک ہمدانی نے عرب کا ایک ایسا جغرافیہ تیار کیا جو زمانہ حال کی تحقیق کے مطابق ہے۔ اس میں عرب کے ایک ایک گاؤں اس کی پیداوار، عمارات، معدنیات، نباتات، حیوانات، تجارت وغیرہ کے حالات تفصیل سے درج ہیں۔ یہ نسخہ ۱۸۸۴ء میں لیڈن سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی علوم اسلامی پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھیں۔ یورپ میں جو اسلامی سائنس اور دیگر علوم کی کتابیں شائع ہوئی ہیں اور ان کے کتب خانوں کا مایۂ ناز سرمایہ ہیں، دیکھ کر مسلمانوں کے علمی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر حال کی تصانیف میں جو کسی تعارف کی محتاج نہیں، سر سید کی "آثار الصنادید" ہے۔ ضرورت ہے اس بات کی ہے کہ اس کتاب کو سامنے رکھ کر ان عمارات، جن کا اس میں ذکر ہے نقشے (PLANS) تیار کئے جائیں اور اس کتاب میں شامل ہوں تاکہ یہ کتاب تاریخ کے علاوہ انجینئرنگ کے نقطۂ نظر سے مکمل ہو جائے۔ یہ کام محققینِ تاریخ اور سول انجینئرنگ مل کر انجام دے سکتے ہیں۔

قرآن و حدیث کے پیشِ نظر علما اور مفکرین نے حصولِ علم کے لئے مندرجہ ذیل پہلوؤں پر زور دیا:

(۱) اعمالِ خیر، (۲) تہذیب الاخلاق اور، (۳) نشر العلوم،

چنانچہ اس نظریہ کے تحت بلا کسی قید و مذہب وملت مسلمان طلباء کے علاوہ یہودی اور نصرانی یورپ اور ایشیا کے جوق در جوق حصول علم کے لئے جامعہ قرطبہ کی طرف رجوع ہوئے۔

مسلمانوں کے زرّیں دَور میں تین اقسام کے علمی ادارے قائم ہوئے:۔

(۱) مکاتب برائے ابتدائی تعلیم۔

(۲) مدارس برائے تعلیم ثانوی۔ ان کی نوعیت موجودہ دور کے اسکول اور کالجوں کی طرح تھی۔

(۳) دار العلوم برائے اعلیٰ تعلیم وتحقیق۔ ان کی نوعیت موجودہ دور کی یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی وتحقیقی مرکزوں کی طرح تھی۔

نصاب عام طور پر دینیات، صرف ونحو، منطق، زبان، علم لسانیات، فلکیات، علم ہیئت اور علم الہندسہ وغیرہ پر مشتمل تھا۔

**عربوں کا ذوق:۔** ریگستان اور صحرا کے رہنے والے بدّوؤں کو ملک سے باہر نکل کر پانی سے زیادہ علوم کی تشنگی ہوئی۔ مسٹر ووڈننگٹن اپنی کتاب "تاریخ طب" میں عربوں کی ابتدائی فتوحات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی علمی طلب وعلمی ذوق کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"۔۔۔۔۔۔ ایک بزنطینی بادشاہ کو حیرت ہوئی کہ عرب کی بدو اور فاتح قوم نے علاوہ اور شرائط صلح کے ایک شرط یہ بھی رکھی کہ ان کو یونانی کتابوں کی خرید اور جمع کرنے کا مجاز ہو۔۔۔ بادشاہ کو حیرت تھی کہ DIOS CORIDOS کی کتاب مع تشریح تصاویر عرب کے سردار کے لئے سب سے اعلیٰ بیش بہا اور قابل قبول تحفہ ہو سکتی ہے۔ قسطنطنیہ کے فلسفی مسلمان مصنفین کو دیکھ کر متحیر رہ گئے۔ یہ وہی عرب تھے جن کو انھوں نے نہایت بددلی سے تعریف کرتے ہوئے ان کو عالم وفاضل مگر غیر متمدن کا لقب دیا تھا۔۔۔۔۔"

یہی وہ بدّو تھے جنھوں نے یونانی طب وعلوم کی بجھتی ہوئی شمع کو گل ہونے سے بچایا۔۔۔ پانچسو سال کے بعد انھیں عربوں نے اس شمع کو پہلے سے بھی زیادہ روشن ودرخشاں کر کے یورپ کے حوالہ کیا۔

مسلمانوں کی علوم پروری اور علماء نوازی کی بنا پر عرب جیسے یونانی علوم وفنون سے مستفید ہوئے ان کی تحقیقی جستجو اس درجہ بڑھ گئی کہ جب ان کو یونانی کتابوں کے عربی تراجم سے تشفی نہ ہوئی تو انھوں نے اصل یونانی کتب سے رجوع کیا۔

دوسری قوموں کے علوم حاصل کرنے کے لئے عربوں نے مختلف زبانیں سیکھیں اور ان زبانوں کے لغات وشرح مرتب کیں۔ چنانچہ آج بھی مختلف زبانوں کے لغات دنیا کے عجائب خانوں کا سرمایہ ہیں۔

علمی ذوق اور بڑھا تو عربوں نے انسائیکلوپیڈیا تالیف کیے۔ عربی کا پہلا قاموس "کتاب عیون الاخبار" ابن قتیبہ (۸۲۸ء تا ۸۸۹ء) نے تیار کیا۔ اس کے عنوان طاقت، جنگ، شرافت، سیرت، علم، فصاحت، زہد، دوستی، عبادت، غدا، غذا اور وصف نازک تھے۔ قرطبہ کے ابن عبد ربہ نے "عقد الفرید" شائع کی۔ یہ کتاب عیون الاخبار سے زیادہ جامع اور عنوان بھی زیادہ تھے۔ ۹۷۵ء اور ۹۹۷ء کے درمیان خوارزمی نے مفتاح العلوم شائع کی۔ یہ قاموس علم قانون، فلسفہ، تصوف، صرف ونحو، دفتری کام، شاعری، موسیقی، تاریخ، طب، ریاضی، علم ہندسہ، علم ہیئت وغیرہ پر مشتمل ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں پانچ مصنفوں نے مل کر رسالہ "اخوان الصفا" تالیف کیا۔ یہ ۵۲ رسالوں پر مشتمل تھا۔ اس میں ریاضی، جغرافیہ، موسیقی، منطق، اخلاقیات، علوم سائنس وغیرہ پر بحث کی۔ ان تمام رسائل کا ایک مکمل ایڈیشن ۱۸۸۷-۸۹ء میں شائع ہوا ہے۔ مصری مورخ نویری نے ۱۲۷۲ء اور ۱۳۳۲ء میں "نہایت الارب فی فنون الادب" شائع کیا۔ یہ ۹۰۰۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کے عنوان جغرافیہ، ہیئت، موسمیات، علم تاریخ، ارضیات، حیوانیات اور نباتات تھے۔ اس کا مکمل ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ ان کے علاوہ بھی مختلف قاموس ہر صدی میں تالیف ہوتے رہے۔

اسی علمی ذوق اور تجسس علوم کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں۔ مثالوں کی نشاندہی کا مقصد صرف بتانا ہے کہ اقوام مذاہب اور ملکوں کے عروج وزوال میں علم کو کس درجہ دخل ہے:

علم کے متعلق ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے: "مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے۔ اب اگر یہ قیاس کیا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ کس نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا کرتا تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہوسکتا ہے"۔

نظام الملک طوسی نے ۱۰۶۷ء میں نظامیہ بغداد کی تعمیر کی۔ مشہور مغربی مورخ گبن نظامیہ بغداد کے متعلق لکھتا ہے: "ایک سلطان کے وزیر نے بغداد میں مدرسہ قائم کرنے کے لئے دو لاکھ دینار وقف کئے اور ۱۵ ہزار دینار سالانہ اس کے صرفہ کے لئے مقرر کئے۔ اس ادارہ سے چھ ہزار ہر درجہ کے طلبہ مختلف فنون سے بہرہ اندوز ہوئے ...." (دینار قریب پانچ روپیہ کا تھا)۔

اس مدرسے کے تعلیمی معیار، عظمت اور وسعت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ شیخ سعدی

اور امام غزالیؒ مدرسہ نظامیہ بغداد کے آخری زمانہ کے طالب علم تھے۔

صاحب ابن عباد کو جب نوح بن منصور نے وزارت کے لئے طلب کیا تو اس نے عذر لکھ بھیجا:

"مجھ کو ضروری ساز و سامان کو ساتھ لانے میں بڑی زحمت ہو گی اور صرف کتابوں کے لادنے کے لئے چار سو اونٹ درکار ہوں گے"

صاحب عباد نے علم کو وزارت پر ترجیح دی۔

ابو جعفر بن عباس نے جو کتب خانہ قائم کیا، اس میں ۴ لاکھ مجلد کتابیں تھیں۔ اس سے کتب خانہ کی وسعت اور علم دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام ابن جوزی نے اپنے ہاتھ سے دو ہزار جلدیں لکھیں۔ احادیث لکھتے وقت قلموں کا تراشہ جمع کرتے جاتے تھے۔ مرتے وقت وصیت کی کہ غسل میت کا پانی اسی تراشے سے گرم کیا جائے۔ کہتے ہیں کہ گرم کرنے کے بعد کافی تراشہ بچ رہا۔ اندازاً تراشہ کا کل وزن ساٹھ ستر کیلوگرام رہا ہوگا۔ اس وزن سے بھی ان کی تصانیف اور تحریروں کا اندازہ لگانا زیادہ قرین قیاس ہے۔

زمانۂ حال میں حضرت تھانویؒ کی یومیہ تصانیف کا اوسط ۴۰ صفحات بتایا جاتا ہے۔ یقین بمشکل ہوتا ہے حالانکہ یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے۔

خود بانیٔ درسگاہ سر سید مرحوم کی تصانیف اس قدر کثیر ہیں کہ یقین نہیں ہوتا۔ مگر حقیقت پر مبنی ہے۔

**مدارس:-** **دارِ ارقم** ــ مسلمانوں کا سب سے اول مدرسہ دارِ ارقم ہے۔ اس مدرسہ کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:

معلم: حضور سرورِ کائنات۔ تعداد متعلم: ۴۰ افراد۔ حیثیت:- مدرسہ اور دارالاقامہ یہ مدرسہ صرف ایک ماہ رہا۔ مدرسہ کے علاوہ یہ اول دور کے مسلمانوں کے لئے پناہ گاہ بھی تھی۔ اس کے بعد ہی مسلمان کھلم کھلا اسلام کی نشر و اشاعت کرنے لگے۔

**جامعہ صفہ:** ہجرت کے بعد مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ مدینہ منورہ میں مسجد سے ملحق ایک چبوترہ قائم ہوا۔ اس میں حضور سرورِ کائنات بہ نفس نفیس خود قرآن کا درس دیتے تھے۔ یہ بھی ایک طرح کا مدرسہ اور دارالاقامہ تھا۔ جامعہ صفہ کے فارغ التحصیل حضرات نے اسلام کی نشر و اشاعت میں بہت اہم کارنامے انجام دیے۔ ان میں سے چند جلیل القدر اشخاص کے نام حسب ذیل ہیں:- حضرت اسماء بن حارثہؓ،

حضرت ابوذر غفاری رض، حضرت سعد بن ابی وقاص رض، حضرت بلال بن رباح رض، حضرت طلحہ بن عمر رض، حضرت سلمان فارسی رض، حضرت ابوہریرہ رض، حضرت عبداللہ بن مسعود رض وغیرہ ــــ حضرت ابوہریرہ رض کے ذمہ متعلمین کے طعام کا انتظام تھا۔

**دار الحکمہ:** خلیفہ ہارون رشید نے ۸۳۰ء میں بغداد میں یہ ادارہ قائم کیا۔ یہ ایک کتب خانہ اور دار الترجمہ تھا۔ کتب خانہ میں عربی، سنسکرت، فارسی اور یونانی وغیرہ زبانوں کی کتابیں تھیں۔ ایک حصہ میں رصد خانہ تھا۔ ۸۵۰ء میں خلیفہ المامون نے مشہور حساب داں خوارزمی کو دار الحکمۃ کا ناظم مقرر کر دیا۔

۱۲۵۸ء میں بغداد کے ساتھ دار الحکمہ بھی برباد ہوا۔ کتابیں نذر آتش اور غرق آب کر دی گئی تھیں۔ مسلمانوں کا علمی سرمایہ نیست و نابود کیا۔ کچھ بچی کچھی مگر کثیر تعداد میں کتابیں آج بھی یورپ میں پائی جاتی ہیں۔ ان نایاب نسخوں میں چمڑے پر حضور ص کے دادا عبد المطلب کے ہاتھ کا لکھا ہوا، ایک گراں قدر نسخہ بھی تھا جو ضائع ہوا۔

**جامعہ نظامیہ بغداد:** ۱۰۶۷ء میں نظام الملک طوسی نے بغداد میں قائم کیا۔ یہ ایک یونیورسٹی تھی۔ نیشاپور، ہرات، موصل اور اصفہان وغیرہ میں جامعہ نظامیہ کے الحاقی مدارس تھے۔ خود نیشاپور میں قریب ۲۵ حنفی اور شافعی مدارس اور قریب ۱۲ کتب خانے تھے۔ سلیمان صفوی کے دور میں صرف اصفہان ہی میں ۴۸ مدارس تھے۔ شیخ سعدی رح اور امام غزالی رح اسی جامعہ نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے۔

**مستنصریہ بغداد:** ۱۲۳۴ء میں خلیفہ مستنصر نے بغداد میں قائم کیا۔ چھ سال کے عرصہ میں مدرسہ مکمل ہوا۔ مدرسہ کی عمارت نہایت شاندار اور اس زمانہ کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ تھی۔ طلباء کا قیام و طعام، کتب وغیرہ سب مفت تھا۔ طلبا کو طعام کے ساتھ شیرینی و فواکہ دیے جاتے تھے اس کے علاوہ ایک گنی ماہانہ جیب خرچ دیا جاتا تھا۔ پینے کے پانی کو ٹھنڈا کرنے کا خاص اہتمام تھا۔ مستنصریہ کے قیام کے فوراً ہی بعد قریب ۲۴۸ طلبا اقامت گاہ میں رہتے تھے۔

خلیفہ نے اپنے کتب خانہ سے ۱۶۰ اونٹوں پر لاد کر کتابیں مستنصریہ کو عطا کیں۔ اگر ایک اونٹ پر ۲۰۰ کتابیں فرض کریں، تو کل کتابوں کی تعداد ۳۲ ہزار ہوتی ہے۔ ان مدارس کے علاوہ نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے بے شمار مکاتب اور مدارس قائم کیے۔ ترکوں کے عہد میں بھی، مکاتب و مدارس قائم ہوئے

**اسپین:۔** خلفائے اسپین نے بھی دل کھول کر علوم کو نوازا اور علماء کی بڑی قدر و منزلت کی۔ بڑے بڑے جامعہ، مدارس اور کتب خانے قائم کیے۔ ان کی علم دوستی سے یورپ کے لوگ مستفیذ ہوئے

اندلس کی اسلامی درس گاہوں میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اپنے ملک واپس جاکر علم و حکمت کو فروغ دیا۔ اگر اہلِ یورپ کو اندلس کی درس گاہوں سے علم کی روشنی نہ ملی ہوتی، تو قیاس یہ ہے کہ وہ آج بھی دنیا کی جاہل ترین قوموں میں شمار کیے جاتے۔

بارھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک عرب کی تقریباً تین سو کتابوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا۔ ان میں ذکریا رازی، ابوالقاسم زہراوی، ابن رشد، بوعلی سینا وغیرہ کی تصانیف کا ترجمہ شامل ہے۔ ارسطو، بقراط، جالینوس اور اقلیدس کی کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوا آج ان عالموں کی تصانیف عربی ہی کی بدولت محفوظ ہیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں پیرس، برلن، لندن، اکسفورڈ، اٹلی اور اسکوریال (اسپین) وغیرہ کتب خانوں میں عربی زبان کی ڈھائی لاکھ سے زائد مطبوعہ اور مخطوطہ کتابیں موجود تھیں۔

ملر نے اپنی تصنیف "تاریخ فلسفہ" میں اسپین کی اسلامی درس گاہوں کے تذکرہ میں لکھا ہے:-
"مغربی علوم کے اصلی ماخذ عربوں کے وہ مدارس ہیں جو ہسپانیہ میں قائم ہوئے۔ یورپ کے ہر ملک کے طلباء ان مدرسوں کی طرف دوڑتے تھے اور ان میں جاکر علوم طبعیہ، علوم ریاضیہ اور علوم ماوراء الطبیعہ حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح جب عربوں نے اٹلی پر قبضہ کیا، تو وہ بھی یورپ میں اسلامی علوم کے داخلہ کا سبب بنا۔"

**کتب خانے:** مکاتیب، مدارس، اور دارالعلوم کے کتب خانوں کے علاوہ بہت سے اور کتب خانے دنیائے اسلام میں تھے۔ ان میں سے صرف چند کی نشاندہی مقصود ہے۔

(۱) ۱۔ خالد بن یزید بن معاویہ کا کتب خانہ۔ اسلامی دنیا میں سب سے پہلے کتب خانے کی بنیاد ڈالی۔ (۲) دارالحکمہ کا کتب خانہ (۳) علامہ واقدی کا کتب خانہ۔
(۴) اسپین میں حاکم ثانی کا کتب خانہ۔ (۵) سلطان بخارا نوح بن منصور کا کتب خانہ (۶) شیراز میں عضدالدولہ کا کتب خانہ (۷) سیف الدولہ کا کتب خانہ (۸) دور فاطمی میں مصر کا کتب خانہ۔
(۹) عراق، شام اور فارس کے کتب خانے وغیرہ۔

**استنباط:** (۱) مسلمانوں کے علم کا مفہوم اور حصولِ علم کا نظریہ عین قرآن اور احادیث کے مطابق رہا۔ اس مفہوم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے علم برائے علم نہ کر علم برائے حصولِ دولت،

ثروت، و شان و شوکت مسلمانوں کا مطمح نظر رہا۔

(۲) ضرورت ہے کہ محققین اسلامی فن ساخت اور اصول تعمیر کے اہم لیکن نظر انداز شدہ پہلوؤں کی طرف اپنی گراں قدر توجہ مبذول کریں۔

(۳) جو کتابیں مغرب میں شائع ہو چکی ہیں ان کا ترجمہ انگریزی، اردو، فارسی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں شائع کرنے کا بندوبست ہو۔ ان قلمی نسخوں اور کتابوں کو کتب خانہ سے نکال کر تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے عام کیا جائے۔

(۴) نایاب قلمی نسخوں کے MICRO FILMS بنوا کر دنیا میں مختلف جگہوں پر محفوظ کریں تاکہ حوادث زمانہ ATOMIC WARFARE سے کہیں تو محفوظ رہ سکیں اور انسانیت کا یہ سرمایہ بچ سکے۔ یہ کام زیادہ زر طلب بھی نہیں ہے۔

(۵) چند کتابوں کا اقتباس کتابچوں کی شکل میں عام انسانوں خاص کر طلاب تک پہنچ جائے۔ مثلاً لی بان کی کتاب "تمدن عرب" کا کتابچہ تیار ہو اور اس کو ہمارے نصاب میں شامل کرنے پر غور کریں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہمارے نوجوان اپنے ماضی سے واقف ہوں گے۔ مگر اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہو، کہ "پدرم سلطان بود"

(٦) سر سید کی کتاب "آثار الصنادید" میں نقشے شامل کر کے اس کو پایۂ تکمیل کو پہنچانے کی کوئی اسکیم بنانا چاہیئے۔

ڈاکٹر وارث کرمانی

# جرس فریاد می دارد....

تقسیم ملک سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں کی بڑی تعداد مسلمان امرا و رؤسا کے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھی اور ان کی تعلیم کا مقصد مہذب و شائستہ بننے کے علاوہ اعلیٰ سرکاری ملازمت حاصل کرکے خاندانی اعزاز میں اضافہ کرنا ہوتا تھا۔ اب نہ وہ رئیس و تعلقہ دار باقی رہ گئے ہیں، نہ آئی۔ سی۔ ایس کا دبدبہ باقی ہے۔ موجودہ علی گڑھ کے طالب علم زیادہ تر یو۔پی کے ایسے مسلمان گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں جو ابھی تک سابق زمینداریوں کی بچی کھچی املاک سے اپنے آبائی قصبات میں گزر بسر کر رہے ہیں۔ یا پھر شہروں میں نکل کر آباد ہو گئے ہیں اور وہاں کسی نہ کسی ملازمت یا تجارت سے بسر اوقات کر رہے ہیں۔ قصبوں میں رہنے والوں کی جائداد زیادہ تر کاشتکاری کے فارموں، مختلف کھیتوں اور پھلوں کے باغات کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ بعض جگہوں پر کاشتکاری کے علاوہ یا اس کے ساتھ دوسرے ذرائع آمدنی بھی ہوتے ہیں جیسے ٹیوب ویل، بجلی یا انجن سے چلنے والی چکیاں، آرا مشین، ٹرانسپورٹ کا دھندا، یا کولڈ اسٹوریج کا کاروبار وغیرہ۔

یہ سب کاروبار ان طالب علموں کے گارجین چلاتے ہیں یا پھر گھر کے ایسے افراد جو اعلیٰ تعلیم نہ پانے کی وجہ سے دیہاتی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن گھر کے وہ افراد جو یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے ہیں ان سب کا نصب العین وہی سرکاری ملازمت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ نصب العین آج بوسیدہ واز کار رفتہ ہو گیا ہے۔ اوّل تو سرکاری ملازمت اب اس پایہ کی نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ آج کا ڈپٹی کلکٹر، سائیکل دبائے ہوئے گاؤں گاؤں مارا مارا پھرتا ہے اور اس سے نیچے درجے کے ملازموں کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ ان ملازموں کی تنخواہیں اتنی کم ہوتی ہیں کہ وہ اور صحت مند زندگی کی کفالت نہیں کر سکتیں۔ مجبوراً ملازمت کرنے والا دوسرے ناجائز ذرائع آمدنی سے پیسہ کمانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے باوجود اسے شہر کے تنگ مکانوں میں ملاوٹ کی ہوئی غذا اور صنعتی ماحول کی زہریلی ہوا پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ اس رجحان کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ہمارے گاؤں اور قصبے جو ابھی تھوڑی مدت پہلے ہماری تہذیب کا مرکز تھے اور جنھیں شاہجہاں اپنی سلطنت کا شیرازہ کہا کرتا تھا، آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ لکھوری اینٹ کی بنی ہوئی بلند حویلیاں جہاں عجمی تہذیب کی بہار

نظر آتی تھی۔ آج ویران ہو کر لڑکھڑانے لگی ہیں اور ان کے شکستہ کنگورے آزاد بلگرامی، ریاض خیرآبادی، محسن کاکوروی، جوش ملیح آبادی اور مجاز ردولوی کا نوحہ پڑھ رہے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ختم ہو چکے ہیں، بلکہ اس لیے کہ آج ان کی جائے پیدائش پر ان کے پڑھنے اور سمجھنے والے باقی نہیں رہے ہیں اور ان کے نونہال ترک وطن کر کے کسی گنجان شہری مشین کا پرزہ بن چکے ہیں۔

اس مضمون کے ذریعہ ہم اپنے طالب علموں کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ وہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر شہری مشین کا پرزہ بننے سے پہلے ایک بار اپنے آبائی وطن اور اپنے گھروں کی جانب بھی دیکھ لیا کریں اور وہاں کی آزاد زندگی اور آزادانہ ذریعہ معاش کو بھی پیش نظر رکھ کر اپنے مستقبل کے پروگرام کا فیصلہ کریں۔ آج کل زیادہ تر نوجوان دیہات کی آرام دہ زندگی پر شہر کی مجبور اور تکلیف دہ زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس رویے کے پیچھے کئی غلط مفروضات کارفرما ہیں۔ جو ماضی میں کسی وقت شاید صحیح رہے ہوں ولیکن آج قطعی بے بنیاد ہو گئے ہیں۔ عام طور سے قصبوں کی زندگی کو شہری زندگی کے مقابلہ پر غیر محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ صورت حال اب اس کے برعکس ہے۔ شہروں میں کہیں زیادہ ڈکیتیاں اور فسادات ہوتے رہتے ہیں اور نہ پولیس موقع پر پہنچتی ہے، نہ پڑوسی گھر سے نکلتا ہے۔ جبکہ دیہات میں اگر اتفاق سے اگر ایسا حادثہ ہو بھی جاتا ہے تو پولیس سے پہلے سارے گاؤں والے جمع ہو کر مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ ایک دوسرا اعتراض جو دیہاتی زندگی پر کیا جاتا ہے وہ تعلیمی اور طبی سہولتوں کا نہ ہونا ہے۔ یہ بات بھی اب زیادہ صحیح نہیں رہی ہے۔ تعلیمی اور طبی سہولتیں اب اطراف میں پھیل چکی ہیں، اور سند یافتہ ڈاکٹر چھوٹے چھوٹے قصبوں میں موجود ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے اسکول ہر جگہ کھل چکے ہیں۔ بجلی تقریباً ہر جگہ پہنچ چکی ہے۔ اور ٹرانسپورٹ کی سہولتوں نے قصبوں کو بڑے شہروں سے قریب تر کر دیا ہے۔ کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی بیشتر چیزیں وہاں دکانوں پر موجود رہتی ہیں۔ یہ ہے موجودہ دیہات اور قصبات کا نقشہ جس سے گریز کر کے نوجوان شہروں کی گنجان، غیر صحت مند اور فتنہ پرور زندگی کی طرف بھاگتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں اگر ہمارے طالب علم تعلیم یافتہ ہونے کے بعد شہروں میں معمولی نوکری کرنے کے بجائے اپنے گھروں میں رہ کر پیسہ کمانے کی کوشش کریں تو وہ زیادہ خوش حال اور مطمئن زندگی بسر کر سکتے ہیں، جن کے گھروں میں کاشتکاری یا آم کے باغات ہیں وہ زراعت کے جدید طریقوں سے انھیں ترقی دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے حکومت کی طرف سے ہر ممکن سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ مثلاً اچھے بیج کی فراہمی

کیڑے مار دواؤں کا انتظام اور صنعتی کھاد وغیرہ۔ اس کے علاوہ کھیتوں اور باغوں کی آمدنی پر حکومت کوئی انکم ٹیکس بھی نہیں لیتی ہو مزید عزت افزائی کا سبب ہے۔ اگر یہ طالب علم انجینئر یا ڈاکٹر بن کر نکلے ہیں تو بھی اپنے وطن میں ذاتی کاروبار کر سکتے ہیں جسے انگریزی میں Self employment کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر اپنا دواخانہ کھول کر اور انجینئر اپنی دوکان قائم کر کے ملازمت سے کہیں زیادہ مالی منفعت حاصل کر سکتے ہیں اور ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ آزادانہ زندگی بسر کریں گے جس کی بنا پر وہ اپنے علاقہ کے دیہاتوں سے خوشگوار تعلقات قائم کر سکتے ہیں اور سیاسی و سماجی مسائل میں دلچسپی لے کر اپنے ہموطنوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اس سے ان کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوگا اور انھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ صرف مسلمان فرقے کے ایک فرد نہیں ہیں بلکہ ہندوستان میں کثیر التعداد ہندوؤں کے لیے بھی جزوِ زندگی ہیں اور ان کے دکھ درد میں شریک ہیں۔ ہمارے مشرقی یو۔ پی میں بسنے والے غیر تعلیم یافتہ معصوم ہندوؤں کی اکثریت نہایت ایمان دار، محنتی اور وفا شعار ہے۔ ان سے ربط ضبط پیدا کرنے سے اپنے دائرۂ عمل میں ایک عجیب بالیدگی اور وسعت کا احساس ہوتا ہے جو تجربہ ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ تمام پروگرام اپنے آبائی مستقر یا خاندانی وطن ہی میں رہ کر پورا کیا جا سکتا ہے۔ جس کے ذریعہ جاگیردارانہ دور کا کھویا ہوا وقار دوبارہ ہمارے قصبات میں واپس آجائے گا۔

علی گڑھ میں ہمارے طالب علم ایک عرصے سے اس طرح زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے ہیں جیسے کسی جزیرے پر سکونت اختیار کیے ہوں۔ اطراف و جوانب سے ہمارا کوئی خاص تعلق نہیں جس کی بنا پر ایک قسم کی کشیدگی اور مخاصمت کا احساس دلوں پر طاری رہتا ہے جو اکثر فرقہ وارانہ رنگ بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس مقامی فضا کو غلطی سے ملک کی عام فضا سمجھ کر زیادہ تر طالب علم یونیورسٹی کے اندر ہی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر بڑے شہروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ رویہ گمراہ کن اور حقیقت کے خلاف ہے اور ہمارے طالب علموں کو ملک کے مرکزی دھارے Main stream سے دور رکھتا ہے۔ اگر ہمارے نوجوان اپنے آبائی ٹھکانوں سے جو تمام یو۔ پی کے دیہات میں پھیلے ہوئے ہیں، واپس جا کر اپنا کیریر بنانا شروع کریں تو انھیں علی گڑھ کی محدود زندگی سے نکل کر پورے ملک کے سماجی ارتعاش میں شامل ہونے کا موقع ملے گا اور وہ تسخیر و تعمیر کے بیشمار موقعوں پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں گے۔ اس کا ایک بالواسطہ فائدہ یہ ہوگا کہ وہ قصبات و دیہات جو صدہا سال سے ان کا وطن تھا اور ان کے آباواجداد کے تصرف میں تھے غیر آباد و ویران ہونے سے

پنپ جائیں گے اور وہاں نئے سرے سے ان کا اثر و رسوخ قائم ہو جائے گا اور وہ بالادستی جو جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے انھیں حاصل تھی اب علم و ہنر کے ذریعہ عوامی ہردلعزیزی کی شکل میں پیدا ہو جائے گی۔ مرزا غالب نے اپنی ایک مسلسل غزل میں اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ آپ اگر ان شعروں پر غور کریں تو ان میں آپ کے مستقبل کی زندہ و تابندہ بشارتیں نظر آئیں گی۔ غالب کہتے ہیں:

مژدۂ صبح درین تیرہ شبانم دادند　　شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

ان اندھیری راتوں میں مجھے صبح کی خوشخبری دی ہے، شمع کو بجھا دیا اور سورج کا پتا دیا ہے

گہر از رایت شاہان عجم برچیدند　　بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

عجم کے بادشاہوں کے پرچم سے موتی توڑ لیے لیکن اس کے معاوضہ میں مجھے خزانہ برسانے والا قلم عنایت کیا

افسر از تارک ترکان پشنگی بردند　　بسخن ناصیۂ فرّ کیانم دادند

پشنگ کی نسل کے ترکوں کے سر سے تاج لے لیا (اور اسکی جگہ) میری شاعری کی پیشانی کو کیانی شان عطا کی

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند　　ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

تاج سے موتی توڑ کر علم سے باندھ دیا۔ گویا ظاہر میں جو چیز چھین لی پوشیدہ طور سے مجھے دے دی

غالب اپنا سلسلۂ نسب تورانی بادشاہ پشنگ اور افراسیاب سے جوڑا کرتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی حکومت اور ان کا جاہ و جلال یاد کر کے خود کو تسلی دے رہے ہیں کہ خدا نے ہم سے تخت و تاج لے کر علم و ہنر کی دولت عطا کی جو شاہی میراث سے کہیں بہتر ہے۔ وہ اگر شمع کی مانند تھی تو علم و ہنر سورج کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ ظاہر میں جو چیز لے لی وہ پوشیدہ طور سے ہمیں دوسرے انداز میں عطا کر دی۔

غالب کی طرح ہمارے طالب علموں کو بھی اپنے ماضی کی شان و شوکت کا بدل اپنی محنت اور اپنے علم و ہنر کو سمجھنا چاہیے۔ ہمارے نوجوان خاص طور سے اس عظیم الشان یونیورسٹی کے طالب علم، پوری قوم کی امیدوں کا مرکز اور اس کے مستقبل کی ضمانت ہیں۔ ان کی یہ محدود زندگی جو یونیورسٹی سے نکل کر شہری ملازمت میں کھو جاتی ہے، کسی طرح ان کے شایان شان نہیں۔ انھیں پورے ملک کو اپنی جولان گاہ سمجھنا چاہیے اور اس کے سماج کے ہر گوشہ و قریہ کو اپنی تسخیر و تعمیر کا نشانہ بنانا چاہیے، نہ یہ کہ خود اپنے ہی آبائی مکانوں کو ویران کر کے دور افتادہ شہروں میں گوشۂ عافیت تلاش کریں۔ ان کی ترقی اپنے آبائی مرکز ہی میں قدم جمانے کے بعد ممکن ہو سکے گی اور اسے مضبوطی سے پکڑنے کے بعد ہی دور تر اور بلند تر مقاصد پر کمند ڈال سکتے ہیں۔ اس

کا ذریعہ اور آلۂ کار علم کی روشنی، محنت کی عرق ریزی، وطن کی خدمت، اہل وطن سے محبت اور تعاون ہی ہو سکتا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ہمارے طالب علم اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کو نہ حاصل کریں یا شہروں میں بود و باش نہ اختیار کریں۔ میرا کہنا صرف اس قدر ہے کہ اسے اپنا مستقل گھر نہ بنائیں۔ بقول فراقؔ،

ع وہ کوچہ روکش جنت ہو، گھر ہے گھر پھر بھی

ہمارے طالب علموں کو اعلیٰ ملازمت سے جو فیض اور منفعت حاصل ہو، اسے اپنا آبائی گھر کے بجائے اور بڑھانے میں استعمال کریں اور زندگی کی شام اور کیریر کا خاتمہ ہونے پر وہیں مراجعت کریں۔ اس طرح اپنے ماضی اور اپنی روایت سے جُڑے رہیں گے، اپنے کنبے، اپنے معاشرے اور اپنے خاندان کو ۲۱ ویں صدی کی آنے والی اندھا دھند زندگی میں منتشر نہ ہونے دیں گے۔ ان کے گھر اور ان کے وطن میں نئی رونق اور جگمگاہٹ پیدا ہو جائے گی اور وہ معاشرہ اور محفلیں پھر سے ظہور میں آئیں گی جو ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی میں ہمارے بزرگوں کا طرۂ امتیاز تھیں! اور وہ علم و ادب کے مرکز پھر جاگ اٹھیں گے جن پر شاہان تیموریہ فخر کرتے تھے!!!

●●

اشتیاق محمد خاں

# تلخ، ترش، شیریں

میری رائے اس نوجوان نسل کے متعلق بالخصوص مسلم طلبا کو پیش نظر رکھتے ہوئے زیادہ اچھی نہیں ہے، لیکن اس کے مستقبل سے بہت پُرامید ہوں۔

ہماری موجودہ نسل جو ۱۹۴۷ء کے بعد آئی، اُس، خود رو پودے کی مانند ہے جس کی صحیح نگہداشت اور تربیت گھر سے لے کر اسکول کالج تک نہیں ہو سکی۔ اس نئی نسل کے جوانوں کے پاس کوئی نصب العین نہیں ہے یا بہت سی کیوں یا COMPLEXES کا شکار ہیں جیسے خود اعتمادی، احساس ذمہ داری اور روزمرہ کی زندگی میں برتے جانے والے آداب، وقت و وعدہ کی پابندی، اخلاقی جرأت، سنجیدہ مطالعہ اور ہمہ جوئی کی اسپرٹ جیسی خصوصیات ان میں خال خال نظر آتی ہیں۔ آزاد ملک کے شہری ہونے کے ناطے آزادانہ اور بے باکانہ اظہار خیال سے جھجکتے ہیں۔

اصل ذمہ داری ان سیاسی اور معاشی عوامل اور اس سماجی نظام کی ہے جس نے رشوت، بیکاری، زر پرستی، کالا بازاری، دوغلے اور بے ایمان لیڈروں کو جنم دیا ہے، اسی نظامِ معیشت نے ان کو احساس کمتری اور بزدلی کا شکار بنا دیا ہے۔ ان کی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ اس نسل کے لیے "کس طرح جئیں اور کیسے گزارہ کریں" کا مسئلہ سب سے بڑا اور بھیانک مسئلہ ہے جو ہر وقت بھوت بن کر ان کے سروں پر منڈلاتا رہتا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش سے زیادہ تعلیم کے بعد ملازمت حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔

حالات کی سنگینی نے اُن کو اب یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کوئی رشتہ دار، دوست اب کام نہیں آتا! جو کچھ حاصل کرنا ہے، اپنے ہی بل بوتے پر کرنا ہے۔ گویا کہ زندگی کو بنانے میں ذاتی محنت و عمل کا رجحان ان میں بڑا ہی خوش آیند ہے۔

نوجوانوں کی کردار سازی اور ان کی صحیح رہنمائی کا کام صرف ہوسٹل یا دارالاقامہ ہی انجام دے سکتے ہیں، بشرطیکہ ہوسٹل کے منتظمین بالخصوص نگراں (وارڈن) شعوری طور پر جذبۂ خلوص و ایثار کے ساتھ اس کام کو اپنا مشن بنا لیں۔ سر سید احمد خاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو روزِ اوّل ہی سے اقامتی رکھا۔

جس کے مثبت نتائج بر آمد ہوئے۔ ایک عرصۂ دراز تک علی گڑھ کے طلبا اپنے رہن سہن، ڈسپلن، بیباکانہ اور مہذبانہ طرزِ گفتگو اور بھائی چارگی میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور یہ سب کچھ اقامتی زندگی کی دین تھا۔

میں کسی جماعت کا ممبر نہیں۔ ہاں اپنا ایک نظریہ ہے جو سیاسی کم، معاشی زیادہ ہے جس کی وضاحت علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں کی ہے،

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے ابتک ✧ اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

(تمہاری ضرورتوں سے زیادہ جو تمہارے پاس ہو، اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو)

علامہ اقبالؒ نے یہ شعراب سے ۵۰، ۶۰ سال پہلے کہا تھا؛ اگر اس وقت وہ زندہ ہوتے تو لفظ "شاید" "یقیناً" میں ضرور بدل جاتا۔

بمبئی کی تیز رفتار اور کٹھور زندگی نے وقت کی پلاننگ کو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا گُر سکھا دیا ہے اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کا اپنا کوئی نصب العین ہو، یا جس نے اپنے لئے زندگی میں کوئی اعلیٰ مقصد کا تعین کیا ہو۔

بے انتظامی معاملات تو اسکول و کالج سے لے کر ہوسٹل اور حکومت تک سب ایک ہی نوعیت کر ہوتے ہیں۔ ڈسپلن برقرار رکھنے کے لیے چند بنیادی باتوں اور اصولوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کسی بھی عہدیدار، افسر یا حاکم کا مخلص ہونا ضروری ہے، ساتھ ساتھ سخت گیر بھی۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر تنبیہ کر کے ان کو درگزر کرنا چاہیے۔ ہر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے انسانی پہلو کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ تنبیہ اور وارننگ کے بعد بھی اگر کوئی غلطی یا جرم کا مرتکب ہو، تو سزا دینا ضروری ہے۔ طلباء کے ساتھ بالخصوص ہمدردانہ رویہ اور دوستانہ رویہ رکھنا چاہیے۔ لیکن شرارتی عناصر کے ساتھ سختی سے پیش آنا ضروری ہے۔ کسی بھی معاملہ میں جانبدارانہ رویہ ڈسپلن کو ختم کر دیتا ہے۔ ان ہی چند اصولوں کو اپنا کر اور ان پر عمل پیرا ہو کر اس ہوسٹل میں ڈسپلن پچھلے ۲۰ سال سے برقرار ہے۔

میری رائے میں نوجوان مذہب سے بیزار تو نہیں۔ البتہ مذہبی معلومات کی کمی ضرور ہے اور اس کی وجہ سیاسی ماحول اور معاشی بحران ہے۔ جس نے کٹر مذہبی لوگوں تک کو "مادہ پرست" بنا دیا ہے۔

مذہبی تعلیم جو دراصل گھر سے شروع ہونا چاہیے، آج نچلے اور متوسط طبقے کے گھرانوں میں ممکن نہیں ہے۔ آمدنی کم، اخراجات زیادہ، گزارا ہو تو کیسے؟ یہی فکر والدین کو دامن گیر رہتی ہے ان کے

پاس اتنا وقت نہیں کہ بچے کی اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی نگرانی یا انتظام کر سکیں۔

اس کے علاوہ ہمارے دینی رہنما اور مذہبی شخصیات نوجوان نسل کو متاثر کرنے سے قاصر ہیں۔ علماء میں گفتار کے غازی تو شہر در شہر مل جائیں گے، لیکن کردار کے غازی خال خال ہی کہیں ملیں گے۔

میری رائے میں اس وقت نام نہاد لیڈروں سے کہیں زیادہ مخلص نوجوان منتظمین کی ضرورت ہے جو ملک کے گوشہ گوشہ میں بہترین طلبا، سائنس داں، آرٹسٹ یا فن کار، بہترین کھلاڑیوں اور دستکاروں کو منظم کر سکیں۔ یہی تنظیم بیروزگاروں کو روزگار مہیا کرنے کی کوشش کرے اور معلومات بہم پہنچائے۔ قومی بینکوں کی طرف سے بہت ساری اسکیمیں نکالی گئی ہیں جن سے چھوٹے موٹے دھندے شروع کیے جا سکتے ہیں، لیکن اسکیموں کا علم بہت سے نوجوانوں کو نہیں ہے۔

یہ تنظیم بلا امتیاز مذہب و فرقہ غریب ترین بچوں کی تعلیم کے اخراجات بھی برداشت کرے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پچھلے سالوں میں جو کچھ بھی ہوا، واقعی افسوسناک ہے۔ یہ ایک الگ موضوع بحث ہے، جو تفصیل اور وقت طلب ہے، پھر کبھی اس سلسلے میں گفتگو ہوگی۔ لیکن ایک بات بہت یقین کے ساتھ کہوں گا، اور وہ یہ کہ ہاتھی لُٹے، تب بھی سوا سو من کا رہتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں بگڑے ہوئے حالات میں بھی بہت بہتر ہیں۔

"اچھی چیز جہاں ملے، اپنا کھویا ہوا سرمایہ سمجھ کر اپنا لو"

"کمزور اور پسماندہ طبقوں کی حتی المقدور اس طرح مدد کرو کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور تمہارے دوست بن جائیں۔ سیر و سیاحت ضرور کرو، تاریخی عمارتیں، قدرتی مناظر کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف ملکوں، شہروں اور گاؤں کے عوام کی اسٹڈی کرو۔ شکوہ شکایت کا دور ختم ہوا، احساس کمتری کے لباس کو اتار پھینکو، پریشانیوں اور تکلیفوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ کسی کی سفارش اور سہارے کے بغیر اپنی محنت کے بل بوتے پر اپنی شخصیت کی تعمیر کرو۔ ایک خوددار، غیور اور آزاد شہری کی حیثیت سے سمندروں، پہاڑوں اور میدانوں کی فضاؤں میں مانند شاہین مہم جوئی کا اس طرح آغاز کرو کہ "دوست کیا، دشمن بھی جینے کی دعا دینے لگیں"۔ تمہارا یقین ہو ایسا ہو:

وطن کی ریت مجھے ایڑیاں رگڑنے دے ✤ مجھے یقین ہے پانی یہیں سے نکلے گا

اور تمہارا عزم بلند شاہین صفت ہو!

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر ✤ یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ!!

عبد العلیم قدوائی

# چھوٹی صنعتیں اور مسلمان

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی و اقتصادی پسماندگی اور بدحالی پوری ملت کے لیے ایک سنگین اور اہم معاملہ ہے، جس کے دور کرنے کی تدابیر پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک ہماری معاشی حالت مضبوط اور مستحکم نہیں ہو جاتی، ہمارے معاشرہ کی حالت سدھر نہیں سکتی اور نہ ہم اطمینان سے آزادانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ دورِ انگریزی میں ملازمتوں اور زمینداری کے سہارے ہمارا بھرم ایک حد تک چل رہا تھا۔ مگر آزادی کے بعد زمینداری کا خاتمہ ہوا اور روز بروز اضافۂ آبادی نے ملازمتوں کا دائرہ محدود سے محدود تر کر دیا۔ تجارت کے لیے اچھے خاصے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ بہرحال اس مسئلہ کو سلجھانے کی ایک موثر ترکیب یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ چھوٹی اور گھریلو صنعتیں قائم کریں اور اپنی کارکردگی سے قومی زندگی میں ایک اہم جگہ بنا لیں۔ اس سلسلے میں بڑی ہمت افزا بات یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں مسلمان کاریگروں کی بہتات ہے جو اپنے فن میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی ان صلاحیتوں سے پورا فائدہ ہی نہیں اٹھا سکے۔ اور اب بھی ان کی حیثیت معمولی کاریگر اور مزدور کی ہے جبکہ انھیں یہ پورا موقع حاصل ہے کہ وہ اپنی صنعتیں خود قائم کر کے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کر سکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار فراہم کر سکتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ چھوٹی اور گھریلو صنعتیں ہندوستان جیسے ملک کے لیے جہاں آبادی بہت بڑی ہے اور زیادہ تر دیہی علاقوں میں رہتی ہے، نہایت موزوں ہیں۔ ان صنعتوں کو ترقی دینے اور پھیلانے کا کام سرکاری سطح پر ۱۹۵۲ء میں شروع کیا گیا اور گزشتہ ۲۵-۲۶ برس کے تجربے نے ظاہر کیا کہ اس پروگرام سے ملک کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج ہمارے ملک کی کل صنعتی پیداوار کا ۴۹٪ حصہ ان ہی صنعتوں کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور یہ صنعتیں ملک بھر کے صنعتی مزدوروں کے پچاس فیصد یعنی نصف حصہ کو کام فراہم کر رہی ہیں۔ ہندوستان جو پہلے پسماندہ ملک کہا جاتا تھا، آج ترقی پذیر ملکوں کے سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کی چھوٹی صنعتیں دنیا میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں اور

ہندوستانی مصنوعات ایشیا، افریقہ اور یورپ کی منڈیوں میں خاصی مقبول ہو چکی ہیں۔ تکنیکی اعتبار سے بھی یہ صنعتیں اب بہت ترقی کر چکی ہیں۔ ہمارے ملک کی صنعتوں کو تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) بڑے پیمانہ کی اور بھاری صنعتیں جو سرکاری اور نجی دونوں دائروں میں چل رہی ہیں اور جن کے لیے وافر سرمایہ، بڑی بڑی مشینیں، اعلیٰ تکنیکی صلاحیت، بجلی اور مزدوروں کی بڑی تعداد وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کارخانے نہ ہر جگہ کھولے جا سکتے ہیں اور نہ ہر ایک ان کو قائم کر سکتا ہے۔ پبلک دائرہ میں وہ صنعتیں رکھی گئی ہیں جو اپنی افادیت اور ملک کے دفاع و استحکام کے لیے نہایت ضروری ہوں۔ مثلاً فوجی ساز و سامان بنانے کے کارخانے، ٹیلی فون، فولاد، ریلوے انجن اور ڈبے، جان بچانے والی دوائیں، کھاد، معیاری مشینیں اور کل پرزے، ڈبل روٹی، سمندری اور ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ شکر، کپڑا، انجینئرنگ، کیمیکل، بجلی کا سامان، چمڑا اور دیگر صنعتوں کے بڑے کارخانے ملک کے مختلف حصوں میں نجی سرمایہ داروں کے زیر انتظام چل رہے ہیں۔ اس طرح کی صنعتیں اور کارخانے چلانے کے لیے حکومت ہند کی وزارتِ صنعت سے لائسنس لینا ہوتا ہے اور مختلف قسم کے سرکاری ضوابط اور قواعد کی پابندی کرنی ہوتی ہے۔

(۲) چھوٹے پیمانہ کی اور گھریلو صنعتیں۔ اس شعبہ میں ایسے تمام کارخانے آجاتے ہیں جن میں مشینوں پر سرمایہ ۲۰ لاکھ روپے سے زیادہ نہ لگا ہو۔ بعض مخصوص حالتوں میں یہ حد ۲۵ لاکھ روپیہ تک ہو سکتی ہے۔ اب یہ شعبہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس میں مختلف قسم کی چھوٹی صنعتیں مثلاً انجینئرنگ، کیمیکل، چمڑا، شیشہ، مٹی، لکڑی، بجلی اور گاؤں کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی، مثلاً آٹا چکی، دھان صاف کرنے کی چکی، تیل گھانی، بڑھئی گیری، لوہار گیری، کمہاری، وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اس شعبہ میں کسی بھی کام شروع کرنے کے لیے نہ تو کسی لائسنس کی ضرورت ہے اور نہ لمبے چوڑے ضابطوں کی خانہ پری کرنی پڑتی ہے۔

(۳) ہتھ کرگھے، بجلی سے چلنے والے کرگھے، دستکاریاں وغیرہ۔ اس شعبہ میں زیادہ تر ایسے کاریگر ہیں، جو ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہیں اور عرصہ دراز سے اپنے پیشوں میں لگے ہوئے ہیں۔

زیر نظر مضمون میں (۲) اور (۳) کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ ان ہی کے ذریعہ زیادہ لوگوں کو روزگار مل سکتا ہے اور ملت کو اجتماعی اور انفرادی دونوں طریقوں سے نفع پہنچ سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ان صنعتوں کو شروع کرنے کے لیے کسی قسم کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ کوئی کام شروع کرنے سے پہلے حسب ذیل باتوں پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیے:

(۱) آپ کون سی صنعت شروع کرنا چاہتے ہیں؟ اس کام کے شروع کرنے میں آپ کو کون کون سی سہولتیں حاصل ہیں اور کس قسم کی دشواریاں۔ یہ صنعت کاری کا سب سے پہلا مرحلہ ہے اور بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی پر آپ کی کامیابی منحصر ہے۔

بنیادی چیز یہ دیکھنا چاہیئے کہ کس چیز میں آپ کو دلچسپی یا تجربہ ہے۔ اس کو بنانے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے اور آپ اپنے ذرائع سے کہاں تک مہیا کر سکتے ہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ یہ کام کہاں شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اصل چیز آپ کی سہولت ہے۔ مگر ساتھ میں یہ بھی سوچنا ضروری ہے کہ بجلی، خام مال، سرکاری مدد، مصنوعات کے بیچنے میں کہاں سہولت مل سکتی ہے۔ صنعت کا انتخاب واقعی دشوار کام ہے لیکن اس کے لیے اب آپ کو خاصی سہولتیں بھی دستیاب ہیں۔ کچھ سرکاری اور نیم سرکاری ادارے اس کام میں آپ کو مدد دے سکتے ہیں مگر بہتر یہی ہوگا کہ آپ کسی سرکاری ادارے سے مدد لیں۔

(۱) ہر ضلع میں ایک ضلع صنعتی مرکز قائم ہے (DISTRICT INDUSTRIES CENTRE) یہ صوبہ کی حکومت کا دفتر ہے اور ہر قسم کی صنعتوں کے قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ آپ وہاں جاکر یا خط کے ذریعہ جنرل منیجر سے بات چیت کر کے اپنی صنعت کا انتخاب کر سکتے ہیں اور ضروری لٹریچر سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

(۲) اگر آپ کسی صوبہ کے صدر مقام یا دہلی میں رہتے ہیں تو آپ اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ حکومتِ ہند کی وزارتِ صنعت کے دفتر سے رجوع کر سکتے ہیں۔ دہلی میں یہ انسٹی ٹیوٹ اوکھلا انڈسٹریل اسٹیٹ میں واقع ہے۔ ان دفتروں کو آپ بھی خط لکھ سکتے ہیں اور ان سے ان صنعتوں کی فہرست حاصل کر سکتے ہیں جن کی ہمت افزائی آج کل حکومت اور مالی اداروں کی طرف سے کی جارہی ہے۔

دہلی میں نرمان بھون میں وزارت صنعت کا بڑا دفتر۔ ڈیولپمنٹ کمشنر اسمال انڈسٹریز کا ہے، وہاں سے بھی آپ کو ہر قسم کی ضروری معلومات اور اطلاعات مل سکتی ہیں، خواہ آپ خود تشریف لے جائیں یا ان کو خط لکھ کر دریافت کریں۔

(۳) حکومتِ ہند نے اپنی نئی صنعتی پالیسی کے بموجب ۸۰۷ چیزوں کی فہرست مرتب کی ہے

جن کو چھوٹے پیمانہ ہی پر شروع کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ان چیزوں کو بنانے کے لیے حکومت کسی بڑے کارخانے یا صنعت کو لائسنس نہیں دے گی۔ اس طرح اگر آپ ان چیزوں میں سے کسی چیز کے تیار کرنے کا کارخانہ لگائیں گے تو آپ کو بڑے کارخانوں سے مقابلہ نہ کرنا پڑے گا۔

اس طرح کی ایک اور فہرست ۱۴۲ اشیا کی مرتب کی گئی ہے جن کو حکومتِ ہند اور اس کے متعلقہ دفتر چھوٹے صنعت کاروں ہی سے خریدیں گے بشرطیکہ مصنوعات معیاری ہوں۔

یہ دونوں فہرستیں آپ کو صنعت کے انتخاب میں بہت مدد دیں گی۔ اس کے علاوہ ہر ضلعی صنعتی مرکزوں نے صنعتی جائزہ لے کر ایک فہرست مرتب کی ہے جو اس ضلع کے وسائل، مانگ اور صلاحیتوں پر مبنی ہیں۔ یہ فہرست آپ کو متعلقہ ضلع مرکز سے مل سکتی ہے اور آپ کو صنعت کے انتخاب میں خاصی مدد دے سکتی ہے۔ کیونکہ آپ کو اس سے پتہ چل جائے گا کہ کسی خاص ضلع یا مقام پر کس قسم کا خام مال اور کاریگر دستیاب ہیں اور وہاں کن چیزوں کی مانگ ہے۔

صنعت کے انتخاب کے ساتھ ہی ساتھ یہ طے کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کو کس جگہ قائم کیا جائے۔ ظاہر ہے اپنی سہولت سب سے مقدم ہوتی ہے۔ مگر ساتھ میں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس جگہ بجلی اور ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں کس حد تک دستیاب ہیں۔ پھر آج کل حکومتِ ہند نے پسماندہ علاقوں کی صنعتی ترقی کے لیے خاص مراعات اور سہولتیں دینے کا اعلان کیا ہے۔ یعنی ان جگہوں پر اگر آپ صنعت قائم کریں تو کل سرمایہ کا ۱/۳ حصہ حکومت بطور مدد آپ کو دیگی۔ اس طرح انکم ٹیکس، سیلس ٹیکس میں چھوٹ، آسان قسطوں پر مشینیں اور کم شرح سود پر قرض مہیا کیا جاتا ہے۔ ملک میں ۲۴۷ پسماندہ اضلاع منتخب کیے گئے ہیں۔ کچھ اضلاع کے متعین علاقے پسماندہ قرار دیئے گئے ہیں۔ شمالی مشرقی منطقہ اور پہاڑی علاقوں میں اور زیادہ سہولتیں دی گئی ہیں۔

اپنے فیصلہ سے قبل ان مراعات اور سہولتوں پر بھی نظر ڈال لینا چاہیے۔ یہ چھوٹے کارخانے افراد، ساجھے داری کی فرمیں، کوآپریٹو سوسائٹی، پرائیوٹ لمیٹیڈ کمپنیوں کے زیر اہتمام کھولے جا سکتے ہیں مسلمانوں کے فلاحی ادارے اور تعلیمی و تہذیبی مراکز مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ اس سلسلہ میں رہنمائی اور ابتدائی امداد کے فرائض آسانی سے انجام دے سکتے ہیں۔ صنعتوں کو فروغ دینے اور پھیلانے کی اصل ضرورت تعلیم یافتہ نوجوانوں، کاریگروں، دستکاروں اور تجارت پیشہ لوگوں میں

ہے۔ اس سلسلہ میں مسلم یونیورسٹی اہم کردار حسب ذیل طریقوں سے ادا کر سکتی ہے:

۱۔ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک صنعتی معلوماتی مرکز قائم کیا جائے جو چھوٹی صنعتوں کے بارے میں ضروری لٹریچر اور معلومات فراہم کرے جس سے نئے صنعت کار اور پہلے سے صنعتیں لگائے ہوئے افراد مستفید ہو سکیں۔ یہ مرکز چھوٹے چھوٹے کتابچے اور رسالے شائع کر کے بڑی اچھی خدمت انجام دے سکتا ہے۔

۲۔ یونیورسٹی کے M.B.A کورس میں ایک پرچہ چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے اور صنعت کاری کی فضا قائم کرنے کے متعلق رکھا جائے تاکہ طلبا کو اس ضمن میں عملی معلومات ہو سکیں اور کورس پورا کرنے کے بعد وہ صنعت کے میدان میں داخل ہو سکیں۔

۳۔ مرکزی نیز صوبائی حکومت کے اشتراک سے یونیورسٹی ایک انڈسٹریل اسٹیٹ یونیورسٹی کیمپس میں قائم کرے، جہاں خواہش مند طلبا تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنی اپنی صنعتیں لگا سکیں۔ یونیورسٹی انجینئرنگ کالج کی ورکشاپ اس سلسلہ میں بڑی کارآمد ہو سکتی ہے۔

●●

احمد رشید شیروانی

# علیگ بھائیوں سے پھر التجا

مسلم یونیورسٹی کورٹ میں پورے ۲۵ نمائندے مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو منتخب کرتے ہیں۔ نئے ایکٹ کے تحت کورٹ کی پہلی میٹنگ طلب کر لی گئی۔ لیکن ابھی تک اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اپنے نمائندے نہیں چن سکی۔ کیوں نہیں چن سکی؟ پوچھیے ایسوسی ایشن کے ذمّہ داروں سے۔

اور ذمّہ داران سے کون پوچھے؟ حالت یہ ہے کہ سارے ملک میں کم و بیش ایک لاکھ اولڈ بوائز (یعنی علیگ بھائیوں) میں سے صرف ایک ہزار کے قریب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کے ذمّہ داروں کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ دہلی کے دسیوں پھیرے لگائیں۔ وفود لے کر ارکان حکومت کے دروازوں پر دستک دیں کہ اقلیتی کردار بحال کیجیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کو اتنی فرصت نہ تھی کہ اس ایسوسی ایشن کی ممبر سازی کر کے اسے درحقیقت علیگ بھائیوں کی نمائندہ تنظیم بنائیں اور اس سے بہترین ۲۵ علیگ نمائندے چن کر مسلم یونیورسٹی کورٹ میں بھیجیں۔

صرف ایسوسی ایشن کے ذمّہ داران کو الزام دینے سے کیا حاصل؟ سوال یہ ہے کہ اس وقت ایک لاکھ علیگ بھائیوں میں سے صرف ایک ہزار ایسوسی ایشن کے ممبر کیوں ہیں؟ باقی ۹۹ ہزار علیگ بھائیوں کو یہ توفیق کیوں نہ ہوئی کہ وہ اس ایسوسی ایشن کے ممبر بنیں؟ مسلم یونیورسٹی پر تنقید سب کرتے ہیں مسلم یونیورسٹی میں یہ سب کیوں ہوتا ہے، اور جناب مسلم یونیورسٹی میں وہ کیوں نہیں ہوتا، اور صاحب مسلم یونیورسٹی میں ہرگز یہ نہ ہونا چاہیے! اور قبلہ مسلم یونیورسٹی میں، وہ ضرور بالضرور ہونا چاہیے! جس علیگ بھائی کو دیکھیے ہر مسئلہ پر اپنی رائے عالی سے سرفراز فرمائیں گے۔ لیکن مسلم یونیورسٹی کے تئیں ان کا جو پہلا فرض ہے یعنی سارے ہندوستان کے علیگ بھائیوں میں سے ۲۵ سب سے اچھے، سب سے مفید اور کارگر علیگ بھائیوں کو منتخب کر کے مسلم یونیورسٹی کورٹ میں بھیجیں بس اس فرض کی ادائیگی کی طرف ۹۹ ہزار (۹۹ فی صد) علیگ بھائیوں کی کوئی توجہ نہیں۔ یعنی یہ حضرات مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں ہیں۔

کیوں نہیں؟ فرماتے ہیں "ارے ہمیں کسی نے ممبر بنایا ہی نہیں" کمال ہے۔ یعنی ۹۹ فی صد علیگ بھائی یہ توقع کرتے ہیں کہ کوئی ان کے دولت کدہ پر فارم لے کر آئے۔ ان سے بھروائے، ان سے ۱۲ روپے لے کر، جاکر فارم اور ۱۲ روپے ایسوسی ایشن کے دفتر میں داخل کرے اور ان کو ممبر بنوائے۔ کس کو فرصت ہے؟ کون فالتو ہے؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ علیگ بھائی خود تعلیم یافتہ ہیں، کامیاب ہیں، باہمت ہیں، صاحبِ حیثیت ہیں۔ ان میں سے ۹۹ فی صد اتنے بے حس اور لاپرواہ کیوں ہیں کہ وہ ابھی تک مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر بھی نہیں بنے؟

پھر جب ایسوسی ایشن کے ۲۵ نمائندے منتخب ہوں گے تو کہا جائے گا: ارے یہ تو نالائق ہے بالکل نکھٹو ہے، یا ایک دم ناکارہ ہے، یہ پچھڑ ہے، یہ ایسا ہے، یہ ویسا ہے۔ ظاہر ہے جب ننانوے فی صد علیگ بھائی اتنے بے اعتنا ہیں کہ وہ اس ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں بنے تو پھر ملک بھر کے سب علیگ بھائیوں میں سے بہترین منتخب ہو کر مسلم یونیورسٹی کورٹ میں کیسے پہنچ جائیں گے؟

علیگ بھائیوں کو مسلمانانِ ہند کی کریم کہنا غلط نہیں۔ لیکن جب "کریم" میں ۹۹ فی صد خود الگ ہو کر بیٹھ جائیں گے تو وہ از خود مسلم یونیورسٹی کو مسلمانانِ ہند کی کریم کے بہترین ٹیلنٹ کے ۹۹ فی صد سے محروم کر دیں گے۔ اور مجبوراً صرف ایک فی صد علیگ بھائیوں میں سے ۲۵ نمائندوں کا انتخاب ہوگا۔ پھر ترقی پسند علیگ بھائی بیٹھ کر چیخیں گے کہ ارے مسلم یونیورسٹی پر رجعت پرستوں کا قبضہ ہو گیا۔ بھلے آدمیو! جب تم ترقی پسند نیک معاش ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں ہو گے تو رجعت پرست بدمعاشوں کا قبضہ کیسے نہ ہوگا؟ اور "اسلام پسند" علیگ بھائی بیٹھ کر روئیں گے کہ ارے مسلم یونیورسٹی پر کفر پسند شیطان غالب آ گئے۔ نیک بختو! جب تم اسلام پسند فرشتے ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں ہو گے تو پھر کفر پسند شیطان غالب کیسے نہ آئیں گے؟ مدراسی علیگ بھائی چلائیں گے کہ سب یو پی والے بھر گئے، جب آپ مدراس والے ممبر ہی نہیں بنیں گے تو اور کیا ہوگا؟

چنانچہ دست بستہ التماس سب علیگ بھائیوں سے ہے کہ خدا کے واسطے جلد از جلد مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر بنیں۔ اگر ایک لاکھ علیگ بھائی ممبر بن جائیں اور ان میں ۲۵ بہترین نمائندے مسلم یونیورسٹی کورٹ میں چنے جائیں تو یہ ۲۵ ایسے ہوں گے کہ دنیا دیکھ کے دنگ رہ جائے گی۔ علیگ بھائیوں میں ایک سے ایک لائق و فائق، ایک سے ایک زوردار، ایک سے ایک دھاکڑ موجود ہے۔ علیگ بھائی نہ صرف فخر

مسلمانانِ ہند بلکہ فخرِ مسلمانانِ عالم ہیں۔ ہر ایک علیگ بھائی اپنی مسلم یونیورسٹی، اپنی مادرِ درس گاہ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ کسی اور یونیورسٹی کا اولڈ بوائے اس کی آدھی چوتھائی ایک بٹا دس بھی اپنی یونیورسٹی سے نہیں کر سکتا۔ ہر ایک علیگ مسلم یونیورسٹی پر جان چھڑکتا ہے، تو کیا بارہ روپے دے کر اپنی مسلم یونیورسٹی کا اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا ممبر بننا مشکل ہے۔

صرف ممبر بننا ہی کافی نہیں۔ میں تو کہوں گا کہ ہر جگہ علیگ بھائی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی شاخ قائم کریں۔ ہر جگہ کے علیگ بھائی اپنے علاقے سے چند ہونہار مسلم طلباء کو وظائف دے کر مسلم یونیورسٹی میں پڑھنے بھیجیں تاکہ مسلم یونیورسٹی میں ملک کے ہر حصے سے لائق اور ہونہار ترین مسلم طلبا آکر داخل ہوں جو مسلم یونیورسٹی میں چار چاند لگائیں۔

ہر علاقے، ہر صوبے، ہر شہر کے علیگ بھائی مسلم یونیورسٹی کے ساتھ رابطہ قائم رکھیں۔ اس کے حالات میں دلچسپی لیں۔ مسلم یونیورسٹی کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں، کریں۔ لیکن یہ سب کرنے سے پہلے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا ممبر بنیں۔

میں ہر ایک علیگ بھائی سے عرض کروں گا کہ کوئی نہیں آئے گا، آپ کے پاس فارم لے کر آپ سے ممبر [illegible]
اگر آپ کو دلچسپی ہے تو آپ خود خط لکھ کر فارم منگا لیجیے، اسے بھر کر بھیجیے اور منی آرڈر سے اپنا چندہ بھیج کر [illegible]

میں پہلے بھی اپیل کر چکا ہوں اور اب پھر کرتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار محفوظ رکھنے سے زیادہ اہم ہے کہ اس کا "عقلیتی کردار" بھی محفوظ رہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ملک کے تمام ذی ہوش، باشعور، ذہین اور لائق مسلمان مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں تعمیری اور مثبت دلچسپی لیں۔ اور ظاہر ہے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ سب علیگ بھائی مسلم یونیورسٹی میں دلچسپی لیں اور یہ دلچسپی صرف علی گڑھ کے قصے اور لطیفے سنانے اور علی گڑھ کے دنوں کے بارے میں گپیں لڑانے تک محدود نہ رہے، بلکہ مسلم یونیورسٹی کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر بن کر مسلم یونیورسٹی کے معاملات پر اچھا اثر ڈالیں۔

بدرالدین طیب جی

# سرسیدؒ، علی گڑھ اور میں

۱۸ برس پہلے کی بات ہے کہ میں نے اس یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے قدم رکھا۔ بس وقت تک میں علیگڑھ کے ماحول سے اجنبیت محسوس کرتا تھا۔ یونیورسٹی عمارات پر جابجا سرسید کی تصویریں آویزاں تھیں۔ میں جہاں جاتا محسوس ہوتا کہ سرسید کی پُر وقار اور مرعوب کن شخصیت ایک خاص بلندی سے مجھ پر نظریں جمائے ہوئے ہے، لیکن اجنبیت کا احساس زائل نہ ہو سکا۔

ایسا نہیں کہ سرسید میرے لئے بالکل اجنبی تھے۔ میں ان کے بارے میں تھوڑا بہت ضرور جانتا تھا۔ لیکن جو کچھ جانتا تھا اس سے میرے ذہن میں کسی عظیم شخصیت کی تصویر نہیں اُبھرتی تھی۔ غالباً اس کا آپ سبھی کو علم ہوگا کہ سرسید کی طرح میرے دادا بھی ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ان کی ترقی کے خواہاں تھے۔ لیکن دونوں کے سوچنے کا انداز مختلف تھا۔ ایک نے بمبئی میں انجمنِ اسلام قائم کی اور دوسرے نے علیگڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج۔

بہرحال قسمت کو یہ منظور تھا کہ سرسید کے قایم کیے ہوئے اس عظیم الشان ادارے کا بوجھ ایک دن میرے کندھوں پر رکھا جائے۔ اب یہ ضروری معلوم ہوا کہ میں سرسید کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کروں اور ان کے سلسلے میں جو لٹریچر دستیاب ہو اس کا گہری نظر سے مطالعہ کروں۔ میں ان کے بارے میں جتنا زیادہ پڑھتا گیا، اتنا ہی زیادہ ان کا مداح اور ان کی فہم و فراست کا قائل ہوتا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جن مذہبی معتقدات کے سبب وہ ساری زندگی ہدفِ ملامت بنے رہے، مجھے انہی نے زیادہ متاثر کیا۔

سرسید کی فکر کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا تو خیر کسی طرح ممکن نہیں اور نہ میں ان کے افکار پر کوئی طویل مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہاں موقع کی مناسبت سے ان کی صرف ایک رائے اور ان کی شخصیت کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اور یہ ہے مخالف رائے دینے کا انداز، اختلاف کرنے کا طریقہ اور مخالفوں کو جواب دینے کا ڈھنگ۔

اس سے کون واقف نہیں کہ سرسید اختلافِ رائے کو علم کے فروغ کا ذریعہ بتاتے تھے۔ لیکن اختلاف

کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ اور اس موضوع پر سرسید نے تفصیل سے لکھا ہے۔ مخالفتوں سے سرسید کو ساری زندگی واسطہ رہا، لیکن انھوں نے کبھی شائستگی کا دامن نہ چھوڑا۔ میرے دادا بدرالدین طیب جی سے انھیں سخت اختلاف تھا اور انھوں نے شدت سے مخالفت کی، لیکن متانت کے ساتھ۔ یہی رویہ میرے دادا نے اختیار کیا۔ انھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو چندہ بھی دیا اور سرسید کی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی حمایت بھی کی مختصر یہ کہ دونوں کا انداز پُروقار رہا۔ ان کے باہمی اختلافات سے بھی ایک شان ٹپکتی تھی۔

علیگڑھ میں اختلاف کل بھی تھے اور آج بھی ہیں، ہمیشہ رہیں گے اور رہنے چاہئیں۔ لیکن کیا میرا یہ خیال درست نہیں کہ کل سرسید اور بدرالدین طیب جی کے درمیان جن مسائل پر اختلافات تھے ان کی اہمیت آج کے مسائل سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کے سامنے ایسے مسائل تھے جن کی بنیاد پر آگے چل کر قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ آج ہم جن مسائل پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں وہ اکثر کم اہم، بعض اوقات غیر اہم اور کبھی کبھی تو بالکل بچکانے اور معمولی ہوتے ہیں۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ کیا ہم باہمی اختلافات کے معاملے میں سرسید کی زندگی اور ان کے خیالات سے رہنمائی حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ سب میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ میرے دل میں علیگڑھ کا درد ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں علیگڑھ نہ گیا ہوتا۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ وہاں جو ہو رہا ہے اس پر ملامت کر کے میں چپ ہو جاؤں۔ لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں۔ یہ میں کر نہیں سکتا۔ یوں کہ علیگڑھ میری رگ رگ میں اتر گیا ہے۔ مجھے اس سے جو دلی تعلق ہے اسے کسی مصلحت پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ علیگڑھ کبھی میرے دل سے محو نہیں ہو سکتا۔ وہاں کی سڑکیں، وہاں کے سبزہ زار، وہاں کے حسین درخت، عالیشان کتب خانہ، وہاں کے گھوڑے اور شکار کی پارٹیاں بھلائی جا سکنے والی چیزیں نہیں ہیں۔

ہم اس پر فخر کرتے ہیں کہ علیگڑھ یونیورسٹی ایک مسلم یونیورسٹی ہے۔ آج ملک میں ایک ایسی یونیورسٹی کی ضرورت اس دن سے بھی زیادہ ہے جب سرسید نے محمڈن کالج کی بنیاد ڈالی تھی۔ ہندوستانی مسلمان تعلیم کے میدان میں اپنے دوسرے ہم وطنوں سے آج بھی اتنے ہی پیچھے ہیں، جتنے سرسید کے زمانے میں تھے۔ زمینداری اور جاگیرداری کبھی کی ختم ہو چکیں۔ ان کے خاتمے سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور بھی خراب و خستہ ہو گئی۔ چنانچہ اب مسلم یونیورسٹی کو مالی امداد کے لئے حکومت کی طرف دیکھنا پڑتا ہے (ممکن ہے سرسید اسے بے غیرتی خیال کرتے) لیکن ذاتی طور پر مجھے اس صورت حال کا ذرا بھی ملال نہیں۔ حکومت جیسے ادارے سے امداد قبول کرنے میں ہمیں کیوں تامل ہو۔ کیا حکومت ہمارے تعاون سے نہیں چلتی اور اس میں مالی تعاون بھی شامل نہیں ہے؟ یہی امداد افراد سے حاصل ہو تو

ہم انہیں اس امداد کے عوض کیا دیں ۔ شکر گزاری کے چند الفاظ ، جھوٹی خوشامد اور عمارتوں پر ان کے ناموں کی تختیاں لگا کر ان کی فیاضی کا اعتراف ؟

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ صرف مسلم یونیورسٹی نام رکھ دینے سے کام پورا نہیں ہوتا ۔ اسے صحیح معنی میں مسلم یونیورسٹی ہونا چاہیے اور یہ کہ نہ اسے صرف مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتیں پوری کرنی چاہئیں ۔ بلکہ زندگی کے چند شعبوں میں مسلمانوں کی رہبری کرنی چاہیے ۔ ان کے تمام مسائل پر غور یہیں ہوگا ۔ ان کا حل یہیں سے نکلے گا ۔ اسے وہ تدابیر کرنی ہوں گی جن سے مسلمان تعلیم ، سیاست ، اقتصادیات جملہ شعبوں میں آگے بڑھیں اور سربلند ہو کر جئیں ۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک اہم تعلیمی امانت ہے ۔ ایک عظیم ادارہ ہے اور ہماری قوم کی تہذیبی امانت ہے ۔ علیگڑھ صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب وہ ایسا ہو کہ ہم سب اس پر فخر کر سکیں ہمیں غیر ضروری کاموں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ان عظیم مقاصد کو اپنانا ہوگا ، جو سرسید اور ان کے ساتھیوں کے پیش نظر تھے ۔

●●

ڈاکٹر محمد شریف خاں

# اقلیت کے ثقافتی اور تعلیمی حقوق کی حقیقت

ہمارے ملک کا دستور جب تیار ہو رہا تھا، تو دستور ساز اسمبلی کی ایک مشاورتی کمیٹی نے ۲۷ جولائی ۱۹۴۷ء کو مندرجہ ذیل سفارشات کیں۔

۱ - اقلیتوں کے لئے پارلیمنٹ اور اسمبلی میں آبادی کی بنیاد پر نمائندگی کے اصول کو منظور کیا جائے۔

۲ - اقلیتوں کو آبادی کی بنیاد پر سرکاری نوکریوں میں نشستیں دی جائیں۔

۳ - اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے خصوصی افسران کا تقرر کیا جائے۔

مشاورتی کمیٹی کی ان سفارشات سے اقلیتوں کو بہت تسلی ہوئی اور ان کو یہ اطمینان ہوا کہ دوران جنگ آزادی ملکی سیاست میں جو فرقہ پرستی کا عنصر شامل ہو گیا تھا، وہ اب ختم ہو جائے گا۔

ان سفارشات کو دستور ساز اسمبلی نے اگست ۱۹۴۷ء میں بغیر کسی ترمیم و تنسیخ منظور کر لیا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں دستور ہند کا جو مسودہ تیار ہوا، اس میں مذکورہ بالا سفارشات کو دفعات کی شکل میں شامل کر لیا گیا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں دستور کی ڈرافٹنگ کمیٹی نے اقلیتوں سے متعلق ان دس دفعات کو دستور کے باب چودہ میں "اقلیتوں سے متعلق خصوصی انتظامات" کی سرخی کے تحت دفعات ۲۹۲، لغایت ۳۰۱ کے نمبر پر تحریر کیا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں دستور ساز اسمبلی کی مشاورتی کمیٹی نے سکھوں کے لئے بھی ان جگہوں کے تحفظ کی سفارش کی۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں کچھ ممبران نے یہ تجاویز رکھنی چاہیں کہ اقلیت کو دیے جانے والے تحفظ کو ختم کیا جائے، مگر اس پر غور کرنا ملتوی کر دیا گیا۔

۱۱ مئی ۱۹۴۹ء کو مشاورتی کمیٹی کے اجلاس میں بہت سے ممبران نے تقسیم ہند کے بعد مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کی دفعات کو ختم کرنے کی تجویز رکھی اور ۲۵ مئی ۱۹۴۹ء کے دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں سردار پٹیل نے اس تجویز کی زبردست حمایت کی، تو مذہبی بنیاد پر اقلیت کو دیے گئے تحفظ کو ختم کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ دستور کے مسودہ میں شامل ہو چکا تھا۔

ان تحفظ کی دفعات کو نکال دینے کے بعد یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان کی جگہ اقلیتوں کو ثقافتی اور تعلیمی حقوق دے دیے جائیں، تو دستور ہند کی دفعات ۲۹ اور ۳۰ کے تحت مندرجہ ذیل الفاظ میں ان کو مرتب کیا گیا۔

" دفعہ ۲۹ (۱) بھارت کے علاقہ میں یا اس کے کسی حصہ میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقہ کو جس کی اپنی الگ جداگانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت ہو، اس کو محفوظ رکھنے کا حق ہوگا۔

(۲) کسی شہری کو ایسے تعلیمی ادارے میں جس کو مملکت چلاتی ہو، یا جس کو مملکتی فنڈ سے امداد ملتی ہو، داخلہ دینے سے محض مذہب، نسل، ذات، زبان یا ان میں سے کسی کی بنا پر انکار نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ ۳۰۔ (۱) تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں، یا زبان کی اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کے انتظام کرنے کا حق ہوگا۔

(۲) مملکت تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ کسی اقلیت کے زیر انتظام ہے۔ خواہ وہ اقلیت مذہب کی بنا پر ہو، یا زبان کی۔

اس مضمون کا مقصد یہ جائزہ لینا ہے کہ دفعات ۲۹ اور ۳۰ اقلیتوں کے لئے کہاں تک مفید ثابت ہوئی ہیں اور وہ مقصد حاصل کر سکی ہیں جن کے لئے ان کو دستور میں سیاسی حقوق کا نعم البدل سمجھ کر رکھا گیا تھا؟ دستور کے نفاذ سے کر اب تک جو قانونی پیچیدگیاں اور دشواریاں اقلیت کے سامنے ان دفعات کی وجہ سے آئیں، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اقلیت میں کس کو شامل کیا جائے گا؟ دستور ہند اس کی وضاحت نہیں کرتا۔ سپریم کورٹ کے ایک مشورہ کے مطابق اس فرقہ کو اقلیت مانا جائے جس کی آبادی، کل آبادی کا ۵۰ فیصد سے کم ہو۔ مگر کل آبادی کس کی شمار کی جائے، ملک کی، ریاست کی، کمشنری کی، ضلع کی، یا دیہات کی؟

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ۵۰ فی صد اتنے حصہ کی آبادی کا شمار کیا جائے جتنے حصے پر ان دفعات کی سہولت فراہم کرنا ہے، تو کیا ممکن نہیں ہے کہ اتنے حصہ میں کسی بھی ایک زبان یا مذہب کے لوگ ۵۰ فی صد سے زائد نہ ہوں، تو کیا اس حصہ میں تمام مذاہب اور زبان والوں کو اقلیت قرار دیا جائے گا؟ اگر ۵۰ فی صد کی حد ریاست کی آبادی کو تسلیم کیا جائے، تو کشمیر میں مسلمانوں، ناگالینڈ میں عیسائیوں اور پنجاب میں سکھوں کو وہ ثقافتی اور تعلیمی حقوق حاصل نہ ہوں گے جو ان کے ہم مذہبوں کو دیگر ریاستوں میں حاصل ہوں گے۔ کیونکہ ان ریاستوں میں ان کی ۵۰ فیصد سے زاید آبادی ہے۔ کیا یہ مضحکہ خیز بات نہیں ہوگی؟ اس کے علاوہ کوئی اقلیت مختلف ریاستوں میں اپنے

تعلیمی ادارے قائم کرنا چاہے، تو کچھ ریاستوں میں تو اداروں کو دفعہ ۳۰ کا تحفظ حاصل ہوگا اور کچھ ریاستوں
وہ اس سے محروم ہوگی؟

مذہبی اقلیت میں کن مذاہب کو شامل کیا جائے، ہمارے دستور نے اس کی بھی وضاحت نہیں کی ہے

(۲) لسانی اقلیت میں کن لوگوں کو شامل کیا جائے؟ کیا پنجاب میں آریہ سماجی اس لئے لسانی اقلیت
تصور کیے جائیں کیونکہ ان کا رسم الخط دیوناگری ہے، جب کہ وہاں کی اکثریت سکھوں کا رسم الخط گورمکھی ہے
کیا یو۔پی کے لوگ بنگال میں لسانی اقلیت تصور کیے جائیں گے؟

(۳) کسی تعلیمی ادارے کو اقلیتی تعلیمی ادارہ تسلیم کرنے سے قبل کیا ثبوت طلب کرنے چاہئیں
کیا صرف اس کا دعویٰ ہی کافی ہے؟ کیا دعویٰ کے ساتھ حلفیہ بیان بھی طلب کیا جائے؟ کیا ادارہ کی تاریخ
سابقہ دیکھ کر ہی اقلیتی ادارہ تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

(۴) کیا دفعات ۲۹ اور ۳۰ کے تحفظ سے کسی تعلیمی ادارے کو اس لئے محروم کیا جا سکتا ہے
کیونکہ ابتدائی درخواست تمام شہریوں کی تعلیم کے لئے تھی، نہ کہ صرف اقلیت کی تعلیم کے لئے یا ادارہ کا نام
کسی فرد کے نام پر تھا، نہ کہ اقلیت کے نام یا ادارہ کی مجلس منتظمہ میں غیر اقلیتی فرقہ کے لوگ بھی شامل ہیں یا
ماضی میں رہے ہیں؟

(۵) دفعات ۲۹ اور ۳۰ ثقافتی اور تعلیمی حقوق کے تحفظ کے لئے ہیں۔ دفعہ ۲۹ کو "اقلیتوں کے
مفادات کا تحفظ" کی سرخی کے تحت رکھا گیا ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ پوری دفعہ ۲۹ میں اقلیت کا
کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس دفعہ کے پہلے حصہ میں "شہریوں کے کسی طبقہ" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو
کسی صورت میں اقلیت تک محدود نہیں کیے جا سکتے۔ اس دفعہ کے دوسرے حصہ میں تو "شہری" کا لفظ
استعمال کیا ہے۔ اقلیت کا استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ اس لئے دفعہ ۲۹ کے تحت زبان، رسم الخط اور ثقافت
کا تحفظ اقلیتوں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ شہری کے لئے ہے جو اس روح کے منافی ہے۔ جس کی بنیاد پر
دفعات ۲۹ اور ۳۰ دستور ہند میں شامل کی گئی تھیں۔

(۶) دفعہ ۳۰ کے تحت اقلیتوں کو اپنی پسند کے ادارے قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے
مگر ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیاں کسی کالج کا الحاق کرنے سے قبل شرائط لگاتی ہیں۔ ان سے اقلیتی
کالجوں کو مستثنیٰ رکھا جاتا ہے اور اگر اقلیتی تعلیمی اداروں کو بھی ان تمام شرائط کو پورا کرنا ضروری ہے

اگر یہی تعلیمی اداروں کو پوری کرنی پڑتی ہیں، تو پھر دفعہ ۳۰ کے تحت اقلیتی حقوق کی کیا خصوصیت رہ جاتی ہے؟ کیا کوئی عدالت کسی یونیورسٹی کو یہ مجبور کر سکتی ہے کہ کسی اقلیتی ادارہ کا الحاق دفعہ ۳۰ کے تحت کرے؟ اور اگر عدالت ایسا کرنے کی مجاز نہیں ہے، تو پھر اقلیت کا تحفظ بے معنی ہو جاتا ہے۔

کیا کوئی اقلیت اپنی یونیورسٹی دفعہ ۳۰ کے تحت قائم کرنا چاہے، تو بغیر اسمبلی پارلیمنٹ کی منظوری کر سکتی ہے؟ اور اگر اسمبلی یا پارلیمنٹ اس کو منظوری دیدے، تو وہ یونیورسٹی اقلیتی ادارے کی فہرست سے اس لئے خارج ہو جائے کیونکہ اس کا قیام پارلیامنٹ یا اسمبلی کی منظوری سے ہوا ہے؟ تو پھر اقلیت کون سی صورت رہ جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ دفعہ ۳۰ کے تحفظ کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لئے کوئی کالج یا کوئی یونیورسٹی قائم کر سکے؟ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے ایکٹ میں جو آخری ترمیم ہوئی ہے اس کے تحت بھی یونیورسٹی کو دفعہ ۳۰ کے تحت اقلیتی تعلیمی ادارہ کا تحفظ حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ پورے ایکٹ میں کسی جگہ بھی دفعہ ۳۰ کا ذکر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ترمیمی بل کے ساتھ جو اغراض و مقاصد پارلیمنٹ کے سامنے تحریری شکل میں لائے گئے، ان میں بھی دفعہ ۳۰ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

(۷) بھارت کی تمام یونیورسیٹیوں اور کالجوں نے ذریعہ تعلیم کچھ زبانوں تک محدود کر رکھا ہے۔ اس صورت میں اقلیتیں دفعہ ۳۰ کے تحت اپنی زبان کو ذریعہ تعلیم کس طرح بنا سکتی ہیں؟ مثال کے لئے یوپی کی کوئی ریاستی یونیورسٹی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کے کسی کالج میں اردو ذریعہ تعلیم ہو۔ اسی طرح کوئی بھی ریاستی یونیورسٹی اردو میں پرچہ کے جوابات لکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ پھر دفعہ ۳۰ کے تحفظ کا اقلیت کو کیا فائدہ ہے؟

تو پھر کیا ایسے حالات میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا جائے کہ دفعہ ۳۰ صرف پرائمری اور ثانوی تعلیم کے اداروں کے تحفظ کی ذمہ داری لیتی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ایسا کوئی تحفظ عطا نہیں کرتی؟

(۸) اگر ثانوی درجات پر بھی اس کا جائزہ لیا جائے، تو یوپی بورڈ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کا تسلیم شدہ کوئی تعلیمی ادارہ اردو ذریعۂ تعلیم اختیار کرے! تو کیا اس کو دفعہ ۳۰ کی خلاف ورزی نہیں مانا جائے گا؟

(۹) دفعہ ۳۰ کے تحت اقلیت کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کو انتظام چلانے کا حق ہے۔ کیا وہ ادارہ اپنی اقلیت کے طلباء کے داخلہ کے لئے کچھ نشستیں محفوظ کر سکتا ہے؟

یا اکثریت اور دیگر اقلیتوں کے طلبا کا داخلہ بند کرسکتا ہے؟ اگر وہ ایسا کرسکتا ہے، تو کیا وہ دفعہ دستور ہند کی دفعہ ۱۵ کی خلاف ورزی تصور نہیں کی جائے گی؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر دفعہ ۳۰ کے تحت اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے کے تحفظ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ یاد رہے کہ دفعہ ۱۵ میں درج ہے: "مملکت محض ذات، جنس، یا مقام یا پیدائش یا ان میں سے کسی کی بنا پر کسی شہری کے خلاف امتیاز نہیں برتے گی۔"

(۱۰) کسی بھی ادارے کو چلانے کے لئے ایک مجلس منتظمہ ہوتی ہے۔ کیا کسی اقلیتی تعلیمی ادارے پر یہ شرط لگائی جاسکتی ہے کہ اس کو منظوری اسی وقت دیجائے گی جب وہ بورڈ یا یونیورسٹی کے نامزد کردہ کو، یا پرنسپل کو یا اساتذہ کے نمائندوں کو، یا ان میں سے ایک سے زیادہ کو اپنی مجلس منتظمہ میں شامل کرلے؟ اور کوئی بورڈ یا یونیورسٹی ایسی شرط لگاتی ہے تو وہ دفعہ ۳۰ کی خلاف ورزی ہے یا نہیں؟ اگر وہ ادارہ ان شرائط کو اس لئے مان لیتا ہے، تاکہ اس کو منظوری حاصل ہوجائے، تو کیا یہ شرائط اس تعلیمی ادارہ کو اس بات کے لئے مجبور نہ کریں گی کہ وہ اپنے اسٹاف پر صرف اقلیت کے لوگوں کا ہی تقرر کرے، تاکہ پرنسپل ہو کر یا اساتذہ کا نمائندہ ہو کر غیر اقلیتی فرقہ کا شخص مجلس منتظمہ میں شامل نہ ہوجائے؟ کیا اس مجبوری کا یہ خراب نتیجہ نہ ہوگا کہ وہ اقلیتی تعلیمی ادارہ اچھے غیر اقلیتی اساتذہ کے استفادے سے محروم ہوجائے گا؟

(۱۱) کیا کوئی یونیورسٹی ایسا قانون بنا سکتی ہے کہ اس کی منظوری کے بغیر کسی ملحق کالج میں کسی اسٹاف ممبر کی تقرری نہیں ہوسکتی؟ اور کیا ایسی کوئی پابندی دفعہ ۳۰ کے تحت اقلیتی تعلیمی ادارہ اپنی پسند سے چلانے میں دخل اندازی نہیں ہوگی؟ کیا یونیورسٹی اساتذہ کی تعلیمی لیاقت، تجربہ اور عمر وغیرہ کے سلسلہ میں ایسا قانون بنا سکتی ہے، جو اقلیتی تعلیمی اداروں اور غیر اقلیتی تعلیمی اداروں پر یکساں طریقہ سے نافذ ہوں؟ اگر ایسا ہے تو دفعہ ۳۰ کیا تحفظ عطا کرتی ہے؟

ان تمام قانونی پیچیدگیوں اور دشواریوں کے پس منظر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دفعہ ۲۹ اور دفعہ ۳۰ جن سیاسی حقوق کے محروم ہونے کے معاوضہ کے طور پر دستور ہند میں رکھی گئی تھیں وہ کم ا ثابت ہوئیں اور دستور ساز اسمبلی کے ممبران کی خواہشات کو پورا کرنے میں ناکام رہیں۔

اصغر عباس۔

## علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں:

# ہندوستانی مسلمان: ان کی تعلیم اور روزگار کے مسائل پر دو روزہ سیمنار۔ (ایک رپورٹ)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک دو روزہ سیمنار ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل ان کی تعلیم اور روزگار کے موضوع پر ہوا۔ یہ سیمنار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو نئی دہلی کے تعاون سے منعقد کیا۔

اس سیمنار میں پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی، گورنر بہار، مرکزی وزیر سیاحت جناب خورشید عالم خاں، اقلیتی کمیشن کے چیرمین جسٹس محمد حمید اللہ بیگ، جناب این۔ سی سکسینہ جوائنٹ سکریٹری اقلیتی کمیشن اور جناب حکیم عبد الحمید صاحب دہلوی، متولی ہمدرد۔ دہلی کے علاوہ ملک کے آئے ہوئے دانشوروں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کُل آبادی کا [illegible] فیصد ہے لیکن جب ہم ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے تناسب میں اس کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی پسماندگی کی تشویشناک کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے تیزی سے ترقی نہ کرنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ یہاں مسلمان اپنی تعلیمی پسماندگی کی بنا پر ملک کی ترقی میں وہ حصہ نہیں لے پا رہے ہیں جو انھیں لینا چاہیے۔ مسلمانوں کے مسائل پر یہ دوسرا سیمنار تھا جو علیگڑھ میں منعقد ہوا۔ اس طرح کے اجلاس ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ہوں گے اور ان کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا اندازہ لگانا اور ان مسائل کو حل کرنے کی راہیں تلاش کرنا ہے۔

سیمنار کا آغاز ۵ اگست ۱۹۸۳ء کو یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ حاضرین کی تعداد تقریباً دو ہزار سے زیادہ تھی۔ افتتاحی اجلاس کی کارروائی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب کے صدارتی خطبہ سے شروع ہوئی۔ انھوں نے سیمنار کے مقاصد کا ذکر کیا اور فرمایا کہ سیمنار میں جو دانشور شریک ہوئے ہیں ان کی تحقیقات سے ہماری حکومت اور ملک کے دوسرے فرقوں کا ضمیر جاگے گا اور وہ مسلمانوں کی بے دلی کے اسباب پر غور کریں گے۔ اس سیمنار کے نتائج مسلمانوں میں ملک کی ترقی کے لئے ایک جوش اور لگن پیدا کریں گے۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی کے عوامل کا ذکر کرتے ہوئے وائس چانسلر نے کہا کہ مسلمانوں کی تعلیم کی طرف عدم توجہی، طرزِ کہن پر اڑنا، پڑھے لکھے مسلمانوں کے درمیان ذہنی اور نفسیاتی فاصلہ اور عدم تعاون کے علاوہ

فقدان اور مسلمانوں میں غیر محفوظ ہونے کا احساس، یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں مایوسی اور بے اعتمادی کا رجحان پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ حد سے بڑھا ہوا جذبۂ انفرادیت اور مختلف مراحل پر مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک، یہ وہ مسائل ہیں جو فوری توجہ کے طالب ہیں۔ جناب سید حامد نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی اخلاقی اور اصلاحی مہم میں پورے خلوص کے ساتھ حصہ لیں، اسلام کی تعلیم سے فیضان اور بصیرت حاصل کریں اور ملک کے دوسرے فرقوں سے مل جل کر ہندوستان کی ترقی میں دل و جان سے لگ جائیں۔

اپنے افتتاحی خطبہ میں ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے موجودہ تعلیمی نظام میں تبدیلی لانے اور جدید سائنسی نقطۂ نظر اپنانے پر زور دیا۔ ان کی رائے میں انڈر گریجویٹ سطح پر پیشہ وارانہ کورسز کھولنے سے ہندوستان کی پسماندگی عام طور پر اور مسلمانوں کی خصوصی طور پر دور ہوگی۔ اس کے علاوہ تعلیمی اداروں میں تعلیمی ماحول پیدا کرنے اور مقابلے کے امتحانات میں شرکت کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کرنے سے مسلمانوں میں بیروزگاری کا مسئلہ کم پیدا ہوگا۔

اس سیمینار کے مہمان خصوصی جسٹس محمد حمید اللہ بیگ نے کہا کہ اگر مسلمان کڑی محنت کریں، تو دور حاضر کی دنیا میں ان کی اہمیت تسلیم کی جائے گی۔

سیمنار کی کنوینر پروفیسر مسز کشور شیر خاں نے حاضرین کو بتایا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سماجی علوم کا ایک بین العلومی تحقیقاتی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ اس مرکز کا بنیادی کام ان مسائل کی تحقیق ہے جن کے حل سے سماجی انصاف اور معاشی استحکام حاصل ہوگا۔ یہ مرکز عملی اور نظریاتی طور پر ان مسائل پر خصوصی توجہ دیگا جن کا تعلق ہمارے ملک کی موجودہ ترقی سے ہے۔

اقلیتی کمیشن کے جوائنٹ سکریٹری جناب این۔ سی۔ سکسینہ نے اپنے تحقیقی مقالے میں کہا کہ مختلف ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ اقلیتی تعلیمی اداروں میں بھی مسلمان غیر مسلموں سے پیچھے ہیں۔ جناب سکسینہ کی رائے میں اس کا بنیادی سبب مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہے۔ لیکن ساتھ ہی امتیازی برتاؤ کی شکایت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں زور دیا کہ بڑی تعداد میں تعلیمی اور پیشہ ورانہ اداروں کو کھولنے کی ضرورت ہے، خاص طور سے ان جگہوں پر جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہو۔ جناب سکسینہ نے کہا کہ اقلیتی اداروں کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں عملی مشکلات کو دور کیا جائے، اور مسلمانوں کی تعلیم اور روزگار کے سلسلے میں مستند اعداد و شمار اکٹھے کئے جائیں۔ ایسا کرنے سے مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی شکایت کا جواب دیا جاسکے گا

اقلیتی اداروں کو کشادہ دلی سے امداد دینی چاہیے جو عملی ملازمتوں کے لیے مسلمان طلبا کو تیار کرتے ہیں۔ مسٹر سکسینہ نے مزید کہا کہ سرکاری اداروں اور پبلک سیکٹر میں تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ ملازمین کے لئے معروضی قسم کے تحریری امتحانات ہونے چاہئیں۔ ریاستی حکومتوں، مرکزی حکومت اور دوسرے متعلقہ اداروں کو چاہیے کہ وہ اقلیتی کمیشن کو ایسے اعداد و شمار بھیجیں جن سے یہ پتہ چل سکے کہ ان کے یہاں اقلیتی فرقوں کی نمائندگی کا تناسب کیا ہے۔ مئی ۱۹۸۳ء میں وزیر اعظم مسز گاندھی نے اقلیتی فرقوں کی ترقی کے لئے جو ہدایتیں بھیجی ہیں ان پر دیانتدارانہ طور پر لازمی طور پر عمل کرنا چاہیے۔

اس سیمنار میں تقریباً تیس مقالے پیش کیے گئے۔ سیمنار کا بنیادی مقصد ان معاشی اور تعلیمی مسائل کی نشاندہی تھا جو اکثریتی فرقے کے مقابلے میں مسلمانوں کو پسماندہ بنائے ہوئے ہیں۔ اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ صحیح اعداد و شمار ہی سے اقلیتی فرقے کے نقصان اور خسارے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ان کے مسائل کے حل کے لئے مناسب لائحہ عمل تیار کیا جا سکتا ہے۔ سیمنار کے دوسرے مقالات میں مسلمانوں کی ذہنی، معاشی، تعلیمی اور سماجی پسماندگی کے محرکات کا جائزہ اعداد و شمار کے ذریعہ لیا گیا۔ اس امر پر تمام مقالہ نگار متفق تھے کہ آبادی کے تناسب سے مسلمان تعلیم اور روزگار کے میدان میں پیچھے ہیں اور روزگار اور ملازمتوں میں ان کا حصہ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کو بیدار کرنے کا فریضہ رضاکارانہ تنظیموں کو لینا چاہیے۔ مقالہ نگاروں نے علیگڑھ، کاشی پور، رام پور، بڑودہ، بجنور، پونے، کیرلا اور آندھرا پردیش کے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی کے متعلق اہم اعداد و شمار پیش کیے جو آئندہ اس سلسلے کی تحقیقات کے لئے بہت مفید ہوں گے۔

مرکزی وزیر سیاحت جناب خورشید عالم خاں نے اپنی اختتامی تقریر میں فرمایا کہ ہمارے دستور میں اقلیتی فرقوں کو سماجی انصاف، مذہبی آزادی اور تعلیمی اور ثقافتی تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ لیکن یہ ضمانت اسی وقت کارگر ہو سکتی ہے جبکہ اقلیت مستقل ہوشیار رہے۔ اکثریت کے ساتھ اس کا رشتہ دوستانہ ہو اور حکومت یہ تہیہ کیے ہوئے ہو کہ جو وعدے آئین میں کیے گئے ہیں وہ بہر صورت ایفا ہوں گے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ ہندوستان کی اقلیتوں کو ملک کی دفاعی افواج، پولس اور دوسری فورسز میں مناسب نمائندگی ملنی چاہیے۔ مذہب کی بنیاد پر جو غیر مساوی سلوک روا رکھا جاتا ہے اس کا سدباب حکومت کو کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو خود آگے بڑھ کر ملک کی تعمیر میں جوش، لگن اور خوش دلی سے حصہ لینا چاہیے۔

سیمنار کی تین نشستیں ہوئیں۔ آخری اجلاس میں یہ تجویزیں منظور ہوئیں:

- سرکاری اور غیر سرکاری سائنسی اور تکنیکی اداروں میں مسلمانوں کی تعلیم کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی جائے۔

• علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں پیرا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی تجویز پر فوری عمل کی ضرورت ہے۔ • ...
سطح پر ہی نوجوانوں کے لئے ملازمتوں کے سلسلے میں گائڈنس سروسز کا انتظام ہونا چاہیے۔ • اقلیتی کمیشن کو ...
اعداد و شمار جمع کرنے چاہئیں جس سے ارباب حکومت کو اقلیتی فرقہ کے مستقبل کو بہتر بنانے کی تدبیروں میں مدد ...
لائے علاوہ بھی اقلیتی فرقوں کے حق میں ہموار ہو سکے۔

اس سیمینار میں یہ سفارش بھی کی گئی کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو کے تعاون ...
ایک ایسا یونٹ علیگڑھ میں قائم کیا جائے جس کا مقصد صحیح اعداد و شمار اکٹھا کرنا ہو، تاکہ ان سے مسلمانوں کی
ذہنی اور معاشی پسماندگی دور کرنے کے پروگرام میں مدد ملے۔

ڈاکٹر ضیاءالدین انصاری

# مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

سرسید بڑے دور اندیش اور دوررس انسان تھے۔ قوم کا درد، ان کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا، ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مسلم قوم کی اصلاح اور اس کی ترقی کی فکر میں صرف ہوا۔ ان کی زندگی سعی پیہم، جہد مسلسل اور یقین محکم کی عملی تصویر تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کیے۔ یہ بات ثواب مسلّم ہو چکی ہے کہ موجودہ طرزِ تعلیم کو وہ مسلمانوں کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے مسلمانوں میں مغربی طرزِ تعلیم کے نظام کو عام کیا۔ اپنی اس اسکیم کو مقبول عام بنانے کے لئے انھوں نے مختلف ذرائع اختیار کیے۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی کام تو مدرستہ العلوم مسلمانان کے قیام کا تھا، جو ترقی کی منازل طے کر کے آج ہمارے سامنے "مسلم یونیورسٹی" کی شکل میں موجود ہے۔ اور ملک و بیرون ملک کے تشنگانِ علم کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں سرسید کو جس شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ لیکن سرسید پختہ عزم اور کوہ ہمالہ کی طرح بلند حوصلہ انسان تھے۔ حالات کے سامنے سپر انداز ہو جانا، یا ہمت ہار بیٹھنا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ عوام کی رائے ہموار کرنے اور اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ذرائع اختیار کرتے کہ ان کے مخالف بھی ان کی صداقت اور خلوص اور ان کے منصوبوں کی افادیت کے قائل ہو جاتے۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی مغربی تعلیم کی اسکیم کی مخالفت کی جا رہی ہے، تو انھوں نے اس تحریک کو مقبول بنانے کے لئے کئی ترکیبیں اپنائیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو ۱۸۶۳ء میں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا بنیادی مقصد مغربی زبانوں کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ شائع کرنا تھا۔ اسی سلسلہ میں ۱۸۶۶ء میں انھوں نے "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" جاری کیا۔ پھر ۱۸۷۰ء میں اپنا مشہور زمانہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" نکالا، جس میں تاریخی، معاشرتی اور ادبی مضامین شائع ہوتے۔ اس کو غیر معمولی قبول عام نصیب ہوا، اور سرسید کے مشن کو غیر معمولی تقویت حاصل ہوئی۔ لیکن سرسید نے اسی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ انھوں نے ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت کو بھی محسوس کیا جس میں ملک کے

دانش ور، عالم، ماہرینِ تعلیم اور دردمندانِ قوم یکجا ہو کر مسلمانوں کی تعلیمی حالات کا جائزہ لیں
میں تعلیم عام کرنے کے ذرائع تجویز کریں۔ اس کے لیے انھوں نے ۱۸۸۶ء میں "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس"
کی۔ مختلف اوقات میں اس کے نام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ شروع میں اس کا نام "محمڈن ایجوکیشنل
رکھا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں اس کا نام "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کر دیا گیا۔ پانچ سال بعد ۱۸۹۵ء میں
پھر نام میں تبدیلی کی گئی۔ اب اس کا نام "محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس" کر دیا گیا۔ بعد از
۳۶ ویں سالانہ اجلاس (۱۹۲۳ء) میں صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی تحریک پر
محمڈن کو "مسلم" سے بدل دیا گیا اور اس طرح اس کا نام "مسلم اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس"
آج کل یہ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے معروف ہے۔

کانفرنس کے قیام پر روشنی ڈالتے ہوئے "حیاتِ جاوید" میں مولانا حالی رقمطراز ہیں:-

"محمڈن کالج کی حالت جب کسی قدر اطمینان کے قابل ہو گئی، تو سرسید کو یہ خیال ہوا کہ
اگر بالفرض یہ کالج ہر طرح مکمل ہو گیا، تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور
ایک کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی قوم
جو ہندوستان کے دور دراز حصوں میں پھیلی ہوئی ہے، وہ سب ایک دوسرے کی حالت
سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف صوبوں اور مختلف اضلاع کے لوگ
کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں، اپنے اپنے خیالات، قومی تعلیم اور قومی ترقی کی
نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں۔ ہر حصہ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا حال تمام
قوم کو معلوم ہو، اور مسلمان جو باوجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں
ان میں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اس بنا پر جیسا کہ سرسید نے پہلے اجلاس میں بیان
کیا تھا، یہ کانفرنس قائم کی گئی اور اس کا پہلا اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علی گڑھ
محمڈن اینگلو اورینٹل کالج منعقد ہوا۔"

اس طرح آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا وجود عمل میں آیا۔ اس کانفرنس نے مختلف
پر قوم کی بھرپور خدمت کی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونے میں اس کی مدد کی۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ
کارکردگی میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور اس کے اغراض و مقاصد میں تنوع آتا گیا، لیکن ابتدا میں جو

طے پائے تھے، وہ حسب ذیل تھے:

۱ - " مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا۔

۲ - مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدد سے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تابمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

۳ - علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علماء اسلام جابجا طور پر خود دیتے ہیں، اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم و جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔

۴ - جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے، اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل پیدا ہو گیا ہے، اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔

۵ - قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لئے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے، ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا"

ان مقاصد کی تکمیل ہمیشہ اس کانفرنس کے پیش نظر رہی۔ یہ مقاصد چونکہ نیک اور خلوص نیت پر مبنی تھے، اس لئے جلد ہی کانفرنس کو مقبولیت حاصل ہو گئی اور مختصر سی مدت میں اس نے ملک گیر تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ابتدا میں اس کے خلاف آوازیں اٹھیں۔ دراصل مخالفت سرسید کا مقدر بن چکی تھی۔ ان کا مغربی تعلیم کا تصور پہلے ہی شدید مخالفت کا موضوع بن چکا تھا۔ اس لئے ہر وہ عمل اور ہر وہ اسکیم جس کا مقصد اس طرز تعلیم کو فروغ دینا ہو، اس کی مخالفت فطری اور بدیہی تھی۔ چنانچہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی مخالفت ہوئی اور اسی زور و شور سے ہوئی جس سے کالج کو ہدف مخالفت بنایا جا رہا تھا۔ اس کا بڑا مدلل، واضح اور پُر زور جواب نواب محسن الملک نے ۱۸۹۴ء میں کانفرنس کے آٹھویں اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں ان الفاظ میں دیا:

" مانا ہم نے مغربی علم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا۔ مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا، مانا کہ ہم نے کانفرنس قائم کر کے مسلمانوں کو بہکایا۔ مگر ہم پر طعن کرنے والے خدا کے لئے یہ بتادیں کہ انھوں نے اپنی قوم کے لئے کون سی کوشش کی؟ اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کون سی کوشش کی؟ اگر ہم نے مسلمانوں کے عقیدہ و کنشت بنایا، مگر بیت اللہ کو کس نے بنایا ہوا بیت المقدس کہاں ہے، جہاں جا کر ہم سجدہ کریں؟ اگر ہم نے اپنے بھائیوں کو واسطے ایک نئی کانفرنس قائم کی، ہم

قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا۔ مگر ہمارے دوست براہ مہربانی یہ فرمادیں کہ اُنھوں نے قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے اقوم کی مصیبت پر ماتم کرنے کے لیے کون سی مجلس بنائی تھی کہ ہم وہیں جاکر نوحہ کریں اور سر پیٹیں؟ ہم اگر مضر یا بیہودہ کام کرنے کے گنہگار ہیں تو قوم کو مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے؟"

اس تحریک کو مقبول اور کامیاب بنانے کے لئے سرسید اور اُن کے رفقانے بہت سے اقد کیے جو بڑے کارگر ثابت ہوئے۔ اُن سے کانفرنس کی ہردلعزیزی میں اضافہ ہوا اور اُس کی اہ مسلّم ہوئی۔ ان میں ایک تدبیر تو یہ اختیار کی گئی کہ اگرچہ کہ اس کا صدر دفتر علیگڑھ میں تھا اس کے سالا ملک کے مختلف مقامات پر بھی کیے جاتے اور اس طرح دُور دراز کے علاقوں تک اس کی آواز جاتی۔ ہر سال نئے شہر کا انتخاب کیا جاتا اور وہاں جلسہ ہوتا۔ چنانچہ علیگڑھ کے علاوہ رنگون، پشاور، لاہور، امرتسر، سورت، بمبئی، کلکتہ، مدراس، پونا، جبل پور، ناگپور، پٹنہ الٰہ آباد، آگرہ، دہلی، میرٹھ، شاہجہاں پور وغیرہ جیسے دُور دراز شہروں میں اس کے اجلاس منعق گئے جس سے ملک کے کونے کونے میں اس کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

دوسری اہم اور کارگر ترکیب یہ اختیار کی جاتی کہ ان اجلاسوں کی صدارت کے لئے ملک کی نامور اور بااثر شخصیات کا انتخاب کیا جاتا جس سے کانفرنس کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا او وقار میں چار چاند لگ جاتے۔ چنانچہ جن حضرات نے منصب صدارت کو اعزاز بخشا، اُن میں مولو نواب اسحاق خاں، محسن الملک، عماد الملک، جسٹس شاہ دین ہمایوں، سر آغا خاں، بدرالدین طی سر تھیوڈر مارلین، مولانا حالی، مہاراجہ محمود آباد، عبداللہ یوسف علی، میاں محمد شفیع، ابراہیم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر عبدالقادر، سر راس مسعود، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، نواب زادہ لیاق ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ جیسی نادر روزگار شخصیات کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ذرا بھی شک نہیں کہ کسی بھی تحریک سے ان حضرات کی وابستگی اُس کی کامیابی کی ضمانت ہوسکتی ہے اجلاسوں کا اہتمام بڑے پیمانے پر کیا جاتا۔ خود سرسید کا یہ عالم تھا کہ جس شہر میں اجلاس منعقد کافی پہلے سے وہاں پہنچ جاتے اور تمام انتظامات کی نگرانی خود کرتے۔

کانفرنس میں جو صدارتی خطبے پڑھے جاتے، وہ بھی کئی حیثیتوں سے اہم ہوتے۔ ان میں

کی مکمل شخصیت اُبھر کر سامنے آتی۔[55] اس کے خیالات، نظریات اور جذبات کا آئینہ دار ہوتا۔ یہ خیالات قوم کے کاموں میں اس کی زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ ہوتے جن سے قوم کی صحیح سمت رہنمائی ہوتی۔ ان کے علاوہ دیگر عمائدِ ملک بھی ان اجلاسوں میں شرکت کرتے، کارروائیوں میں حصہ لیتے، مقالے پیش کرتے، نظمیں پڑھتے اور اس طرح اپنے خیالات سے دوسروں کو مستفید کرتے۔ ان کی معرفت تعلیمی، ثقافتی اور تاریخی اہمیت کے علاوہ ان اجلاسوں کی ادبی حیثیت بھی مسلّم ہو گئی۔ ان کی افادیت واضح کرتے ہوئے نجم الہند سردار محمد حیات خاں نے پانچویں اجلاس (۱۸۹۰ء) منعقدہ الٰہ آباد میں اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا:

"صاحبان! ہم آپ کو اس تعلیمی کانفرنس سے جن برکتوں کی توقع ہے، اور جو مفاد ہم کو حاصل ہوتے ہیں، ان میں سے یہ فائدہ کچھ کم قابلِ قدر نہیں، جو ہر سال ہماری قوم کے علماء اور فضلا کے قیمتی لکچروں اور قومی مضامین کی تحریروں سے حاصل ہوتا ہے، جو اس میٹنگ میں پڑھے جاتے ہیں۔ پچھلے سالوں میں ہمارے لائق پروفیسر مولوی محمد شبلی صاحب اور مولوی نذیر احمد صاحب اور مولوی الطاف حسین حالی کی بیش بہا تحریروں سے قوم متمتع ہوئی ہے اور اس سال کے اجلاس میں جو بات نہایت خوشی اور بے انتہا مسرت بخشنے والی ہے وہ ہمارے جلیل القدر اور فاضل بے بدل نواب محسن الملک، محسن الدولہ منیر نواز جنگ بہادر مولوی سید مہدی علی صاحب کی شمولیت ہے (جو ہر ایک مسلمان کا فخر ہے) اور اپنے بے نظیر علم و فضل سے قوم کو فائدہ بخشنے کے لئے تیار ہیں۔ نواب صاحب کی کوئی تحریر یا تقریر سننے کے لئے قوم کے اشتیاق کی کوئی حد باقی نہیں رہی تھی۔"

ابتداء میں کانفرنس کا دائرہ عمل محدود تھا۔ اس کے اجلاسوں کا واحد موضوع مسلمانوں میں جدید تعلیم کی تبلیغ کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ ان میں جو مقالے پیش کیے جاتے، یا تقریریں کی جاتیں ان کا مقصد مسلمانوں میں جدید تعلیم کو واضح کرنا اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہوتا۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا اور حالات بدلتے گئے، اسی کے ساتھ مسلم قوم کے مسائل بھی مختلف النوع ہوتے گئے۔ اسی کے لحاظ سے کانفرنس کا دائرہ عمل بھی وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں کانفرنس کی ۵۰ سالہ جوبلی کے موقع پر جو چار روزہ اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا، اس کو بارہ مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر شعبہ کا صدر اور سکریٹری علیحدہ علیحدہ مقرر ہوا تھا۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ شعبۂ ابتدائی تعلیم و مدارسِ اُردو : صدر: سید آل علی نقوی انسپکٹر مدارس اسلامی صوبجات متحدہ۔ سکریٹری: سید اسد اللہ، اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز۔

۲۔ شعبۂ ثانوی تعلیم ، صدر: ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ سکریٹری: خواجہ غلام السیدین

۳۔ شعبۂ اعلیٰ تعلیم : صدر: عبداللہ یوسف علی۔ سکریٹری: پروفیسر محمد حبیب

۴۔ شعبۂ تعلیم نسواں: صدر: شیخ عبداللہ (بانی ویمنس کالج علی گڑھ) سکریٹری: سید ہادی حسن

۵۔ شعبۂ مدارس اسلامی: صدر: مولانا حسین احمد مدنی۔ سکریٹری: ابوبکر محمد شیث

۶۔ شعبۂ ترسیل و تعلیم بالغان: صدر: طفیل احمد منگوری۔ سکریٹری: تجمل حسین

۷۔ شعبۂ معاشیات و اصلاح معاشرہ: صدر: محمد الیاس برنی۔ سکریٹری: شیخ عطاء اللہ

۸۔ شعبۂ اُردو یا اُردو کانفرنس: صدر: مولوی عبدالحق۔ سکریٹری: رشید احمد صدیقی

۹۔ شعبۂ پریس کانفرنس : صدر: (۱) مولوی بشیر الدین (ایڈیٹر البشیر۔ اٹاوہ) (۲) منشی دیا نرائن نگم (ایڈیٹر زمانہ۔ کانپور) سکریٹری: (۱) محمد اکرام خاں ندوی (۲) نظام الدین نظامی (اڈیٹر ذوالقرنین بدایوں)

۱۰۔ شعبۂ ٹیکنیکل تعلیم : صدر: ڈاکٹر اے۔ جی۔ خاں (ڈپٹی ڈائرکٹر اسٹورز۔ دہلی)۔ سکریٹری: (۱) ڈاکٹر رفیق احمد (۲) عبیداللہ درانی۔

۱۱۔ شعبۂ اسلامی علوم و فنون : صدر: سید سلیمان ندوی۔ سکریٹری: امیر حسن صدیقی

۱۲۔ شعبۂ تعلیمی نمائش : صدر: کرنل آر۔ ایس ویر (ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم۔ صوبجات متحدہ) سکریٹری: ڈاکٹر عبادالرحمن۔

اس طرح کانفرنس نے محض تعلیمی مسائل سے گزر کر زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمانانِ ہند کی قیادت کا بار سنبھالا۔ خصوصاً اصلاح معاشرہ اور اُردو زبان کے تحفظ کے سلسلے میں اس کی سرگرمیاں بڑے پیمانے پر ہونے لگیں۔ اس کے علاوہ مسلم ثقافت کی بازیافت اور اس کی بہترین روایات کی تجدید بھی اکثر کانفرنس کی توجہ کے مرکز بنے رہے۔ اردو زبان وادب کی خدمات کے سلسلہ میں اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ انجمن ترقی اُردو، جس نے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں سرگرم اور فعّال ہے، اسی کانفرنس کے بطن سے پیدا ہوئی۔

اگرچہ آج کل یہ کانفرنس اتنی فعال اور سرگرم نہیں ہے، جتنی ۱۹۴۷ء سے قبل تھی۔ تاہم اس کی اہمیت کو آج بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آزادی سے قبل ملک وقوم کے لئے اس کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس کا سب سے بڑا اور اہم کام سرسید کی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھانا تھا۔ اس میں بڑی حد تک اس کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اس نے مسلمانوں پر جدید تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا اور ان کے دلوں سے تمام شکوک و شبہات کو نہ صرف رفع کیا بلکہ ان کے دلوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے کا شوق بھی پیدا کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے قدیم اور جدید دونوں مکاتبِ فکر کے اکابر و عمائد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، چنانچہ اس کے پلیٹ فارم پر جہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، علامہ سلیمان ندوی، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا ابوبکر شیث اور مولانا ابوالحسن ندوی جیسے علما و مشائخ نظر آتے ہیں، ادھر سرسید اور ان کے رفقا کے علاوہ سر آغا خاں، بدرالدین طیب جی، مہاراجہ محمود آباد، میاں محمد شفیع، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر راس مسعود، سر عبدالقادر، ڈاکٹر سر ضیاءالدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے رہنمایانِ قوم بھی نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کانفرنس کو غیر معمولی کامیابی اس لئے نصیب ہوئی کہ اس کو دونوں مکاتبِ فکر کے اکابر کا تعاون حاصل رہا۔ یہ اجتماعِ ضدین حقیقت میں قرانِ سعدین ثابت ہوا جو دلچسپ بھی تھا اور فالِ نیک بھی۔

کانفرنس نے بہت سے ٹھوس اور عملی اقدام کیے، جس سے نونہالانِ وطن کو بہت فائدہ ہوا۔ اس نے بہت سے نادار اور ضرورت مند طلبا کو وظیفے دیئے۔ اس مد میں اس نے لاکھوں روپے صرف کیے اور ہزاروں طلبا کی مالی اعانت کر کے ان کی مشکلات دور کیں۔ وظائف کے علاوہ زیادہ مستحق طلبا کو درسی کتب بھی فراہم کیں۔ لیکن اس نے صرف طلبا کی امداد پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ مدارس اور مکاتب تک اپنے دائرۂ عمل کو وسیع کیا اور ایسے بہت سے مدرسوں کی خدمت کی، جو معاشی مشکلات سے دوچار ہو رہے تھے۔ کانفرنس نے پیشہ وارانہ تعلیم پر بھی توجہ دی اور طلبہ کو ایسی تعلیم کی طرف رغبت دلائی جس کو حاصل کر کے وہ اپنی روزی کا انتظام خود کر سکیں، محض ملازمت پر ہی انحصار نہ کریں، بلکہ اپنا بھی کام کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اس طرح اس نے بڑی خوش اسلوبی سے اس تنقید کا جواب دیا کہ مسلم یونیورسٹی کا کام صرف دفتری کلرک پیدا کرنا ہے۔

کانفرنس نے ہر مرحلہ پر مذہبی اقدار کو برقرار رکھنے اور اخلاقیات کو قائم رکھنے پر زور دیا

اس ہی قسم کی تعلیم کی تبلیغ کی جس کو حاصل کرکے طلبہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے روشناس ہوں۔ یہی وہ راہ عمل تھی جس کو کانفرنس نے روزِ اوّل سے ہی اختیار کر لیا تھا اور جس کی وضاحت نواب محسن الملک نے اس کے دسویں اجلاس (۱۸۹۵ء) منعقدہ شاہجہاں پور میں اپنے مخصوص پُر زور اور پُر اثر انداز میں اس طرح کی تھی —— "صاحبو! ہمارا ہرگز یہ مقصود نہیں ہے کہ ہم انگریزوں کی کورانہ تقلید کریں، اپنے بچوں کو صرف وہ تعلیم دلائیں جو فقط دنیا کے لئے مفید ہو اور جس سے وہ صرف گورنمنٹ کی ملازمت کے لائق ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ ہم اس قسم کی تعلیم کو ہرگز تعلیم بھی نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے نزدیک تعلیم کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے اس سے چند پیشوں کے کام کرنے کی لیاقت حاصل ہو بلکہ تعلیم کا مقصود یہ ہے کہ تمام قوتیں جو خدا نے انسان میں رکھی ہیں وہ نمو پائیں اور نہ صرف انھیں قوتوں کو نمو دیا جائے جو ہماری جسمانی آسائش کے کام آئیں، بلکہ روحانی قوتوں کا کام میں لانا، اور دماغ کو غذا پہنچانا تعلیم کا اصلی مقصود ہے۔ بلاشبہ اس قسم کی تعلیم جس سے ہم معاش پیدا کرنے کے لائق ہوں ضروری ہے اور ہماری دنیاوی لذّت دور ہونے کے لئے اس کا سیکھنا بھی لازم ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہم وہ تعلیم بھی چاہتے ہیں کہ جس سے ان کے دل و دماغ روشن ہوں اور علم کو علم کے لئے حاصل اور علاوہ جسمانی آسائش کے جو فنا ہونے والی ہے، ان چیزوں کو بھی حاصل کریں جو ان کی روحانی راحت کے جو کہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، کام آوے۔ ان میں سچی ہمدردی اور کامل انسانیت پیدا ہو۔ انکی زندگی کا مقصد نیک اعلیٰ اور زیادہ پاک ہو اور جس طرح ہمارے بزرگوں نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا اور ہمارے لئے وہ اپنے دل و دماغ ترکہ چھوڑ گئے، اسی طرح ہم بھی علم کو علم کے لئے حاصل کریں اور اپنے بزرگوں کے ترکہ میں کچھ بڑھا کر آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ جائیں۔ اس کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے دینی علوم بھی سیکھیں اور عقلی علوم کی بھی تحصیل کریں۔"

کانفرنس کی ہمہ جہتی خدمات کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کی طرف بھی خصوصی توجہ دی اور مختلف موضوعات پر متعدد مفید کتابیں شائع کیں۔ ان میں سوانح، معاشیات، اسلامیات، سماجیات اور تاریخ جیسے اہم موضوعات پر کتابیں شامل ہیں۔ ان مطبوعات کی فہرست کافی طویل ہے۔ جن میں چند اہم درج ذیل کی جاتی ہیں:

(۱) یادِ ایام۔ از حکیم سید عبدالحی (۱۹۱۹ء)۔ (۲) وقارِ حیات۔ اکرام اللہ ندوی (۱۹۲۵ء) ۳۔ گنجِ سلیمانی۔ از مظفر حسین سلیمانی (۱۹۲۶ء) ۴۔ ذکرِ مبارک۔ از بیگم بھوپال (۱۹۲۷ء) ۵۔ خطباتِ عالیہ (۳ حصے) مرتبہ انوار احمد زبیری (۱۹۲۰-۲۷) (۶) مولفِ شرشاہی از سید احمد مرتضیٰ نظر تطبی (۱۹۳۴ء) ۷۔ حیاتِ محسن۔ از محمد امین زبیری (۱۹۳۴ء) ۸۔ مرقعِ کانفرنس از انوار احمد زبیری (۱۹۳۵ء) ۹۔ ہمایوں نامہ، ترجمہ عثمان حیدر مرزا و حیدر مرزا (۱۹۳۵ء) ۱۰۔ خطباتِ صدارت پنجاہ سالہ (۱۹۳۸ء) ۱۱۔ اللغة والامثال، مؤلفہ محمد فضل قدیر ظفر ندوی (۱۹۴۰ء) ۱۲۔ الترتیب التعلیم (عربی متن مع اردو ترجمہ) از علامہ رشید رضا (ب ت) ۱۳۔ اسلامی عقائد۔ از مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۶۱ء)۔

# اطہر پرویز

• ڈاکٹر اطہر پرویز (پ ۱۹۲۸ء تقو) اپنی عملی زندگی کا آغاز کمیونسٹ پارٹی کے کارکن کی حیثیت سے کیا تھا۔ پارٹی سے کنارہ کرکے جامعہ ملیہ منسلک ہوئے۔ یہاں ذاکر صاحب کی رفاقت میسر آئی جو بچوں کے لئے ایک لافانی ذخیرہ چھوڑنے کا سبب بنی۔ علی گڑھ آنے کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ تصنیفی کاموں سے انھیں ایسی دلچسپی تھی کہ لوگ ان کا اصل نام بھول گئے، صرف قلمی نام یاد رہ گیا اور آخری دم تک علیگڑھ کی خدمت کرتے رہے۔ ایک عرصے سے دل کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ بالآخر اپریل ۸۴ء میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

••

(۱)

# یونیورسٹی کا معیارِ تعلیم بہتر بنانے کے سلسلہ میں چند تجاویز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اب باقاعدہ ایک اقلیتی ادارہ بن گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب ہم سنجیدگی سے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر غور کریں۔ یہ ادارہ اب ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر حصہ لے سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں میری چند تجاویز ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۱- اس یونیورسٹی کو علی گڑھ اور اس کے گرد و نواح کے نوجوانوں تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ اس کا کل کردار قوم کے سامنے آنا چاہیے۔ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں جو نوجوان اپنی ریاستوں میں یا انٹرمیڈیٹ یا پری یونیورسٹی کے امتحانات اعزازات سے پاس کریں، انھیں یہاں پڑھنے کی دعوت دی... ایک زمانہ کی بات ہے جب مولانا حسرت موہانی نے ہائی اسکول کا امتحان اعزاز سے پاس کیا تھا تو ان... یہاں آنے اور پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی۔

۲- فی الحال ہر ریاست کے امیدواروں کا کم سے کم کوٹہ مقرر کر دیا جائے تاکہ ہم یہ دعویٰ کر سکیں کہ ہمارے یہاں ہندوستان کے ہر علاقے کے نوجوان تعلیم پا رہے ہیں۔

۳- جن طالب علموں کو ہم یہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے دعوت دیں ان کی تعلیم مفت ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں دلچسپی...

۴- جو طالب علم دوسری ریاستوں سے یہاں آئیں ان کے لئے ہوسٹل کی سہولت فراہم کی جائے۔ یہ نہ ہو کہ ہم ان کے حالات سے...

۵- جو طالب علم یونیورسٹی کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کریں ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی باقاعدہ تشہیر کی جائے تاکہ ان کو یونیورسٹی میں عزت ملے۔

۶- یونیورسٹی میں ڈیبیٹس کا معیار خاصا گر گیا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ نوجوانوں کو ڈیبیٹس کے لئے تیار... اور انھیں دوسرے اداروں میں شرکت کے لئے بھیجیں۔

۷- کھیلوں کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اچھے کھلاڑیوں کو جو کسی اچھے تعلیمی ادارے سے وابستہ ہیں یہاں آنے کی دعوت دی جائے۔ انھیں یونیورسٹی کی ٹیم میں جگہ دی جائے اور ان کی پڑھائی کا بھی خیال رکھا جائے۔ مختلف صنعتی ادارے اور کل ہند سروسز سے ربط قائم کیا جائے اور جو کھلاڑی یہاں سے فارغ ہوں ان کی ملازمت کے لئے کوشش کی جائے۔

## ۲

# سماج میں بوڑھوں کی ضرورت

جارج برناڈ شا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی نے ان سے کہا کہ "نئی نسل آپ کی نسل کے مقابلے میں زیادہ قد آور ہے" تو برناڈ شا نے برجستہ جواب دیا "کیوں نہیں — ظاہر ہے کہ قد آور تو دکھائی دیں گے ہی، کیوں کہ وہ ہمارے کندھوں پر کھڑے ہوئے ہیں۔"

اس بیان میں بڑی صداقت ہے۔ تہذیبوں کی عظمت اور توانائی کا انحصار درختوں کی طرح ان کی جڑوں پر ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کی جھنڈی والی دوڑ ہے کہ ایک دوڑنے والا، اپنی منزل پر پہنچ کر وہ جھنڈی اگلے کے سپرد کرتا ہے، جو اس کو لے کر دوڑتا ہے اور وہ جھنڈی پھر اگلی منزل پر کسی دوسرے کو دیدیتا ہے، اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ اسی لئے جب آگے والا آگے نکلتا ہے تو ہم جانتے ہیں کہ اس کے آگے نکلنے میں پہلے والے کا بھی ہاتھ ہے۔ اور اسی لئے جب نئی نسل کوئی بڑا کام کرتی ہے، تو اس میں پچھلی نسل کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ دنیا راکٹ کی منزل میں پہنچ گئی ہے لیکن جس آدمی نے پہیہ ایجاد کیا تھا، اس کی حکمت بھی اس میں شامل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں بوڑھوں کی بڑائی کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ تجربے اور دانائی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

مغرب میں بوڑھوں کو سماج سے علیحدہ کرنے کی کوشش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ہمارا سماج مغرب سے بہت مختلف ہے۔ مغرب میں جہاں فرد کی آزادی کا بڑا ڈھول پیٹا جاتا ہے۔ وہاں بوڑھے کو اس انفرادی آزادی سے گویا محروم کرنے کا عمل کارفرما ہے۔ جیسے ہی انسان بڑھاپے کی منزل میں رکھتا ہے وہ معاشرے سے بھی الگ پڑ جاتا ہے۔ جن لوگوں سے ان کا خون کا رشتہ ہے، وہ اس سے اپنا ناتا توڑ لینا چاہتے ہیں۔ اب وہ چلتا پھرتا ہے تو صرف اس لئے کہ وہ زندہ ہے۔ اس کی انفرادی آزادی محض اس حد تک رہ جاتی ہے کہ وہ چل پھر سکتا ہے۔ لیکن معاشرے میں رہنے کے معنی محض چلنا پھرنا نہیں ہوتا بلکہ معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں میں حصہ لینا ہوتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں بوڑھے کو ایک اہم سماجی حیثیت حاصل ہے۔ مشترکہ خاندان میں اس کی حیثیت ایک سربراہ کی ہوتی ہے، وہ اپنے بال بچوں کی زندگی کی سمت مقرر کرنے میں ایک نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اس

چھوٹے خاندان کا مشیر بھی ہوتا ہے اور ان کا ذمہ دار بھی۔

جب میں بوڑھے کا لفظ استعمال کر رہا ہوں، تو اس سے مراد محض مرد نہیں، بلکہ عورتیں بھی ہیں۔ ایسی عورتیں گھر میں ایک مثبت کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ خاندانی روایات کی پاسبان ہوتی ہیں۔ وہ بے لکھے خاندانی قانون عمل درآمد کرانے میں مددگار ہوتی ہیں۔ وہ رشتوں کے اعتبار سے ہر ایک کے حقوق و فرائض سے واقف ہوتی ہیں بلکہ ان کی رہنمائی میں ان حقوق و فرائض پر عمل ہوتا ہے۔ معاشرتی قوانین اپنی جگہ پر --- لیکن معاشرے میں روایات اور رسومات کو ان سے کم حیثیت حاصل نہیں ہے اور ان روایات اور رسومات نے معاشرے کو بکھرنے سے بچا رکھا ہے۔

بڑے بوڑھے نہ صرف یہ کہ ان کی پاسبانی کرتے ہیں۔ ان پر عمل کرواتے ہیں، وہ گھر کے اندر کبھی باہر بھی "عدالت" کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ گھر کے لڑائی جھگڑے، ان کے تصفیوں کے مختار اور گھر کا ہر فرد ان کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ وہ اپنے خاندان کا ڈکٹیٹر ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی ڈکٹیٹر شپ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی معاشی تکلیف برداشت کر لیتا ہے، موسموں سے رجھگڑ لیتا ہے اور ان کے سامنے ہتھیار بھی ڈال دیتا ہے۔ چھوٹی موٹی زیادتی برداشت کر لیتا ہے، لیکن وہ اپنی انفرادی آزادی کو کبھی کسی دوسرے کے سپرد نہیں کر سکتا۔ یہ انفرادی آزادی اُسے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اپنی زباں بندی گوارا نہیں کرتا کہ اس کے بغیر اُسے روحانی تسکین حاصل نہیں ہو سکتی۔

بوڑھے کی یہ حیثیت نہ صرف اپنے گھر میں ہوتی ہے، باہر بھی اس کو عزت سے دیکھا جاتا ہے۔ اُسے پنچایت کے پنچ پر بٹھایا جاتا ہے۔ سب لوگ اس کے سامنے اپنی شکایتیں اور اپنے جھگڑے رکھتے ہیں۔ اس وقت اس کی حیثیت پنچ پرمیشور کی ہوتی ہے۔ وہ حق و انصاف کی روشنی میں اپنے فیصلے کرتا ہے۔ وہ اس وقت انصاف کے ترازو کو ہاتھ میں لینے کے بعد اپنے پرائے میں تمیز نہیں کرتا۔ یہاں اس کی عمر کے تجربے اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک بڑی اور بامعنی زندگی گزار دینے کے بعد وہ خود غرضی کی سطح سے اپنے آپ کو بلند کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارا گاؤں اس کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔

ہندوستانی بوڑھا، علم و عقل اور تجربے کا دوسرا نام ہے۔ وہ ایک بڑی روایت کا حامل ہے اس لئے یہ فطری ہے کہ وہ آنے والی نسل کو اپنا سب کچھ دے جو اس نے برسوں کی محنت، مشقت اور ریاضت کے بعد حاصل کیا ہے اور وہ ایسا کرتا بھی ہے۔ لیکن کیا یہ عجیب نہیں کہ ہم اس کے مالی ورثہ کو بلا جھجک قبول کر لیں لیکن اس کے تہذیبی

آپ کو بے نیاز سمجھیں؟ کیا یہ خواہش بہت زیادہ نہیں کہ ہم از سرِ نو اپنے تجربے سے ہی سب کچھ حاصل کریں؟ کیا یہ کا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو نہیں ہے؟ حالانکہ جس کو کڑوا سمجھ کے تھوکا جا رہا ہے، وہ اتنا کڑوا بھی نہیں ہے

شاید ہندوستانی معاشرے نے یہ بات روزِ اوّل سے ہی سمجھ لی ہے کہ بوڑھے بھی سماج کا اٹوٹ انگ ہوتے ہیں جو اگر توڑ دیا جائے تو ہمارا معاشرہ لولا اور لنگڑا ہو جائے گا۔ اس لئے سماج میں ان کا کردار مثبت حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہے کہ سرکاری ملازمت سے وہ ایک خاص عمر میں پہنچ کر سبکدوش ہوتے ہیں۔ لیکن معاشرے سے سبکدوش نہیں ہوتے۔ یہ بوڑھا جسے لوگ غلطی سے از کار رفتہ بھی سمجھ لیتے ہیں، اس کا ذہن ایک شاندار کمپیوٹر ہوتا ہے جس میں زندگی کے تجربے، انسانی رشتوں کی نزاکتیں، علم و عمل کی سرگرمیاں سب محفوظ ہو جاتے ہیں۔ رات میں بچہ اچانک رونے لگتا ہے۔ جواں ماں اور باپ پریشان ہو جاتے ہیں کہ ان کے بھلے چنگے بیٹے کو کیا ہوا۔ ماں تو اپنے ہوش و حواس کھونے لگتی ہے اس وقت گھر کا یہ بزرگ آگے بڑھ کر ان کو تسلی دیتا ہے۔ ان میں اعتماد پیدا کرتا ہے اور پھر غور سے بچے کو دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ "بہو ذرا بستر تو دیکھو۔ یہ کیا ہے۔ چونٹیاں کاٹ رہی ہیں۔ بغلوں اور جانگوں میں چونٹیاں رینگ رہی ہیں۔" ماں کے ہلانے سے بچہ کیسے چپ ہو جاتا۔ وہ اپنی تکلیف کو بیان نہیں کر سکتا۔ اور بوڑھی دادی نے بروقت اپنے تجربے سے مدد دی۔ یہ ضروری نہیں کہ بچے کے چونٹی ہی کاٹ رہی ہو۔ اس کے کان میں درد بھی ہو سکتا ہے وہ اپنی تکلیف بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن بوڑھی دادی غور سے دیکھنے کے بعد یہ دریافت کر لیتی ہے کہ اس کے کان میں درد ہے وہ سب کو مطمئن کر دیتی ہے اور طاق پر سے کوئی تیل نکال کر ایک آدھ قطرہ کان میں ٹپکا دیتی ہے اور ذرا سی دیر میں بچہ خاموش ہو کر سو جاتا ہے۔ گویا یہ بوڑھے اپنے چٹکلوں سے اس چھوٹے سے گھر کے بروقت معالج بھی بن جاتے ہیں۔

بوڑھوں کی سماجی حیثیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جدید سوسائٹی بوڑھوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ خیال خام ہے۔ بلکہ میں تو اور آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ آج ان کی جتنی ضرورت ہے اتنی شاید اس سے پہلے نہیں تھی۔ اب جبکہ نوجوان میاں بیوی دونوں گھر سے باہر بھی کام کرتے ہیں ان کو کم از کم آٹھ گھنٹے تو ضرور اپنے منصبی فرائض کی وجہ سے باہر رہنا پڑتا ہے تو اس وقت ان کے ننھے منھے بچے ان بوڑھوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ملازم ان کی دیکھ بھال کر لیتے ہوں۔ لیکن ان کو وہ محبت تو نہیں مل سکتی جو ان کو دادی اور دادا دے سکتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے بچوں کی پرورش کرنے ہی میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں، بلکہ ان بچوں کی ابتدائی تربیت میں بھی بڑا نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔

یہ کہنا کہ حکومت چونکہ ایک خاص عمر پر بلا وجہ تھوڑا ہی اپنے کارکنوں کو سبکدوش کر دیتی ہے، یہ ٹھیک لیکن کلّی حقیقت نہیں۔ وہ بوڑھوں کو اس لئے سبکدوش کرتی ہے کہ نوجوانوں کو موقع فراہم کرے۔ لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دوسرے لوگ ان کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں اور ان کے علم اور تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سیاست کے میدان میں بڑے اہم فرائض انجام دیتے ہیں۔ کاروبار کی دنیا میں وہ اپنی کامیابی کے سکے جماتے ہیں۔ ان کے مشورے سے قومیں سرفراز ہوتی ہیں۔

# ۳

# صنعتی ترقی اور گرانی

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان نے صنعتی اور زراعتی میدانوں میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ جہاں تک صن
کا تعلق ہے اب دنیا کے ملکوں میں ہندوستان کا نمبر ۹ واں ہے۔ زراعت میں بھی ہماری پیداوار اتنی بڑھ گئی
کہ اجناس کے معاملے میں ہم بڑی حد تک خود کفیل ہو گئے ہیں اور یہ معمولی بات نہیں۔

لیکن اس کا ایک منفی پہلو بھی ہے کہ ہماری اشیار کی قیمتوں میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے جس نے
امیر طبقہ کو امیر تر اور غریب طبقہ کو غریب تر کر دیا ہے۔ چونکہ امیروں کی تعداد محدود ہے اور غریبوں کی تعداد
اس لئے خوش حالی کم اور افلاس زیادہ نظر آتا ہے۔ قیمتوں کے بڑھنے کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ
میں گیہوں کی قیمت ایک روپیہ میں ۸ سیر تھی اور اب دو روپیہ میں ایک کیلو ملتا ہے۔ گویا یہ قیمت ۱۶ گنا
کیا اس زمانے میں جس آدمی کی آمدنی سو روپے تھی اب ۱۶ سو روپے ہو گئی ہے؟

یہ رہی غلے کی بات —— اور اشیا کا حال اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ایک
اونی کپڑا تین روپیہ گز ملتا تھا، آج اس کی قیمت ۲۰۰ روپیہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے قیمتوں کا تعین
پیداواری قیمت کے لحاظ سے ہوتا تھا اور اب ہمارے صنعت کار آنکھ بند کر کے جو دام مناسب سمجھتے
دیتے ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں جب کوئی چیز کارخانوں میں بننے لگتی ہے تو اس کا فوری تحفظ صنعت کار اس
سے کر لیتا ہے کہ وہ حکومت سے اس کی درآمد پر پابندی لگواتا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ اس کی فروخت
جاتے ہیں۔ وہ پیداوار کو کم کر کے اس کی مانگ کو بڑھا دیتا ہے اور جو کالا بازار جنم لیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ
اس کی "کوالٹی" تو خراب تر ہوتی رہتی ہے، پھر عام آدمی غیر ملکی چیزوں کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔

جب گرانی کی بات کہی جاتی ہے تو مفاد پرست فوراً غیر ملکی بازار کا حوالہ دیتے ہیں کہ یہی قیمت
بھی ہے لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسرے ملکوں میں مزدوروں کی اجرت ہمارے یہاں سے کئی گنا زیادہ ہے
[اس کے علاوہ وہاں کے لوگوں کی آمدنی بھی ہم سے بہت زیادہ ہے]، مثال کے طور پر بریف کیس کو لیجئے
اس چھوٹے سے بریف کیس پر اتنا خرچ آتا ہے کہ اس کی قیمت ڈھائی سو اور تین سو روپیہ

منافع کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ یہ فرمیں کرکٹ ٹسٹ کے دوران لاکھوں روپے کے انعامات کا اعلان کرتی ہے اور ان کے اشتہارات پر اتنا ہی خرچ ہوتا ہے، ایسا کیوں ہے۔ دراصل وہ اپنے منافع پر غیر معمولی انکم ٹیکس کی بچت کرتے ہیں۔ ابھی حکومت یہ اعلان کر دے کہ ان پر انکم ٹیکس کی رعایت نہ دی جائے گی۔ پھر دیکھیے ان میں کتنے کھیل اور کھلاڑیوں سے دلچسپی لیتے ہیں۔ دراصل یہ عام لوگوں کی جیبوں سے بڑی رقم نکال کر ان میں سے بہت معمولی رقم خرچ کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ حکومت بھی اس طرف توجہ نہیں دے رہی ہے کہ وہ قیمتوں کے تعین پر نظر رکھے۔ مجھے یقین ہے کہ جو ٹیلی ویژن انگلستان میں چار ہزار میں فروخت ہوتا ہے، وہ ہندوستان میں زیادہ سے ڈھائی ہزار میں مل سکتا ہے کیونکہ ہماری مزدوری سستی اور کوالٹی ان کے مقابلے میں پست ہوتی ہے۔

گرانی کا بوجھ خوش حال طبقہ بہر حال برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن یہ عام آدمی کی کمر توڑنے کے لئے کافی ہے۔ اگر ہمارے یہاں قیمتوں پر قابو پا لیا جائے، تو سارا ملک خوش حالی کے راستے پر چل سکتا ہے۔

••

عنایت علی (اورنگ آباد)

# یونیورسٹی امتحانات اور مسلم طلبا

موجودہ دور ایک جدوجہد اور مقابلہ کا دور ہے۔ اقوام عالم کی ترقی کا اگر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آج وہی قومیں ترقی کی دوڑ میں آگے ہیں، جن کے افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہمارے ملک میں بھی تعلیم کے میدان میں کافی ترقی ہوئی۔ نئے نئے کالجس اور یونیورسیٹیاں قائم ہوئیں۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے بھی اس سلسلے میں بہت سا کام کیا، جس کے نتیجے میں آج ملک میں تعلیم کا تناسب کافی حد تک بڑھا ہے، جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

مسلمان ہندوستان کی ایک بڑی اقلیت ہیں، لیکن اعلیٰ تعلیم کے حصول میں وہ ہنوز اپنے دوسرے ہم وطنوں کے مقابلے میں کافی پیچھے ہیں۔ اس تعلیمی پسماندگی کا اندازہ ہمیں ہر سال ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے امتحانات میں شریک ہونے والے طلبا اور طالبات کی تعداد سے بخوبی ہوتا ہے۔ ملک کی ریاستوں میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۰ سے ۲۰ فیصد تک ہے۔ لیکن کالجوں اور جامعات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبا کی تعداد آبادی کے اس تناسب سے بے حد کم ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کی طرف مسلمان متوجہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان تیزی سے ایک اَن پڑھ اور پسماندہ طبقہ میں تبدیل ہوتے جارہے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) نہ صرف ریاست آندھرا پردیش، بلکہ ملک کی ایک ممتاز یونیورسٹی تسلیم کی جاتی ہے۔ ماضی میں، اس یونیورسٹی نے کئی ذہین اور نامور طلبا قوم کو دیے ہیں۔ جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ملک کا نام اونچا کیا ہے۔ ملک کی دوسری تمام یونیورسٹیوں کی طرح عثمانیہ یونیورسٹی بھی ہر سال انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کورسس کے امتحانوں میں، مختلف مضامین میں سب سے زائد نشانات حاصل کرنے والے ذہین طالب علموں کو گولڈ میڈلس اور انعامات عطا کرتی ہے۔ یونیورسٹی کے امتحانات میں گولڈ میڈل کا حصول طالب علم کی زندگی کا ایک روشن پہلو ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس پر نہ صرف طالب علم بلکہ اس کے والدین، استاد، نیز سماج کا وہ طبقہ جس سے طالب علم کا تعلق ہے، بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔

ہم نے ۱۹۸۰-۸۱ء / ۱۹۸۱-۸۲ء کے تعلیمی سال کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کورسس کے امتحانوں میں عطا کیے جانے والے گولڈ میڈل کا ایک جائزہ لیا اور اس بات کی کوشش کی کہ ان مسلم طلبا اور

طالبات کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکے جنھوں نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ لیکن مسلم طلبا کے تعلق سے جو نتائج سا
گئے ہیں، وہ کافی مایوس کن ہیں۔

۸۱-۱۹۸۰ء میں انڈر گریجویٹ کورسس کے لئے کل ۶۲ گولڈ میڈل دیے گئے۔ ان میڈل کے حاصل کرنے وا
میں مسلم طلبا کی تعداد صرف ۵ ہے۔ ان پانچ گولڈ میڈل میں چار میڈل فیکلٹی آف آرٹس اور ایک فیکلٹی آف میڈیسن میں
ہیں۔ فیکلٹی آف آرٹس کے میڈلوں میں جو میڈل مسلم طالبات نے حاصل کیے ہیں وہ اردو، فارسی، عربی اور اسلامیا
کے مضامین سے متعلق ہیں۔

۸۲-۱۹۸۱ء میں کل ۶۶ گولڈ میڈل دیے گئے۔ انھیں حاصل کرنے والوں میں مسلم طلبا کی تعداد صرف ۱۴ ہے۔ ا
میڈلوں میں فیکلٹی آف آرٹس میں ۷، فیکلٹی آف میڈیسن میں ۵ اور فیکلٹی آف انجینئرنگ میں ۲ میڈل شامل ہیں۔ حسب روای
فیکلٹی آف آرٹس میں سب گولڈ میڈل طالبات نے حاصل کیے ہیں جو اردو، عربی، فارسی، اسلامیات، سوشیالوجی اور ...
(جنرل) کے امتحانات میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے پر ملے ہیں۔ ایک قابل ذکر چیز یہ ہے کہ فیکلٹی آف میڈیسن میں
تنہا ایک مسلم طالب علم (وقار الدین مسعود) نے حاصل کیے ہیں جبکہ فیکلٹی آف انجینئرنگ میں ۲ میڈل ایک مسلم طالب علم
(محمد عبد القدوس) کو ملے ہیں۔

۸۱-۱۹۸۰ء اور ۸۲-۱۹۸۱ء میں پوسٹ گریجویٹ کورس کے لئے کل ۵۵ گولڈ میڈل دیے گئے ہیں۔ جنھیں
حاصل کرنے والے خوش نصیب طلبا میں مسلم طلبا کی تعداد بالترتیب ۷ اور ۶ ہے۔

۸۱-۱۹۸۰ء میں حاصل کیے گئے ۷ میڈل میں ۵ فیکلٹی آف آرٹس اور ۲ فیکلٹی آف میڈیسن میں ملے ہی
فیکلٹی آف آرٹس کے تحت ۵ گولڈ میڈل میں ۲ اردو ۲ اسلامیات اور ایک فارسی کے مضمون سے متعلق ہے۔ میڈل حاصل
کرنے والوں میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد بالترتیب ۴ اور ۳ ہے۔

۸۲-۱۹۸۱ء میں مسلم طلبا کے حاصل کیے ہوئے سب ہی ۶ میڈل فیکلٹی آف آرٹس کے مضامین یعنی اردو،
فارسی، اسلامیات اور پبلک ایڈمنسٹریشن سے متعلق ہیں، ان میں طالبات کی تعداد ۳ ہے۔

مندرجہ بالا نتائج کا ایک تعجب خیز پہلو یہ ہے کہ سوائے فیکلٹی آف آرٹس کو چھوڑ کر تمام دوسری فیکلٹیوں
میں یعنی فیکلٹی آف سائنس، ٹکنالوجی، کامرس، سوشل سائنس، ایجوکیشن اور لا میں ایک بھی مسلم طالب علم گولڈ میڈل حا
نہیں کر پایا ہے۔ فیکلٹی آف آرٹس میں بھی مسلم طلبا اور طالبات صرف اردو، فارسی، عربی اور اسلامیات کے مضامین میں
گولڈ میڈل حاصل کر پائے ہیں، جبکہ دوسرے مضامین مثلاً معاشیات، پولٹکل سائنس، جغرافیہ، انگریزی، ہندی وغیرہ

میں مسلم طالب علموں کی کارکردگی صفر رہی ہے۔ ان نتائج کو دیکھ کر یہ خدشہ ابھرتا ہے کہ کہیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ذہین اور محنتی مسلم بچوں کا فقدان تو نہیں ہو گیا ہے یا یہ کہ مسلم طبقہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا رجحان تو ختم نہیں ہو رہا ہے؟

ریاست آندھرا پردیش میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے دلچسپی رکھنے والے افراد کی کمی نہیں ہے۔ کئی ادارے ہیں جو اس کے لئے کوشاں ہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلم طلبا اور طالبات کے یونیورسٹی ایجوکیشن کے تعلق سے کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ میری اس ضمن میں تمام مسلم برادران سے درخواست ہے کہ وہ اس طرف توجہ دیں۔ ایک بات جس کا ہم سب کو اعتراف کرنا چاہیئے وہ یہ کہ ہر ریاست کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلم طلبا اور طالبات کے داخلے کی تعداد بے حد کم ہے۔ اکثر مسلم اداروں کا وجود خود خطرے میں آرہا ہے۔ اس کا بڑا سبب مسلمانوں کی معاشی بدحالی اور اپنی اولاد کی تعلیم سے ان کی عدم دلچسپی ہے۔ آج کے دور میں تعلیم پہلے کی بہ نسبت سستی اور آسان ہے۔ حکومت نے بہت سی سہولتیں دے رکھی ہیں جس سے فائدہ اٹھانا عوام کا کام ہے۔ مثال کے طور پر مہاراشٹر میں جون ۱۹۸۳ء سے لڑکیوں کے لئے ایس ایس سی تک کی تعلیم پوری ریاست میں مفت کر دی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا انقلابی اقدام ہے جس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں نے ایسے بھی مسلمان دیکھے ہیں جنھوں نے حکومت کے اس اقدام کو سراہنے کے بجائے اسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے۔

ہندوستان کا تہذیبی اور معاشرتی ڈھانچہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ آئندہ چند برسوں میں سماج کا وہی طبقہ بے مثال ترقی یافتہ اور طاقتور ہوگا جس کے افراد بشمول خواتین زیادہ سے زیادہ تعداد میں تعلیم یافتہ ہوں گے۔ مسلمانوں کی معاشی، تہذیبی اور سیاسی بقا کے لئے اعلیٰ تعلیم کا حصول آج کی اوّلین ضرورت ہے اور اس کے لئے ہر مسلمان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر کوشش کرنا ہے اور مسلم والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم پر ضروری توجہ دیں اور روایتی مضامین کے بجائے انھیں سائنس، کامرس، میڈیسن، ٹکنالوجی، انجینئرنگ اور ایسے دوسرے مضامین جن کی آج زیادہ مانگ ہے، پڑھنے پر راغب کریں۔

اجتماعی طور پر اس بات کی کوشش ضروری ہے کہ ہر تعلیمی سال کے آغاز میں زیادہ سے زیادہ مسلم بچے اور بچیوں کو پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول میں شریک کیا جائے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلم طلبا اور طالبات کے داخلہ کا تناسب بڑھایا جائے، ایس ایس سی بورڈ اور مقابلے کے امتحانات کے لئے ہر بڑے شہر میں خاص کوچنگ کا انتظام کیا جائے۔

آج ملک میں مسلمانوں کی کئی مذہبی، سماجی اور سیاسی جماعتیں ہیں۔ کانگریسی اور غیر کانگریسی مسلمان

ہیں ۔ ان میں ہر ایک کے اپنے اپنے علاقے ہیں، جہاں ان کا کافی اثر ہے ۔ میری ان سب لیڈروں سے
ہے ۔ کہ وہ بھی اس طرف توجہ دیں اور مسلم سماج میں تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں عملی جد و جہد کریں، یہ ملک
اور خود ان کی اپنی جماعت کے لئے ایک بڑی کامیابی ہوگی ۔

آخر میں، میں ان تمام مسلم افراد اور مسلم اداروں سے جنھیں مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کے کاز سے
اور جو مسلم معاشرہ کو ایک تعلیم یافتہ معاشرہ دیکھنا چاہتے ہیں، ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ کُل
سطح پر بھی ایک ایسے ادارے کی سخت ضرورت ہے جو ملک کی مختلف ریاستوں کے ایس ایس سی بورڈ اور یونیور
کے امتحانات میں داخلہ لینے والے مسلم طلبا اور طالبات کی تعداد کا جائزہ لیتا ہے اور ہر سال اس میں جو کمی
ہو رہی ہے، اس کا اندازہ لے اور اس کے تعلق سے اعداد و شمار اخبارات میں شائع کرے ۔ ابھی تک صرف
اشخاص ہی نے اس طرف توجہ دی ہے اور اپنی انفرادی کوششوں کی بنا پر بعض اسکولوں اور کالجوں کے
کا جائزہ لیا ہے ۔ اگر مسلم پرسنل لا بورڈ، مرکزی مسلم مجلس مشاورت، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی وغیرہ اس کو
اپنے پروگراموں میں شامل کرلیں، تو یہ ملک و ملت کی ایک بڑی خدمت ہوگی ۔

نواب زادہ ابن سعید خاں
راحت منزل، میرس روڈ، علیگڑھ

# نواب چھتاری: میرے باپو

کیا لکھوں، کیسے لکھوں، کس پر مضمون لکھوں۔ قلم اٹھاتا ہوں، دماغ ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ دماغ پر زور دیتا ہوں، ہاتھ کی انگلیاں قلم اٹھانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک بیٹا اپنے باپ پر کیا مضمون لکھے۔

نواب صاحب کی ذات کا جہاں تک تعلق ہے میں کلر بلائنڈ (colour Blind) ہوں۔ مجھے ایک ہی رنگ نظر آتا ہے۔ میں ایک ہی رنگ دیکھتا ہوں اس میں کسی قسم کی کمی یا جھول نہیں پاتا۔ ان کے محاسن و اخلاق ان کا سیاسی کردار، ان کی سوشل زندگی اس پر قلم فرسائی کرنا یہ میرا میدان نہیں۔ یہ میرے لیے مناسب بھی نہیں اس پر تنقید و تبصرہ ہوگا۔ مضامین لکھے جارہے ہیں، لکھے جاتے رہیں گے۔ ہاں میں ان کی خانگی زندگی کے متعلق اپنے تاثرات پیش کرتا ہوں۔

دنیا نواب حافظ سر احمد سعید خاں کو نواب چھتاری کے نام سے جانتی تھی اور ہمیشہ اسی نام سے جانتی رہے گی۔ پارلیامنٹ میں ان کے انتقال پر جو تعزیتی پیغام پڑھا گیا وہ ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے:

"نواب احمد سعید خاں جو نواب چھتاری کے نام سے معروف تھے، جنوری ۱۸۸۹ء میں باغپت (اترپردیش) میں پیدا ہوئے۔ موصوف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔"

لیکن ان کے بچے انھیں باپو کہا کرتے تھے۔ وہ میرے باپ تھے، وہ میرے باپو تھے۔ باپو نے اپنی سوانح حیات 'یادِ ایام' لکھی ہے۔ میں بھی آج اپنے ماضی کو یاد کر رہا ہوں:

اے آنسو نہ کہہ یہ یادِ ایامِ گذشتہ ہے ؎ مری عمرِ رواں کو عمرِ رفتہ کا سلام آیا

۵ جنوری کی صبح مجھے کیا معلوم تھا کہ آج سورج شام ہونے سے پہلے ہی غروب ہو جائے گا۔ آج کا دن چھتاری کے گھر کے لیے ایک عظیم المیہ ثابت ہوگا۔ ایک ایسا عظیم انقلاب آنے والا ہے کہ ایک صدی پلٹ کر رکھ دے گا۔ چھتاری کے گھر کی نمود و شہرت، مال و دولت، عزت و خوشی و مسرت سب ایک شخص کی ذات کے

ساتھ ختم ہو جائے گی اور یہی ہوا۔ ۹۳ سال اختتام کو پہنچے اور ۹۴ سال شروع ہوا چاہتا تھا کہ ہماری کی تاریخ کے اوراق یک لخت پلٹ گئے اور اس طرح ایک صدی کا باب ختم ہوا۔ فسبحٰن الذی بیدہٖ ملکوت کل شئ و الیہ ترجعون۔ (پاک ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ہر ایک شئے کی سلطنت ہے اور سب شئے اسی کی طرف واپس ہونگی) میری زندگی کے ۵۹ برس باپو کے ساتھ گزرے۔ میری والدہ کا انتقال سنہ ۲۳ء میں ہوا جب میں صرف ایک ماہ کا تھا۔ میں نے باپو میں ماں اور باپ کی شفقت اور محبت کو پایا۔ ان میں ماں جیسی تڑپ، محبت، ایثار قربانی اور اس کے ساتھ باپ کا "ڈسپلن"، کبھی سختی کبھی نرمی، صلاح و مشورہ، نظم و نسق موجود تھا۔ باپو گھر کے معاملے میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر پورا عمل فرماتے تھے۔ باپو کو اپنے سب بچوں سے انتہائی محبت تھی اور حقیقت میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ باپو اور اپنے بہن بھائیوں کے مقابلے میں اس سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کے بچوں کے ساتھ اسی طرح محبت و شفقت فرماتے تھے جس سے ان کے پوتے اور پوتیوں کو یہ گمان ہو چلا تھا کہ باپو اپنے بچوں سے زیادہ اپنے بچوں کے بچوں سے محبت کرتے ہیں۔ جب کبھی سفر سے تشریف لاتے چھوٹے بچوں کے لیے مٹھائی یا کھلونے ضرور لاتے اور سب سے پہلے جو سب سے زیادہ چھوٹا ہوتا اس کی طرف توجہ دیتے۔ باپو مجھ سے فرمایا کرتے تھے "چھوٹے بچوں کی طرف سب سے پہلے توجہ دینی چاہیئے کہ بڑے حساس ہوتے ہیں اگر ان کی طرف توجہ نہ دی جائے، تو ان میں حسد اور نفرت کی حس پیدا ہو جاتی ہے، جو آئندہ زندگی میں ان کے کردار پر اثر ڈالتی ہے۔

میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اپنے بہن بھائیوں میں باپو کے ساتھ سب سے زیادہ میں قریب رہا۔ سب سے زیادہ ان کی خدمت کرنے کے مواقع مجھے نصیب ہوئے اور ظاہر ہے کہ انکی محبت اور دعائیں مجھے نصیب ہوئیں۔

باپو نے میری ابتدائی تعلیم و تربیت کی! اس کے نشیب و فراز سمجھائے صلاح و مشورہ دیا میری غلطیوں کی اصلاح فرمایا کرتے تھے اور خطا پر ڈانٹ دیتے تھے۔ اگر کوئی اچھی بات ہوتی اس کی تعریف بھی اتنی ہی فرماتے اور اب اخیر زمانے میں مجھ سے اکثر فرمایا کرتے کہ "ابن میاں میں تمہاری آنکھوں سے دیکھتا ہوں تمہارے کانوں سے سنتا ہوں۔ تمہارے سہارے چلتا ہوں تم میرے لئے 'عصائے پیری' ہو!!"

سنہ ۲۳ء میں میری والدہ کے مرجانے کے بعد ہم تینوں بھائی باپو کے کمرے میں سویا کرتے تھے مجھے نینی تال میں بروک ہل میں رہنا آج بھی یاد ہے جو اس وقت ہوم ممبر کی قیامگاہ ہوا کرتی تھی۔ رات میں کبھی اٹھ کر میں

رضائی لحاف اڑھاتے — دیکھتے کہ موسم کے لحاظ سے ہم گرم کپڑے پہنے ہوئے ہیں یا نہیں۔ اگر ہم بیمار پڑ جاتے، رات بھر ہماری دیکھ بھال کرتے تھے۔ تھرما میٹر لگا کر خود بخار دیکھتے، نبض گنتے۔ اور یہ سب کچھ اس وقت ہوتا تھا جب کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے زمانے میں "ہوم ممبر" تھے۔ دن بھر حکومت کے فرائض انجام دیتے اور فرصت ملنے پر گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے۔

میری ماں کے انتقال کے بعد باپو کی شادی میری خالہ سے ہوئی جن کا انتقال سنہ ۷۱ء میں ہوا۔ بڑی نافرض شناسی ہوگی، اگر میں یہ اعتراف نہ کروں کہ میری پرورش میری خالہ اور جو ماں بھی تھیں ان کے ہاتھوں ہوئی۔

مجھے یاد ہے کہ ۴۷ء میں جبکہ باپو چیف منسٹر تھے (یوپی کے سب سے پہلے چیف منسٹر وہی ہوئے) میں بیمار تھا۔ مجھے اس زمانہ میں بخار رہنے لگا تھا۔ میرے پاؤں میں چوٹ آئی۔ غالباً سمیت ہو گئی تھی۔ وہ علی گڑھ سے لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے۔ کان پور کے اسٹیشن پر ریل بدلنی تھی میں چوٹ کی وجہ سے چلنے سے معذور تھا۔ باپو نے مجھے اپنی گود میں لے لیا۔ اس وقت میری عمر ۱۴ برس تھی اور اس طرح ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر لے کر چلے۔ اسٹیشن ماسٹر کو اطلاع پہنچی کہ یوپی کا چیف منسٹر ایک بچے کو گود میں لے کر پل کراس کر رہا ہے۔ وہ کرسی لے کر پہنچا اور باپو سے کہا کہ وہ تکلیف نہ کریں اور بچے کو اس پر بیٹھا دیں۔ مجھے یاد ہے کہ باپو نے کہا کہ "میں اپنے بچے کو گود میں لیے جا رہا ہوں، اس سے چیف منسٹری کے عہدے پر کیا اثر پڑتا ہے؟"

سنہ ۵۵ء میں باپو پارلیمنٹ کے وفد کو لے کر فن لینڈ کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ کانفرنس کے بعد وفد تو ہوائی جہاز سے ہندوستان واپس ہوا لیکن باپو میری وجہ سے دو ماہ ٹھہرے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں یورپ اچھی طرح دیکھ لوں شاید مستقبل میں میرے نصیب میں نہ ہو۔ ہم نے سویڈن، ڈنمارک، جرمنی، ہالینڈ، فرانس، انگلستان، مصر، عدن اور کراچی دیکھا۔ سفر کی نوعیت اس طرح رہی کہ ہوائی جہاز سے سفر، پانی کا سفر اور بس کے ذریعہ سفر، اور یہ سب کچھ باپو نے اس لیے کیا کہ میں کسی چیز کے تجربے اور لطف سے محروم نہ رہوں۔ پورٹ سعید سے قاہرہ گئے۔ قاہرہ کی تمام مشہور چیزیں دیکھیں۔ اہرام دیکھنے گئے۔ باپو نے مجھے اہرام کے اندر جانے نہیں دیا فرمانے لگے کہ ان کے اندر کی ہوا زہریلی ہوتی ہے۔ ہم سیر و تفریح کے لیے آئے ہیں یا موت کو گلے لگانے۔ ہمارے ہمسفر ایک پاکستانی تھے۔ انہوں نے مجھے ترغیب دی کہ نائٹ

کلب چلنا چاہیے۔ باپو نے جب نانا مجھ سے علیحدہ بلا کر کہا "تم ہرگز مت جانا۔ یہ جگہ تہذیب و اخلاق پر بُرا اثر ڈالتی ہے"۔ میں نے اپنے دوستوں سے معافی مانگ لی۔

جب ہمارا قیام سوئٹزرلینڈ میں ہوا، ایک شب میری طبیعت خراب ہوگئی۔ میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ کسی کے قدموں کی آواز راہگذر میں سُنی اور وہ آواز میرے دروازہ پر آکر رُکی اور کچھ ہی دیر بعد میں نے وہ قدم واپس جاتے سُنے۔ اس وقت شب کا ڈیڑھ بجا تھا۔ صبح جب دروازہ میں نے کھولا تو باپو کا رکھا ہوا 'جگ' ملا۔

باپو کا یہ طرز صرف میرے ہی ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ ان کا یہ رویہ اپنے سب بچوں کے ساتھ تھا۔ جاوید، ہمایوں، فرخ ان کے پوتے ان کے کمرے میں سویا کرتے تھے۔ شب میں جب کسی بچے کا پلنگ خالی پاتے، بچوں کے پڑھنے کے کمرے میں انھیں دیکھ آتے اور یہ عمل ان کا اس وقت تھا جبکہ وہ نوّے برس کی عمر سے گزر رہے تھے۔

سنہ ۵۴ء میں، میں نے بی۔اے پاس کیا۔ میں نے باپو سے خواہش کی کہ وہ مجھے ملازمت دلوا دیں، وہ اس وقت وزیر اعظم حیدرآباد تھے۔ ان کے بعض خطوں کے تراشے پیش کر رہا ہوں:

"تمہارا محبت نامہ مورخہ ۱۲ فروری باعثِ مسرت ہوا۔ تمہارے خط سے مجھے خوشی اور رنج دونوں ہوئے۔ میرا ذہن تو مسرور ہوا لیکن میرے دل کو تکلیف پہنچی۔ مجھے خوشی اس پر ہوئی کہ تمہیں اپنے مستقبل کی فکر ہے اور مجھے اس کا اندازہ ہے کہ تمہارا مستقبل تمہارے ماضی کی طرح محفوظ اور بے فکری کا نہ ہوگا۔ لیکن والدین کے دل میں جو یہ فطری جذبہ ہوتا ہے کہ ان کی اولاد کو کسی طرح کی کوئی فکر نہ ہو، اسی جذبہ کے تحت مجھے یہ معلوم ہو کر تکلیف ہوئی کہ تم اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہو۔

"میرے عزیز فرزند، مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا مستقبل تابناک ہے۔

"تمہیں اپنے مستقبل کی فکر ہے، یہ احساس ہی اس کی ضمانت ہے کہ تمہارا مستقبل تابناک ہوگا۔ جو لوگ مستقبل سے لاپرواہی برتتے ہیں انھیں آگے چل کر طرح طرح کے مصائب برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن جو لوگ مستقبل کا خیال رکھتے ہیں، پروردگار ان کے لیے سیکڑوں راہیں کھول

دیتا ہے۔ عزم کا وجود کامیابی کی راہ تلاش کر لیتا ہے۔"

"محض ملازمت ہی ذریعۂ معاش نہیں ہے۔ اگر تم میری رائے جاننے کے خواہش مند ہو تو میں بے تکلف یہ کہوں گا کہ ملازمت زیادہ سے زیادہ ایک محفوظ ذریعۂ معاش ہے۔ اس کے بجز اور کچھ نہیں۔ ایسے دوسرے متعدد ذرائع معاش ہیں، جو اس سے کہیں زیادہ نفع بخش اور پُرلطف ہیں۔ لہٰذا تم اس بارے میں زیادہ فکرمند نہ ہو۔ مجھے یقین کامل ہے کہ سب بحسن وخوبی طے ہو جائے گا۔ یاد رکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ مستقبل سے لاپرواہی مت برتو اور اپنے اخراجات کو اپنی آمدنی سے زیادہ مت بڑھنے دو۔ تمہاری آمدنی جو کچھ بھی ہو اس کا کم از کم دس فی صدی ضرور پس انداز کرو۔ مثلاً تمہاری آمدنی ۱۰۰ روپے ہو تو اپنے اخراجات کو ۹۰ روپے سے زیادہ نہ ہونے دو۔ انسان کو اپنی آمدنی کا کم از کم دس فیصدی حصہ ضرور پس انداز کرنا چاہیے۔ اگر کوئی اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا تو معاشی مشکلات اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔"

اس خط میں باپو نے مجھے آمدنی اور اخراجات میں میانہ روی کی نصیحت کی ہے۔ یہ خود ان کا مزاج تھا۔ اخراجاتِ بیجا سے پرہیز اور ضرورت پر فراخدلی سے صرف۔ غلام محمد صاحب مرحوم جو بعد میں گورنر جنرل پاکستان ہوئے، اس وقت حیدرآباد میں نواب صاحب کی کیبنٹ میں وزیر مالیات تھے۔ ایک بار مالیات کے مسئلے پر نواب صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے غلام محمد صاحب نے کہا کہ نواب صاحب مالیات میں آپ کی پالیسی یہ ہے کہ پتلون پر بیلٹ باندھو اور Bracesses لگاؤ تاکہ پتلون کسی حالت میں گرنے نہ پائے۔ نواب صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے "غلام محمد صاحب آپ نے بالکل صحیح سمجھا میں ہمیشہ اسی پر عمل کرتا آیا ہوں۔ لیکن آپ کی پالیسی مالیات میں یہ ہے کہ ایک منہ زور گھوڑے پر آپ سوار ہیں۔ گھوڑا نالے گڈھے کو دو رہا ہے۔ سامنے خندق ہے ہو سکتا ہے کہ کود جائے، یا پھر اس کی ٹانگ ہی ٹوٹ جائے۔"

اس وقت مجھے ایک پُرلطف واقعہ یاد آگیا۔ سنہ ۵۵ء میں یورپ کے سفر میں" میں اور باپو لنچ بس کے ذریعے سوئیڈن سے روانہ ہوئے، تاکہ مختلف ممالک بس کے سفر سے دیکھیں۔ ہمسفر ایک یورپین تھے۔ میں نے دیکھا وہ واقعی پتلون پر بیلٹ اور اس پر Bracesses لگائے ہوئے تھے۔ میں نے باپو کو

اس طرف متوجہ کیا اور کہا کہ "یہ شخص آپ کے مالیات کے اُصول پر پورا عمل کرتا ہے، پتلون کسی طرح گرنے نہ پائے"
باپو بہت ہنسے اور فرمانے لگے۔ "دیکھا میاں، یہ ہے ایک شخص۔"

سنہ ۴۳ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کر کے میں بی ٹی ایل میں آ گیا۔ یونیورسٹی کے پراکٹوریل اسٹاف میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ میں نے باپو کو لکھا اُن کا مشورہ اور اجازت طلب کی۔ اُن کے جواب سے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کس طرز پر دنیا میں چلانا پسند فرماتے تھے۔

"تمہارے خیالات اور ردِّ عمل سے واقفیت میرے لیے ہمیشہ باعثِ مسرت ہوتی ہے۔ میں تم سے ہرگز ناراض نہیں۔ لیکن جو امر میری ناپسندیدگی کا موجب ہوا وہ یہ تھا کہ تمہارا نصب العین زیادہ سے زیادہ خدمتِ خلق ہونا چاہیے۔ میں تم کو یہ تنبیہ کرتا ہوں کہ تم یونیورسٹی کا ایسا کوئی عہدہ قبول نہ کرو جس عہدہ پر (ہونے کے لئے تمہیں طاقت کا استعمال کرنا پڑے) کارروائی کرنا پڑے اور دوسروں کی شکایات کرنا پڑے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اگر تمہارے پاس مقصد خدمتِ خلق ہے، تو تمہارے دوستوں اور مخلصین کا دائرہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔ برخلاف اس کے اگر تمہاری ذمہ داری محض دوسروں کے خلاف تعزیری کارروائی کرنا ہے، تو تمہارے نئے نئے دشمن پیدا ہوں گے۔ مجھے یہ ہرگز پسند نہیں کہ تمہارے دشمنوں کی تعداد میں حتی الامکان کسی طرح کا بھی اضافہ ہو۔ آج کے دور میں دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنا بڑا مشکل ہے۔"

باپو نے طے کر ہی لیا تھا کہ میرا مستقبل ان کی خدمت کرنا ہوگا اور اسٹیٹ کے کاموں کو سرانجام دینا اور پھر یہی ہوا۔ میں نے اپنی زندگی ان کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ اس سلسلے میں باپو کے خط کا اقتباس پیش ہے:۔

"مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ انتظام جائداد اور پڑھائی کے بار کے باعث تم جسمانی طور پر بہت کمزور ہو گئے ہو۔

"مجھے اس بارے میں سخت تشویش ہے۔ تمہیں خود بھی اس کا اندازہ ہوگا کہ جسمانی کمزوری سے بڑھ کر کوئی اور چیز تمہارے لئے خطرناک نہیں ہے۔ لہٰذا میں تم سے اصرار کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم صحت زیادہ ... پڑھائی کی نذر نہ کرو۔ تم امتحان میں ضرور شریک ہو اور معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اگر تم کامیاب ہو گئے ...

ے مسرت ہوگی، لیکن اگر تم ناکام بھی ہوئے تو مجھے اس کا قطعاً ملال نہ ہوگا۔ جب یہ طے ہوگیا ہے کہ تم اُمورِ جائداد کی نگرانی کروگے تو تمہارا بی۔اے میں کامیاب یا ناکامیاب ہونا اس ضمن میں بالکل غیر متعلق ہے۔ اس کے علاوہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان ڈگریوں کی فی نفسہٖ کوئی اہمیت ہے۔ اگر تمہارا یہ نظریہ ہے تو تم غلطی پر ہو۔ اگر تمہارا خیال ہے تو اپنے والد کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے جو ڈگریوں سے ہمیشہ اس طرح دور رہا جیسے کوئی شخص زہریلے سانپ سے دُور رہتا ہے۔

”پیارے ابن! جو امر واقعی اہم ہے، وہ ہے تربیت یافتہ اور مہذب ذہن[۱] افراد اشیاء اور کرداروں سے بخوبی واقفیت ہے۔“

---

1- I am sorry to learn from your letter that you have been weak on account of your studies and the work of your estate. I take a very serious view of this. You know there can be nothing more injurious for you than to become weak. Therefore, I urge upon you not to give too much time to your studies. You may sit for the Examination and leave it to God. If you pass it, it is well and good; if you do not, I will not be sorry at all. We have decided that you are to work with me and the Estate. Then it does not matter at all whether you have passed your B.A. or not, as it will be of no use in your Esatate work. Besides this, do you really think that these degrees have any intrinsic value?, if you do so, you are very badly mistaken, and if you do so what do you think of your father who avoided degrees as if one should avoid a poisonous snake. Dear Ibban, what really matters is a cultivated mind and real knowledge of men, things and characters.

(Letter dated 20th March, 1945 - Hyderabad)

ایک دفعہ مجھے نصیحت فرماتے ہوئے اپنے خط میں لکھا :-

"آفریں ہے تم پر کہ ان معاملات میں تم نے خود اپنی رائے کا استعمال کیا۔ حالانکہ یہ معاملات کچھ زیادہ اہم نہ تھے، لیکن قوت فیصلہ کا استعمال دوسروں کی نگاہ میں تمہاری قدر و منزلت بڑھا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے انسان کے اندرون کا اندازہ ہوتا ہے۔ تمہارے خاندان کی امتیازی خصوصیات ہیں دریادلی اور خوش خلقی۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ تم نے اپنی خاندانی روایات کی پاسداری کی۔ خدا تمہیں درازی عمر عطا فرمائے اور تم اپنے والدین اور اپنے خاندان کے لئے ہمیشہ باعث فخر و مسرت بنے رہو۔"

سنہ ۱۹ اکتوبر ۴۷ء کے خط میں باپو نے مجھے اس طرح نصیحت فرمائی کہ :

"اس زمانے میں ہر شخص مختلف قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہے اگر ان پریشانیوں سے نجات دلانے کے لئے حسب مقدرت کسی کی کچھ امداد ہو سکے تو اچھا ہے۔ وقت گذرتا جاتا ہے لیکن بات باقی رہتی ہے۔"

باپو حیدرآباد سے نومبر ۴۸ء میں واپس ہوئے اور پھر اُن کا علی گڑھ میں زیادہ قیام رہنے لگا۔ مسلم یونیورسٹی کے پرو چانسلر اور پھر چانسلر مقرر ہوئے۔ باپو کو یونیورسٹی سے والہانہ عشق تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو یونیورسٹی کے معاملے میں colour blind ہوں۔ مجھے ایک ہی رنگ نظر آتا ہے اور وہ ہے اچھائی کا۔ ۱۹۵ میں میں خود یونیورسٹی کورٹ کا ممبر تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب نواب علی یاور جنگ وائس چانسلر تھے۔ نواب صاحب کا انتخاب چانسلر کی حیثیت سے ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ نواب صاحب نے بحیثیت چانسلر پہلی تقریر جو مسلم یونیورسٹی کورٹ میں کی وہ یہ تھی کہ : "آپ نے مجھے چانسلر منتخب کر کے میری بڑی عزت افزائی فرمائی ہے۔ یوں تو میں جب گورنر تھا تو یوپی کی یونیورسٹیوں کا چانسلر تھا، حیدرآباد میں مدار المہام کی حیثیت سے عثمانیہ یونیورسٹی کا چانسلر تھا لیکن وہ سب اپنے عہدہ کی رعایت سے تھا لیکن اس ادارہ کا جس کا کہ میں خود طالب علم رہا ہوں چانسلر منتخب ہونا میرے لئے باعث عزت و افتخار ہے۔ چانسلرشپ تو بہت بڑی چیز ہے۔ آپ نے اگر اس یونیورسٹی کی جامع مسجد کی جاروب کشی بھی دی ہوتی تو میں اس کو خوشی کے ساتھ قبول کر لیتا۔"

باپو یونیورسٹی کے ہر فنکشن میں بڑی پابندی سے شرکت فرماتے اور دوسرے پروگرام کو پس پشت ڈال دیتے۔ وائس چانسلر کا ادب بہت ملحوظ رکھتے تھے، وہ فرمایا کرتے تھے "وائس چانسلر سر سید کا جانشین ہوتا ہے"۔

اب تین چار برس سے ان کی آواز گر گئی تھی۔ تقریر کرنے سے گریز فرمایا کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی سہارے سے آہستہ آہستہ چل کر صدارت اور شرکت فرمایا کرتے تھے۔ انھیں خیال ہو چلا تھا کہ ان کی زندگی کے اختتام کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آخری فنکشن ۲ اکتوبر سنہ ۸۰ء گاندھی جینتی میں شرکت فرمائی۔ پروگرام میں ان کی تقریر نہ تھی پروفیسر [illegible] وائس چانسلر کے عہدہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ تقریر فرمائیں گے۔ شروع کے الفاظ یاد ہیں "شاید یہ میری آخری تقریر ہے۔ شاید آخری بار آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ زندگی کا کیا بھروسا" پھر یہ شعر بے ساختہ پڑھا:

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید ⁂ کہ اک بوئے کفن دامن بہار میں ہے

اور ہوا بھی یہی۔ پھر بابو یونیورسٹی کے کسی فنکشن میں شریک نہ ہو سکے۔ کوئی نہ کوئی علالت پیش آتی رہی۔

بابو کو اسکاؤٹنگ سے ہمیشہ لگاؤ تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے وہ چیف کمشنر آف انڈیا تھے۔ ۱۹۳۷ء میں اس کی کانفرنس دہلی میں ہوئی تھی۔ اگرچہ میں بہت نو عمر تھا۔ مگر مجھے اس میں شریک ہونا یاد ہے۔ یونیورسٹی کے اسکول میں اسکاؤٹنگ کا رواج تھا۔ میں خود بھی اسکاؤٹ رہا ہوں۔ مجھے کئی دفعہ وکٹوریہ گیٹ کے سامنے ڈنڈے ہاتھ میں لئے یونیورسٹی کے مہمانوں کا خیر مقدم کرنا یاد ہے۔ اس آل انڈیا جمبوری میں بانیٔ (اسکاؤٹ) تحریک لارڈ بیڈن پاول اور چیف اسکاؤٹ آف انڈیا لارڈ لنلتھگو (وائسرائے ہند) کی تشریف آوری یاد ہے۔ بابو خاکی رنگ کا صافہ باندھے اور اسکاؤٹ ڈریس پہنے تھے۔ بابو کو اسکاؤٹنگ کا سب سے بڑا میڈل سلور وولف (SILVER WOLF) اور ہاتھی (ELEPHANT) ملا۔ ملک کی آزادی کے بعد اسکاؤٹ تحریک دھیمی پڑ گئی اس لئے کہ بہت سی اس طرح کی تحریکیں شروع ہو گئی تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ اس کے روح رواں تھے انھوں نے انتھک کوشش شروع کر دی۔ مومن حسن علی جعفری صاحب چیف جسٹس دیا س دیو مصرا صاحب اور ظفر افضلی نے اس تحریک میں تازہ روح ڈال دی۔

بابو چیف اسکاؤٹ آف انڈیا (chief scout of India) ہو گئے۔ صدر جمہوریہ اس کے (PATRON) ہوئے اور اس اسکاؤٹ تحریک نے پھر ابھر کر اپنا مقام حاصل کر لیا۔

بابو کی دیرینہ خدمات کو زندگی دینے کے لئے جعفری صاحب اور چیف جسٹس مصرا صاحب نے ایک عمارت اوکھلا میں تعمیر کرائی جس کا نام "چھتاری ہٹ" رکھا۔ اس کا سنگ بنیاد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

صدرِ جمہوریہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھا۔ 'چھتاری ہٹ' کے افتتاح کی رسم مسز گاندھی، وزیرِ اعظم نے
اس 'چھتاری ہٹ' نے نواب صاحب چھتاری کے نام کو اسکاؤٹنگ میں زندہ جاوید بنا دیا۔ غالباً اس کا
کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا کہ 'چھتاری ہٹ' کمیٹی کے چیرمین کرنل بشیر حسین زیدی صاحب ہیں۔

ایک بار کرنل زیدی صاحب باپو سے 'چھتاری ہٹ' کی تعمیر کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے
لگے۔ "نواب صاحب آپ نے اب تک تین ہٹ سُنی ہوں گی۔ راج ہٹ، بالک ہٹ، تریا ہٹ
یہ چوتھی چھتاری ہٹ قائم ہوئی ہے۔" زیدی صاحب کے الفاظ اگرچہ مذاق اور لطیف پیرائے میں تھے لیکن
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت بن گئے۔ سنگِ بنیاد صدرِ جمہوریہ نے رکھا، 'راج ہٹ' شامل ہو گئی۔ اس
افتتاح کی رسم وزیرِ اعظم مسز گاندھی کے دستِ مبارک سے ہوئی، 'تریا ہٹ' شامل ہو گئی۔ اسکاؤٹ
بالک ہیں۔ 'بالک ہٹ' موجود ہے۔ جب یہ تینوں ہٹ شامل ہو گئیں تو انشاء اللہ 'چھتاری ہٹ'

۵۶ء میں باپو بحیثیت پرو چانسلر یونیورسٹی کا وفد لے کر سعودی عرب گئے۔ شاہ سعود
دس لاکھ روپیہ میڈیکل کالج کے لئے عطا فرمایا۔

میں باپو کی خدمت میں ساتھ تھا۔ مکہ مکرمہ میں باپو کے دادا (نواب محمود علی خاں صاحب) کا
کیا ہوا ایک مکان تھا، جو توسیعِ حرم میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کا معاوضہ ڈھائی لاکھ ریال ملا جو
یونیورسٹی کی تعمیر میں نذر کئے۔ یہ رقم پنڈت جواہر لال نہرو آنجہانی وزیرِ اعظم کے خط کے ساتھ شاہ سعود کی
خدمت میں بھیجی گئی۔ باپو نے مجھ سے کہا کہ "ذاتی اخراجات کم کرو اور پبلک میں داد و دہش بر معاد" خدمتِ
خلق بہتر ہے اس سے کہ اپنی ذات پر صرف کرو اور خود غرض اور بخیل کہلاؤ۔"

۵۷ء میں باپو حج کے فریضہ سے سبکدوش ہوئے۔ سفر میں، میں تو خدمت میں تھا ہی لیکن میری
والدہ، میری چھوٹی بہن اور میرا چھوٹا بھائی بھی ساتھ گئے تھے۔

میں ہمیشہ باپو کے ساتھ سفر میں رہا ہوں۔ تنہائی ہوتی تھی کتنی باتیں وہ مجھ سے کرتے تھے کتنے نشیب و
فراز سمجھاتے تھے۔ گھر کی باتیں، سیاست کے طور و طریق، سوشل لائف، اخلاقیات، مذہب، غرض کوئی مضمون
ایسا نہ تھا جس پر انہوں نے گفتگو نہ کی ہو۔ اگر میں باپو پر مضمون لکھنے بیٹھوں تو ایک کتاب تیار کر سکتا ہوں۔

اکثر باپو فرمایا کرتے تھے کہ "جب تم کسی دعوت میں جاؤ یا کسی فنکشن میں پہنچو تو وقت کی پابندی کرو
دو منٹ پہلے پہنچنے کی کوشش کرو، یاد رکھو اگر تم مہمانِ خصوصی ہو اور دیر میں پہنچو گے تو اس سے جن

ور مہمانوں کو انتظار کی تکلیف ہوتی رہے گی۔ اگر تم مہمانوں میں شریک ہو اور دیر سے پہنچے تو جو لوگ پہلے سے پہنچے ہیں وہ اگلی نشستوں پر بیٹھ چکے ہوں گے اور تمہیں سب سے پیچھے جگہ ملے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو نگاہیں تمہیں آگے دیکھنے کی عادی تھیں وہ تمہیں پیچھے دیکھنے کی عادی ہو جائیں گی"۔ باپو نے ایک دفعہ فرمایا کہ "جب تم ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہو گے تو تم بہت سے لوگوں سے تو ملتے ہوئے چڑھو گے لیکن جب تم اترو گے تو پھر ایک بار ان ہی لوگوں سے ہاتھ ملانا ہوگا۔ لہٰذا ایسا طرز رکھو کہ تمہیں واپسی پر شرمندگی نہ ہو"۔ فرمانے لگے "بیٹا میں نے کبھی حکومت کا بیجا استعمال نہیں کیا۔ جب ہوم ممبر تھا جب یوپی کا چیف منسٹر تھا جب گورنر ہوا اور پھر وزیر اعظم حیدرآباد ہوا، اس کا ہمیشہ خیال رکھا کہ جب کسی کا معاملہ میرے سامنے آیا میں نے خلاف فیصلہ کرتے ہوئے بھی جتنی ممکن رعایت اس کے ساتھ برت سکتا تھا بغیر سفارش کر دی اور کبھی کسی کے ساتھ ذاتی عناد نہیں برتا۔ یاد رکھو آج کرسی پر ہو، کل کرسی پر نہیں بھی ہو گے"۔

یہاں مجھے ایک واقعہ حیدرآباد کا یاد آگیا۔ باپو جب صدر اعظم حکومت آصفیہ کے عہدے پر فائز تھے اور دہلی میں برٹش گورنمنٹ سے حیدرآباد کے مستقبل کے متعلق معاملات طے کر رہے تھے اعلیٰ حضرت نظام کا تار کوڈ میں آیا، جس کا جواب کوڈ میں دیدیا گیا۔ یہ تار نواب صاحب کے پی اے کرم اللہ صاحب کی تحویل میں تھا۔ وہ تار کسی طرح غائب ہو گیا اور بعد بسیار تلاش بھی مل سکا۔ معاملہ سی آئی ڈی کے سپرد کر دیا گیا۔ سی آئی ڈی کی رپورٹ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ تار کرم اللہ صاحب کی سیف سے ان کی لاپرواہی سے نکل گیا۔ نواب صاحب نے وہ رپورٹ کرم اللہ کو دکھائی اور کہا کہ اس لاپرواہی کی سزا حیدرآباد کی ملازمت سے برخواستگی ہے۔ کرم اللہ گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ نواب صاحب نے کہنا شروع کیا "کرم اللہ میں تمہارے ساتھ یہ رعایت کر سکتا ہوں کہ تم مجھے خود درخواست دو کہ تمہارا تبادلہ صدر اعظم کے اسٹاف سے کسی اور شعبہ میں کرا دیا جائے۔ تم جہاں جانا چاہو گے وہیں پہنچا دوں گا" اور پھر نواب صاحب نے ان کے ساتھ یہی برتاؤ کیا۔ باپو نے اپنے منصب سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ اپنے بچوں کو کبھی اپنے عہدہ میں دخل دینے دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ اورنگ آباد کے دورہ سے واپس ہوئے اعلیٰ حضرت کا فرمان مبارک صدر اعظم کے نام موصول ہوا جو مثل حکم کے ہوتا تھا۔ اس میں تحریر تھا کہ چونکہ آپ مملکت کے کاموں پر اکثر دہلی اور دورہ پر رہتے ہیں اس لئے آپ کے ذاتی کاموں کی دیکھ بھال کے لئے آپ کے بیٹے (یعنی راقم) کو اپنا معتمد راز مقرر کرتا ہوں۔ باپو نے وہ فرمان مجھے دکھایا اور فرمایا کہ دیکھا خدا کس طرح عطا فرماتا ہے۔ لیکن میری رائے میں جب تک میں حیدرآباد میں بحیثیت صدر اعظم ہوں اس وقت تک کسی

میرے بیٹے کو یہاں ملازم نہیں ہونا چاہیئے۔ باپو نے عرضداشت حضور کے سامنے پیش کی کہ "اعلیٰ حضرت کی ذرہ نوازی اور بندہ پروری ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لقمہ حیدرآباد کا حق ہے۔ اس کے علاوہ میں جب تک حیدرآباد کی خدمت پر معمور ہوں اس وقت تک میرے کسی بچے کو یہاں ملازمت نہ دی جائے (میرے جانے کے بعد غلام زادوں کا جو نمک خوار ہی ہیں اوّلین فرض ہوگا، خاندان آصفیہ کی خدمت بجالائیں"۔

باپو مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ "میں کبھی غصّہ نہیں کرتا۔ تم کبھی غصّہ نہ کرنا۔ غصّہ بُری چیز ہے۔ اگر کبھی کسی بات پر ناگواری ہو اور غصّہ کا اظہار کرنا ہو تو غصّہ کو لانا، غصّہ کو خود مت آنے دینا۔ اس کا فرق یہ ہے کہ جب تم غصّہ کو لاتے ہو، تمہارا کنٹرول غصّہ پر رہتا ہے اور جب غصّہ خود آتا ہے تو پھر اس کا کنٹرول تمہارے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ ہر بات جو نہ کہنے کی ہو اور ہر حرکت جو نہ کرنے کی ہو آدمی کر گذرتا ہے (دیکھیئے، مجھے اکثر غصّہ آجاتا تھا۔ شاید اس لئے انہوں نے میری توجہ اس طرف دلائی اور اب ان کے جانے کے بعد خاموش ہو جاتا ہوں، صبر کر لیتا ہوں) یہ حقیقت ہے کہ میں نے باپو کو کبھی غصّہ کرتے نہیں دیکھا۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ناگواری کے وقت اچھے الفاظ ادا کرو، جو لوگ گالیاں بکنے لگتے ہیں اس سے دوسرا شخص چڑ جاتا ہے، چڑچڑا ہو جاتا ہے، اور پھر الزام تمہاری بدمزاجی کے سر آجاتا ہے"۔

ایک صاحب کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خط ۲۰ فروری سنہ ۴۳ء میں مجھے نصیحت فرمائی کہ "ابھی آپ نے دنیا کو برتنا شروع کیا ہے۔ یہ تو ابتدا ہے۔ جوں جوں آپ کو ان سے ملنے کے مواقع حاصل ہوتے جائیں گے اسی نسبت سے آپ پر ان کی فطرت کے عجب عجب پہلو روشن ہوتے جائیں گے۔ فطرتِ انسانی کا مطالعہ بہر حال دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ دل سے غور کر کے نتائج اخذ کریں۔ تاکہ قوتِ فیصلہ متاثر نہ ہو"۔

باپو کو جب کسی بات پر ناگواری ہوتی اس کا اظہار کچھ اس طرح فرماتے کہ اس کے سمجھنے کے لئے بھی عقل کی ضرورت ہوتی۔ نواب صاحب باغپت جمشید علی خاں صاحب مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ بھائی جی (نواب صاحب چھتاری) کی خفگی اور ناگواری کو سمجھنے کے لئے صلاحیت اور عقل کی ضرورت ہے۔ یہ ذکر غالباً سنہ ۴۴ء کا ہے کہ ایک فلم ایکٹر علی گڑھ آیا مسلم یونیورسٹی کی کلچرل سوسائٹی نے استقبالیہ دیا۔ شب کا کھانا راحت منزل پر ہوا۔ دعوت کے بعد میں حیدرآباد چلا گیا، وہاں جو اخبارات دہلی سے پہنچے اس میں یہ خبر اس طرح شائع ہوئی کہ "ایک فلمی اداکار کی ضیافت نواب چھتاری کی

رہائش گاہ پر کی گئی"۔

باپو اس وقت صدر اعظم سلطنت حیدر آباد تھے۔ ظاہر ہے اس خبر سے باپو کو کوئی خوشی نہیں ہوئی ہوگی۔ میں نے اس خبر کا ان سے تذکرہ کیا اور معافی مانگی۔ فرمانے لگے "کوئی بات نہیں، تم نے دعوت کی تھی کوئی عداوت تو نہیں۔ ایک وقت تھا کہ اخباروں میں اس طرح خبر شائع ہوا کرتی تھی کہ "ہز ایکسلنسی گورنر کی دعوت نواب صاحب چھتاری کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ ہز ہائی نس بھوپال، ہز ہائی نس آغا خاں کی دعوت نواب صاحب چھتاری کی رہائش گاہ پر ہوئی" اور آج اس طرح خبر شائع ہوئی کہ "ایک فلمی اداکار کی ضیافت نواب چھتاری کی رہائش گاہ پر کی گئی"۔ بہر حال ترقی نہ سہی تنزلی ہی سہی، کچھ تو ہے۔ مجھ پر کیا گذری یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن ان الفاظ سے ان کی ناگواری کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

میں نے باپو کو کبھی مذاق کرتے نہیں دیکھا۔ میری عادت فقرہ اڑانے اور مذاق کرنے کی بہت تھی۔ اکثر باپو کی ڈانٹ پڑ جایا کرتی تھی۔ باپو فرمایا کرتے تھے کہ "مذاق کرتے وقت یہ مت دیکھو کہ تم نے مذاق کیسا کیا۔ بلکہ یہ دیکھو کہ مذاق کس پر کیا اور اس کا اثر اس نے کیسا قبول کیا۔ جس شخص کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے اگر اسے ناگواری ہوئی ہے تو وہ مذاق نہیں دل آزاری ہوگی۔ دشمنی بڑی سستی خرید لی"۔

باپو اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "جب کسی آنریری جگہ پر تمہارا تقرر ہو تو ایک میعاد (Term) کے بعد چھوڑ دو۔ اگر تم سے لوگ اس میعاد (Term) میں خوش رہے ہیں اور ان کا انتہائی اصرار ہو تو دوسری میعاد (Term) منظور کر لو، ورنہ دوسروں کے لئے جگہ خالی کرو، اس سے قبل کہ لوگوں کے دلوں میں تمہیں ہٹانے کی آرزو پیدا ہو اور تم نے اپنے عہد میں ادارہ کی جو خدمت کی ہے اس کی تعریف و تحسین بھی جاتی رہے سبکدوش ہو جانا بہتر ہے۔ باپو طویل تقریر کے بہت خلاف تھے۔ فرمایا کرتے تھے جو کچھ کہنا ہو اختصار سے کہہ دو تاکہ اہم بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے۔ بات کرتے وقت سننے والے کے چہرہ کو دیکھو، اگر وہ دلچسپی لے رہا ہے بات جاری رکھو، ورنہ موضوع بدل دو، ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس بات میں دلچسپی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ سننے والے کو بھی دلچسپی ہو۔ دلچسپ گفتگو اس وقت ہو سکتی ہے کہ جس سے تم بات کر رہے ہو اس کی دلچسپی کا مضمون بھی اپنی گفتگو میں شامل رکھو"۔

باپو قرض لینے کے بہت خلاف تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے "قرض مت لینا، اس سے عزت جاتی

رہتی ہے۔ مجھ پر اکثر over draft ہو جایا کرتا تھا اسے ناپسند فرماتے تھے۔ ان کا قول یہ ہوا کرتا تھا "میں قرض سے Allergic ہوں"۔ باپو نے تمام جائیداد اپنے بچوں میں سنہ ۱۹۳۷ء میں تقسیم کردی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ زمینداری کے خاتمہ سے وہ بھی ختم ہو گئی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ایک اینٹ بھی ان کے نام نہیں تھی۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "روپے سے مجھے کبھی محبت نہیں ہوئی۔ دولت کمانے کے لئے ہے لیکن محبت کرنے کے لئے نہیں۔ دولت تمہاری خدمت کے لئے ہے نہ کہ عبادت کے لئے اپنے ذاتی اخراجات اعتدال میں رکھو، لیکن پبلک کے کاموں میں اور جود و دہش میں فراخ دلی سے صرف کرو"

روپیہ جمع کرنے کے سلسلے میں فرمایا کرتے تھے کہ کچھ لوگ منیجر کی حیثیت سے پیدا ہوتے ہیں ان کا کام صرف روپیہ جمع کرنا ہوتا ہے۔ منیجر وہ ہیں جو روپیہ جمع کرتے ہیں۔ اپنے اوپر صرف نہ کریں نہ دوسروں پر۔ اور مالک جب آتا ہے تو وہ جمع شدہ مال بیدردی سے اڑا دیتا ہے۔

باپو آخری زمانے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس ۹۰ سال کی عمر میں تمہاری فیملی کا میں earning member ہوں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ حیدرآباد سے پنشن اور نظام فیملی ٹرسٹ سے تنخواہ سالانہ ملتی تھی جو ہمارے لئے ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ نظام ٹرسٹ کی میٹنگ جب بھی ہوتی تو وہ حیدرآباد جاتے۔ جب سے انھیں قلب کی شکایت ہوئی تھی ان کا معالج اور ہم گھر والے انھیں حیدرآباد کے سفر سے روک دیا کرتے تھے اور یہ رکنا انھیں بار گذرتا تھا۔ باپو فرمایا کرتے تھے "جب تنخواہ لو تو کام باقاعدہ کرو ورنہ استعفیٰ دیدو۔ اپنی معذوری سے دوسرے کا نقصان نہ کرو اور دوسرے کی شرافت سے بیجا فائدہ نہ اٹھاؤ۔ لہٰذا باپو نے کئی بار استعفیٰ نظام ٹرسٹ کو بھیجا۔ لیکن ٹرسٹ نے اسے قبول نہیں کیا۔ اس کی وجہ ان کا دیرینہ تعلق خاندان آصفیہ سے اور وہ خدمات تھیں جو حیدرآباد کی بحیثیت وزیر اعظم انھوں نے انجام دی تھیں۔

باپو کی زندگی بہت سادی تھی کسی چیز کے عادی نہیں، کسی چیز میں fussy نہیں۔ صبح پانچ بجے اٹھ جانا، نماز اور وظائف سے فارغ ہونا، ناشتہ میں ایک انڈا، توس، اکثر کچے ٹماٹر یا گاجر کیلا یا سنترہ۔ شہد بالالتزام استعمال فرمایا کرتے تھے۔ کھانا جو بھی ہوتا کھا لیا کرتے تھے۔ خوراک بہت کم تھی آخری عمر میں ان کی خوراک نصف چپاتی رہ گئی تھی۔ فرمایا کرتے تھے عمر جیسے جیسے بڑھے، خوراک کم کرتے رہنا چاہیے، صحت اور طوالت عمر کا امکان ہو جاتا ہے۔ ظہر کی نماز کے بعد تلاوت کلام پاک فرماتے

شام کی چائے میں خبوڈال کر پیا کرتے۔ حافظ تھے ورد کلام پاک مغرب کے بعد بھی کیا کرتے اور خدا کے فضل سے ا، محرابیں سنائیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اپنے اللہ کی طرف رجوع ہونے میں بڑا سکون ملتا ہے۔ اس آخری علالت میں اکثر یہ شعر پڑھتے اور مجھے سناتے: ؎

خرم آن روز کزین وادیٔ ویران بروم　　راحتِ جان طلبم و زپئے جانان بروم

باپو کو شکار کا شوق تھا، بندوق بہت اچھی چلاتے تھے۔ ۷۵ برس کی عمر میں اسپھاٹپ اور تیر مار لیا کرتے تھے۔ سنہ ۴۷ء تک گھوڑ سواری کیا کرتے تھے۔ ان کا اپنا گھوڑا عربی النسل تھا۔

شب میں ساڑھے دس بجے پلنگ پر لیٹ جاتے۔ ۱۱ بجے تک کتاب بینی اور پھر سو جاتے۔ میں نے باپو کو زیادہ رات تک جاگتے نہیں دیکھا۔ یہ عادت ان کی عمر بھر کی عادت تھی۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ زندگی میں میں صرف ایک بار صبح ۴ بجے تک جاگ کر سوئے۔ یہ جب کی بات ہے کہ باپو یوپی کے گورنر تھے اور ہز ایکسیلینسی وائسرائے لارڈ ولنگڈن مہمان کی حیثیت سے نینی تال تشریف لائے تھے۔ جب تک وائسرائے محفل میں بیٹھے رہے، باپو کو انتظار کرنا پڑا۔

قدامت پسند بھی تھے اور بہت ماڈرن بھی۔ ہم چاروں بھائی اور ہماری بیویاں ایک ساتھ کبھی ان کے سامنے نہیں آئے۔ یہ ہمارے گھر کی قدامت پسندی کا رواج تھا۔ لیکن باپو اس قدامت پسندی کو اپنے پوتے اور پوتیوں اور نواسے اور نواسیوں کے ساتھ روا نہ رکھتے تھے۔

ریاست چھتاری کے انتظامی امور میں مجھے حیدرآباد سے صلاح و مشورہ دیتے رہتے تھے۔ ملک کے سیاسی حالات ان کے پیش نظر رہتے تھے۔ نواب صاحب مزاجاً جمہوریت کے ماننے والے تھے۔ ریاست کے معاملات ہی میں نہیں، بلکہ گھر کے معاملات میں بھی بچوں کو جمہوری آزادی تھی۔ اکثر گھر کے معاملات گفتگو اور آپس کے مشورے سے طے ہوتے تھے۔ حیدرآباد سے یکم جون ۴۹ء کے خط میں مجھے لکھا کہ:

"آپ کے یہاں جو دیہات میں جو پنچایتیں قائم ہیں وہ بجائے نامزدگی کے بذریعہ انتخاب تشکیل پا جائیں تو اچھا ہے۔ اس کے متعلق ہم نے آپ کو لکھا تھا کہ آپ منیجر صاحب سے کہہ کر جلد اس کا سلسلہ شروع کرا دیں۔ باضابطہ انتخاب کے ذریعہ ہر فرد کی رائے شماری فوراً تو ممکن نہیں لیکن آپ دیہات کے لوگوں سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہر قوم اور ہر برادری میں سے اپنے جن نمایندوں کو خود چن کر اپنی مرضی سے جن آدمیوں کی فہرست ریاست کو دیں گے ان ہی لوگوں کا اعلان کر دیا جائے گا۔"

میں سنہ ۵۲ء جون میں چھتاری کی تحصیل وصولی کا انتظام کر رہا تھا۔ زمینداری یکم جولائی سنہ
کو ختم ہو رہی تھی۔ حکومت کی طرف سے اس کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ باپو کا قیام اس وقت علی گڑھ میں
میرے پاس خط اس مضمون کا پہنچا: "۳۰ جون کی شام تک جو روپیہ وصول ہو جائے وہ ٹھیک ہے
اپنے کارندوں کو حکم دیدیں کہ یکم جولائی سے وصولیابی بند کر دیں۔ اگرچہ قانون میں اس کی رعایت دی
زمیندار بقایا لگان وصول کر سکتا ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ سو برس سے جو تعلقات ریاست
کاشتکاروں سے رہے ہیں ان کا خاتمہ مقدمہ بازی پر ہو۔" تقریباً ساٹھ ستر ہزار روپے کی رقم پھر
کبھی وصول نہیں ہوئی۔

باپو کو چھتاری سے والہانہ تعلق تھا۔ چھتاری نے انھیں نواب چھتاری کا لقب دیا اور
صاحب کی ذات نے چھتاری کو دنیا کے ہر گوشے میں مشہور کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ دونوں لازم و
باپو نے اپنے خط میں میرے بڑے بھائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"میں فرحت سلمہٗ کی آئی، سی، ایس میں کامیابی کے لئے دعاگو ہوں۔ لیکن خواہ کامیابی ہو
ناکامی چھتاری خاندان کے ہر فرزند کا اولین فریضہ چھتاری کے عوام کی خدمت ہونا چاہئے اور
اس باب میں ہر ذمہ داری کو پورا کرنا چاہئے۔ بخدا دنیا میں دانش وروں سے بڑھ کر ضرورت
لوگوں کی ہے جو عام سوجھ بوجھ رکھتے ہوں اور معتدل مزاج ہوں۔ اگر دنیا میں محض دانشور ہوں
تو دنیا رہنے کے قابل نہیں۔[1]"

---

"I am Praying and Praying hard that Farhat may ucceed in his I.C.S. Examination. But success or failure very child of mine must realize, that he owes a duty to the eople of chhatari and the People in chhatari Estate, and hould be Prepared to fullfil that responsibility whenever is called upon todo so by Providence. Let me tell you one hing. In this world what we need are level headed men ith strong common sense and not geniuses. If the orld were full of geniuses it would not have been orthliving" (Letter dated 28th April, 1943- Hyderabad)

۱۵ دسمبر ۴۴ء کے خط میں مجھے لکھا ہے کہ:

"تمہارے اس احساس ذمہ داری سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ کسی معتمد کے آنے سے قبل تم چھتاری سے روانہ نہیں ہوئے یہ محض اللہ کی رحمت ہے کہ امور جائداد کے بارے میں تم اس درجہ فرض شناس ہو۔ میرے عزیز فرزند! تمہیں یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہمارے مستقبل کا دارومدار چھتاری پر ہے اور اس کے معاملات کو ہمیں کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے"

باپو کو چھتاری سے عشق تھا۔ بات بات پر وہ چھتاری کا ذکر ہم سے اس طرح فرماتے کہ اس کی اہمیت ان کے بچوں کے دماغوں میں راسخ ہو جائے۔ فرمایا کرتے کہ حکومت یوپی کے دفاتر موسم گرما میں نینی تال منتقل ہو جاتے تھے۔ نینی تال کا پانی میری صحت کے ساتھ سازگار نہ تھا۔ میں چھتاری کے کوئیں کا پانی مخصوص انتظام سے اپنے پینے کے لیے نینی تال منگوایا کرتا تھا۔ باپو نے کبھی چھتاری کے قلعہ کے رہن سہن میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ ۱۹۰۷ء میں جو پردے ٹنگے ہوئے تھے وہ آج بھی ہیں۔ ایک صوفہ سیٹ جو ان کے دادا کے زمانے کا ہے وہ آج بھی ہے، اگرچہ خستہ حالت میں ہے۔ چھتاری کا قلعہ تقریباً دو سو برس پرانا ہے۔ عمارت اپنی عمر ختم کر چکی ہے۔ اینٹ مٹی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ریاست کے زمانے میں اس کی مرمت کا انتظام تھا۔ باپو کے لئے قلعہ کی مرمت کا مسئلہ مستقل میں فکر و تشویش کا باعث تھا، ان کا خیال تھا کہ ان کے بچے ان کے بعد اس کا بوجھ نہ اٹھا سکیں گے۔ لہٰذا زراعتی فارم کے لئے وصیت لکھ دی کہ اس کی آمدنی قلعہ کی مرمت اور دیکھ بھال میں صرف ہوتی رہے۔ باپو اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے کہ یاد رکھو تم چھتاری کے کہلانے کے اس وقت تک مستحق ہو جب تک یہ تمہارا گھر قائم ہے جس دن قلعہ ختم ہوا تمہاری چھتاری سے نسبت اور وجود جاتا رہے گا۔

پچھلے تیس برس پہلے سے باپو نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ انھیں چھتاری میں دفن کیا جائے۔ مجھے کئی دفعہ جگہ کی نشان دہی کی یہ جگہ میری ماں کی قبر سے ملی ہوئی ہے۔ سن ۱۲ء میں میری ماں کی شادی ہوئی تھی۔ سنہ ۲۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ۱۱ برس دونوں ساتھ رہے۔ ۵۹ برس انتظار میں گذر گئے۔ باپو کی خواہش اور وصیت کے مطابق انھیں میری ماں (والدہ) کے برابر دفن کر دیا، آخر وہ دن آپہنچا جس کے لئے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: منها خلقنكم وفيها

نعیدکم و منہا نخرجکم تارۃً اُخریٰ ۝ (اسی زمین سے ہم نے تمہیں بنایا، اسی زمین میں
تم کو پھر ڈالتے ہیں اور اسی زمین سے پھر نکالیں گے ایک بار")

- جنوری کی شام میں چھتاری کی مٹی، چھتاری میں ضم ہو گئی۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون ۝

جب کبھی کرم فرما دوست باپو کی تعریف کیا کرتے، یہ کہہ دیا کرتا تھا کہ فی زمانہ یہ کریڈٹ نہیں کہ کسی کی تعریف کی جائے، اگر اسے بُرا نہ کہا جائے تو میں اسے بہت بڑا کریڈٹ سمجھتا ہوں۔ لیکن مجھے اپنے خیال سے زیادہ اس بات کا اندازہ اس وقت ہوا جب باپو کے انتقال کی خبر آگ کی طرح علی گڑھ میں پھیل گئی۔ ہر طبقہ، ہر فرقہ کے لوگ بھاگے چلے آئے۔ یونیورسٹی کے حضرات، حکامانِ ضلع، دوست و احباب سب ہی جمع ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو پر انتقال کی خبر نشر ہوئی۔ حکومت نے انھیں اسٹیٹ فیونرل دیا۔ صدرِ جمہوریہ کی طرف سے پھول مالا (wreath) رکھی گئی۔ اور وزیر اعظم مسز گاندھی کی طرف سے پھول ڈالے گئے اور وزیر اعظم کا اخبار میں بیان نکلا جس سے باپو کی ذاتی شخصیت اُجاگر ہو گئی۔

علیگڈھ اور چھتاری میں مجمع کی انتہا نہ تھی۔ اعزا، اداروں کا ہجوم، تار اور خطوں کی بے تحاشا آمد، مجھے باپو کے ایک خط کے الفاظ یاد آ رہے ہیں:

" ہاں تمہارا یہ خیال بالکل درست ہے کہ ہم کو اپنے فرائض اس طور پر انجام دینا چاہیے کہ رخصت ہونے پر لوگ ہماری کمی محسوس کریں اور ہمیں یاد کریں۔ ایسی زندگی سے کوئی فائدہ نہیں کہ موت کے بعد لوگ یہ سمجھیں کہ انہیں کسی لعنت سے نجات مل گئی"[1]

---

1- yes you are right in thinking that one should live in Such a manner that when one leaves, People may miss him and feel sorry for him. It is of no use living a life that may leave an impression behind that a great curse that had been fallen has been removevd."
(Letter dated 30th. October 1942 - Hyderabad.)

اس دنیا میں آج باپو نہیں ہیں۔ لیکن میں خدا کے فضل سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی کا گراف بنایا جائے تو نیچے سے اوپر ایک ہی سمت کو لائن چلی گئی ہے۔ ان کی زندگی، سیاسی زندگی، آنریری مجسٹریٹ سے شروع ہوئی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین، ہوم ممبر، چیف منسٹر صوبہ یوپی کے گورنر، وائسرائے کونسل کے ممبر، وزیر اعظم مملکت آصفیہ اور پھر ملک کی آزادی کے بعد راجیہ سبھا کے ممبر۔ باپو نے زندگی میں فراز ہی فراز دیکھا، نشیب دیکھنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔

مجھے باپو سے بہت مشابہت تھی۔ اکثر اپنے بہن بھائیوں سے کہا کرتا تھا کہ مجھے چھوٹے باپو کہا کرو۔ میرے اور باپو کے دستخطوں کا طرز ایک تھا۔ میں نے بڑی محنت سے ان کا طرز اپنایا تھا۔ میری سوچ اور فکر ان کی تعلیم کی مرہون ہے۔ اکثر میرے گھر والے اور دوست احباب باپو سے کسی معاملہ کو رجوع کرنے سے پہلے مجھ سے ذکر کیا کرتے۔ مجھے باپو کے مزاج کا اندازہ تھا، پسند و ناپسند کو جانتا تھا۔ میرا تاثر اکثر معاملات میں وہی ہوتا، باپو جس کا اظہار فرما دیا کرتے تھے۔ مجھ سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرے بعد کچھ عرصہ تک تم پر وقت سخت گزرے گا، لیکن خدا کی مدد تمہارے ساتھ شامل رہے گی، تم پھر سنبھل جاؤ گے۔

مجھے ایسے واقعات یاد ہیں جب لوگوں کو مشابہت کی وجہ سے دھوکا ہوا ہو۔ ایک بار میں اور باپو پٹنہ گئے۔ یہ سنہ ۱۹۵۷ء کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اس وقت گورنر بہار تھے۔ گورنر نے باپو کے اعزاز میں ڈنر دیا۔ گورنر کے سکریٹری مسٹر بھٹناگر نے میرا مہمانوں سے تعارف کرایا۔ انھوں نے نواب زادہ کے لفظ کو کچھ اس طرح ادا کیا کہ بعض حضرات نے آخر کے لفظ پر توجہ نہ دی۔ پٹنہ سٹی کے ایک پروفیسر نے مجھ سے کہا کہ میں علی گڑھ اردو کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ حضور والا اس کی صدارت فرما رہے تھے۔ میں نے جی کا لفظ ہی ادا کیا تھا کہ باپو سامنے سے آتے نظر آئے۔ میں نے کہا کہ وہ نواب صاحب آ رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے مجھے دیکھا، پھر انہیں دیکھا اور ایسی خاموشی اختیار کی کہ پھر بات ہی نہیں کی۔ اصلیت نمودار ہوئی تو ان کی حقیقت سمجھ میں آ گئی۔ باپو نے اس حقیقت کا اظہار اپنے خط مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۵۷ء حیدرآباد میں اس طرح فرمایا:

"راجہ صاحب جہانگیر آباد نے صرف ظاہری حالت کا اندازہ کر کے اپنا خیال ظاہر کیا تھا لیکن انھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ تم صورتاً ہی نہیں بلکہ طبیعتاً اور عادتاً بھی ہم سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہو۔"

اب بتاؤ تو تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہے:

باپو اس دنیا میں نہیں ہیں کسی کو کیا بتاؤں میری اب کیا رائے ہے:

تمہارے نام سے سب لوگ مجھ کو جان جاتے ہیں
میں وہ کھوئی ہوئی اک چیز ہوں جس کا پتا تم ہو

کیا کہوں کہ باپو کے جانے سے کیا کیا کھو یا چھتاری کے گھر کی عزت مال و دولت، نمود شہرت
خوشی و مسرت غرض سب ہی کچھ ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گیا اور جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق
ان سب چیزوں کے ساتھ وہ سب کچھ بھی لٹ گیا جس سے میری زندگی عبارت تھی۔ میں نے
باپ کی خدمت عبادت کا ایک حصہ سمجھ کر ادا کی ہے اور اس حقیقت کا اندازہ ان ہی کے الفاظ میں
" یہ جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تمہیں میرا خط وصول ہونے سے اتنی ہی خوشی ہوئی
کسی گناہ گار کو توبہ و استغفار کے بعد۔ لیکن تمہیں گناہ گاروں کے بارے میں کیا واقفیت ہے؟"
کیا بتاؤں مجھ پہ کیا گزر رہی ہے! ۵۹ برس ہنستا رہا ہوں اور اب تقدیر میں رونا ہے
اس دنیا میں اپنی ذات کو یتیم اور تنہا محسوس کرتا ہوں۔ اندھیرے میں ہوں، روشنی کی تلاش ہے

فانی کو یا جنوں ہے، یا تیری آرزو
کل نام لے کر تیرا دیوانہ وار رویا

# نسیم انصاری

• ڈاکٹر محمد نسیم انصاری (پ ۱۹۳۵ء) فرنگی محل لکھنؤ، ابتدائی تعلیم انٹرمیڈیٹ تک مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ، کلکتہ میڈیکل کالج کلکتہ سے ۱۹۵۵ میں ایم بی۔ بی ایس۔ ۱۹۶۳ء میں لندن سے ایف، آر، سی، ایس۔ ۱۹۶۴ء سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی خدمت کرتے رہے ہیں اور میڈیکل کالج میں شعبہ سرجری کے سربراہ ہیں۔ پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ایجوکیشن چنڈی گڑھ اور بیرونِ ہند کی یونیورسٹیوں میں الفتح یونیورسٹی طرابلس اور عرب میڈیکل یونیورسٹی بن غازی کے وزیٹنگ پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ حکومتِ ہند نے میڈیکل کاؤنسل آف انڈیا اور اس کی پوسٹ گریجویٹ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا ہے۔

اُردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی ہے ـــــ اس دلچسپی اور شغف کی بدولت آپ اُردو ترقی بورڈ کے میڈیکل پینل کے بھی ممبر ہیں اور مسلم یونیورسٹی کے 'فکر و نظر' اور 'تہذیب الاخلاق' کی ادارتی مجلسوں کے بھی۔

••

# زادِ راہ

آج مجھے علی گڑھ کی اُن روایات کا ذکر کرنا ہے، جو سَو سال سے بنتی اور مٹتی آرہی ہیں
ن سے یونیورسٹی کی عمارتوں میں اس روح کا رقص جاری ہے جسے لوگ اس کا تاریخی کردار کہتے
۔ گزشتہ ۴۴ برس سے میں اس رقص کا تماشائی ہوں اور نہ معلوم کتنی دفعہ دل ایسا تڑپا ہے کہ خود اس رقص
شامل ہو گیا ہوں۔ آیئے آج اس محفلِ رنگ و بُو کی کچھ جھلکیاں آپ کو بھی دکھاؤں۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے ہندوستان کا تصور کیجئے! غور کیجئے غدر کے ہنگامے کو اٹھارہ برس گزر چکے
۔ ہندوستانی قوم پوری طرح انگریزوں کے قابو میں ہے۔ اس قوم کے سامنے اندھیرے کا ایک بھیانک
یا ہے کہ اس کے پار روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی۔ مسلمانوں کی حالت تو اور بھی خراب تھی۔ دلّی میں
کے مکان اجڑ چکے تھے۔ ان کے پیاروں کو سرِ راہ سولی پر چڑھایا گیا تھا۔ حکمران قوم کی کوشش یہ
کہ ان کو یقین دلایا جائے کہ تم غیر مہذّب ہو، اور اس لئے اس قابل ہو کہ سر جھکا کر رہو۔ بڑی بھیانک
تھی! اس اندھیرے میں سرسیّد نے علی گڑھ میں ایک شمع جلائی۔ اس کو بجھانے کے لئے جو آندھیاں
ان میں سب سے خطرناک وہ آندھی تھی جو خود اسی قوم کے نادانوں نے اٹھائی۔ وہ آندھی جہالت
تعصب کی آندھی تھی۔ یہ نادان کہتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی نئی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے، اُن کی
کتابوں میں سب علم موجود ہے؛ انگریزی زبان کافروں کی زبان ہے اور اس کا پڑھنا حرام ہے۔
سیّد اور ان کے ساتھیوں نے مردانہ وار ان حملوں کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں کو بتایا کہ پانچ چھ سو سال سے
ان کا رشتہ کمزور ہوتا جارہا تھا اور اب تو تقریباً ٹوٹ ہی گیا تھا۔ اُنھوں نے قوم کو وہ دن یاد
جب اُن کے بزرگ فلسفہ، منطق، ریاضی، طب، جغرافیہ، سرجری، تاریخ، ہیئت اور عمرانیات
دنیا کو سکھاتے تھے اور انکی کتابیں صدیوں تک یورپ ایشیا اور افریقہ میں پڑھائی جاتی تھیں۔
۱۸۷۵ء میں ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ پڑھے لکھے لوگ تک ابن سینا، زہراوی، ادریسی ابن خلدون،

ابن رشد کے ناموں تک سے ناواقف تھے۔ انھوں نے بتایا کہ علم کسی ایک قوم کی ملکیت نہ رہا ہے اور نہ رہے گا۔ جس نے اس دریا سے فیض اٹھایا وہ سرسبز و شاداب رہا اور جس نے اس سے منھ پھیرا وہ ذلیل و خوار ہوا۔ سر سید نے اپنی قوم کو اس ذلت اور خواری سے بچانے کا بیڑا اٹھایا تھا اور زندگی بھر وہ اس مقصد کے لئے لڑتے رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری سب سے قیمتی روایت سر سید کی یہی لگن ہے کہ حالات چاہے کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں، لوگ چاہے کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کریں، سچی بات پر ڈٹے رہنا ہی بہادری کی شان ہے۔

سر سید کے شاگردوں میں ایک دیوانہ اور پیدا ہوا، نام شیخ عبداللہ تھا۔ اس زمانہ میں جاہل لوگ اپنی لڑکیوں کو اس ڈر سے لکھنا پڑھنا نہیں سکھاتے تھے کہ کہیں وہ بڑی ہو کر خط نہ لکھنے لگیں۔ شیخ عبداللہ نے جہالت کی اس کالی چادر کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ آج اس شاندار کالج میں بیٹھ کر ذرا اس زمانہ کا تصور کیجئے جب لڑکیاں ڈولیوں پر پردہ ڈال کر اسکول بھیجی جاتی تھیں اور اگر ڈولی کے پردے سے ان کے دوپٹہ کا ایک کونہ بھی باہر آجاتا تھا تو شہر والے آفت مچا دیتے تھے۔ کیا کیا باتیں نہیں سننا پڑیں شیخ عبداللہ کو! اس ہمت والے نے سب کچھ سنا، سب کچھ برداشت کیا لیکن اپنے پیروں میں لغزش نہ آنے دی۔ آج اس کے مدرسہ کی پڑھی ہوئی لڑکیاں وکیل ہیں، ڈاکٹر ہیں، سرجن ہیں، انجینئر ہیں، یونیورسٹیوں میں پروفیسر ہیں اور حکومت میں وزیر ہیں۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ شیخ عبداللہ نے حالات کے سامنے سپر نہیں ڈالی۔ بلکہ یہ کہا کہ انسان اشرف المخلوقات اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کو بدلنے کی سکت بھی رکھتا ہے اور اس کا کمال یہی ہے کہ وہ اندھیرے کو روشنی میں بدل دے اور پھر فطرت کو للکارے "تو شب آفریدی چراغ آفریدم"۔

میرا تعلق علی گڑھ سے اس وقت ہوا جب یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ ۳۵ء میں اسکول کے انفنٹ کلاس میں جسے آج کل کی زبان میں نرسری کہتے ہیں میرا داخلہ ہوا تھا۔ ہم لوگوں کا اسکول ظہور وارڈ میں تھا جہاں آج کل اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ ہے۔ یہاں انفنٹ کلاس سے لے کر چوتھے درجہ تک پڑھائی ہوتی تھی۔ مس قمر جہاں جعفر علی اس اسکول کی نگراں تھیں۔ لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ لڑکوں کے رہنے کے لئے اسکول ہی کے ایک حصہ میں ہوسٹل بھی تھا۔ صبح پڑھائی شروع ہونے سے پہلے سب بچے صفیں باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور دو تین بچے اقبال کی مشہور نظم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" گا کر پڑھتے تھے، اور ہم سب اسے دہراتے تھے۔ میں کیا بتاؤں کہ اس دعا کا کیا اثر ہوا۔ آج تک کانوں میں صدا آتی ہے:

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا — درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

دُور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے — ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

نیک جو راہ ہو اُس رہ پہ چلانا مجھکو!

یہ گویا کہ پہلا نقش تھا، جو علی گڑھ نے دل پر بٹھایا، اے کاش یہ کبھی نہ مٹے۔

انفنٹ کلاس میں کھلونے بہت تھے اور ہم کو پتہ بھی نہ چلا، لیکن کھیل کود ہی میں A، B، C، D اور الف، ب، ت، ٹ سکھا دی گئی۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو ایک انگریز خاتون مس ڈنکن نے انگریزی پڑھائی۔ چوتھے درجے میں جب پہنچا تو اسکول کے بچوں کی انجمن کا صدر بنایا گیا۔ یہ گویا کہ پہلی ذمہ داری تھی جو مجھے سونپی گئی۔ اس وقت نو برس کا تھا۔ اسی انجمن میں مجھے تقریر کرنا آیا۔ اس کے بعد پانچویں درجہ سے منٹو سرکل میں پڑھائی شروع ہوئی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایک انگریز جی، سی، ووڈ تھے۔ پڑھانے والے اساتذہ ایک سے ایک قابل اور محبت کرنے والے۔ یہاں تیراکی، گھوڑے کی سواری اور اسکیٹنگ سیکھی۔ پانچویں درجہ میں جب رائڈنگ کلب میں میرا نام لکھوایا گیا تو میرا قد اتنا چھوٹا تھا کہ رکاب تک پاؤں نہیں پہنچتے تھے اور خود سے گھوڑے پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ سائیس گود میں اُٹھا کر سوار کراتا تھا۔ محمود بٹ صاحب جو آج کل یو پی گورنمنٹ کے چیف سکریٹری ہیں، رائڈنگ کلب کے کیپٹن تھے۔ لیکن میری کم عمری کے باوجود میرے استاد جمعدار عبدالشکور صاحب نے بڑی محنت سے مجھے شہسواری سکھائی اور تھوڑے ہی دنوں میں مجھے اس قابل بنا دیا کہ میں گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر کھڑا ہو کر گھوڑا سرپٹ دوڑانے لگا۔

اس زمانہ کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ یونیورسٹی کے ایک بہت ہی بہادر اور ماہر سوار امان اللہ خان صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ایک گھوڑے کو ایسی تربیت دی تھی کہ جب وہ اس پر سوار ہو کر ایڑ لگاتے تھے، تو وہ اپنے پچھلے دونوں پیروں پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ تم بہت کرتب دکھاتے ہو؛ دیکھیں میری طرح اس گھوڑے کو اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا تو کر دو؟ میں نے فوراً چیلنج قبول کر لیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر ایڑ لگائی۔ گھوڑا اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اسی وقت میرا بیلنس بگڑا اور میں نے سہارے کے لئے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا گھوڑا اگر پڑا۔ اتفاق کی بات کہ میں اس کے گرنے سے پہلے خود ہی گر پڑا۔ ورنہ آج میرے بجائے کوئی دوسرا آپ کو یہ کہانی سناتا ہوتا۔

اسپورٹس کے علاوہ اسکول میں تعلیم و تربیت کے اور بھی بہت سامان تھے۔ اسکاؤٹس کلب تھا جہاں ڈرل کرنا سکھائی جاتی اور جھنڈیوں کے ذریعہ سگنل کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ سرجری کا سے میرا پہلا واسطہ اسکول ہی میں پڑا، جب فرسٹ ایڈ کا تربیت دی گئی۔ مضمون لکھنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ہر سال اسکول سے میگزین نکلتا تھا۔ آدھا اردو میں، آدھا انگریزی میں۔ تقریر کرنا سکھانے کے لئے ڈبیٹنگ سوسائٹی تھی۔ مشغلوں یعنی HOBBIES کی ہمت افزائی کے لئے ایک سائنٹفک سوسائٹی بھی تھی۔ یہاں میں نے بیٹری سے کام کرنے والا ٹیلیفون بنانا اور بجلی یا بیٹری کی مدد کے بغیر چلنے والا ریڈیو بنانا بھی سیکھا۔ غرض اسکول کی تعلیم و تربیت ایسی تھی کہ طالب علموں کی شخصیت کے ہر اچھے پہلو کو ابھرنے کا موقع ملتا تھا۔ میرے ساتھ جو احسانات اس اسکول نے کیے ان کو میں گنوا بھی نہیں سکتا۔

۱۹۴۵ء میں جب میں نے اسکول چھوڑا، تو اس وقت ایک انگریز مسٹر جونس ہیڈ ماسٹر تھے۔ میرے اساتذہ میں سے مولوی عبدالقیوم صاحب اب تک اس اسکول میں پڑھاتے ہیں اور ماسٹر عبدالاحد صاحب اور حنیف صاحب قبلہ ماشاءاللہ بقید حیات ہیں اور ان کی موجودگی اس شہر کے لئے باعثِ برکت ہے۔ مرنے والوں میں سید محمود صاحب ٹونکی، عالم بخش صاحب، احسن صاحب اور ماسٹر زین العابدین صاحب نے جو نقوش دل پر بٹھائے وہ ہمیشہ سینے سے لگے رہیں گے۔

یونیورسٹی میں میرا داخلہ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہوا۔ آفتاب ہوسٹل میں رہنے کو جگہ ملی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب آزادی کا ڈنکا بج رہا تھا، جیسے جیسے آزادی قریب آ رہی تھی یہ سوال بار بار اُٹھ رہا تھا کہ نئے ہندوستان کا کیا نقشہ ہوگا۔ اس سوال پر ہندوستانیوں میں آپس میں بڑی کشمکش تھی۔ اس کا مظاہرہ علی گڑھ میں بھی تھا: یہاں مسلم لیگ، کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی کے لوگ بڑے جوش و خروش سے کام کر رہے تھے۔ مسلم لیگ کا پلّہ بہت بھاری تھا لیکن تمام اختلافات کے باوجود آپس میں بھائی چارہ اور محبت بھی بہت مضبوط تھی۔ پروفیسر حبیب بہت سخت کانگریسی تھے، سید محمد ٹونکی اور محمود صاحب کیمونسٹ گروپ کے رہنما تھے اور مسلم لیگ کے حامی تو زیادہ تر لوگ تھے۔ لیکن پروفیسر حبیب، محمود صاحب اور ٹونکی صاحب کی جو عزت یونیورسٹی میں تھی اس کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ جب مسلم لیگ کے دو گروپوں میں آپس میں یونین کے الیکشن کے معاملہ پر اختلاف ہوا تو سب نے یہ کہا کہ فیصلہ حبیب صاحب کریں گے، وہ حبیب صاحب جو مسلم لیگ کے خلاف اسمبلی کا الیکشن لڑ رہے تھے!

یہ رواداری علی گڑھ والوں کو ورثے میں ملی تھی۔ بہت دن پہلے اس درس گاہ میں دو طالب علم پڑھتے تھے، چودھری خلیق الزماں اور رفیع احمد قدوائی۔ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد یہ دونوں سیاسی میدان میں آئے۔ ایک دفعہ یو۔پی اسمبلی کے الیکشن میں چودھری صاحب مسلم لیگ کی طرف سے اور رفیع احمد صاحب کانگریس کی طرف سے اپنی اپنی جماعت کی رہنمائی کر رہے تھے۔ چودھری صاحب کے امیدوار کو ایک جگہ الیکشن کے دورے پہ جانا تھا، لیکن موٹر نہیں تھی۔ امیدوار نے رفیع صاحب کے یہاں سے موٹر منگوائی جو بغیر کسی چوں چرا کے بھیج دی گئی!

خود علی گڑھ میں دو بہت سینئر اساتذہ میں سخت اختلاف تھا۔ بول چال بند تھی۔ اسی زمانہ میں ان میں سے ایک کی بیگم کی طبیعت خراب ہوئی اور اس کی ضرورت ہوئی کہ انھیں آگرہ لے جا کر کسی ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ ان کی موٹر خراب تھی اس لئے روانگی میں دیر ہو رہی تھی۔ ان کے مخالف کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً ان کے گھر پہنچے اور ان کے بیٹے کو بلوا کر سخت ڈانٹا کہ تمھاری ماں کی طبیعت خراب ہے اور تمھیں اس کی توفیق نہیں ہوئی کہ میری موٹر لے جاتے! یہ لو میری موٹر، ابھی اسی وقت انھیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔

جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو یہاں ایک اور دیوانہ وائس چانسلر تھا۔ نام تھا ڈاکٹر ضیاء الدین احمد۔ اس کے دل میں لگن تھی کہ یہاں انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج اور ایگریکلچر کالج کھل جائیں۔ انجینئرنگ کالج تو اس طرح شروع ہوا کہ ایک جگہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور اس کے دونوں طرف کچھ دکانیں تھیں۔ ہم لوگ اسے "نیو مارکٹ" کہتے تھے اور یہاں سے چاکلیٹ وغیرہ خریدتے تھے۔ سر ضیاء الدین نے دکانیں خالی کروائیں اور کہا کہ یہیں انجینئرنگ کالج بنے گا۔ لوگوں نے کہا پاگل ہو گئے ہو۔ بغیر مشینوں کے ان دکانوں میں بٹھا کر لڑکوں کو انجینئرنگ پڑھاؤ گے؟ جواب دیا کہ مشین موجود ہے۔ لوگوں نے کہا، کہاں؟ جواب دیا کہ وہ جو میری پرانی موٹر ہے۔ اس کی مشین سے سب کچھ سیکھ لیں گے۔ چنانچہ انجینئرنگ کالج قائم ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے کالج میں پڑھنے کے لئے کون تیار ہوتا۔ اس کی ترکیب یہ نکالی گئی کہ جن لڑکوں کے خلاف شکایتیں تھیں کہ وہ سب شرارتیں کرتے ہیں۔ ان کو حکم دیا گیا کہ وہ یونیورسٹی کو چھوڑ دیں۔ یہ لوگ بھاگے ہوئے وائس چانسلر کے پاس گئے اور فریاد کی۔ حکم ملا کہ یونیورسٹی میں ان کے لئے جگہ صرف انجینئرنگ کالج میں ہے۔ بہت واویلا ہوا کہ ہم لوگ اچھے خاصے شریف ہیں، ہمیں انجینئرنگ کالج میں کیوں ٹھونسا جا رہا ہے۔ جواب ملا کہ بس تمھاری یہی سزا ہے! یہ وہی انجینئرنگ کالج ہے جس میں داخلہ کے لئے آج سخت مقابلہ ہوتا ہے اور جس کے پڑھے ہوئے لڑکے دنیا میں اپنا نام پیدا کر رہے ہیں۔

سر ضیاء الدین نے انجینئرنگ کالج تو بنا لیا، لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ میڈیکل کالج نہ دیکھ سکے۔

حالانکہ سارے ملک کا چکر لگا کر اور اپنے نامور ساتھیوں اور طلباء کو بھیج کر اس کے لئے روپیہ جمع کر لیا تھا۔
میڈیکل کالج ان کے مرنے کے بارہ برس بعد کھلا اور اسی شان سے جیسے انجینئرنگ کالج بنا تھا۔ ایک پرانی ...
میں کلاسوں اور لیبارٹری کا انتظام ہوا۔ جب دو برس بعد اس کا وقت آیا کہ لڑکے اور لڑکیاں اسپتال ...
کام سیکھیں تو پڑھنے اور پڑھانے والے رکشے اور سائیکلوں پر سوار ہو کر شہر کے اسپتال میں جہاں ...
بنولتے تھے۔ اس کے قریب ایک کمرہ مجھے دکھایا گیا کہ یہاں آپ پڑھائیے۔ وہاں ایک پرانی زنگ آلود ...
رکھی تھی جس پر کسی زمانے میں مریض کو لٹا کر اس کی مرہم پٹی کی جاتی تھی، لیکن جواب بالکل خستہ حالت میں ...
ایک پرانا اسٹول بھی پڑا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ میں نے پوچھا کہ مریض کہاں ہے ...
کہ سرجری کا مریض کوئی نہیں ہے۔ برآمدہ میں ایک بوڑھی عورت زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے اس ...
پوچھا کہ کیا تکلیف ہے؟ کہا کہ پیٹ میں درد ہے۔ میں اس کو لے آیا، اپنے اسٹوڈنٹس کی مدد سے اس کو ...
لٹایا اور اس کے بعد پڑھانا شروع کیا کہ مریض کا معائنہ کیسے کرتے ہیں۔ اس طرح میڈیکل کالج میں ...
کی پڑھائی شروع ہوئی۔

تھوڑے دنوں کے بعد طبیہ کالج کے اسپتال میں اس کا انتظام کیا گیا کہ وہاں میڈیکل کالج ...
مریض رہ سکیں اور ان کے آپریشن کیے جا سکیں۔ جب میں نے پہلا آپریشن کیا تو بے ہوشی دینے کے لئے ...
ایک ڈاکٹر بلائے گئے، ایک حکیم صاحب کو اس پر تیار کیا کہ آپریشن میں وہ مجھے اوزار دیتے رہیں اور ...
آئی ہاسپٹل سے ایک نرس کو بلایا کہ وہ آپریشن کا سامان تیار کرے۔ لیکن اس بے سروسامانی میں بھی ہماری ...
ہمت نہیں ٹوٹی۔ ہمارے کانوں میں سرسید، شیخ عبداللہ، ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کے بہت سے ...
کی آوازیں آئیں:

رہ روِ تشنہ لب نہ گھبرانا ÷ اب لیا چشمۂ بقا تو نے

تو یہ ہیں وہ روایات جن پر ہماری درس گاہ قائم ہے اور یہی "زادِ راہ" ہے اس سفر کا جس پر ہم نے
کمر باندھ رکھی ہے۔

# ریاض الرحمٰن شیروانی

عبیدالرحمٰن خاں شیروانی کے فرزند اور صدر یار جنگ
واب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے پوتے، ڈاکٹر ریاض الرحمٰن
خاں شیروانی علی گڑھ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد شعبہ عربی میں
۲۵-۳۰ سال استاد رہے۔ آج کل کشمیر یونیورسٹی
میں عربی و اسلامیات کے شعبہ کے صدر اور پروفیسر ہیں۔

••

# علی گڑھ اور جامعہ ملیہ

علی گڑھ نے حصولِ آزادی سے قبل کی اپنی ۷۰ سالہ زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی طرف رجحان اور ذہنی بیداری سب سے زیادہ اسی نے پیدا کی تھی۔ اس کے فرزندوں نے ہندستان کی سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی زندگی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا اور تاریخ کے صفحات میں اپنی جگہ محفوظ کر لی تھی۔ اس کے اربابِ اقتدار کا جو بھی سیاسی مسلک رہا ہو، ہندستان کی تحریکِ آزادی میں اس کے فرزندوں کا حصّہ کسی سے کم نہیں تھا، لیکن حصولِ آزادی سے قبل کی دس سالہ زندگی کی سیاسی کشمکش کے نتیجے میں اس پر ہر طرف سے طرح طرح کے حملے ہو رہے تھے اور اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس وقت ہندستان کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، اور وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد تھے جنھیں سیاسی اختلافِ رائے کے باوجود علی گڑھ کی اہمیت اور افادیت کا پورا پورا احساس تھا اور مولانا آزاد نے ۱۹۴۹ء میں مسلم یونیورسٹی میں جو کانووکیشن ایڈریس دیا اس میں اس کے طالب علموں کو یہ نوید دی کہ وہ ان کے لیے آزاد ہندوستان میں روشن مستقبل کے سارے امکانات دیکھ رہے تھے۔ ان ہی دونوں کی تحریک پر ۱۹۴۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ملیہ کو چھوڑ کر علی گڑھ آ گئے، اور مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی ذمّہ داری سنبھالی۔ گویا مولانا محمد علی نے علی گڑھ کا قلعہ فتح کرنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ اس طرح پورا ہوا۔ ذاکر صاحب کے آنے سے علی گڑھ کے لیل و نہار آہستہ آہستہ بدلنے لگے اور افسردگی و مایوسی کی جگہ نشاط و کامرانی کی فضا چھانے لگی۔ ذاکر صاحب کا آٹھ سالہ دَورِ وائس چانسلری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا عہدِ زرّیں ہے۔ اس دَور میں وہاں علمی کام کو بڑھاوا ملا، حرّیتِ فکر کو فروغ حاصل ہوا اور نظم و ضبط بحال ہوا۔ سید احمد خاں علمی میدان میں آزادانہ تحقیق کے حامی تھے۔ ذاکر صاحب نے بھی اسی پر اصرار کیا۔ کیسا عجیب اتفاق تھا، علی گڑھ تحریک کے ایک باغی کے ہاتھوں اس تحریک کے صالح عناصر کی بازیافت ہوئی! کوئی تحریک اس وقت تک اپنا مقصد پورا نہیں کرتی جب تک اس

ب کے بانی کی حقیقی منشا کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ ذاکر صاحب اس نکتے سے واقف تھے، اس لئے انھوں ید احمد خاں کے افکار پر عمل پیرا ہونے کی بڑی حد تک کوشش کی۔ لیکن زمانے کی اس ستم ظریفی کو کیا کہیے ں سید احمد خاں کے خلاف ان کی زندگی میں ان کی روشن خیالی کے باعث کفر کے فتوے صادر کیے گئے اب بعض لوگ ان ہی کا نام لے کر تنگ نظری کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ذاکر صاحب نے اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ ی اور اپنے کام میں لگے رہے۔ ان کے ذہن میں علی گڑھ کا تصور یہ تھا کہ ہندوستانی قومیت کا مستقبل اس پر منحصر ہوگا کہ علی گڑھ کیا سوچتا ہے اور علی گڑھ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ کام بہت بڑا تھا اور پورا کرنے کے لئے آٹھ سال کی مدت بالکل ناکافی تھی۔ تاہم جتنا ہوا وہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ذاکر صاحب ۱۹ء میں علی گڑھ سے چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء تک مسلم یونیورسٹی کم و بیش ان ہی خطوط پر چلتی رہی جو ذاکر صاحب نے وضع کیے تھے۔ لیکن اس سال اس کی زندگی میں ایک حادثہ پیش آیا جس نے گھڑی کی سوئیاں پیچھے ت موڑ دیں۔ نواب علی یاور جنگ پر، جو اس وقت مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، بعض شر پسندوں بعض غلط فہمیوں کی بنا پر حملہ کر کے انھیں بری طرح مجروح کر دیا۔ اب مرکزی حکومت میں نہ پنڈت جواہر لال نہرو اور نہ مولانا ابوالکلام آزاد جو وسعتِ قلب کا ثبوت دے کر بگڑی کو بنا لیتے۔ علی گڑھ جس تباہی سے ۱۹۴۷ء بچ گیا تھا اسے اب اس کا سامنا کرنا پڑا۔ جس ایکٹ کے تحت یونیورسٹی چل رہی تھی وہ منسوخ کیا گیا اور اس ایک آرڈی ننس جاری کر دیا گیا جس نے اس کی اندرونی خود مختاری ختم کر دی۔ اس کے خلاف مسلمانوں یک بڑے طبقے نے ملک گیر مہم چلائی۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آتے رہے ان کا تفصیلی ذکر مقصود نہیں، یہ کرنا ہے کہ ان حالات و واقعات نے مسلم یونیورسٹی میں ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ اسے آزاد ہندوستان میں مانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا جو اہم فریضہ انجام دینا تھا اور جس کی بنیاد ذاکر صاحب اپنے دورِ وائس چانسلری میں ڈال تھے وہ ادھورا رہ گیا اور لوگوں کا دھیان دوسرے نسبتاً کم اہم اور وقتی کاموں کی طرف لگ گیا۔ دوسری طرف ع اور ہنگاموں نے ان عناصر کو ابھرنے کا موقع فراہم کر دیا جو ذہنی طور پر سید احمد خاں کے مشن اور مقاصد ہم آہنگ نہیں تھے اگرچہ نام ان ہی کا لیتے تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے حصول آزادی سے کئی برس قبل موقع پر جامعہ کے طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے مستقبل کے بارے میں فرمایا تھا:

"اس جامعہ کو بھی تمھیں میں سے بعض چلاتے ہوں گے۔ اس وقت روپے کی کمی نہ ہوگی کہ اِ

کی عمارتیں نہ ہوں گی، تعلیمی سامان کی کمی نہ ہوگی، کتب خانے میں نہ جانے کتنی کتابیں ہوں گی، تعلیم تمہارے ہاتھ میں ہوگی، سیاست تمہارے اشارے پر چلے گی، رائے عامّہ پر تمہارا اثر ہوگا۔ آج ہم کمزور ہیں، اس وقت تم مضبوط ہوگے ان شاء اللہ۔ ہاں اس وقت بھول نہ جانا کہ تم نے اور تمہارے اگلوں نے بے غرض خدمت کو اپنا شعار بنایا، جو ٹھیک سمجھا وہ دل لگا کر کیا اور نتیجے کو خدا پر چھوڑ دیا۔"

ذاکر صاحب نے ایک دوسرے موقع پر جامعہ ملّیہ کی حیثیت اور اس کے مقصد کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا تھا:

"میرے نزدیک جامعہ ایک اسلامی ادارہ ہے جس کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم ہے۔ اس تعلیم کی بنیاد دینِ اسلام اور تمدنِ اسلام ہے۔۔۔ اس بڑے مقصد میں چند اور مقاصد بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ ہیں: آزادی کی خواہش۔۔۔ اردو کی خدمت۔ خلاصہ یہ کہ جامعہ کے کام کی بنیاد اسلامی تعلیمات، آزادی کی خواہش اور اُردو کی خدمت ہے۔"

بےشک حصولِ آزادی کے بعد جامعہ ملّیہ میں روپے کی کمی نہیں رہی، کرایہ کی عمارتیں نہیں رہیں، تعلیمی سامان وافر مقدار میں مہیا ہو گیا۔ کتب خانہ کتابوں سے پُر ہو گیا۔ لیکن کیا ایثار اور قربانی کی وہ دولت اسی طرح باقی رہی جو اُس وقت حاصل تھی؟ اور کیا سیاست اور رائے عامّہ پر اہلِ جامعہ کا اثر اُسی طرح قائم ہو سکا جس طرح ذاکر صاحب دیکھنا چاہتے تھے؟ اپنے تعلیمی کاموں میں بھی جامعہ کس قدر آزاد ہے، یہ کہنا دشوار ہے۔ بےشک جامعہ ملّیہ آج بھی ایک اسلامی ادارہ ہے جو سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کرتا ہے وہاں منجملہ دیگر علوم کے اسلامی تمدن کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اُردو کی خدمت بھی وہاں کے اہلِ علم تصنیف و تالیف کے ذریعہ برابر کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔ لیکن اسلامی تمدن کی تعلیم ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر اور بھی متعدد درس گاہوں میں دی جاتی ہے اور اُردو تصنیف و تالیف کا کام اور مقامات پر بھی ہو رہا ہے۔

ان حالات میں دیکھنا یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی تاسیس کا جو اصلی مقصد تھا آزاد ہندوستان میں وہ کس حد تک پورا ہوا ہے اور آئندہ اس کے پورا ہونے کے کیا امکانات ہیں۔ علی گڑھ تحریک کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تقلید پسندی اور توہم پرستی کو دور کرنا تھا اور جامعہ ملّیہ ایثار و قربانی کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کا ایسا تصور پیش کرنا چاہتی تھی جو بقول ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم دلوں کو جوڑتا ہے توڑتا نہیں ہے۔

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا اس کی روشنی میں یہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں کہ یہ دونوں ہی ادارے ابھی اس منزل سے بہت دور ہیں۔ لیکن ان اداروں کی خاکستر میں ایسی چنگاری یقینی پوشیدہ ہے جسے کرید کر شعلہ بنایا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کارکنوں، اساتذہ، اور طلبا کو ہمت و جرأت کا وہ سبق پڑھنا ہوگا جو سید احمد خاں اپنی ذاتی مثال سے انھیں پڑھانا چاہتے تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اراکین کو ایثار و قربانی کے اس نمونے کی پیروی کرنی ہوگی جو ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں نے اپنے عمل کے ذریعہ ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ آزاد ہندستان کو سید احمد خاں کی جرأت و ہمت کی بھی ضرورت ہے اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں کے ایثار و قربانی کی بھی۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد اتنی ہے جتنی انڈونیشیا کو چھوڑ کر کسی مسلمان ملک میں بھی نہیں ہے، اور اس ملک کی جو ہیئت ترکیبی ہے اس میں مسلمانوں کا رول بلاشبہ بہت اہم ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی راہ میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں۔ لیکن دشواریاں تو ۱۸۷۵ء اور ۱۹۲۰ء میں بھی حائل تھیں۔ ان کی نوعیت یقیناً بدل گئی ہے۔ لیکن ان کی شدت میں میرے خیال سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ان دشواریوں کے باوجود مسلمان خود اپنی اور اپنے ملک کی خدمت صحیح طور پر اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب یہ دونوں ادارے ایسے نوجوان پیدا کریں جن کے دماغ روشن اور دل وسیع ہوں اور جو سچ کو سچ کہنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں تامل نہ کریں، خواہ اس کے لئے انھیں کوئی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ اس سچ کا مظاہرہ انھیں دوسروں کے مقابلے میں بھی کرنا ہوگا اور خود اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے میں بھی۔ سچ کہنے کے ساتھ سچ سننے اور اسے برداشت کرنے کی عادت ڈالنا بھی ضروری ہے۔ اب جبکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو وہ اندرونی خود مختاری ایک مرتبہ پھر حاصل ہو گئی ہے جو اس سے ۱۹۶۵ء میں چھن گئی تھی، میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ارباب حل و عقد کے ساتھ اس کے ارباب حل و عقد بھی اپنی توجہ اور صلاحیتیں اس کام پر پوری طرح صرف کر سکتے ہیں۔

ایک اور مسئلہ بھی قابل توجہ ہے۔ ایک طرف سائنس، ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم کے میدان میں ان اداروں کو ملک کی دوسری درس گاہوں کے دوش بدوش چلنا ہوگا اور دوسری طرف ان علوم و فنون میں جو ان کی اسلامیت اور مشرقیت کے ضامن ہیں یعنی عربی، فارسی، اردو، اسلامیات اور دینیات میں بھی ایسا معیار پیش کرنا ہوگا جیسا کہیں اور موجود نہ ہو۔ یہ صرف اس لئے ضروری نہیں ہے کہ جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ علوم و فنون ان کا طرۂ امتیاز ہیں اور ان سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔ بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اسلام کو پوری طرح سمجھنے اور دوسروں

کو سمجھنے کی خاطر ان کا حصول ناگزیر ہے۔ بہت سے مسائل محض غلط فہمیوں کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک ہزار برس سے زیادہ مدت سے ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود آج بھی یہاں بسنے والوں کے درمیان بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ غلط فہمیاں اسی وقت دور ہو سکتی ہیں جب ایک دوسرے کے مذہب اور روایات سے بھی واقفیت حاصل کی جائے۔ میرے نزدیک یہ کام ایک طرف بنارس ہندو یونیورسٹی اور دوسری طرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذریعہ سب سے بہتر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کھلے دماغ اور وسیع دل کی شرط ہے۔ سید احمد خاں کی تفسیر قرآن کے ہر حصے سے اتفاق ضروری نہیں لیکن اس کا رجحان یعنی عقل اور عقیدے کے درمیان مفاہمت، اس راہ میں ہماری رہنمائی ضرور کر سکتی ہے۔

مسلمانوں کی اقتصادی حالت دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہے۔ اس لئے نادار مسلم طلباء کی تعلیم بالکل خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ کسی ہونہار اور باصلاحیت نوجوان کو محض پیسے کی کمی کی بنا پر تعلیم سے محروم نہیں رہنا چاہئے۔ یہ ذمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دیگر تعلیمی اداروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں۔ علی گڑھ میں اس سلسلے میں بہت کچھ ہو بھی رہا ہے۔ خاص طور سے ڈیوٹی سوسائٹی جس کے بانی مسلم یونیورسٹی کے ایک نامور وائس چانسلر صاحب زادہ آفتاب احمد خاں تھے، اسی مقصد سے سرگرم عمل ہے لیکن یہ کام مدت کی اور زیادہ توجہ کا طالب ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کی خدمت نہیں ہوگی بلکہ ہندوستان کی خدمت بھی ہوگی کیونکہ تعلیم یافتہ باصلاحیت اور روشن خیال مسلمان ملک کے زیادہ اچھے اور کارآمد شہری ثابت ہو سکتے ہیں۔

علی گڑھ اور جامعہ کے بانیوں کے پیش نظر اپنے حدود سے باہر بھی مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی بہتری کا کام تھا اور یہ ادارے کسی نہ کسی حد تک یہ کام انجام دیتے رہے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بعض کارکنوں نے جن میں شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب کا نام سر فہرست ہے، تعلیم بالغاں کی طرف خاص توجہ دی اور اس سے بہت سے لوگوں نے (جن میں غیر مسلم بھی شامل تھے) فائدہ اٹھایا۔ تقسیم ہند کے دنوں میں ذاکر صاحب کی قیادت میں اس ادارے کے اراکین نے بے گھر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے پچھلے دنوں یوپی میں مسلمانوں کے صنعتی اداروں کا جائزہ لیا اور انھیں مفید مشورے دیے۔ اس یونیورسٹی کی تاسیس بہت دنوں تک اس لئے معرض التوا میں پڑی رہی تھی کہ اس کے ہمدردوں کی خواہش تھی کہ اسے مسلمانوں کے دوسرے تعلیمی اداروں کے الحاق کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ یہ خواہش تو پوری نہیں ہو سکی لیکن مسلم یونیورسٹی کے ارباب کار مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی بہتری اور ترقی میں ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اور اس کام میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا خاص رول رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے کاموں کو نہ صرف جاری رکھا جائے بلکہ ان کی رفتار اور تیز کی جائے۔ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ صرف تعلیم گاہیں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت تحریکوں کی ہے اور تحریکیں اسی وقت زندہ رہ سکتی ہیں جب کہ ان کا رشتہ اپنے عوام سے استوار رہے اور وہ ان کی فلاح و بہبود کی طرف سے غافل نہ ہوں۔

●●

# آل احمد سرور

روفیسر آل احمد سرور (پ ۱۹۱۱ء)
ہمارے عہد میں اردو کے ممتاز ترین نقاد، صاحبِ طرز
یب و شاعر اور اس لحاظ سے اہم ترین دانشور جو ادب، مذہب،
ذیب اور سماج کے سبھی مسائل پر غور و فکر کرتے رہے
اور مسائل پر جرأت کے ساتھ لکھ بھی رہے ہیں۔
ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر۔

# کون کس سے مایوس

## مسلمان اسلام سے؟ یا اسلام مسلمانوں سے!

اس بات سے کوئی ہوش مند آدمی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کی تیرہ سو سال کی ایک شا
ہے اور اس نے دنیا کے ہر گوشے اور علم و عمل کے ہر دائرے پر اپنا اثر چھوڑا ہے۔ ازمنہ وسطی میں ایک
پر دنیا کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، مگر جدید دور میں صورت حال بدل گئی ہے۔ اقوال، مارشل
اس وقت دنیا کی آبادی کا ۲۰ فی صد حصہ مسلمان ہے اور اگرچہ اسلامی ممالک ایشیا اور افریقہ میں بڑی
میں ہیں اور ہندستان میں بھی اُن کی آبادی ۱۲ فیصد سے کم نہیں ہے، مگر سائنس اور ٹیکنالوجی، علم و فن
و حرفت، خوشحالی اور اقتصادی ترقی کے لحاظ سے مسلمان مغرب سے بہت پیچھے ہیں۔ بیشتر اسلامی ممالک
ترقی پذیر ممالک میں ہوتا ہے اور ان کا معیار زندگی ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں خاصا پست ہے
وسطی اور شمالی افریقہ میں تیل کے ذخائر کی دریافت نے ان علاقوں کے باشندوں کو خوش حالی عطا کی
علمی اور سائنسی لحاظ سے یہ اب بھی ترقی یافتہ نہیں کہے جا سکتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ازمنہ وسطی
ذہنی اور مادی قیادت کے بعد مسلمان جدید دور میں کیوں پیچھے رہ گئے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ا
دور ہو گئے، یا اسلام ان کی ترقی کے راستے میں حارج ہوا؟ مغرب نے اتنی آسانی سے ان پر کس طر
حاصل کر لیا؟ یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلام کے اندر اتنی اندرونی طاقت موجود ہے کہ جب اُسے کسی ا
سامنا ہوا، یا کوئی بحران پیدا ہوا تو کسی نہ کسی تحریک نے اسے ایک نئی زندگی عطا کی۔ یہ تحریکیں احیا کی
اور اصلاح کی بھی۔ دوسری جنگ عظیم نے دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملک ج
مسلمانوں کی اکثریت تھی آزاد ہوئے۔ ان کے یہاں قومیت کا جذبہ بھی بڑھا۔ ہندستان جیسے
ملک میں قومیت کے فروغ کے ساتھ مسلمانوں کے مخصوص مسائل اور ان کے مستقبل پر غور و فکر
سائنسی طرز فکر کے پیدا کردہ مسائل، صنعتی زندگی کے پیدا کردہ مسائل، مغرب سے متواتر ربط سے
اندرون سے پیدا کردہ مسائل ایسے ہیں کہ ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ہر طرح مضر ہوگا۔ اس لیے

کوشش جس میں ایک طرف اسلام کی بنیادی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے، اور اس کی توانائی اور طاقت کی روح دریافت کی جائے اور دوسری طرف موجودہ دور کی برکتوں اور لعنتوں کا معروضی مطالعہ کیا جائے، یقیناً موجودہ دور کے آشوب سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد کر سکتی ہے اور مضطرب اور سراسیمہ انسانیت کے لئے راہ فلاح کی نشان دہی کر سکتی ہے۔

دراصل آج مذہب کے متعلق ایک بڑے طبقے کا مرض یہ ہے کہ ایک جذباتی لگاؤ کے باوجود مذہب پوری زندگی کا رہنما نہیں ہے۔ اسے چند عقاید اور عبادات میں محصور سمجھ لیا گیا ہے۔ معاملات کے سلسلے میں جدید دور کی ضروریات کی فکر نہیں ہے۔ اسلام میں قرآن کے احکام، حدیث کے ذریعے سے اسوۂ حسنہ پر نظر کے علاوہ قیاس، اجماع اور اجتہاد کے ذریعے سے ہر دور کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ مگر ہمارے علما شریعت کے حصار میں رخنہ پڑ جانے کے اندیشے سے عملاً اجتہاد کا دروازہ بند کر دیتے ہیں، گو نظری طور پر وہ اس کی ضروریات کو تسلیم کرتے ہیں۔ پھر ان کے سامنے دارالاسلام یا دارالحرب یا دارالامن کی اصطلاحیں ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ایسا بھی ہوا ہے کہ علما کی فکر جامد ہو گئی اور انھوں نے نزاع کے اندیشے سے جابر حکومتوں کے خلاف آواز بلند نہیں کی کیونکہ ان کے نزدیک جابر حکومت بدامنی کے مقابلے میں بہتر تھی۔ پھر انھوں نے تقلید کو اپنا شیوہ بنایا اور حریتِ فکر سے بھڑکتے رہے۔ دولت اور طاقت، یہ دو چیزیں ایک نشہ پیدا کرتی ہیں اور ان کے زیر اثر عدل، مساوات اور اخلاق کی طرف سے روگردانی برتی جاتی ہے۔ اسلام نے ان پر پابندیاں عاید کی ہیں، لیکن مطلق العنان حکومتوں اور امرا نے اپنی من مانی کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اس مرحلے پر تصوف کی تحریک نے سماجی اصلاح، اخلاق کی درستی اور خدا اور رسول سے لگن پیدا کرنے میں بڑی مدد کی، اور تصوف نے اسلام کے مشن کو پھیلانے میں جو نمایاں کام انجام دیا ہے اس کا اعتراف ضروری ہے۔ مگر رفتہ رفتہ تصوف بھی مزاج خانقاہی اور ترکِ دنیا کے فلسفے کا شکار ہو گیا اور مسلمانوں کے عملی قویٰ شل ہو گئے۔ جدید دور کا چیلنج دراصل اسلام کو سب سے بڑا چیلنج ہے کیونکہ جدید دور نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے سے انسان کو جو اقتدار عطا کیا ہے اور جس طرح فضا اور بحر و بر پر اس کی حکومت ہو گئی ہے، اس سے انکار ممکن نہیں ہے مگر اس ترقی نے کچھ مسائل بھی پیدا کیے ہیں اور اقبال کے الفاظ میں جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا ہے، وہ زندگی کی شبِ تاریک کو سحر نہیں کر سکا ہے۔ چنانچہ ضرورت اس بات

کی ہے کہ اسلام کی روح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس کے آفاقی اور اخلاقی مشن کی روشنی میں انسان
کی مادی، ذہنی اور روحانی ضرورتوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ زمانہ پیچھے کی طرف نہیں جا
سکتا، گھڑی کی سوئی ماضی کی طرف نہیں موڑی جا سکتی۔ ہم قرونِ اولیٰ میں واپس نہیں جا سکتے، ہاں
قرونِ اولیٰ کی روح کی مدد سے آج بھی تازہ بستیاں آباد کر سکتے ہیں۔ جس طرح ہم ماضی میں واپس
نہیں جا سکتے، اسی طرح موجودہ دور کے سیلاب میں تنکے کی طرح بھی نہیں بہہ سکتے۔ شاہ ولی اللہ
سرسید، مولانا آزاد اور اقبال نے دین اور شریعت کا فرق واضح کیا تھا اور اجتہاد کی ضرورت پر
زور دیا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ" میں اس بات پر
زور دیا ہے کہ حکمت ولی اللہی آج بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ قرآن ہماری اساس ہے اور علم
اس اساس کو مستحکم کرتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے نزدیک قرآن اسلام کی اجتماعی تحریک کا اسا
قانون ہے اور اصول فقہ کو آج کل کی اصطلاح میں "بائی لاز" کہا جا سکتا ہے۔ اگر اس نکتے کو سمجھ لیا
جائے، تو جدید دور کی بہت سی مشکلات رفع ہو سکتی ہیں۔ اسی لئے اجتہاد اسلام کی آفاقی اور اخلاقی
تعلیم کے ہر دور میں جاری و ساری رکھنے کا دوسرا نام ہو جاتا ہے اور اس کی جتنی ضرورت آج ہے
کبھی نہ تھی۔ لیکن اجتہاد کا حق قرآن کی تعلیم اور سیرت رسول کی روشنی میں ہی استعمال کیا جا سکتا
ہے! یہ جدھر کی ہوا ہو، ادھر کو پھر جانے کا نام نہیں ہے۔ بہر حال اس وقت ان مسائل پر سنجیدگی
سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

روٹی روزی کے مسئلے کی اہمیت مسلّم ہے اور کوئی ایمان دار آدمی اس کی اہمیت سے
انکار نہیں کر سکتا مگر یہ واقعہ ہے کہ تہذیب و اخلاق انسان کو ایک سمت اور مقصد عطا کرتے ہیں
اس لئے دراصل دونوں میں توازن پیدا کرنا ہی دانش مندی ہے۔ اس طرح تغیر اور تسلسل دونوں
کے تقاضوں کو سمجھنا اور برتنا، پھر بنیادی اور جزوی باتوں میں فرق کرنا بھی ضروری ہے۔ آج زندگی
پیچیدہ بھی ہے اور قدرتی وسائل کے اندھے استعمال کی وجہ سے اور بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ
کی وجہ سے نئے خطرات سے دوچار بھی ہے۔ اس لئے موجودہ دور اپنے سارے امکانات کے ساتھ
ایک چیلنج ہے، انسانیت کی بہتر تنظیم اور سماج کی تفہیم کے لئے۔ اسلام اس کام میں ہماری رہنمائی
کر سکتا ہے بشرطیکہ ہم اضطراب اور خوف اور بےیقینی کی دلدل سے نکل سکیں اور اپنے

پ کو سمجھتے ہوئے کائنات اور اس کے قوانین اور آداب کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

سولہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں نے علوم کی اہمیت کو مدنظر رکھا۔ اُس کے بعد ان کے ہاں علم کی طرف سے بے توجہی اور تحقیق و تجربے کی طرف سے بے پروائی عام ہو گئی۔ نتیجے میں انسانیت کے کارواں کی ترقی مغرب کے ہاتھ میں آ گئی۔ مغرب نے انسانیت کو جو کچھ دیا ہے، اُسے نظر انداز کرنے یا اُس کی تحقیر سے کام نہ چلے گا۔ مغرب کی ترقی، دراصل علوم کی ترقی اور سائنس کی ترقی سے عبارت ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کو جو اقتدار دیا ہے، فرد کی آزادی پر جو توجہ کی ہے، سماج کی اصلاح میں اس کا جو رول ہے، جمہوری تصورات اور جمہوری اداروں کے فروغ میں جو اس کا کارنامہ ہے، معیار زندگی بڑھانے میں جو اس کی سعی بلیغ ہے، انسان کے علم اور اس کے وسائل میں جو اس کا اضافہ ہے، اسے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جدید کاری (MODERNIZATION) اب صرف مغرب کی جاگیر نہیں، یہ ساری دنیا میں ایک کارکشا اور کارساز طاقت ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے لیے مغرب کی آنکھ بند کر کے تقلید کی جائے۔ ہر ملک اور ہر قوم کو جدید کاری کے عمل سے اپنی تاریخ، اپنی روایات، اپنے ماحول اور اپنے مزاج کے مطابق گزرنا ہے۔ مغرب کی ترقی نے کچھ مسائل بھی پیدا کیے ہیں جو وہاں کی تاریخ اور فکر و فن کے مخصوص میلانات کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم ترقی کے راستے میں چند افراد کی خوش حالی پر نظر نہ رکھیں بلکہ پورے سماج کی خوش حالی پر زور دیں۔ ہم دولت کے حصول کو زندگی کا نصب العین نہ سمجھیں، بلکہ تقویٰ اور پرہیزگاری کو اپنا معیار بنائیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ دولت اور اقتدار کا نشہ بہت سی اخلاقی خرابیوں کا باعث ہوتا ہے۔ اسلام نے اسی لیے دولت کو محدود رکھنے اور اقتدار کو اعلیٰ انسانی اقدار کے تحت برتنے پر زور دیا ہے۔ پھر ہمارے یہاں علوم اور نئی معلومات کی طرف سے ایک خوف ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم جدید علوم کی تحصیل کر لیں گے تو ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے، وہ اغیار کی نذر ہو جائے گا۔ ہمارے علما کو اس جدید زمانے، اس کے مسائل اور اس کے امکانات کا احساس نہیں ہے۔ ان کے پاس جو علمی سرمایہ ہے وہ ازمنۂ وسطیٰ کی دین ہے اور آج کی دنیا جدیدیت (MODERNITY) کے راستے پر گامزن ہے۔ زندگی تسلسل اور تغیر دونوں میں توازن سکھاتی ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اسلامی اقدار کو بنیاد بنا کر نئے زمانے

اور نئے حالات سے عہدہ برآ ہوں۔ اسلام کی روح میں جو حرکت کا عنصر ہے، اس پر اقبال نے اپنے خطبات "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں بجا طور پر زور دیا ہے۔ اُنھوں نے کہا ہے کہ حرکت کا یہ عنصر مسلسل اجتہاد کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسلام نے اجتہاد کا دروازہ کھُلا رکھنے کی وجہ سے اس نظر کی گنجایش رکھی ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اس کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اس سلسلے میں کوئی نمایاں کام نہیں ہوا ہے۔ حالات کے دھارے پر تنکے کی طرح بہنے اور جدید کاری کے عمل میں بہت سی باتوں کو چار و ناچار اختیار کرنے کے بجائے ردّ و قبول کے ایک ایسے ہوش مندرویّے کی ضرورت ہے جو انسان کی انسانیت برقرار رکھے، لیکن "تشنوں کے دھوئیں سے سیہ پوش" اور "بیکاری و مے خواری و عریانی و افلاس" کے مغرب دشمن راستے سے الگ اخلاقی اور سماجی خیر کی طرف عوام کو لے جائے۔ مغربی تعلیم سے بہرہ ور اشخاص سے امید کی جاتی تھی کہ وہ اس سلسلے میں رہ نمائی کریں گے، مگر وہ ہماری اپنی جڑوں سے کٹ گئے ہیں اور مغرب کی ذہنی غلامی نے انھیں ہمارے کام کا نہیں رکھا۔ علما کو اس کرب، اس ذہن، اس ابتلا، اس آشوب کا احساس نہیں۔ وہ اپنے بسم اللہ کے گنبد میں مگن ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مغربی تعلیم سے بہرہ ور اشخاص اور جدید علوم کے ماہرین اپنی بنیاد، اپنی تاریخ اور اپنے علوم سے واقف ہوں اور اسے فرسودہ اور از کار رفتہ کہہ کر نظر انداز نہ کریں۔ دوسری طرف علما کو بھی ان مسائل، معاملات، ترقیات اور میلانات سے آگہی حاصل کرنی چاہیے جو اس دور کی خصوصیت ہیں۔ اس کے ساتھ دونوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف تنگ نظری کا مظاہرہ نہ کریں بلکہ مل بیٹھ کر تبادلۂ خیالات کر کے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر پر غور کریں اور آج کے سفر میں اپنی سمت متعین کریں اور اپنے سماج اور اپنی قوم اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی طرف اپنی ساری کوشش مرکوز کر دیں۔ اقبال نے اپنی ایک مشہور نظم "پیر رومی و مرید ہندی" میں آج کے مسائل کا جو تجزیہ کیا ہے، اور اُن کا جو حل پیش کیا ہے، وہ آج بھی ہماری رہ نمائی کر سکتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ علم حاضر سے دین زار و زبوں ہو جاتا ہے، ان کے لیے رومی کی یہ ہدایت ہے کہ علم کو تن کے لیے نہیں، دل کے لیے کام میں لاؤ۔ سلاطین کے ندیم ہونے کی کوشش نہ کرو، بلکہ کسی مردِ روشن دل کا بندہ ہو جاؤ۔ دانائے دیں کو ابلہ دنیا نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ جو افلاک کی سیر کر سکتا ہے اس کے لیے زمین پر چلنا یعنی دنیا کے ہنگاموں کو سہل کرنا) مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ پھر یہ خاص نکتہ بیان کیا ہے کہ علم و حکمت نانِ حلال سے پیدا ہوتے ہیں اور عشق و رقت بھی اسی سے آتی ہے۔ آخر میں اس نظریے کے جواب میں کہ ہندی اہلِ

نور ہے۔ سوز اور اہل دل اس دیس میں تیرہ روز ہیں، یہ حیات افروز اور ولولہ انگیز پیام ملتا ہے کہ مردوں کا کام روشنی اور گرمی پھیلانا ہے۔ ہاں پست فطرت لوگوں کا کام حیلہ سازی اور بے شرمی ہے۔

آج کا مسئلہ یہ ہے کہ مادیت، ہوس زر، بے لگام انفرادی آزادی، اخلاقیات کے زوال، اقتدار کی ہوس، بے جا توقعات، سیاست کی بے اصولی، سرمایہ کی چیرہ دستی، سستی مسرت اور لذت کی تلاش، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور اخباروں میں کاروباری یا تجارتی نقطۂ نظر نے ایسی مقبولیت حاصل کرلی ہے کہ ساری ترقی کے باوجود انسانیت کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ یہ خطرہ آسانی سے نہیں ٹل سکتا۔ صنعت کاری سے اور مشین سے مفر نہیں ہے، مگر صنعت کاری کو انسانی مقاصد اور واقعی اور حقیقی سماجی ضروریات کے تحت ہونا چاہیے۔ اور مشین کی انسان پر حکومت کے بجائے، انسان کی مشین پر حکومت ہونی چاہیئے۔ یہ کام صحت مند اور صالح بنیادوں پر منصوبہ بندی چاہتا ہے اور اس منصوبہ بندی کے لئے ایسے دانشوروں کو سامنے آنا چاہیے جو قدیم و جدید کی حد بندی میں اسیر نہ ہوں بلکہ دونوں پر نظر رکھتے ہوں۔ اس منصوبہ بندی کا مقصد ذہنی، اخلاقی، سماجی، معاشرتی، تعلیمی، سیاسی، سبھی دائروں میں ایسی تبدیلی لانا ہوگا، جو حقوق اور فرائض کے درمیان توازن قائم کرے، جو انسان کو شیطان کا مرید بنانے کے بجائے خدا کا خلیفہ بننے کا اہل کرے اور جو دنیا کو ہلاکت اور تباہی کے بڑھتے ہوئے خطرے سے بچاکر امن و آشتی، اخوت و مساوات کی جنت بنا سکے۔

○

جدید دنیا، ایک ایسی حقیقت ہے، جس کے پیچھے ایک سائنسی نظر، ایک جدید کاری کا عمل، ایک صنعتی نظام، ایک سماجی انقلاب، ایک جمہوری سفر، ایک اخلاقی رویہ ہے۔ اسے نہ تو محمد حسن عسکری کی طرح گمراہیوں کا ایک سلسلہ کہا جا سکتا ہے نہ کچھ تہذیب کے فرزندوں کی طرح انسانیت کی نجات کا واحد راستہ! ہمارا فرض ہے کہ ہم وقت کے سمندر میں اس موج کو خلاصۂ کائنات نہ سمجھیں بلکہ وقت کا عرفان حاصل کریں۔ اور ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ اس موج کی عظمت اور طاقت کو بھی ذہن میں رکھیں۔

جدید دنیا کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس کی طاقت اور کمزوری کیا ہے؟ کن عناصر سے اس کی تشکیل ہوئی ہے، اور انسانیت کو اس نے کہاں پہنچایا ہے؟ کیا جدید دنیا مغربی اثرات کی نمود کا دوسرا

نام ہے؟ کیا اس کا محور مغربیت ہے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات، جدید دنیا کا نام آتے ہی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان سب کا مختصر اور شافی جواب آسان نہیں ہے۔ پھر بھی یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ جدید دنیا کی پہلی خصوصیت روایتی نقطۂ نظر کے بجائے عقلی اور سائنسی نقطۂ نظر ہے۔ عقلی اور سائنسی نقطۂ نظر کے نشانات جدید دور سے پہلے بھی ملتے ہیں، مگر اس کی حکمرانی نہیں ملتی۔ چنانچہ روایتی سماج سے عقل کی سمت ترقی، جدید دور کی خصوصیت ہے۔ اس دور میں رنگ، نسل، حسب نسب کے بجائے ذاتی صلاحیت معیار بنتی ہے۔ ترقی ایک قدر کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ سائنس کی ترقی ٹیکنالوجی میں ترقی کا باعث ہوتی ہے اور ٹیکنالوجی انسان کو اتنا اقتدار اور اتنے وسائل عطا کرتی ہے کہ بنی نوع انسان، اقتصادی، سماجی اور ذہنی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر لیتا ہے۔ تکنیکی مہارت زندگی میں ایک کیفیاتی (QUALITATIVE) تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ روایت اور اس کے تسلسل کا احساس رہتا ہے مگر روایت کی جبریت اور آمریت باقی نہیں رہتی۔ تخصیص، آفاقی انسان کے بجائے ماہرین پیدا کرتی ہے۔ فرد کی آزادی بنیادی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی صلاحیت، سماج میں اس کے درجے کو متعین کرتی ہے۔ جمہوری تصورات ترقی ہوتی ہے اور اقتدار میں عوام کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی، صداقت اور آزادی کی علامت بن جاتے ہیں۔ جدید کاری کا عمل ایک طور پر صنعت کاری کا عمل ہے۔ اور زراعت میں ترقی بھی صنعت کی مرہون منت ہو جاتی ہے۔ ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی تصورات، یہاں تک کہ مذہب کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ سماجی رشتوں میں تبدیلی ہوتی ہے اور خاندان کی مرکزیت باقی نہیں رہتی۔ عورتوں کی آزادی اور ان کی زندگی کے بہت سے شعبوں میں شرکت سے پرانے سماجی اور اخلاقی خیالات کو خاصی زک پہنچتی ہے۔ جامد مشرق، مغرب کی تکنیکی مہارت کی وجہ سے نہ صرف اس سے مغلوب ہو جاتا ہے، بلکہ اس کی تقلید پر مجبور ہوتا ہے۔ جدید کاری مغرب کے نقش قدم پر چلنے کے مترادف ہو جاتی ہے۔

لیکن اس ترقی نے کچھ مسائل بھی پیدا کیے ہیں اور جدید کاری کو چونکہ مغرب کے راستے پر چلنے کا دوسرا نام مان لیا گیا ہے، اس لیے مغرب کے ان مسائل سے اب مشرق بھی دوچار ہے۔ عقلی اور سائنسی نقطۂ نظر میں اتنی رعونت آگئی ہے کہ وہ اپنے حدود کو بھلا بیٹھا ہے۔ مادی خوشحالی اور صارفیت (CONSUMERISM) کے فلسفے نے بدن کو بیدار اور روح کو خوابیدہ کر دیا ہے۔ انسان کی مشین پر حکومت نہیں ہے مشین حاکم ہو گئی ہے۔ جمہوری ادارے جمہور کی آواز نہیں رہے، حکومت یا سرمایے کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئے ہیں۔ فرد

کی آزادی کی لے اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہر سماجی اور اخلاقی پابندی سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ طاقت کی پرستش نے بے رحمی اور سخت دلی پیدا کی ہے۔ عورت کی بے لگام "آزادی" نے اُسے شتر بے مہار بنا دیا ہے اور وہ مردوں سے ہزاروں سال کے ظلم و جبر کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ تعلیم نے مہارت پر زور دیا ہے، سیرت سازی پر توجہ نہیں کی۔ اس نے علم دیا ہے، بصیرت نہیں دی۔ ہنر دیا ہے، نظر نہیں پیدا کی۔ سرمایہ دارانہ سماج، فلاحی ریاست کے ذریعے سے اپنی اصلاح کی ناکام کوشش کر رہا ہے، مگر اشتراکی سماج جو بھی عوام کی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، بقول جلاس ایک نئے طبقے کو جنم دیا ہے جو مادیت اور اقتدار کو سب کچھ سمجھتا ہے اور پرانے تہذیبی ورثے سے صرف ایک عجائب خانے کی زینت کا کام لیتا ہے۔

جدیدیت سے تو مفر نہیں ہے، لیکن جدید کاری کے عمل کو مغرب کے نقش قدم پہ آنکھ بند کر کے چلنے سے روکا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جدید دَور اور جدید کاری کے مضمرات کو سمجھیں۔ یہ مضمرات، جدید سماجوں میں جو کچھ فتوحات ہوئی ہیں اُن میں یکسانیت دیکھنا اور اسی طرح دوسرے سماجوں میں جو جدیدیت سے متاثر ہو رہے ہیں توقعات کی یکسانیت کو مدنظر رکھنا ہیں۔

جو فتوحات یا توقعات کی یکسانیت ہے، اس کی بنیاد میں اقتصادی پہلو کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس لئے اقتصادی ترقی جدید کاری کا ایک اچھا معیار ہے۔ جدید کاری وہ سماجی ماحول پیدا کرتی ہے جس میں ہر شخص کی دولت میں اضافہ کرنے کی اہمیت ہے اور دولت آفریں رویے کو ملحوظ رکھنے اور اس کو عام بنانے کی وجہ سے تمام سماجی قدروں، جیسے طاقت، احترام، محبت، خوش حالی، مہارت اور روشن خیالی کی نئی تشکیل ہوتی ہے اور ان سے نیا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ ترقی کے لئے اقتصادی عوامل اور دوسرے عوامل میں باہمی رشتوں کے اس احساس کا نام جدید کاری ہے، جو ایک طرف عمومی جواز رکھتا ہے اور دوسری طرف ساری دنیا کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔

جدید کاری میں اقتصادی نظام کی ترقی پذیری، سیاسی نظام میں عوامی رول اور جمہوری نمائندگی، تہذیب میں عقلی اور دنیوی معیار، سماج میں نقل و حرکت کی آزادی (جو جدوجہد کی تمنائیں اور آرزوئیں پیدا کرے) کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس طرح جدید کاری صرف اس ترقی کا نام نہیں جو پیداوار اور خرچ میں اضافہ ترقی ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ سماجی اداروں کے ذریعے سے انسانی وسائل کی نئی تنظیم بھی ہے۔ چنانچہ صنعت کاری، شہروں کی طرف میلان، اقتصادی ترقی، روشن خیالی (جو تعلیم اور MASS MEDIA کے ذریعے

وجود میں آئے، سیاسی اقتدار میں شرکت اور شخصیت میں تغیر اور تسلسل کا توازن قائم کرنے کی صلاحیت، یہ سب جدید کاری کی ایسی خصوصیات ہیں جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔ جدید کاری اہلِ نظر کی تازہ بستیاں آباد کرنے کا نام بن جاتی ہے اور اس عمل کو اس کی برکتوں کے علاوہ اس کی لعنتوں کے ساتھ ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ صرف برکتوں پر اصرار جتنا غلط ہوگا، اتنا ہی صرف لعنتوں پر اصرار بھی۔

آج صورت حال یہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں ان ملکوں کی آزادی نے جو کل تک مغرب کے غلام تھے، جدید کاری کے عمل کو اتنی تیزی سے روایتی سماجوں تک پہنچا دیا ہے کہ وہ توازن قائم نہیں رکھ سکے۔ اگر یہ عمل آہستہ آہستہ ہوتا تو شاید تبدیلی اتنی ہوش رُبا اور قیامت خیز نہ ہوتی۔ مگر تبدیلی وقت کا تقاضا اور فطرت کا قانون ہے۔ مغربی سماج میں جو مسائل پیدا ہوئے، ان کے حل کی طرف توجہ بھی ہے، خواہ اس حل سے ہمیں کتنا ہی اختلاف ہو۔ مگر مشرقی سماجوں کے مسائل میں مغربی حل تمام تر کام نہیں آسکتے۔ کیونکہ کوئی سماج بیرونی اداروں کو بجنسہٖ اپنے یہاں نافذ کر کے صحت مند نہیں رہ سکتا؛ اسے ان اداروں کے تصورات کو اپنے طور پر اپنانا ہوتا ہے۔

چنانچہ اس وقت مشرق، خصوصاً دنیائے اسلام کا مسئلہ یہی ہے کہ اس کا جدید کاری کے عمل سے سابقہ ہے اور اسے وقتی طور پر اپنی فلاح مغربیت ہی میں نظر آتی ہے۔ اگر اس کے روایتی سماج میں جو حرکی عناصر ہیں ان کی طرف توجہ ہوتی اور جامد عناصر کا غلبہ نہ ہوتا تو وہ اس تبدیلی کے لئے مناسب سانچے وضع کر لیتا اور آنکھ بند کر کے مغربی سانچوں پر تکیہ نہ کرتا۔ مگر اس کے یہاں اس تبدیلی کے لئے ذہنی آمادگی تو کیا، ایک قسم کا خوف ہے، جو اپنے خول میں سکڑنے کا ویرہ ہے، جو پھیلنے اور پھیلانے، خدا کی زمین میں ہاتھ پاؤں مارنے کا عزم نہیں ہے۔ تجربے سے جھجک ہے، ایسے علم سے ہراس ہے جو مسائل اور مشکلات پیدا کرے؛ آگے دیکھنے کی اُمنگ نہیں ہے، صرف پیچھے دیکھنے کی صلاحیت ہے۔ تبدیلی کو قبول کرنے سے پس و پیش ہے، ہاں چار و ناچار تبدیل ہو جانے کو قسمت کا کھیل سمجھ کر گوارا کرنے کی عادت ہے!

ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نفسیاتی گرہ، سماجی پس ماندگی اور ذہنی جمود کے لئے سہارا اسلام سے لیا جاتا ہے۔ جو دنیا کو آخرت کی کھیتی کہہ کر صاف کہتا ہے کہ دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے، جو فطرت کے مشاہدے کو اور خدا کی نشانیوں کو ضروری سمجھتا ہے، جو ایک منصفانہ سماج اور ایک اخلاقی نظام کو مرکزی اہمیت دیتا ہے، جو علم کے حصول پر کوئی حد مقرر نہیں کرتا، جو مساواتِ انسانی کا علمبردار ہے، جو

مرد عورت کی برابری کا قائل ہے، جو بھائی چارے اخوت اور انسانی برادری پر زور دیتا ہے، جو امن و آشتی کی تلقین کرتا ہے، جو عقیدے اور عبادت کے ساتھ ساتھ معاملات میں عدل و انصاف پر اصرار کرتا ہے، جو فرد کو عمل پر اکساتا ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیت کو بیدار کرتا ہے، جو حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کو ضروری سمجھتا ہے۔ جو دولت کے چند افراد یا گروہوں کا اجارہ ہونے کے قطعی طور پر خلاف ہے، جو زمین کو خدا کی ملکیت سمجھتا ہے، جو جمہوریت پسند ہے، جو اپنی تعلیم کی ابدیت کے باوجود وقت اور حالات کی تبدیلی میں اجتہاد کے لئے دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حقیقی اسلام اور تاریخی اسلام میں فرق نہیں کیا گیا۔ حقیقی اسلام اپنے کو خدا کے حوالے کرنے کا نام ہے۔ مگر آج عام طور پر اسلام کے معنی اسلام کی پوری تاریخ کے لئے جاتے ہیں جس میں ظاہر ہے، اس طویل عرصے میں بہت سے غیر اسلامی عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اس میں شہنشاہیت اور اس کے ظلم و جبر کی خونیں داستانیں بھی ہیں اور تصوف کی وہ بے اعتدالیاں بھی ہیں جو مزاجِ خانقاہی کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں۔ پھر جاگیر داری کے دَور کی وہ روایات بھی ہیں جن میں بہت سی فرسودہ ہو گئی ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جدید کاری کے عمل سے نہ تو اس طرح مرعوب ہوں کہ آنکھ بند کر کے مغرب کے راستے پر گامزن ہو جائیں اور نہ اس سے اس طرح دامن بچائیں گویا یہ گمراہی اور پستی، شیطنت اور بے راہ روی کا دوسرا نام ہے۔ بلکہ اس زریں اصول پر عمل کریں جو "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے مقولے میں پوشیدہ ہے۔

یہ بات اب کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ مادیت کے فروغ نے دولت کی ہوس پیدا کی ہے اور اس دولت کی ہوس نے بہت سی سماجی اور اخلاقی بدعنوانیوں کو جنم دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان اسلامی ممالک میں بھی جہاں تیل کی وجہ سے دولت کی فراوانی ہے، ایک انتشار پیدا ہوا ہے اور اوپر کی اسلامی زندگی کے اندر بہت سی اخلاقی خرابیاں وجود میں آ گئی ہیں۔ اس لئے ہر ایسے سماجی نظام کے قیام کی خواہش جس میں دولت چند افراد یا حکومت کے چند افراد کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ سب کو اس کا مساوی حصہ ملے، عین اسلامی ہے۔ اسلامی سوشلزم اور کمیونزم میں صرف یہ فرق ہی اہم نہیں کہ اس میں تاریخی مادیت اور اس کی بنا پر لامذہبیت کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ اس میں صارفیت یا (CONSUMERISM) پر توجہ ہے۔ جب کہ اسلام، سادگی، اور ایک طرح کی پرہیزگاری یا تقویٰ (ASCETCISM) سکھاتا ہے۔ اسی زہد اور مسیحی زہد میں فرق یہ ہے کہ اسلامی زہد دنیا کو قبول کرتا اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں پر سب کا حق سمجھتا ہے، جبکہ

مسیحی زہد ترک دنیا کی تلقین کرتا ہے اور زندگی کو بھی ایک گناہ سمجھتا ہے۔

پھر اسلام، جمہوری طرزِ حکومت کے حق میں ہے۔ جمہوری طرزِ حکومت یا جمہوری ادارے مغرب کی جاگیر نہیں انسانی ادارے ہیں۔ لیکن مغرب میں جمہوریت کا جس طرح فروغ ہوا ہے، وہ وہاں کے مخصوص تاریخی حالات کی وجہ سے ہوا ہے اور ہم اس بات کو پھر دہرائیں کہ کوئی ادارہ بجنسہٖ کہیں سے لایا جائے تو اس سے الجھنیں پیدا ہوں گی اور اگر اس کو اپنے مخصوص حالات کی روشنی میں اپنی تاریخ اور اپنے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے طور پر نافذ کیا جائے تو اس سے فلاح کی صورت یقیناً نکلے گی۔ اس لئے مغربی جمہوریت کی بجنسہٖ تقلید لازمی نہیں ہے بلکہ اس کی روح کے لئے مشرقی قالب کی ضرورت ہے۔ موجودہ پارلیمانی نظام کی اصلاح اسی ذیل میں آتی ہے۔

جدید کاری میں بینک کاری کو جو اہمیت ہے، وہ ظاہر ہے۔ سرمایہ داری اور صنعت کاری کے فروغ میں اس کا جو رول ہے، وہ مسلّم ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا سود سرے سے ناجائز ہے، یا سودِ مرکب یا ربا میں فرق ہے جس سے سود خوری (USURY) وجود میں آتی ہے؟ دنیا میں مسلمان اقلیت میں ہیں، اکثریت میں نہیں۔ وہ سود دینے پر ایک طرح سے مجبور ہیں، مگر سود لینا ان کے لئے نامناسب ہے۔ ہمارے علما اس صورتِ حال میں ہماری کتنی رہنمائی کرتے ہیں؟ فقہ اسلامی میں قیاس، اجماع اور اجتہاد تینوں کی روایات موجود ہے۔ کیا اس سے پورا پورا کام لیا گیا ہے؟ شریعت جو ڈسپلن قائم کرتی ہے اس کی ضرورت مسلّم ہے اور اس ڈسپلن کے بغیر انتشار فطری ہے۔ مگر اس ڈسپلن کے پیچھے ایسی نظر بھی ضروری ہے جو قدیم و جدید، ماضی و حال، دونوں سے گہری واقفیت رکھتی ہو۔ مذہب صرف ادا روایات کا نام نہیں ہے، صرف چند قوانین کا مجموعہ نہیں ہے، اس کی ایک روح ہے۔ اس میں ایک عقیدے، ایک ایمان، ایک جذبۂ تسلیم، ایک عشقِ الٰہی، ایک عشقِ رسولؐ کی مرکزیت ہے، جس کے لئے وقت کی ضرورت کے مطابق قوانین پر اصرار ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام کے ابدی اصولوں کی روشنی میں قانونِ وراثت، تعددِ ازدواج اور حدودِ شرعی پر برابر غور کرنے اور ان کی روح کے مطابق ان کی عملی تعبیروں کی ضرورت بہر حال مسلّم ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم ناقص ہے۔ اس نے دو الگ الگ دھاروں کو جنم دیا ہے۔ ایک طرف ایک بڑی تعداد اُن تعلیمی اداروں کی ہے جو روزگار مہیا کرنے اور دنیا میں جگہ بنانے

کے لئے ہیں، گو وہ اب اس مقصد میں بھی خاصے ناکام ہیں۔ دوسرے وہ قدیم ادارے ہیں جو مذہبی تعلیم دیتے ہیں اور اس تعلیم میں درس نظامیہ کے نہج پر اصرار کرتے ہیں جو قرآن اور حدیث کے علاوہ قدیم علوم اور قدیم طرزِ فکر (METHODOLOGY) کو کافی سمجھتے ہیں۔ ان ممالک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں نظامِ تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو قرآن اور اسلامی اخلاق کی تعلیم کے ساتھ جدید طبیعیاتی علوم، معاشیاتی علوم، سماجی علوم اور انسانی علوم کی تعلیم دے، اور جہاں اسلامی تعلیم صرف دینیات کو لازمی قرار دینے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ اُسے دوسرے علوم کے ساتھ موجودہ ذہن کی ضروریات کے مطابق حرزِ جان بنائے۔ اُن ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، عام اداروں میں مذہبی تعلیم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے مسلم رہنماؤں، مسلم اداروں اور اوقاف کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان اداروں کے طالب علموں کے لئے ایسے جز وقتی ادارے قائم کریں جن میں اس کمی کو پورا کیا جا سکے۔ مسلم اسکولوں اور کالجوں میں رسمی طور پر دینیات کی تعلیم کافی نہیں۔ یہاں دنیوی علوم کی تعلیم کے ساتھ اسلامی بنیاد کو مضبوط کرنے کے لئے تدریس کے اوقات میں اضافے کو صرف قبول ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس پر اصرار کرنا چاہیے۔

ایسا لگتا ہے کہ اسلام مسلمانوں سے مایوس نہیں ہوا ہے، بلکہ مسلمان اسلام سے مایوس ہو گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آج عالم اسلام میں ایک بیداری، ایک احیا، ایک نئی زندگی کے آثار ہیں مگر یہ تیل کی طاقت، مادی وسائل اور اسلحہ کی فراہمی میں اسیر لگتی ہے۔ اس بیداری میں دانش وری کی کمی ہے۔ ہندوستان کو دیکھئے تو اس کا دستور اور اس کا جمہوری نظام نہ صرف ہر شہری کو اس نظام میں شرکت کی ضمانت دیتا ہے، بلکہ اپنے عقاید اور تعلیمات کو عام کرنے کی بھی۔ اس اصول کے نفاذ میں تاریخی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر بہت سی دشواریاں ہیں جو مسلّم ہیں۔ پھر بھی بنیادی دستوری ضمانتوں کی کلید بہرحال موجود ہے۔ مگر دانش وری کی روایات کے ضعیف ہونے کی وجہ سے کچھ حلقوں میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جب تک طاقت ہاتھ میں نہ ہو اسلامی مشن کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ صرف اسلام کے مدنی دَور کو سامنے رکھتے ہیں، اس کے مکی دور کو جو مدنی دَور سے پہلے تھا مناسب اہمیت نہیں دیتے۔ سر سید کے دَور سے ہمارے یہاں دانش وری کی جو روایت شروع ہوئی وہ اب بھی خاصی کمزور ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ علمی اور عقلی نقطۂ نظر کو فروغ ہو، فکر روشن زندگی اور عمل کا سہارا ہو، اور علم و عمل کے لئے راہ ہموار کرے۔ یہ دانشوری صرف قدیم علوم کے سہارے ممکن نہیں، اور جدید علوم بھی سچی دانشوری کی راہ نہیں

دکھلاتے اسے یک رخا بنا دیتے ہیں۔ اس لئے ہندستان کے مسلمانوں کو ایسی دانشوری کی ضرورت ہے جو بقول اقبالؔ "کہنہ پیکر میں نئی روح" کو آباد کرے، یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے۔ اس کے معنی کہ ہمارے لئے دانشوری وہی ہوگی جو ہماری مذہبی قدروں سے نہ صرف واقف ہو بلکہ ان کا پاس رکھتی ہو، اور جدید دور، جدید علوم اور جدید زندگی کے سارے تقاضوں سے خائف ہونے کے بجائے معروضی طور پر جائزہ لے سکتی ہو، اور ان کے ذریعے سے انسان کو جو طاقت میسر آتی ہے اس سے طور پر کام لینے کا گر جانتی ہو۔

اسلام جب دنیا میں پھیلا ہے تو اس نے دوسرے علاقوں، قوموں اور تہذیبوں کو متاثر کیا ہے اور ان سے متاثر بھی ہوا ہے۔ یہ ذہن ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں عام نہیں وہ مذہب سے زیادہ مذہبیت پر زور دیتے ہیں؛ تشخص کے معنی علاحدگی پسندی سمجھتے ہیں؛ مذ ارکان کی بجا آوری کو تو ضروری سمجھتے ہیں مگر دنیوی معاملات میں اسلام کے اصولوں کی پابندی کو ضرور نہیں سمجھتے اور دیانت، ایمانداری، رفاہ عام، خدمتِ خلق، سماجی بہبود کے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ یہ اسلام کی جامعیت کو بھلا دینے کے مترادف ہے۔ سرسید نے غلط نہیں کہا تھا کہ "دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی، مگر دنیا چھوڑنے سے دین بھی جاتا ہے۔" اسلام دین اور دنیا دونوں کو ملحوظ رکھتا ہے دونوں کے ساتھ انصاف کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

سولھویں صدی عیسوی تک مسلمان علمی دنیا میں نمایاں رہے۔ اس کے بعد مغرب نے علمی دنیا کی باگ سنبھالی۔ یہ اسلام کا قصور نہیں، مسلمانوں کا قصور ہے۔ اسلام میں وقتاً فوقتاً احیا اور بیداری کی جو اٹھی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں یہ اندرونی طاقت موجود ہے کہ وہ نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق اپنی از سر نو تنظیم کر سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک طرف ہم حقیقی اسلام کو سمجھیں اور دوسری طرف دانشوری کی روایت کو مضبوط کر کے تنگ نظری، تعصب، توہمات، روا اندھی ماضی پرستی کی دلدل سے نکلیں۔ حقیقی اسلام زندگی کے ہر موڑ پر ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

○

# جا بجا ...

## علی گڑھ کدھر

یہ ادارہ اب بہت بڑا ہو گیا ہے اور وقتی سیاست اور سستے مفادات اس پر غالب آ گئے ہیں۔ یہاں ایک بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا، ایسے لوگوں کے ایک گروہ کو بے مقصد تعلیم دینا جن کی صلاحیت مشتبہ ہے، ایسے لوگوں کا تقرر کرنا جو کسی اور جگہ نہیں کھپ سکتے، حقوق پر اصرار کرنا اور ذمے داریوں کو نظر انداز کرنا کچھ عرصے سے علی گڑھ میں عام ہو گیا ہے۔ جنگل اور چمن میں فرق ہے اور باغبان چمن بندی کے لیے خس و خاشاک کو ہٹاتا ہے اور بڑھتی ہوئی شاخوں کی قطع و برید کرتا ہے۔ اگر علمی نظر کے بجائے جذباتیت، اگر قدروں کے احساس کے بجائے ذاتی مفادات، اگر اخلاقی اور روحانی معیاروں کے بجائے حبِ زر اور اقتدار کی ہوس، اگر سیاسی شعور کے بجائے موقع پرستی عام ہو جائے تو پھر علمی ادارے تہذیبی گہوارے اور ادبی مرکز، سیاسی اکھاڑے اور گروہ بندی کے دنگل بن جاتے ہیں۔ تعلیم اور سیاست کا فرق ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ کی جوبلی کے موقع پر بڑی خوبی سے واضح کیا تھا۔ سیاست بے صبر ہوتی ہے، تعلیم صبر اور ریاض چاہتی ہے، سیاست لہو کی دھار اور شعلے کی لپک ہے، تعلیم ماتھے سے محنت کا پسینہ، ایک سے کچھ دیر کے لیے نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں، دوسرے سے چمن بندی ہوتی ہے، بستیاں بستی ہیں، ذہنوں میں روشنی ہوتی ہے اور دلوں میں تعمیر و تشکیل کے ولولے پیدا ہوتے ہیں۔ تعلیم کے لیے سیاسی شعور مفید ہی نہیں ضروری بھی ہے، گروہ سیاست جس پر ہمارے ملک کی سیاسی پارٹیاں، اقتدار کے لیے داؤ پیچ میں مصروف رہتی ہیں، تعلیم کے مرحلے کے لیے اس انجن کی طرح ہے جو پٹری کو بھی ٹیڑھا کر دیتا ہے۔

## اقبال، ابوالکلام، ذاکر حسین

اقبال نے ایک تاریخی آفاقی اور سماجی رول کے لیے مرد مومن اور مرد کامل کے تصور پر زور دیا جس میں نطشے کے فوق البشر کی جھلکیاں ہیں مگر جو دراصل خیر البشر کا تصور ہے اور نہ صرف سماج کو آگے کی راہ دکھاتا ہے بلکہ اس کا رشتہ ماضی کی صالح روایات سے بھی مستحکم رکھتا ہے۔ پیامِ مشرق کے دیباچے میں اقبال نے کہا ہے کہ ان کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں بلکہ روحِ عالم میں ایک انقلاب اور ایک نئی انسانیت کی تخلیق ہے۔ ہاں اس مقصد کی تعمیر و تعبیر اگر ان کے نزدیک اسلام کی حقیقی تعلیم کے ذریعے سے ہو سکتی ہے تو اُسے کیوں نہ پیش کیا جائے۔ میرے نزدیک یہاں اقبال حق بجانب ہیں کیونکہ ہر عمومیت کے لیے کسی خصوصیت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ تغیر اور تبدیلی پر ایمان کے باوجود اور تاریخی ضروریات کو ملحوظ رکھنے کے باوجود جدید دور کی بعض قدروں مثلاً جمہوریت، قومیت اور سائنسی نظر کے ساتھ اقبال نے انصاف نہیں کیا۔ اقبال نے جمہوریت، قومیت [illegible] اور سائنس اور صنعت و حرفت کی خرابیوں پر تو نظر رکھی مگر ان کے روشن پہلوؤں، ان کی طاقت [illegible] ان کے امکانات کو مناسب اہمیت نہیں دی۔ اقبال کا عشق کا تصور اگرچہ عقلیت کو رد نہیں کر[illegible] کیونکہ ان کا مقصد عقل کو ادب خوردۂ دل بناتا ہے مگر مجموعی طور سے اس کی وجہ سے اردو دا[illegible] طبقے میں علم و عقل کی طرف سے ایک خوف اور اس کی تحقیر کا میلان ضرور پیدا ہوا۔ اقبال حب وطن کے قائل تھے مگر وہ قومیت کو نئی تہذیب کا تراشا ہوا بت سمجھتے تھے۔ بے شک قومیت کا تصور نشانِ راہ ہے منزل نہیں۔ منزل آفاقیت ہی ہے مگر قومیت کی اہمیت، اس کے اثرات اور مطا[illegible] سے چشم پوشی حقائق سے گریز کرنا ہے۔ اقبال کو اتنا احساس تو تھا کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو[illegible] قومیت اور اسلام ایک دوسرے سے مطابقت پیدا کر لیتے ہیں مگر انھیں یہ خیال نہ رہا کہ قومیت کے اثرات وہاں ناگزیر ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اسلام کی حقیقی تصویر مکی اور مدنی دور دونوں سے عبارت ہے۔ اسلامی ریاست کا قیام مدنی دور سے وابستہ ہے۔ مولانا آزاد کا یہ خیال غلط نہ تھا کہ اسلام اور قومیت میں کوئی تضاد نہیں اور مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک اُمتِ واحدہ بنا سکتے ہیں۔ اقبال اس نظریے سے متفق نہ تھے۔ انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی کے اس قول کی سخت مخالفت کی کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" حالانکہ مولانا حسین احمد نے ایک قوم کا لفظ استعمال کیا

جس کا رشتہ ایک سرزمین سے لازمی ہے۔ اسلام ایک مذہب ہے، اور عالمگیر مذہب ہے۔ یہ قومیت سے ماورا ہے اور ایک بین الاقوامی نظر رکھتا ہے مگر تاریخِ اسلام یہ بتاتی ہے کہ اسلام نے قومیت کا انکار نہیں کیا ہے۔ دراصل اس معاملے میں مولانا آزاد اور اقبال دونوں اپنی انا کے شکار ہوئے۔ مولانا آزاد نے اسلام کے سارے سرمایے پر فخر کیا اور اس میں سے کسی چھوٹے سے حصّے سے محرومی گوارا نہ کی مگر ہندوستان کی اکثریت سے ہندوستان میں اسلام کو زبان سے نہیں دل سے قبول کرنے پر اور ہندوستان میں اسلام کے رول اور اس کے افکار و اقدار کی ضمانت پر وہ اصرار نہ کیا جس کی ان سے توقع تھی۔ یہاں یگانہ کا ایک شعر بے ساختہ یاد آتا ہے:

صد رفیق و صد عدم پر شکستہ و دل تنگ — داورانی زبید بال و پر منی تنہا

دراصل مولانا آزاد کو گاندھی جی کی تقلید کرنی چاہیے تھی۔ انھیں حکومتِ ہند میں وزارتِ تعلیم کا عہدہ قبول نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر ذاکر حسین کو علی گڑھ سے سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ واپس آنا چاہیے تھا۔ بہار کی گورنری، نائب صدر کا اعزاز اور پھر صدرِ جمہوریہ کا اعزاز بہت بڑی چیزیں ہیں مگر ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کا مسئلہ ان سب عہدوں سے زیادہ اہم تھا۔ مولانا آزاد اور ذاکر صاحب یہ قربانی نہ دے سکے یا شاید انھوں نے نیک نیتی سے یہ سمجھا کہ اُن کے حکومت میں شریک ہونے سے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان کی نئی جمہوریت انصاف کر سکے گی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی راہ نمائی جس دانش وری، جس دور رس طریقۂ کار، جس منصوبہ بندی، اسلام کی بنیادی خصوصیات پر اصرار کے ساتھ معاملات میں عدل اور خدمتِ خلق، سب میں شرکت کی ضرورت تھی، اس سے ہندوستانی مسلمان محروم ہو گئے۔ حکومت کا پرزہ بن کر آدمی عوام سے کٹ جاتا ہے۔ یہ بات عوامی اور جمہوری حکومت کے دور میں بھی صحیح ہے۔ عوام کے ساتھ رہ کر وہ عوام کی بہتر رہ نمائی کر سکتا ہے۔ اقبال نے دراصل کمال اتاترک سے بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں مگر وہاں کے لادینی طرزِ حکومت سے گھبرا کر انھوں نے یہ سوچا کہ اگر ہندوستان کے ان علاقوں کی نئی تنظیم ہو جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں تو ان علاقوں کے ذریعے سے اسلام کی خدمت اور ہندوستان کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ اقبال کو پاکستان کے نظریے کا نام دینا میرے نزدیک کسی طرح درست نہ ہوگا۔ اقبال نے ٹامسن کے نام ایک خط میں ۱۹۳۴ء میں لکھا تھا کہ "پاکستان میری اسکیم نہیں ہے۔ میری اسکیم ہندوستانی فیڈریشن میں مسلم علاقوں کی اسکیم ہے۔"

## علی گڑھ کے فرزند

وہ گہری مذہبیت رکھتے تھے مگر ان کے یہاں کسی قسم کا کٹرپن نہ تھا۔ تنگ نظری اور تعصب کا ان کے یہاں گزر بھی نہ تھا۔ وہ رواداری اور اعتدال کو تہذیب کی روح سمجھتے تھے اور ان کے یہاں یہ رواداری ایک طرزِ زندگی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں لبرل تھے۔ ان کے یہاں مشرقیت اور مغربیت دونوں کا ایک دلآویز سنگم تھا۔ تہذیب اور انسان دوستی اور اخلاقی نقطۂ نظر، قومیت اور بین الاقوامیت ان کے یہاں گھل مل گئے تھے۔ اُن کے مزاج میں ایک بانکپن و شوخی بھی تھی۔ وہ سیاسی آدمی نہیں تھے اور اس پر خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ وہ آزادئ رائے کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور مخالف حالات میں بھی بڑی نرمی لیکن صفائی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ حالات نے انہیں ملول کیا مگر وہ نہ مایوس ہوئے، نہ برہم، نہ بیزار ——— ان کے یہاں نرم دلی کے ساتھ ذہنی پختگی اور مضبوطی تھی، خودی کی اہمیت کے احساس کے ساتھ خودپسندی سے احتراز، طرفداری کے بجائے سخن فہمی اور ایمان، امید اور محبت تینوں اصولوں سے وفاداری نے ان کی شخصیت کو جو آب و تاب عطا کی وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔

## ~~دو سو سال کی غلامی~~ ایک ہزار سال کی غلامی

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو جب میں لکھنؤ کی سڑکوں پر آزادی کا جشن دیکھ رہا تھا تو میرے کانوں میں دو علاحدہ نعرے گونج رہے تھے۔ ایک جواہر لال نہرو کا کہ ہم دو سو سال کی غلامی کے بعد آزاد ہوئے ہیں، دوسرا پنڈت گوند بلبھ پنت کا کہ ہم ایک ہزار سال کی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں۔ حکومت جواہر لال کی تھی مگر بات پنت کی مقبول تھی۔ اس بات کو میں ایک تاریخی مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ جب امام حسین کوفے جا رہے تھے تو راستے میں عرب کے مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ امام نے اُن سے کوفیوں کے رویّے کے متعلق سوال کیا ——— فرزدق نے جواب دیا کوفیوں کے دل آپ کے ساتھ مگر ان کی تلواریں یزید کے ساتھ ہیں ——— ہندوستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ ابتک ہندوستان کی اکثریت کا دل (میں یہاں ذہن کا لفظ استعمال کرنا بہتر سمجھتا ہوں) جواہر لال کے ساتھ ہے مگر اس کی تلواریں ابھی تک یزیدیت کے ساتھ ہیں۔ اس لیے سیکولرزم کو طرزِ زندگی بنانا اور اکثریت اور اقلیت دونوں کے لیے اسے معنی خیز، موثر اور کارکشا اور کارساز قرار دینا ہمارا اولین فریضہ ہے۔

# سیّد ہاشم علی

○ جناب سیّد ہاشم علی (پ ۱۹۲۶ء وفات)

سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے بعد حیدرآباد سول سروس میں رہے پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، آزادی کے بعد کامیاب ترین وائس چانسلروں میں ان کا شمار ہے۔ اب اپریل ۱۹۸۵ء سے علی گڑھ کی سربراہی کر رہے ہیں۔ سیّد حامد کے بعد علی گڑھ کی وائس چانسلری سنبھالنا ایک اور رخ سے اتنا ہی مشکل کام تھا جتنا علی محمد خسرو کے بعد کسی کا جم جانا۔ پہلا ساز بتاتا ہے کہ وہ اس سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ اور سیّد حامد کے ساتھ علی گڑھ کو اس کی تحریک کے ساتھ تعلیمی توازن قائم کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

# کچھ علی گڑھ کے بارے میں

سر سید کے خوابوں کی، میں سمجھتا ہوں، پوری طرح تکمیل نہیں ہوئی۔ جس طرح ان کو سماجی برائیوں سے ٹکر لینے کی عادت تھی، جس طرح ان کی لوگوں نے مخالفت کی اور وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے، اسی دیوا... کی اب بھی ضرورت ہے۔ غیر اہم اور غیر قانونی اختلافات کی پروا کیے بغیر آج ہم سب کو یونیورسٹی کی اور... کی ترقی کے لئے کوشش کرنا ہے۔

ضبط و تنظیم پورے ملک کے لئے ضروری ہے۔ ضبط و نظم کی کمی تمام ہندوستان میں ہے اور... میں بھی ہے۔ اور جب کبھی کوئی اسے شروع کرے گا، ابتدا میں لوگوں کو ناگوار معلوم ہوگا۔ لیکن کسی نہ کسی شخص کو... شروع کرنا ہے۔ میں اپنے پروگرام میں ضبط و نظم کو سب سے پہلے اہمیت دوں گا۔ ہم لوگ آزاد ملک ہو... کے باوجود آج ترقی نہیں کر سکے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ ورنہ جاپان اور مغربی جرمنی وغیرہ... چھوٹے ملک جو جنگ میں تباہ ہو گئے تھے، آج معاشی اور صنعتی حیثیت سے امریکہ سے کسی طرح کم نہیں ہیں... اس لئے ہندوستان کی ترقی کے لئے ضبط و نظم کی سخت ضرورت ہے۔

آندھرا میں ہر روز ہم کو ایسے سیکڑوں فیصلے کرنا ہوتے تھے جس میں ایک پارٹی کا فائدہ ہو... اور دوسری کا نقصان۔ ظاہر ہے پچاس فیصدی لوگ ہمیشہ مخالف رہے۔ کیونکہ ان کے خلاف فیصلہ ہوا۔ کسی بھی... بڑے کام کے ساتھ مخالفت اور نکتہ چینی تو ہوتی ہی ہے۔ اگر ہر بڑے آدمی یا ہر بڑے عہدیدار کو اپنے دفتر... ان لوگوں کی باتیں سننے کا موقع مل جائے جو اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں، تو وہ ایک دن زندہ نہیں... زندگی میں مختلف قسم کے لوگوں کا ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔ پھر جہاں آپ کام کروانا چاہیں گے ظاہر ہے وہ بھی... کی صف میں شامل ہو جائیں گے۔ لہذا مخالفت کی پروا کیے بغیر ہمیں طلبا کے زیادہ سے زیادہ فائدے کے لئے کام کرنا چاہیے۔

ہمیں اپنے ذہن کو مقصد کی تکمیل کے لئے تیار کرنا ہے۔ ہندوستان میں اس کی بہت کمی ہے۔ کتنے ایسے طالب علموں سے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ہیں میں نے پوچھا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ لیکن انہیں اپنی منزل کا علم نہیں ہے۔ میں نے امریکہ میں چھوٹے چھوٹے بچوں سے جو دس سال سے بھی کم عمر کے تھے معلوم کیا کہ تم کیا بننا چاہتے ہو؟ کسی نے کہا ڈاکٹر، کسی نے انجینئر یہاں تک کہ ایک بچے نے کہا کہ میں ٹرک ڈرائیور بننا چاہتا ہوں۔ یعنی ہر شخص کا شروع سے ہی اپنا ایک مقصد ہے۔ اس لئے ہمیں اپنا مقصد شروع ہی سے متعین کرنا چاہیے اور پھر اس کو پانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

○

حالات اتنے مایوس کن نہیں ہیں جتنی کہ مایوس کن خود ہماری اپنی کاہلی ہے۔ ہمیں حالات کے صحیح تجزیہ کی توفیق نہیں۔ ترقی کی راہیں ہمارے لئے وا ہیں، ضرورت ہے سخت محنت اور کوشش کی۔ ہمیں سماج میں ایک مقام بنانے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہیے۔ ہر شخص کو چاہے وہ استاد ہو یا طالب علم اپنے سے بہتر کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ جہاں تک ہماری یونیورسٹی کا معاملہ ہے بہت اچھے اساتذہ ہمارے پاس ہیں۔ قابل عزت لوگ ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس قابل نہیں ہیں کہ استاد کہلائیں۔ بدقسمتی سے یہ عام خیال رہا ہے کہ ان کے ساتھ کچھ کیا نہیں جا سکتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ادارے کے سربراہ کا یہ فرض ہے کہ جہاں اچھے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرے، وہاں ان لوگوں کے ساتھ جو ادارے کے لئے نقصان دہ ہیں ایسا رویہ اختیار کرے جس سے ان کو شرمندگی ہو اور اپنی غلطی کا احساس ہو۔

○

ہمارے تعلیمی مسائل میں عربی مدارس کی اصلاح کا مسئلہ اہم ہے اور معاشرتی مسائل میں عورتوں کے قرآنی حقوق کی بازیافت کا مسئلہ!

مدارس کو یہ بات تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ سائنس کی تعلیم بھی دیں گے۔ سائنس پڑھائے جانے کے لئے جس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا، ہر مضمون کے اعتبار سے سائنس کی اچھی کتابیں موجود تھیں۔ اب NCERT کی کتابیں مختلف مضامین کی مختلف زبانوں میں قومی سطح پر پورے ہندوستان کے طلباء کے لئے چھپ رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتابیں کافی ہیں۔ سب سے پہلے یہی سوال اٹھتا ہے کہ مدارس فیصلہ کریں کہ کیا ان کے لئے سائنس ضروری ہے، اور وہ سائنس کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ بہت سے ایسے اسکول ہیں جنھوں نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ میرے پیشرو نے اس سلسلے میں کچھ کوشش کی تھی اور میں بھی کروں گا۔ میں نے ایسے بہت سے مسلم اداروں کو چار پانچ سو خط لکھے ہیں۔ ان میں جنوبی ہند سے

بڑا اچھا جواب آیا ہے، اور شمالی ہند سے کم۔ تو یہ ایک کوشش ہوگی جو سرسید کے وقت سے چلی ہے اور آیندہ بھی رہے گی۔ کیونکہ توہم پرستی ہمیشہ ہر وقت میں اور ہر مذہب میں رہی ہے، اس کا خاتمہ سب کا فرض ہے۔

عورت کو جتنے حقوق قرآن میں دیئے گئے تھے وہ سب ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مروجہ (اینگلو محمڈن) قانون نے واپس لے لیے ہیں اور قرآن شریف کی رو سے جو حیثیت عورت کو ملنا چاہیے تھی وہ نہیں ملی ہے۔ اس سے زیادہ اگر میں بولوں گا تو ان لوگوں کو اختلاف ہوگا جو یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کے بارے میں صرف وہی لوگ بول سکتے ہیں۔ لیکن مذہب کسی ایک شخص کی جائداد نہیں ہے۔ ہر شخص کو اپنی کتاب اور مذہب کے بارے میں آزادانہ طور سے اظہار خیال کرنے اور رائے قائم کرنے کا پورا حق ہے، اور مجھے اس بات پر قطعی اعتراض نہیں ہوگا اگر یونیورسٹی کے دانشور موجودہ معاملات کے بارے میں اپنی رائے دیں، یا اس کے خلاف آواز اٹھا سکیں۔ یہ اتنا جذباتی معاملہ ہے کہ یہاں پر لوگ یہ سوچنے پر راضی نہیں ہوتے کہ اگر خود اپنی بیٹی کو کوئی شخص چھوڑ دے، یا معلق لٹکا کر رکھے تو برسوں اس کی زندگی تباہ رہے گی۔

قومی سطح پر ایک اہم مسئلہ ہمارا لسانی مسئلہ ہے!!

ایک ہندی چلنے والی تھی جس کو لوگ ہندی کہتے ہیں، اور ہم سب لوگ روزمرہ میں بولتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کو اتنا مشکل بنا دیا گیا کہ جنوبی ہند کے صوبے اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ہندوستان میں ہمیشہ ہندی سے مشتق ایک زبان لنگوا فرانکا رہی ہے۔ اس کا نام، ڈھانچہ اور رسم الخط بدلتا رہا ہے مگر ہندی کا ہندی رہی ہے۔ اردو میں ہندی اور فارسی زبانوں کا ملاپ ہوا، جبکہ دکنی زبان جو اردو کی بہ نسبت اور زیادہ دوسری زبانوں کے اشتراک سے بنی جیسے: تیلگو، مراٹھی، کنڑی، اور فارسی وغیرہ۔ عوام کی زبان ہی عام زبان ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہم نے کوشش نہیں کی۔ ایک بہت اچھی کتاب آندھرا پردیش کے چیف جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے کی آئی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستانی آئین کی دفعہ ۳۵۱ میں آیا ہے کہ ہندی کو فروغ دے کر عوام کی زبان بنایا جائے، لیکن زبان کے فروغ دینے کا کام نہیں کیا گیا؛ ہمیں ہندی کو اس طرح بنانا چاہیے کہ وہ لوگوں میں خود بخود مقبولیت حاصل کر سکے؛ اس کے لیے ہندی والوں نے کوشش نہیں کی اور جو علاقائی ہندی مروج تھی اس کو قابلِ تسلیم بنانے کی کوشش کی گئی۔ ہندی میں اگر الفاظ کم ملتے ہیں تو دوسری زبانوں سے لینا چاہیے۔ جہاں تک ممکن ہے یہ زبان آسان اور عام

تاکہ اس کو ہم اُردو بھی کہہ سکیں اور ہندی بھی۔ جس طرح انگریزوں نے انگریزی کو عوام کی زبان بنانے کے لیے کافی تبدیلیاں کیں اور آسان انگریزی شروع کی، تب ہم ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں کرتے۔ ہندی زبان والے جب اس کو قابلِ قبول بنائیں گے تو یہ سارے ملک کی نیچرل زبان ہو سکے گی۔ ہم کو اپنے لسانی مسائل کے بارے میں عقل کی روشنی میں غور کرنا چاہیے اور خواہ مخواہ کے تعصبات اور جھگڑوں کو چھوڑ دینا چاہیے۔ ہندی سچ مچ ہمارے ملک کی زبان ہے لیکن اُسے تنگ نظری سے دور رہنا چاہیے۔ لوگ ہندی عوام کی زبان ہے جو ہم سب بولتے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جنھیں اُردو نہیں آتی اور بہت سے ایسے ہیں جنھیں ہندی نہیں آتی۔ لیکن بولتے دونوں ایک ہی زبان ہیں۔ یہ تو ریاکاری ہے! اگر یہ ختم کر دیجیے تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

ہر سمجھ دار شخص اس ملی جلی زبان کو پسند کرے گا۔ ہمارا ذہن صاف ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں دو مختلف زبانوں کے اشتراک سے ایک عام زبان بنی ہے۔ جو بھی سرکاری زبان ہوتی ہے وہ عوام کی زبان کو متاثر کرتی ہے۔ اس وقت ہم لوگ پورے ہندوستان میں بغیر انگریزی زبان کے الفاظ شامل کیے اپنی مادری زبان نہیں بول سکتے۔ پانچ چھ برس تک جب فارسی سرکاری زبان رہی تو اس کا اثر بھی پڑا۔ تیلگو میں نو ہزار فارسی الفاظ ہیں تامل میں چار ہزار فارسی الفاظ ہیں اور کنڑ میں پانچ ہزار۔ اسی طرح ہندی میں بھی شامل تھے تو ہر زبان فارسی الفاظ کے ساتھ چل رہی ہے۔ لیکن ہندی کو اس میں کیا اعتراض ہے جو لوگ ہندی کا مروج ہے اس میں ایسا نہیں ہے۔ اگر آپ "بالکل" یا "مطلب" بولتے ہیں تو یہ فارسی لفظ ہے۔ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ ہندی ہندوستان کی عام بول چال کی زبان ہے۔ وہ شمال اور جنوب میں بولی جاتی ہے۔ اسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور اس میں دوسری زبانوں مثلاً فارسی اور عربی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ اور جب فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے تو اُردو ہے۔ اس طرح گاندھی جی دونوں زبانوں کے ملاپ کی کوشش کر رہے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں آزادی کے بعد اور تقسیم ہند کے بعد اُنھوں نے گورنر کے نام ایک خط لکھا کہ تم جو زبان بولو، دونوں رسم الخط میں لکھا کرو۔ اگر ہم لوگ یہ بات اُسی وقت تسلیم کر لیتے کہ ایک ہی زبان دو رسم الخط میں لکھی جائے گی، تو سارا جھگڑا وہیں ختم ہو جاتا، لیکن دونوں طرف سے تعصب اختیار کیا گیا۔

آپس میں میل جول اور اتحاد ہو۔ سوچنے کا انداز فکر پر مبنی ہو اور سائنسی نقطۂ نظر ہو، ان تمام

مقاصد کی نشانات اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے تشہیر ہونا چاہیے۔ کیونکہ نشانات ہندی رسم الخط میں ب
ہمارے ہندی قارئین تک بھی پہنچتا ہے، اس طرح متحد ہو کر ملک کی ترقی کی راہ ہموار کی جاسکے گی
کی ایسی بہت سی تصنیفات ہیں جو تعصبات کو دور کرتی ہیں اور ایسے بہت سے واقعات ہیں جو ایسی
میں خوش گواری پیدا کرتے ہیں۔ انھیں سامنے لانا چاہیے۔ مثلاً ایک جلسے میں جس میں سرسید
تھے۔ ایک صاحب نے کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ جو مسلمان طالب علم بی۔ اے میں اوّل آئے گا، اس کو
انعام دوں گا۔ سرسید اسی وقت کھڑے ہوئے اور انھوں نے اعلان کیا کہ جو ہندو طالب علم اوّل
اس کو میں انعام دوں گا۔ سرسید ایک بہت بڑے سیکولرسٹ تھے، وہ سمجھتے تھے ہم سب میں
میں کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ آج بھی ہمارے بیچ بہت سے لوگ ہیں جو اس بات کو نہیں
کہ ہندوستانیوں کی نجات اسی میں ہے کہ ہم سب آپس میں مل کر رہیں۔

میں تمام وائس چانسلروں کو خطوط بھی تحریر کر رہا ہوں کہ اس دسمبر یا جنوری میں ہر یونیورسٹی سے
طالب علم یہاں آئیں اور ہمارے طالب علموں کے ساتھ رہیں، جس سے ان کو معلوم ہو کہ علیگڑھ کے طلبا
شائستہ اور مہذب ہیں۔ ہمارے طلبا کو سب سے مختلف اور دیگر یونیورسٹی کے طلبا کے لیے مثالی ہونا چاہیے
ہندوستان میں ہماری نوجوان نسل کو تعصب اور نااتفاقی سے دور رہنا ہے، یہ بہت اہم کام ہے۔

# تصحیح اغلاط

فہرست کا صفحہ ا/سطر ۳ پیشکش • صفحہ تین/۶ تہذیبی • چار/۲ تسلسل • چار/۹ دالوں کو کون • پانچ/۱۲ [illegible]تیں • چھ/۵ ہونے کی بھی • ذرا ان کو • سات/۱ تحریک • سات/۷ نے اپنے • آٹھ/۱۱ تربیت • گیارہ/۲۲ ہیں ہم • تیرہ/۱۶ [illegible]یں • چودہ/۲۱ درجہ کے اس • اٹھارہ/۸ حقائق سے آنکھیں چار کرتے ہوئے گزارتا ہے • اٹھارہ/۱۲ باقی ماندہ پندرہ برسوں • [illegible]/۱۶ نجات کی راہ • اٹھارہ/۱۸ زیاں • اٹھارہ/۱۹ تیوہاروں • انیس/۱۵ ماضی سے • انیس/۲۳ ماضی کے • اکیس/۳ پیارا • [illegible]/۵ باپ • بائیس/۷ شکل میں سچائی ہوئی۔

۶/۱ قسم کے ۱۰/۱۸ تعلیم ہوتا ۱۱/۳ جس میں کئی جگہ ۱۹/۲ حب للّٰہ ۲۳/۲ دارالمصنفین ۲۹/۳ بڑے ابجائے بڑے ۲۲/[illegible] محنت کا ۳۱/۲۲ کر سکتا ۳۶/۲۱ بھی ۴۴/۲ اہمیت ۵۸/۱۶ ہتھیار ۵۹/۱۸ انھوں نے صاف ۹۳/۱۳ موجودہ ہندی [illegible]/۱ لفظ ۱۰۵/۱۳ بارھویں بجائے بارھواں ۱۰۶/۹ تاکہ ۱۰۶/۱۳ ہو ۱۵۹/۲۳ ہمارے ۱۶۲/۸ جس کے عہدہ پر ۱۶۵/۵ سب مجھے ۲۳/[illegible] بلکہ ایک دو منٹ پہلے ۱۶۷/۱۳ لاپرواہی ۱۷۵/۱۱ مجھ سے ۱۷۹/۱ بتاؤ ۱۸۲/۱۸ اسکول نے ۱۸۳/۱۲ اگر ٹیکچر بجائے انگچر ۱۹۶/۱۱ ہی ۲۰۳/۱۳ دنیا ۲۱۳/۲ تب ہم ہندی میں ۲۱۳/۵ زبان ۲۱۳/۷ ریاکاری ۲۱۴/۳ اور ایسے۔

۲

# حرفے چند

سید حامد کی جو تحریریں یہاں پیش کی جا رہی ہیں وہ پچھلے اُن پانچ سال میں لکھی گئیں جب وہ علی گڑھ کے قافلے کے سردار تھے۔ اور کیسے پرخار گزرے ہیں یہ پانچ سال! علی گڑھ کی محبت میں سرشاری کے بغیر اس بال سے باریک اور تلوار سے تیز راستے پر سلامتی سے گزر جانا سید حامد کیا کسی کے لیے بھی ممکن نہ ہوتا۔

اصغر (گونڈوی) کی طرح یہ شخص بھی عمر عزیز کے چالیس سال گزارنے کے بعد ایک مدت بعد اس وقت دریافت (DISCOVER) ہوا جب علی گڑھ کا وائس چانسلر ہوا۔ شاید یہ سب کچھ اس نے اسی وقت کے لیے بچا رکھا تھا۔ بنیادی طور سے انتظامیہ کا ایک پرزہ ہونے کے باوجود سب کی آنکھ بچا کے گاہے گاہے ادبی مضامین لکھتے رہتے تھے، لیکن ان میں نہ جذبۂ بے اختیارِ شوق کا پتا چلتا تھا نہ خمارِ چشمِ ساقی کا۔ وہ علی گڑھ کے فرزند ضرور تھے لیکن استیذ الاکبری کی جانشینی کچھ چیز ہی اور تھی:

جانفزا بادہ ہے جس کے ہاتھ میں جام آ گیا۔ سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ایسے ہاتھ میں اب قلم آیا تو وہ قلم ہی دوسرا تھا، ایک خاموش قلبِ ماہیت ہو چکی تھی: اب لگا غبارِ خاطر کے مصنف کے قلم سے وہ نکلتا جو اس مقدس درگاہ کی روح اس سے لکھواتی تھی۔ نتیجہ میں موضوع کوئی بھی ہو، بظاہر کتنا ہی غیر متعلق، لیکن کسی نہ کسی طور علی گڑھ کی فکر اس میں در آتی تھی ع اختر چھپے چھانکے میں فلک سے زمیں کو!

میں نے سید حامد کی کم سے کم چار اردو تقریریں سنی ہیں۔ کہہ سکتا ہوں کہ ذاکر صاحب اور سید ہادی صاحب کی طرح ان کے یہاں بھی تقریر اور تحریر میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس کا کچھ اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں اگر آپ ان کے خدابخش خطبہ کو پورا پڑھ جائیں اور اس کے بعد ہی آپ کو یہ پتا چلے کہ اس کا صرف پہلا صفحہ لکھا ہوا تھا اور دوسرا سراسر زبانی!

جامعہ ملیہ میں خدابخش دانشوری سمینار کے مندوبین کے لیے استقبالیہ دیا جا رہا تھا۔ رسمی موقع تھا، رسمی تقریریں ہوتی رہیں۔ سید حامد نے بھی مختصر تقریر کی لیکن اختصار کے باوجود کیفیت اور کمیت میں

کوئی کمی نہ تھی۔ رسمیات سے نبٹتے نبٹتے کہہ گئے، "تقریری" الفاظ میں ایک اچھی تحریر کی پوری دلآویزی موجود تھی:

"اپنے اکابر کو خراج تحسین ادا کر کے ہم الفاظ کو اعمال کا بدل سمجھ بیٹھے ہیں"۔ "کہیں ہم قصۂ پارینہ کو تقویم پارینہ تو نہیں بنا رہے ہیں!" "ہم اپنے ماضی پر نازاں ہیں تو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہم اس سے کتنا انحراف کرتے جا رہے ہیں"۔ اور — "یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ کیا اس ایثار کا کوئی رشتہ بھی باقی ہے جس پر اس ادارہ کی بنیاد تھی!"

انگریزی اور فارسی ادبیات میں اعلیٰ اسناد کے حصول کے ساتھ ان دونوں زبانوں کے بہترین ذخیروں سے آشنائی نے انہیں ان دونوں کی جینئس سے قریب تر کر دیا۔ انگریزی نے بنیادی طور سے ان کا اسلوب متعین کیا اتنا کہ فارسی نے دلکش خوبصورت تراکیب تراشنے کی "اقدامیت" (سید حامد کی ایک خوبصورت ترکیب) بھی انگریزی ہی نے دی۔

اسلوب نگارش میں ان کا اصل انسپریشن رشید صاحب ہیں جو یوں بھی نہیں چھپتے —— مگر اب تو ڈاکٹر اصغر عباس کی مرتبہ "رشید احمد صدیقی افکار و آثار" میں شامل خوبصورت مضمون میں سید حامد اقبالی جرم کے طور سے سامنے آ گئے ہیں۔

تاہم یہ سب تو اسلوب کے محض تانے بانے ہوتے ہیں۔ اس میں اصل جان آتی ہے، جاندار مقصد سے "اگر کوئی ایسا کام جسے زندگی کا مقصد بنا لیا گیا ہو اور جو ذاتی حوادث کے لیے سپر کا کام دے جس کے آگے ذات اور سانحات اور واردات کی حیثیت جزئی فروعی اور ثانوی ہو کر رہ جائے" (سید حامد)

اسلوب خلا میں پرورش نہیں پاتا۔ یہ دراصل فکر ہے جسے اسلوب کی تشکیل میں سب سے زیادہ دخل رہتا ہے۔ فکر جتنی اُتھلی یا گہری ہوگی اسلوب میں اسی نسبت سے اتھلا پن یا گہرائی ہوگی۔ بسا اوقات کسی صاحب تحریر پر بھی صاحب طرز ہونے کا گمان گزرتا ہے لیکن رفتہ رفتہ پتا چلتا ہے کہ یہ تو کاغذ کے پھول تھے! وجہ یہی رہتی ہے کہ وہ بے چارہ صرف الفاظ اور تراکیب سے اپنی دوکان سجائے بیٹھا ہوتا ہے، اندرونی جان کچھ بھی نہیں ہوتی۔ سید حامد کے یہاں ایک جاندار مقصد بھی واضح طور سے موجود ہے اور اس کے حصول کے لیے فکری گہرائی بھی۔ اس سے ان کے اسلوب میں اندرونی جان بھی آئی دلآویزی بھی۔ اس لیے سید حامد کے اسلوب میں کہیں آپ کو پُرفریب انداز تحریر نہیں ملے گا۔ لفظ تراشی، ترکیب تراشی اور

لفظیاتی آہنگ کی شعوری کوشش کے باوجود نہ کہیں تصنع ہے نہ فضول گوئی۔ جتنی بات کہنی ہو اس کیلئے جتنے کم سے کم الفاظ درکار ہوں اتنے ہی لفظوں کا استعمال، یہ انشاپردازی میں خصوصاً آج کی صنفِ سخن میں آسان نہیں جسے سید حامد نے اپنایا، یعنی ایسّے۔ کلاسیکی توا کثر و بیشتر ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھیں والا سلسلہ ایسّے کی روایت سے جڑتا چلا جارہا ہے۔ سید حامد کو انگریزی نے اس فضول گوئی سے بھی باز رکھا۔

سید حامد کی فکر کے کچھ مرکزی نکتے ذیل کے چند جملوں میں ملیں گے:

— تعلیمی صورت حال یہ ہے کہ ایک طبقہ دینی تعلیم حاصل کرتا ہے دوسرا جدید انگریزی تعلیم: اس طرح ملت دو نیم ہوکر رہ گئی ہے۔ یہ ہم آہنگی یا توازن اور اتحاد سے اس وقت تک محروم رہے گی جب تک کہ دینی اور دنیاوی تعلیم پانے والوں کے درمیان فاصلہ باقی رہتا ہے۔

— گذشتہ سو سال میں ہم نے جدید تعلیم صرف حصولِ معاش کے لیے حاصل کی ہے جدید علوم سے استفادہ کے لیے نہیں۔ اسی بنا پر ہم میں ذہنی غلامی بدستور ہے اور اس تصور سے نکلنا ہمارے لیے دشوار ہوگیا ہے۔ یہی ہماری ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

— کسی اقلیت کی بقا کے لیے تین تدابیر ہیں:۔

(۱) وہ اپنے مذہب اور تمدن پر مضبوطی سے قائم رہے (۲) ان تھک ریاضت کرکے اپنے آپ کو اکثریت سے بہتر ثابت کرے۔ (۳) اکثریت اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ اپنے تعلقات خوشگوار رکھے۔

— کاش مسلمان برادرانِ وطن کا دل جیتنے کی کوشش کرتے! لیکن یہ ذمہ داری صرف مسلمانوں پر نہیں بلکہ برادرانِ وطن پر بھی اسی طرح عائد ہوتی ہے! اکثریت پر کچھ اور زیادہ!!

اور ان کے اسلوب کی دلآویزی اور دلنشینی اِدھر اُدھر سے لیے گئے ان چند جملوں میں اوپر مذکور شدہ خصوصیات کے ساتھ کافی حد تک مل سکے گی:

— اردو نثر سے منوانا اس کا استدلال "توانا اعتماد" ہی نشین عبارت کا جواب نہیں ہے، پڑا ہے جو سر سید کے قلم سے گزشتہ صدی میں ٹپکی تھی:

— "وہ مسلمانوں کی نیندیں اچاٹ دیتا۔"

— "علی گڑھ تحریک اعتماد کی بازیابی کی تحریک تھی"۔

— "انگریزی تعلیم کی مخالفت میں بالآخر دراڑ پڑ گئی۔"

— "جسے عہد آفریں ہونا تھا وہ عہد شکن ثابت ہوئی۔"

— "خدا ہمیں اس افلاس سے بچائے جو زر نہ ہونے کا دوسرا نام ہے اور اس افلاس و محرومی سے بھی جو زر کے سائے میں شروع ہو۔"

اردو ادب بالعموم جس بے دانشی سے دوچار ہے اس کے مظاہر سب سے زیادہ واضح طور سے ایسے کی صنف میں نظر آسکتے ہیں۔ اچھے اچھے لکھنے والوں کے نقاب یہاں آکے اتر جاتے ہیں جب کہنے کے لیے کچھ نہ ہو، (کیوں کہ جینے کے لیے یا مرمٹنے کے لیے پاس کچھ بھی نہیں!) تو عبارت آرائی یا طرز انشا پردازی کے سوا لکھنے والا اور کرے گا بھی کیا۔ پہلے، اسی لیے 'ایسے' کے بجائے اسے سیدھے سادے انشا پردازی کہا جاتا تھا۔ غزل کی طرح ایسے بھی نثر نویس کی کسوٹی ہے جہاں کھرے کھوٹے کی پہچان بڑی سہولت سے ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ہوشیار نثر نگار تحقیق یا تنقید کا میدان اپنانے کے بعد ادھر کا رخ نہیں کیا کرتے۔ سید حامد نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ادبی تنقید کا میدان ترک کر کے ایسے نگاری کی طرف عنانِ قلم موڑ دی، جس سے سچ تو یہ ہے کہ ایسے کو ہمارے عہد میں اس کا وہ صحیح استعمال بھی ملا جس کا یہ صنف کبھی مدت سے مطالبہ کرتی رہی تھی — اور رتبہ بھی مل گیا کہ ع جو زمیں تھی گئی تا آسمان لیتا گیا۔

ایسے کے اس خوبصورت اور کارآمد استعمال سے ایک طرف اس کی زبونی ختم ہوئی، دوسری طرف ایسے محض مزاح، طنز، ظرافت یا پھکڑ کے ہم معنی لیے جانے سے بھی بچ گیا — کہ اس طرف کسی نہ کسی سبب ایسے سے طنز و مزاح کو ملتبس کیا جانے لگا تھا جو دو مختلف چیزیں ہیں۔ اگرچہ ایسے میں طنز بھی ہو سکتا ہے مزاح بھی! مگر ضروری نہیں کہ ایک طنزیہ یا ایک مزاحیہ ایسے کہلایا جانے کا مستحق ٹھہرے۔

سید حامد کے مضامین پڑھ کے مجھے امید ہے، آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ اردو میں ایک اچھے صاحبِ طرز نثر نگار کا اضافہ ہو چکا ہے۔

— عابد رضا بیدار

# علی گڑھ تحریک

ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کی صدارتی تقریر

”

○

سر سید احمد خاں اور علی گڑھ یونیورسٹی کے اوپر جتنا عبور حامد صاحب کو ہے، جتنا یہ جانتے ہیں اور جس طرح عملی طور پر انھوں نے اس کو سنبھالا اور سمجھایا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان سے زیادہ کوئی موزوں آدمی نہیں تھا جو اس سبجکٹ پر خدا بخش لکچر دیتا۔

میں حامد صاحب کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ ان کے جذبات اور ان کے کام کرنے کا وہی طریقہ ہے جو سر سید احمد خاں کا تھا۔ جب یہ منسٹری میں ایڈیشنل سکریٹری تھے، اس زمانے میں ہی انھوں نے ایک پبلک اسکول "کریسنٹ اسکول" قائم کیا اور ان ہی کی کوششوں کی وجہ سے وہ آج ایک اچھا پراسپرس (PROSPEROUS) اسکول ہے اور ترقی کر رہا ہے۔ علاوہ اپنی آفیشیل ذمہ داریوں کے، وہ تعلیم کے، کلچر کے، لٹریچر کے، اور سیرت کے جلسوں میں برابر حصہ لیتے تھے۔ دہلی میں سب سے ایکٹیو مسلمانوں میں جو شخصیت تھی وہ حامد صاحب کی تھی۔ ان کے دہلی سے آجانے سے دہلی کی زندگی میں کافی کمی پیدا ہوئی ہے جو ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔

وہ اسٹاف سروس کمیشن کے صدر تھے اور اس کے بعد پلان کے مطابق ان کو یو پی ایس سی (U.P.S.C) میں آنا چاہیئے تھا اور اس کے بہت چانسز (CHANCES) تھے، چند مہینے کے بعد آجاتے۔ لیکن اس کے باوجود جب ان سے علی گڑھ کی وائس چانسلری کے لئے لوگوں نے درخواست کی تو انھوں نے اسٹاف سروس کمیشن سے ریزائن (RESIGN) کردیا؛ اور ان کو جو دوسرے مواقع تھے، ان کو چھوڑ کر کے علی گڑھ کی وائس چانسلری ایکسپٹ (ACCEPT) کرلی: ایسے وقت جب علی گڑھ بہت ہی مشکل حالات سے گزر رہا تھا؛ وہاں پر جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی، امتحانوں میں، ایڈمیشن (ADMISSIONS) میں

اور پڑھائی کے کاموں میں جو بدنامی ہو رہی تھی، مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے بہت بہادری اور کوشش کے ساتھ حالات پر قابو پایا اور آج علیگڑھ کو پھر انھوں نے اس لایق کر دیا ہے کہ وہ اچھی یونیورسٹیوں کی طرح چل سکے۔ جب ایسے کام کیے جاتے ہیں تو اس میں مشکلات بھی پیش آتی ہیں۔ ان سب مشکلات کو انھوں نے بڑی بہادری اور ہمت کے ساتھ جھیلا، مقابلہ کیا۔ جبھی وہ اس منزل پر پہنچ سکے! ہم کو خوشی ہے کہ ان کی قیادت میں یونیورسٹی صحیح طریقہ پہ چل رہی ہے اور ہماری دعا ہے کہ اور ترقی کرے۔

دوسری چیز جو بہت کم لوگوں نے کی ہے وہ یہ کہ علیگڑھ سے ان کی وابستگی محض وائس چانسلر کی حیثیت سے ایک ٹرم (TERM) کے لئے نہیں ہے جس جذبہ کے ماتحت انھوں نے اپنی نوکری چھوڑی اور اس کو قبول کیا، وہ علی گڑھ موومنٹ اور مسلمانوں کے پرابلم تھے جن کے پیش نظر انھوں نے اس کو قبول کیا۔ تو وہ نہ صرف علیگڑھ یونیورسٹی کو چلا رہے ہیں یعنی اس کے انتظامی حالات کی درستی اور اس کو صحیح تعلیمی طریقے سے چلانا بلکہ انھوں نے اس چیلنج کو بھی قبول کیا: علیگڑھ موومنٹ کو موجودہ حالات میں چلانے کا چیلنج۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ سرسید نے خاص حالات میں جب علیگڑھ یونیورسٹی شروع کی، تو اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں اس بات کا احساس پیدا کیا جائے کہ وہ بجائے آئی سولیشن (ISOLATION) کے نئے حالات میں، نئی زندگی میں، اپنا رول، اپنا کردار ادا کریں اور جو حصہ ہونا چاہیے وہ پورا پورا حصہ لیں، سامنے آئیں اور جو سیاست کی اور حکومت کی منجدھار ہے، اس میں پوری طرح سے شریک ہوں۔ یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اسی جذبہ کے تحت حامد صاحب نے علیگڑھ یونیورسٹی کو چلایا اور علیگڑھ موومنٹ کے لئے وہ جگہ جگہ گئے۔ لوگوں سے بات چیت کی۔ 'تہذیب الاخلاق' شروع کیا، تہذیب الاخلاق سے بہت پہلے وہ یونیورسٹی گزٹ میں بھی لکھتے رہے اور توجہ دلاتے رہے۔

مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے یہاں آکر علی گڑھ موومنٹ کے مقاصد کو سمجھایا اور انھوں نے خاص طور پر اس بات کو سمجھایا کہ علی گڑھ موومنٹ ایک میسیج (MESSAGE) تھا، چند اصول تھے جن کی بنا پر سرسید نے یہ ادارہ شروع کیا تھا کہ: مسلمانوں کو بلکہ ہر قوم کو، ہر شخص کو، زمانے کے حالات کے مطابق ایڈجسٹ (ADJUST) کرنا چاہیے، ان کے مطابق چلنا چاہیے

چار

اور اپنے لئے ایک جگہ بنانی چاہیئے کہ وہ قابلِ عزت زندگی بسر کر سکے۔ اور یہ امر جس کے لئے انھوں نے کام کیا تھا یہ آج بھی اتنا ہی صادق آتا ہے اور اتنا ہی ویلڈ (VALID) ہے جتنا پہلے تھا۔ جب حامد صاحب سر سید کے اقتباسات پڑھ رہے تھے تو لگ رہا تھا سر سید کے عہد پر نہیں، یہ سب تو آج کے حالات پر ہے! یہ اس لئے کہ وہ کچھ اصول تھے اور اصول ہر زمانے اور ہر وقت کے لئے ویلڈ (VALID) ہوتے ہیں، کسی ایک سچوئیشن (SITUATION) کے لئے نہیں ہوا ہوتے۔

پہلے وائس چانسلر والے علی گڑھ یونیورسٹی کو تو چلایا، مگر میں سمجھتا ہوں، ذاکر صاحب کے علاوہ کسی نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ سر سید کی جو مومنٹ تھی، اس کو سمجھ کر کے اس مومنٹ کو بھی چلایا جائے، اس کا احیا کیا جائے اور نئے حالات کے مطابق اس کو پیش کیا جائے۔ ہم کو خوشی ہے کہ حامد صاحب نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ سر سید کی علیگڑھ مومنٹ کی ذمہ داری بھی سنبھالی ہے، اور اس طرح سنبھالی ہے جو اس کا حق تھا۔ اور یہ بہت بڑا کام ہے۔

میری دعا ہے کہ وہ علیگڑھ یونیورسٹی کو چلانے میں اور ان خیالات کو اور ان باتوں کو جو انھوں نے کہیں، لوگوں کو سمجھانے میں اور توجہ دلانے میں کامیاب ہوں۔ ان کی کامیابی محض ان کی کامیابی نہیں ہوگی، بلکہ سب مسلمانوں کے لئے، اور میں سمجھتا ہوں، ملک کے لئے کامیابی ہوگی۔ اس لئے کہ مسلمان ملک کا ایک اہم حصّہ ہیں۔ اگر وہ اس کی زندگی میں پورا حصّہ لیں اور کامیابی کے ساتھ اس میں کنٹری بیوٹ (CONTRIBUTE) کریں تو یہ ملک کے لئے بہتر ہوگا، مفید ہوگا!۔

(سید حامد، وائس چانسلر علی گڑھ کے "خدا بخش خطبہ" کے موقع پر صدارتی تقریر، ۲۶ فروری ۱۹۸۳)

# فہرست مضامین

## حصۂ انگریزی :

سیّد حامد

**جناب سیّد حامد :** پیدائش ۲۸ مارچ ۱۹۲۰ء (مرادآباد)، ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس میں گریجویشن، پھر یہیں سے ۱۹۴۱ء میں انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کیا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ آنے پر یونیورسٹی سے "مزمل اللہ" گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۴۷ء میں فارسی ادب میں بھی ایم اے کیا۔ ۱۹۴۳ء میں اسٹیٹ سول سروس کے لئے اور پھر ۱۹۵۱ء میں انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس (آئی۔اے۔ایس) کے لئے منتخب ہوئے۔ وزارت تجارت (خارجہ) کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے آپنے ہندوستان کے چوتھے پنجسالہ منصوبے کی تشکیل میں ہاتھ بٹایا اور بہت سے تجارتی معاہدے بھی آپ کی زیر نگرانی ہوئے۔ علی گڑھ کی وائس چانسلرشپ سنبھالنے سے قبل آپ اسٹاف سلیکشن کمیشن کے چیرمین رہے۔ بلگریڈ میں ۱۹۸۰ء میں منعقدہ یونیسکو کانفرنس میں آپنے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ جامعہ ازہر، قاہرہ کی ہزارویں سالگرہ کے موقع پر ہندوستان کی نمائندگی کی۔ ۱۹۸۲ء میں برطانیہ اور امریکا میں آپنے لکچر بھی دیئے تھے۔

آپ مارچ ۱۹۸۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اور فروری ۱۹۸۲ء میں علی گڑھ کے ادارہ کو علی گڑھ تحریک کا پرانا مشن یاد دلانے کے لئے سرسیّد کے انداز پر سرسیّد کے "تہذیب الاخلاق" کا اجرا کیا جو اب تک جاری ہے۔

●●

خدا بخش خطبہ

# علی گڑھ تحریک

سید حامد

وائس چانسلر

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

لائبریری میں

خدابخش خطبات کا ایک سلسلہ جاری ہے

قبلاً

- ڈاکٹر زبیر صدیقی
- جناب قاضی عبدالودود
- پروفیسر کلیم الدین احمد
- ڈاکٹر ہاشم امیر علی
- پروفیسر وحیدالدین
- پروفیسر محمد شفیع اگوانی
- پروفیسر آصف فیضی
- پروفیسر حسن عسکری
- جناب بدرالدین طیب جی
- پروفیسر عبدالسلام خاں
- پروفیسر مقبول احمد
- ڈاکٹر نذیر احمد وغیرہ

یہ خطبات دے چکے ہیں

۷ فروری کو جناب سید حامد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ۱۹۸۳-۸۴ء کا خدابخش خطبہ دیا۔

"زمانہ بہتوں کو رو چکا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا، لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے، نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔"

یہ سطور سرسید نے مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھی تھیں۔ یہ سطور ایک طرف ان کی فراخدلی کی دلیل ہیں، تو دوسری طرف خود ان کی ذات پر کہی گئی زور کے ساتھ عائد ہوتی ہیں۔ سرسید نے علیگڑھ تحریک کی بنا ڈالی اور اس کو پروان بھی چڑھایا۔ انھوں نے یہ کمال کر دکھایا کہ ستم رسیدہ، کچلے ہوئے اور ہمت باختہ ہندوستانی مسلمانوں کو نہ صرف اعتماد اور عزتِ نفس سے ہمکنار کر دیا، بلکہ ان ظالم انگریز حکمرانوں سے جنھوں نے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے تھے، ہندوستانی مسلمانوں کے تعلقات کو شگفتگی کی سطح تک پہنچا دیا۔ وہ ایسا نہ کرتے تو ایک عرصے تک مسلمان کڑھتے رہتے، سلگتے رہتے اور اجتماعی زندگی کی لہر سے دور تر ہوتے چلے جاتے!

سرسید کی پذیرائی تنگ نظروں نے کفر کے الزام سے کی۔ انھیں انگریزی حکومت کا زر خرید غلام کہا گیا۔ ان فتووں میں جو ان کے خلاف ہندوستان اور حجاز سے حاصل کئے گئے، سرسید کو ابلیس کا خلیفہ بنایا گیا، جس کے ملحدانہ عقائد یہودیوں اور عیسائیوں کے عقائد سے بدتر ہیں۔ جب وہ انگلستان گئے تو یہ افواہ پھیلائی گئی کہ وہ بپتسمہ کے لئے گئے ہیں یعنی عیسائی بن کر واپس آئیں گے۔ ہمارے سب سے بڑے مزاح نگار شاعر نے تو ان پر پھبتیاں کسیں۔

اس محفل میں جو حضرات کھیلوں کے آداب اور ہنر سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ بہت سے کھیلوں میں کھلاڑی کا کمال اور نسخۂ تسخیر یہ ہوتا ہے کہ فریق مخالف نے جو طاقت صرف کی ہے اسے اپنے کام میں لایا جائے، اپنی جیت کے لئے معاون بنایا جائے۔ کرکٹ میں بہت تیز پھینکی ہوئی گیند کو بلّے کے ہلکے سے اشارے سے باؤنڈری میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ علیگڑھ تحریک کی شدید مخالفت بھی کچھ اسی طرح کے برگ و بار لائی۔ لیکن یہاں ہلکے سے اشارے سے کام نہیں چلا۔ اس تحریک کو پھیلانے کے لئے جو پاپڑ سرسید اور ان کے رفقا نے بیلے، جو مصیبتیں جھیلیں، جن مخالفتوں اور بیہودیوں اور الزام تراشیوں کا مقابلہ کیا، اس کا وہ لوگ اندازہ نہیں لگا سکتے جو سرسید کی ملک گیر تحریک سے کئی پیڑھیاں گزرنے کے بعد فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جس طرح ہم اس ہوا کے احسان مند نظر نہیں

آتے جو سائنس کے رُوپ میں ہمیں زندہ رکھتی ہے، اُسی طرح علم وعقل کی اُس فضا کے لئے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں سرسید کی طرف جنھوں نے اس فضا کو تشکیل دی، پُرسپاس نگاہوں سے مُڑ کر نہیں دیکھتے۔

علیگڑھ تحریک اعتماد کی بازیابی کی تحریک تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ ہندوستانی مسلمان مٹی کے ڈھلے کی طرح زمین کے سینہ پر بوجھ بننے کے بجائے باخبر اور حوصلہ مند شہری بنیں۔ زمانہ سے خائف اور نفور ہونے کے بجائے وہ زمانہ سے عقلمندانہ ہم آہنگ ہوں۔ اپنے درخشاں ماضی پر وہ فخر ضرور کریں لیکن اس فخر کو حرکت کا ذریعہ بنائیں، نیند لانیوالی دوا نہیں اور ہمت اور اتحاد کے ساتھ وہ کام کریں جس سے حال سنور جائے اور مستقبل نکھر جائے۔ وہ خول میں سمٹنے کی جگہ ساری دنیا کو ذہن و نظر کی جولانگاہ بنالیں۔ خُذ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدِر کے تحت اپنے زمانے اور عصروں سے اچھی باتیں سیکھیں، اور علوم نے جو ترقی کی ہے اُسے جذب کریں۔ زمانہ کے ہمقدم ہوں، اس کی گرد راہ نہ بنیں۔ اپنے مذہب کو ان ساری ملاوٹوں، واہموں اور جہالتوں سے پاک کریں جنھیں گردش ایام نے اس میں شامل کر دیا ہے۔ مذہب کو علم اور عقل کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں، اسلام اور جدید علوم میں کوئی تضاد نہیں ہے روزمرہ کی زندگی میں شائستگی، خوش اطواری، استدلال اور افہام و تفہیم کی روش اختیار کریں۔ باتوں اور عقیدوں کو عقل کی کسوٹی پر کسیں، علم کی روشنی میں پرکھیں۔ قوم اور وطن کی محبت کو جزوِ ایمان جانیں۔ حالی نے سرسید کے مسلک کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی زندگی اور آثار بیرونی اور غیر مسلم حکومت کے تحت زندگی گزارنے کے آداب سکھاتے ہیں۔ چونکہ مسلمان اپنے بازوؤں کی طاقت سے اب ہندوستان پر حکومت نہیں کر رہے ہیں، اس لئے انھیں چاہیے کہ اپنے حکمرانوں اور اپنے اہل وطن کے دل جیت لیں، کہ اب عزت اور احترام حاصل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے۔ کاش کہ بدلے ہوئے زمانہ میں ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنے اہل وطن کا دل جیتنے کی کوشش کرتے، لیکن یہ ذمہ داری صرف مسلمانوں پر ہی نہیں، بلکہ برادران وطن پر بھی اسی طرح عاید ہوتی ہے! اکثریت پر کچھ اور زیادہ!!

بدقسمتی سے ایسے حادثے ہوتے رہے ہیں جو تعلقات کی خوشگواری میں سدِّ راہ ہوتے ہیں۔ حکومت اور اکثریت دونوں کا فرض ہے کہ ایسا نہ ہونے دیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں سے یہ احساس نکالنا ہوگا کہ وہ مظلوم اور محروم ہیں اور ملک کی ترقی پر جو وسائل صرف ہوتے ہیں اور یہ وسائل خوش حالی کے جو برگ و بار لاتے ہیں ان دونوں میں اُن کا حصہ برائے نام ہے۔ اگر علیگڑھ تحریک کا بانی اس وقت زندہ ہوتا تو اپنے وطنی اور دینی بھائیوں کی محرومی پر وہ کڑھتا، نہ فریاد کرتا، نہ بدگمانی کو ہوا دیتا۔ وہ ہندوؤں سے کہتا کہ بھائی آگے بڑھنے کے لئے

جتن کرنے پڑتے ہیں، پیچھے کھینچنا سہل ہے۔ ہمارا قافلہ آگے جب ہی بڑھ سکتا ہے جب سب قافلے والے قدم ملا کر چلیں۔ اگر ہر سات آدمیوں میں سے کوئی ایک آگے بڑھنے سے جی چرائے گا، یا آگے بڑھنے ہی نہ پائیگا بلکہ پیچھے کی طرف جائے گا، تو قافلے کی رفتار لامحالہ سست ہو جائے گی۔ اگر اُس ایک آدمی کے دل میں یہ خوف کروٹیں لیتا رہا کہ جان و مال کا جوکھم ہے، یا یہ احساس کھٹک پیدا کرتا رہا کہ ملک کے انتظام اور اس کی خوشحالی میں ہمیں اپنا حق نہیں مل رہا ہے، تو وہ کیونکر وطن کو خوش حال اور ترقی یافتہ بنانے میں ولولے اور اُمنگ کے ساتھ شریک ہو سکے گا: افسردگی اور محرومی کے احساس کو ملک کے ساتھ بے وفائی سے تعبیر کرنا بے دردی ہے۔ دوسری طرف، وہ مسلمانوں کو سمجھاتا کہ کوتاہ دستی میں محرومی ہے۔ خود کو مستحق بناؤ اور ہاتھ بڑھا کر اپنا حق لو۔ وطن عزیز کی ترقی اور خوش حالی کے لئے تن من دھن لگا دو۔ وطن کسی ایک فرقہ کی جاگیر نہیں ہے، اس پر تمہارا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسرے فرقہ کا۔ جمہوریت کی صحت اور سلامتی کی بنیادی علامت یہ ہے کہ اقلیتیں محفوظ اور بہرہ یاب رہیں۔ وہ مسلمانوں کی نیندیں اُچاٹ دیتا، تاوقتیکہ وہ اپنی علمی اور معاشی اور اقتصادی بدحالی اور پسماندگی کو دُور نہ کر دیتے۔

علیگڑھ تحریک، باوجود شدید مخالفت کے، روزِ روشن کی طرح ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ اس نے اعتماد کے علاوہ مسلمانوں میں قومیت کے احساس اور آگے بڑھنے کے ولولے کو جنم دیا۔ مسلمان جدید تعلیم سے بہرہ ور ہونے لگے۔ سر سید کا آوازۂ تجدید، تقلید فرنگی کا بہانہ نہیں تھا۔ فرنگیوں سے مرعوب ہونے کے باوجود سر سید ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے سانچے میں ڈھالنے پر راضی نہیں تھے۔ ہندوستان کے کسی مسلمان خاندان کو ٹٹولئے، چار پیڑھیوں میں سے کسی ایک کا ناتا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یا علیگڑھ تحریک سے جڑا ہوا ملے گا۔ یہی نہیں، دنیا میں کہیں جائیے، آپ کو ایسے لوگ ضرور مل جائیں گے جو علم کے اس سرچشمے سے اپنی پیاس بجھا چکے ہیں، بلکہ اپنی پیاس بڑھا چکے ہیں۔

گزشتہ تقریباً ڈیڑھ سو سال میں ہندوستانی مسلمانوں میں بڑے نوابغ روزگار پیدا ہوئے۔ خود بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں مسلمان قائدین کے پرے کے پرے نظر آتے ہیں، ایسے لوگ بھی جن کی آواز پر سارے ہندوستانی مسلمان لبیک کہکر نکل آئے۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی علیگڑھ تحریک کے بانی کی گرد کو نہیں پہنچا۔ زمانہ گزرتا جا رہا ہے، ان کے قد گھٹ رہے ہیں، سر سید کا قد بڑھ رہا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا۔ یہ وجہ ڈھونڈنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ علیگڑھ تحریک کی کامیابی کے راز کا سرا ابھی یہیں سے ملے گا۔ سید والا گہر کی پہلی خصوصیت جس میں کوئی مسلمان رہنما ان کا شریک نہیں تھا، ان کی حکمت عملی ہے۔ ان میں بیک وقت خواب دیکھنے اور خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی وہ صلاحیت موجود تھی جو شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ ایسے رہنما قوموں اور

ملتوں کی تقدیر بدل دیا کرتے ہیں۔ سرسید ہر چند کہ زاویۂ نگاہ اور افتادِ طبع میں مسلمانانِ ہند کے نمائندہ نہ تھے" تاہم ان کا ہاتھ مسلمانوں کی نبض پر تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان ان کا ساتھ بدقت کہاں تک دے سکتے ہیں اور کون سی حد ایسی ہے جس کے آگے اگر قدم رکھا تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے تعلیمِ نسواں پر زور نہیں دیا۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے لوگ لڑکوں کی جدید تعلیم کے خوگر ہو جائیں، پھر کہیں لڑکیوں کی تعلیم کا قصہ چھیڑا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بعد میں جہاں تک شمالی ہندوستان کا تعلق ہے ان کے ایک شاگرد شیخ عبداللہ نے علیگڑھ میں اور دوسرے شاگرد کرامت حسین نے لکھنؤ میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے باوجود مخالفت کے، اسکول کھولے جو اب ڈگری کالج ہیں۔

اصولوں پر قائم رہتے ہوئے ان کی مصلحت اندیشی یا حکمتِ عملی کی ایک دوسری مثال کچھ اس طرح ہے: سرسید نے "تہذیب الاخلاق" کو اپنے اصلاحی مقاصد کا ترجمان بنایا تھا۔ یہ رسالہ تین قسطوں میں کوئی بارہ سال چلا۔ لیکن جب کچھ ان بااثر اور اہلِ زر حضرات نے جن سے سید عالی مقام ایم اے او کالج کے لیے امداد کے طالب تھے، اس رجحان پر احتجاج کیا جو ان کے دین سے متعلق مضامین سے جھلک رہا تھا، تو انھوں نے ایسے موقع معاونین کی تالیفِ قلب کی خاطر اپنے اس لختِ جگر کو دفن کرنا قبول کر لیا۔ انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ علیگڑھ تحریک میں ایم اے او کالج کی اہمیت مرکزی ہے۔ ایک دفعہ یہ کالج، جسے بالآخر یونیورسٹی بننا ہے، قائم ہو گیا تو پھر خود ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے جو اس تحریک کو فروغ دیں گے۔

یہاں یہ کہہ دینا شاید بے محل نہ ہو کہ سرسید کے اصلاحی اور تعلیمی مقصد کو لے کر "تہذیب الاخلاق" کا احیا اس دور میں کیا گیا ہے۔ دو سال سے یہ رسالہ اپنے معیار اور مقصد کو برقرار رکھتے ہوئے نکل رہا ہے جیسا کہ میں آگے چل کر کہوں گا، ہمیں پھر علیگڑھ تحریک کی ضرورت ہے اور یہ رسالہ جو اس تحریک کا ترجمان ہے مسلمانانِ ہند کے التفات کا طالب اور حقدار ہے۔

'تہذیب الاخلاق' کا تذکرہ ہمیں علی گڑھ تحریک کے ایک اہم وصف اور اس کی حیرت انگیز کامیابی کے ایک بڑے سبب کی طرف لے جاتا ہے۔ سید علیہ الرحمۃ نے مسلمانوں کے مزاج کو بدلنے کی جو کوشش کی اس کی ایک شکل زبان اور ادب کے مزاج کو بدلنے میں مضمر تھی۔ اردو زبان خصوصاً اردو نثر کو سرسید نے تصنعات اور دم گھونٹنے والی بندشوں سے چھڑا کر مقصدیت، معنویت، سادگی، روانی، توانائی اور صحت سے لبریز کر دیا۔ اپنے مضمون "ہمارا علمِ ادب" میں سرسید نے ایک حوالے سے لکھا تھا "ہمارا علمِ ادب جس میں فقرہ بندی اور قافیہ گوئی

بر کمال ہمت مصروف رہتی ہے، اس قسم کی صاف و سیدھی تحریر کے سامنے کیسا بھونڈا خراب معلوم ہوتا ہے؛ اور جو تفاوت آورد اور آمد میں ہے، وہ بخوبی دکھائی دیتا ہے۔ قافیہ بندی کی عبارت ایک آورد ہوتی ہے، جیسے کوئی ایک بھاری لٹھ کو رسی باندھ کے زور سے کھینچے لیے جاتا ہو۔ صاف و شستہ عبارت ایک آمد ہوتی ہے جیسے نہایت شفاف پانی بہتا چلا جاتا ہو۔" اور جس شخص کو ایک پسماندہ قوم کو تیزی کے ساتھ آگے بڑھانا ہو وہ اس رفتار پر کیسے قناعت کر سکتا جو رسی میں بندھے ہوئے بھاری لٹھ کو نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ سرسید اردو زبان کی ادا اور تاثیر اور استدلال کی بیکراں مخفی صلاحیتوں کو خلاقانہ ڈھنگ سے بروے کار لے آئے۔ غیر معمولی ترقی کے باوجود اردو نثر سے ہنوز اس پُر استدلال توانا اور ذہن نشین عبارت کا جواب نہیں بن پڑا جو سید کے قلم سے گزشتہ صدی میں ٹپکی تھی۔

نثر کی داستان آپ نے سن لی۔ سائنٹفک سوسائٹی گزٹ کے ایک دوسرے مضمون کا عنوان ہے: "تدبیر ترقی نظم" محمد حسین آزاد کے ایک مضمون کے متعلق سرسید لکھتے ہیں: "ہم اس مضمون کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ نظم کلام میں جس چیز کی نہایت توصیف کی جاتی ہے وہ صرف یہی نہیں ہے کہ پیچیدہ اور مغلق مضامین بیان کیے جاویں اور آدمی کو پہاڑ اور پہاڑ کو آدمی بنایا جاوے اور جھوٹے مبالغہ سے اصل مطالب کو بھی خبط کر دیا جاوے۔ بلکہ حقیقت میں خوبی یہ ہے کہ غم کا ذکر ہو تو سننے والوں کے دل پُر غم اور چشم پُرنم ہو جاویں؛ اور خوشی کا ذکر ہو تو روتے ہوئے ہنس پڑیں۔ اگر میدان کارزار کا ذکر ہو تو دلاور حملہ کرتے اور نامرد بھاگتے نظر آجاویں، اور اگر سخاوت کا ذکر ہو تو بخیل بھی دریا دل ہو جائیں۔ غرض کہ ہر مضمون کی صورت بن جاوے۔ کیونکہ حقیقت میں فصاحت جس چیز سے عبارت ہے وہ صرف ایسے مناسب اور نرم الفاظ کے استعمال کرنے کا نام ہے جو خود بخود سننے والے کے دل میں بیٹھ جاویں۔ اور بلاغت جو چیز ہے وہ صرف مقتضائے حال کے موافق کلام کرنے کا نام ہے۔"

اسی مضمون سے آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی تعلیم کی مخالفت میں بالآخر دراڑ پڑ گئی تھی اور ان سبزی خوروں کی طرح [illegible] جو چھپ کر گوشت کھا لیتے ہیں انگریزی کے مخالف درپردہ انگریزی تعلیم کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ملاحظہ ہو:— "ہم خوب جانتے ہیں کہ ہر چیز اور ہر فن کی ترقی کسی نہ کسی امید پر مبنی ہوتی ہے... البتہ ایک ادنیٰ سند جو فوراً قابل تسلیم ہوتی ہے یہ ہے کہ انگریزی زبان جو ہمارے حکام وقت کی زبان ہے، برابر ہمارے ملک میں ایسی پھیلتی جاتی ہے جیسے ایک ہوا کا جھونکا دم کے دم میں ادھر

سے اُدھر نکل جاتا ہے، حالانکہ اسی کی تعلیم کے واسطے کوئی تحریکِ ظاہری نہیں ہے ... یہاں تک کہ جو لوگ بڑے بڑے اتقیا میں شمار ہوتے ہیں اور جن کے جلسوں میں ہر وقت کفر و اسلام ہی چھنا کرتا ہے اور جب پوچھو تو اوروں کو انگریزی پڑھنا حرام ہی بتاتے ہیں، وہ بھی خفیہ انگریزی کے مشتاق ہیں اور عوام الناس کی نظر سے غائب ہو کر حکام کے سامنے انگریزی بولنے اور سمجھنے پر فخر کرتے ہیں۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ امید عجیب چیز ہے اور امید سے بڑے بڑے کام چلتے ہیں اور علوم و فنون کی ترقی صرف قدر دانی پر ہی موقوف ہوتی ہے۔"

حضرات! آپ خود سے یہ سوال کر رہے ہوں گے کہ فی زمانہ اُردو کوئی پڑھے تو کس امید پر! مذکورہ اقتباس سے پھر سامعین کو سیّد احمد خاں کی علمی بصیرت اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوا ہوگا۔

اقتباسات کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ان سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ سیّد احمد خاں، اُردو نثر اور نظم کی اصلاح اور ان کے ذریعہ قوم کے سُدھار کو علیگڑھ تحریک کا ایک بڑا وسیلہ اور اہم مقصد سمجھتے تھے۔ جو اقتباس آگے آرہا ہے وہ تحریک کی کامیابی کے ایک اور سبب پر روشنی ڈالے گا۔ سماعت فرمائیے۔ اس مضمون کا عنوان ہے "مسدس بطور مرثیہ مسلمانوں کی قوم کی تباہ حالت پر": جب ہم نے سیّد یحییٰ قرطبی کا قصیدہ مرثیۂ اندلس کے غم کا دیکھا تو ہم نے اپنے شفیق مکرم مولوی الطاف حسین حالی سے کہا: کیا افسوس ہے کہ اندلس پر تو رونے والے بھی تھے، مگر ہمارا زمانہ ایسا ہے کہ ہماری قوم کی ابتر حالت پر کوئی رونے والا بھی نہیں ——————

—— حالی سے ہم نے کہا کہ اے میرے مخدوم خدا نے تم کو زبان دی ہے اور تم نہیں بولتے! خدا نے تم کو معجز بیانی دی ہے اور تم کوئی معجزہ نہیں دکھاتے! خدا نے تمہاری آنکھوں میں ابر نیساں سے بہتر آنسو بھرے ہیں اور تم ایک قطرہ بھی نہیں بہاتے۔ یقین کرو کہ ابر نیساں صدف کے دل میں جاتا ہے، مگر تمہارا آنسو انسان کے دل میں جاویگا۔ للہ اپنی قوم کے حال پر روؤ اور قوم کی جو تباہ حالت ہے اس پر مثل قرطبی کے ایک مرثیہ لکھ دو۔

—— ہم حالی کا اور اپنے نالہ کا دل سے شکر کرتے ہیں کہ اس نے ان کے دل میں اثر کیا اور انہوں نے ہماری تمنا کو قبول کیا۔ ایک مسدس قوم کی حالت پر لکھنا شروع کیا اور ابتدا سے انتہا تک قصہ کہنے کا ارادہ کیا تاکہ نمو اور ترقی کے بعد تنزل کی حالت کا دل پر زیادہ اثر ہو اور قوم خفتہ بیدار ہو اور اپنی اپنی اولاد کی بھلائی و ترقی و تربیت کی فکر کرے۔"

یہ وہی مسدس ہے جس کے متعلق سرسید کا خیال تھا کہ ان کا اس کا حالی سے لکھوانا روز حشر ان کی بخشائش کا سبب بن جائیگا۔ غور فرمائیے یہ دیو قامت انسان، یہ بطل جلیل کس طرح نوابغ روزگار کو اپنے گرد جمع کرتا ہے، کس طرح ان کو، جو اس سے عمر اور قامت میں بہت چھوٹے ہیں، اپنے سر و چشم پر بٹھاتا ہے! انھیں مخدوم کہہ کر خطاب کرتا ہے اور انھیں مسلمانوں کی بیداری اور تحریک کے فروغ کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

## ۲

سرسید کی یہ تحریک جو علی گڑھ تحریک کے نام سے منسوب ہے۔ چالیس پچاس سال تک پورے زور و شور کے ساتھ سارے ہندوستان میں جاری و ساری رہی۔ سرسید کو بہت بڑی کامیابی اس امر میں ہوئی کہ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم سے ہم آہنگ کرنے کا فریضہ اپنی زندگی میں انجام دیدیا اور اس روشنی اور اس علم کی کرنیں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں۔ اس لحاظ سے سرسید نے اپنی زندگی میں جو کامیابی حاصل کی وہ محیر العقول ہے۔ یہ کم لوگوں کو میسر آتی ہے، اور اس میں ان کی بصیرت اور ان کی عملی صلاحیت کا بڑا دخل ہے۔ اور اس میں اس کا بھی دخل ہے کہ انھوں نے مشاہیر کو، اکابرین کو، باصلاحیت لوگوں کو، اپنے گرد جمع کر لیا اور نہ صرف جمع کر لیا بلکہ ان کی تربیت بھی کی، ان کو شوق کو دلایا، ان کے حوصلے کو بڑھایا۔ چنانچہ سرسید کے گرد ہمارے اُردو ادب اور ہماری اصلاحی تحریک کے بڑے بڑے مشاہیر جمع ہو گئے۔ حالی کا ذکر ابھی آیا۔ حالی، ذکاءاللہ، شبلی، ڈاکٹر نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک یہ سب ایسے نوابغ روزگار تھے جو کسی بھی ملت اور کسی بھی ملک کی فضا میں اپنی دھاک بٹھا سکتے تھے —— ہر بڑے آدمی کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گرد ایسے لوگوں کو جمع کرتا ہے، جن میں صلاحیت ہو، اور ایک مقصد کے تحت ان صلاحیتوں کو بروے کار لاتا ہے، جو آگ اس کے سینے میں سلگ رہی تھی، وہ دوسرے سینوں میں منتقل ہو جاتی ہے اور جو مقصد وہ لے کر چلا ہے، وہی مقصد اس کے متبعین کا، اس کے رفقا کا مقصد بن جاتا ہے۔ سرسید کو یہ بڑی فضیلت حاصل ہے کہ انھوں نے نہ صرف اُردو ادب اور اُردو زبان کو فروغ دیا، بلکہ اس سے وہ کام لیا جو ترقی اور پیش رفت کی راہ میں معاون بنا۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کی پسماندگی کا کوئی جواز نہیں اور یہ بات کہ ہندوستانی مسلمان پچھڑے ہوئے ہیں، یہ بات بالکل واضح ہے! اور اس کا احساس غالباً ہمیں پورے طور سے نہیں ہے! وہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اہل حرفہ کی مزدوریاں بڑھ رہی ہیں! ہمارے کچھ ساتھی مشرق وسطیٰ چلے جاتے ہیں، وہاں سے زرِ نقد کی کچھ یافت ہو جاتی ہے، اور ہندوستانی مسلمان سمجھتے ہیں کہ ہماری اقتصادی حالت سنبھل رہی ہے۔ لیکن صرف اقتصادی حالت کے سنبھلنے سے ترقی نہیں ہوتا۔ مسلمان تعلیم کے میدان میں دن بدن پیچھے جا رہے ہیں۔ اس کو مطلق الفاظ میں اگر نہ کہا جائے، تو تناسب کے اعتبار سے یقیناً ان کی پسماندگی کسی ثبوت اور کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان اگر اپنا سارا وقت اس میں صرف کر دیں گے کہ فلک ناہنجار کا

شکوہ کریں یا وطنِ عزیز کی بے رُخی کا ماتم کریں، یا حکومت کی بے مہری کا گلہ کریں، یا یہ سمجھیں کہ ہماری قسمت ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہے: تو، اگر یہ رُخ اختیار کیا تو ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ زمانہ بہت تیز رفتار ہے۔ اور اگر ہم آگے بڑھیں گے تو اس پر ہمیں تکیہ نہیں کرنا چاہیے کہ ع مردے از غیب برون آید و کارے بکند!

کام ہم کو کرنا ہے اور میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ وہ دَور ختم ہو گیا کہ کوئی شخص ملک گیر قیادت کو سنبھال سکے۔ بالخصوص مسلمانوں میں، وہ دَور بلند قامت انسانوں کا ختم ہو گیا۔ لیکن اس کا غم البتہ ضرور ہے: ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں جہاں جہاں میں گیا ہوں مجھ کو یہ احساس ہوا ہے کہ ہندوستانی مسلمان عام طور پر اس بات سے آزردہ، آشفتہ اور پریشان ہیں کہ وہ کیوں پیچھے جا رہے ہیں۔ اگر اس احساس کو وہ دل میں صرف سُلگنے دیں گے، کُڑھتے ہی رہیں گے تو یہ ایک غیر صحتمندانہ جذبہ ہو گا۔ جہاں یہ احساس دل میں آئیگا اور جہاں یہ خیال دل میں موجزن ہو، وہاں پہلا قدم اُٹھا لینا چاہیے مسلمانوں کو اپنی اصلاح اور پیش رفت کے انتظام کے لئے!

کسی اقلیت کو کامیاب اور سرخرو ہونے کے لئے تین شرطوں کو پُورا کرنا ہو گا۔ ان میں سے اگر ایک شرط میں بھی کسر رہ گئی تو، نہ تو جانبری ممکن ہو گی، نہ عزت ممکن ہو گی، نہ سرخروئی دائرۂ امکان میں آئیگی۔ پہلی شرط یہ ہے، اور اس کا ضامن ہمارے ملک کا جمہوری آئین ہے، کہ ہم اپنے مسلک، اپنے مذہب اور روایات پر کاربند رہیں؛ کیونکہ اگر ہم ان پر کاربند نہیں تو ہماری کوئی ہستی باقی نہیں رہتی۔ اور جو اپنے مذہب، اپنے مسلک اور اپنی روایات سے وفا نہیں کرتا وہ نہ اپنے وطن سے وفا کرے گا نہ عالمِ انسانیت سے وفا کرے گا۔ لہٰذا پہلی شرط جو میں نے عرض کیا یہ کہ آپ اپنے مسلک، اپنے مذہب اور اپنی روایات پر کاربند رہیں؛ آپ دیکھیں گے کہ اگر آپ اس طرح سے کاربند رہیں تو سب آپ کی عزت کریں گے۔ مذہب پر کاربند ہونے کو کوئی بُری نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ بُری نگاہ سے جب دیکھا جاتا ہے، جب لوگ مذہب سے انحراف کرتے ہیں اور مذہب کے پردہ باتیں کرتے ہیں، اور ان سے وہ اعمال سرزد ہوتے ہیں جن میں اور مذہب میں دراصل بَیر ہے۔

دوسری شرط یہ ہے اقلیت کے سرخرو اور جانبر ہونے کی، کہ وہ اپنی ریاضت سے، محنت سے، اپنے انہماک سے، اپنے آپ کو اکثریت کے افراد سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ وہ اگر اپنے آپ کو بہتر ثابت نہیں کرتی تو اس کو یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ملک کے نظام میں یا معیشت کی ترقی میں کوئی اہم

حصہ لے سکے گی۔

تیسری شرط: یہ میں آپ سے عرض کروں کہ ہمارا آئین جمہوری آئین ہے جس میں ہر فرد کو اور ہر شہری کو برابر کا حق حاصل ہے اور، حکومتوں کی جو حکومتیں بنتی رہی ہیں ان کی ملکی پالیسی اور ان کا پروگرام بھی یہ رہا ہے کہ اس میں کسی مذہب و ملت کے ساتھ امتیاز نہ برتا جائے۔ لیکن امتیاز کسی نہ کسی عنوان راہ پا جاتا ہے، نہ تو آئین اس کی اجازت دیتا ہے، نہ حکومت کی یہ پالیسی ہوتی ہے، لیکن امتیاز راہ یوں پاتا ہے کہ ہم میں، اور دوسرے فرقوں میں، اکثریت میں، ایک فاصلہ رہتا ہے، ایک دیوار حائل رہتی ہے: وہ ہمیں نہیں سمجھ سکتے، ہم انھیں نہیں سمجھ سکتے۔ تو کسی اقلیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسرے فرقوں کے ساتھ، بالخصوص اکثریت کے ساتھ، پہلی شرط پر کاربند رہتے ہوئے، اپنے تعلقات کو شگفتہ رکھے، غلط فہمیوں کو دور کرے۔ مگر جیسا کہ میں نے آغازِ داستان میں عرض کیا تھا، یہ پابندی صرف اقلیت پر نہیں، یہ پابندی اور یہ فرض اکثریت پر بھی عائد ہوتا ہے۔

اگر یہ شرائط پوری ہوتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اقلیت سرخرو نہ ہو، اپنے آپ کو ملک کی ترقی میں برابر کا شریک نہ سمجھے اور ملک کے وسائل سے برابر کی منفعت نہ حاصل کرے ــــــ بعض لوگوں کے ذہن بعض اوقات مسموم ہوتے ہیں، اس میں کسی فرقہ یا کسی ملت کی قید نہیں ہے لیکن اگر مسلمان اپنے آپ کو جہالت سے نکال سکیں، اپنے آپ کو تعلیم دے سکیں، اور اپنی رائے عامہ کا وزن محسوس کرا سکیں، تو بہت سی غلط فہمیاں اور بہت سی بدگمانیاں، جو مسلمانوں سے متعلق بعض اہل وطن کے دل میں راہ پا جاتی ہیں، وہ دور ہو جائیں گی۔ سر سید کی تحریک کا سب سے بڑا اور سب سے اہم عنصر تعلیم کو عام کرنا تھا۔ آپ غور فرمائیں کہ ملک میں کتنے مسلمان ایسے ہیں، آپ ہاتھ کی انگلیوں پر ان لوگوں کو گن سکتے ہیں، ان ہندی مسلمانوں کو، جنھوں نے ملک کی سطح پر یا بین الاقوامی سطح پر کوئی امتیاز حاصل کیا ہو۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں بھی شاید تشنہ رہ جائیں اور آپکو بیچ ہی میں کہیں رکنا پڑے۔ آپ غور کیجئے اسکی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سر سید کی تحریک، جو علم کی تحریک تھی، جو علم کو عام کرنے کی تحریک تھی، وہ ایک پچاس سال چلی، اور اس کے بعد پھر ہم نے اس تحریک سے منہ موڑ لیا اور ہم دن بدن جہالت کی طرف جا رہے ہیں۔

ہم ان بستیوں میں بھی گئے جہاں مسلمان اہل حرفہ ہیں، بہت سے شہر ہیں۔ وہاں یہ معلوم ہوا کہ مسلمان والدین یا تو اپنے بچوں کو اسکولوں میں بھیجتے نہیں، اور اگر بھیجتے ہیں تو دو تین سال کے بعد ان کو بٹھا لیتے ہیں، واپس بلا لیتے ہیں اس خیال سے کہ ان کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا اگر دس سال یا بارہ سال کا لڑکا ان کے ساتھ

صنعت و حرفت میں لگ جائے گا اور کمانے لگے گا۔ مجھے موقع ملا ہے اہلِ حرفہ سے خطاب کرنے کا، اور میں نے
سے سوال کیا ہے کہ جب تم سے حشر کے روز مواخذہ ہوگا کہ ہم نے ان لوگوں کو بحیثیت اولاد کے تمہاری تحویل میں
تم نے محض اس غرض سے کہ تم خوش معاشی کر سکو، آسائش کے ساتھ زندگی بسر کر سکو، تم نے ان کو جہالت کے
میں جھونک دیا! اور تم اس پر مطمئن بیٹھے رہے!! تو تم کیا جواب دو گے؟ اور، آپ کو حیرت ہوگی کہ اس کا
بعض لوگ محسوس کرنے لگے ہیں!! میری درخواست آپ سب حضرات سے یہ ہوگی، اور یہ اسی علی گڑھ تحریک کے
سلسلے میں ہے، کہ یہ سوال کہ کون آکر ہمیں راہ دکھائے گا، کوئی بڑا رہنما پیدا ہوگا وہ ہماری نقلِ ماہیت کر
ایسے سوال نامناسب ہے، یہ امید نامناسب ہے۔

بحیثیت ایک کمیشن کے، جو جونیر پوسٹ کی بھرتی کرتا تھا، مجھے ہندوستان بھر میں جا جا کر انٹرویو کر
کا اتفاق ہوا، اور میں نے یہ عبرت ناک منظر دیکھا کہ بحیثیت مجموعی جو ہریجن لڑکے انٹرویو دینے کے لئے آتے تھے
بحیثیت مجموعی مسلمان لڑکوں سے بہتر ہوتے تھے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہریجن لڑکے بڑھ رہے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب
نہیں کہ ہم پیچھے کی طرف ہٹتے چلے جائیں۔ ان میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہے، ولولہ ہے؛ ہم میں آگے
بڑھنے کا جذبہ ابھی پیدا نہیں ہوا۔ اس جذبہ کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس جذبہ
کو اگر ہم نے بیدار نہیں کیا، تو یہ زمانہ سخت مقابلہ کا زمانہ ہے، اور بہت تیز رفتار زمانہ ہے، جو لوگ پیچھے رہ
گئے ہیں، وہ آگے جانے والوں کو کبھی نہیں پکڑ سکیں گے اگر انھوں نے اسی عنوان سے تساہل برتا۔

میں آخر میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ سرسید کی تحریک جو علم اور روشنی کی تحریک تھی، اس کے
احیا کی ضرورت ہے۔ ہمیں گھر گھر یہ پیغام پہنچانا ہے کہ بغیر علم کے اس دنیا میں کامیابی ناممکن ہے۔
سرسید اور مسلمانوں کے دوسرے قائدین میں بڑا فرق یہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے رہنماؤں نے
مسلمانوں کے جذبات سے اپیل کی، اور مسلمان جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ ان میں سے صرف سرسید ایک ایسے
ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کے شعور، مسلمانوں کی عقل سے، اپیل کی، اور ان سے کہا کہ: "اپنے نیک و
پر غور کرو، ہر بات کو پرکھو۔ کسوٹی پر رکھو، اور جب کسوٹی پر وہ بات سچی ثابت ہو، تب اس کو اختیار کر
عقل کے ساتھ اپیل، سرسید کا طرۂ امتیاز تھا۔ سرسید نے ہماری زبان کے مزاج کو بدل دیا لیکن ہمارے افراد
کے مزاج کو وہ بدل نہیں پائے۔ یہ جان کاشن تھا کہ مزاج جذباتی نہ رہے، مزاج عقل پر مبنی ہو، انسان جو کم
انسان بہکے نہیں؛ ہمارے لئے بہت آسان ہے کوئی افواہ بنا کر اگر ہمارے درمیان مشتہر کر دے تو ہم چند

لمحوں میں اسے باور کر لیتے ہیں؛ یہ نہیں سوچتے کہ یہ افواہ قرینِ قیاس ہے بھی کہ نہیں۔ لہٰذا میری آپ سے اپیل ہوگی اور اپیل آپ حضرات سے تو کم ہے ان حضرات سے زیادہ ہے جن تک آپ کی رسائی ہوگی، آپ ان سے کہیے کہ علم کے بغیر انسان دنیا میں جانور کی حیثیت رکھتا ہے؛ اور بڑے انسان کبھی پیدا نہیں ہو سکتے جب تک علم کی بیس (BASE) بہت وسیع نہ ہو۔ جب علم کی بیس (BASE) وسیع ہوتی ہے، جبھی بڑے بڑے مشاہیر، بڑے بڑے اکابر، بڑے بڑے صاحب ذہن و دماغ، لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں جب لاکھوں کی بیس (BASE) ہوتی ہے۔ مسلمان لڑکوں کے متعلق میں بتا رہا تھا کہ مسلمان ابتدائی تعلیم میں بہت کم داخل ہوتے ہیں اور تناسب ڈراپ آؤٹ (DROP-OUT) کا یعنی چھوٹ جانے کا، جتنا مسلمانوں میں ہے وہ کسی فرقے کسی طبقے میں نہیں ہے۔ جیسے جیسے آگے بڑھتے رہتے ہیں، تناسب کے اعتبار سے مسلمان لڑکوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سرسید کی روح مضطرب ہوگی۔ انھوں نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا، لیکن مزاجوں کو وہ بدل نہیں سکے! اور جتنا انھوں نے کر لیا، اگر ایک انسان اس کا عشرِ عشیر بھی کرے تو اس کے لئے قابلِ فخر ہوگی، یہ بات! لیکن مزاجوں میں تبدیلی ضروری ہے، ورنہ ہم ہر موقع پر دھوکا کھائیں گے! ہم ہر قدم جو اٹھائیں گے وہ پیچھے کی طرف بڑھے گا؛ آگے کی طرف ہماری نظر نہیں ہوگی۔

یہ انوکھی بات ہے کہ مسلمان، جن کے مذہب میں ہر قدم پر علم کی بڑی تاکید ہے: مبصرین نے تو یہ بھی کہا ہے کہ کلام مجید میں جتنی آیتیں تدبر، تفکر اور استخراج نتائج سے متعلق ہیں اتنی آیتیں جملہ امور دینی کے متعلق نہیں ہیں؛ اور انھیں ہدایات کا اثر تھا کہ ۸۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک، یہ سائنس کے عیسائی مؤرخین لکھتے ہیں کہ ۸۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک، چار سو سال، دنیا کے علوم میں کوئی اضافہ ایسا نہیں ہوا جو مسلمانوں سے شروع نہ ہوا ہو۔ یعنی دنیا کے علوم میں سارے اضافے چار سو سال تک، مسلمانوں کے اجتہاد، ان کی ژرف نگاہی، ان کی علم دوستی کے مرہونِ منت ہیں۔ اس کے بعد تین سو، چار سو سال بتدریج زوال کے گزرے اور پھر اس کے بعد چار سو سال ایسے گزرے جب مسلمانوں کے ساتھ علم کا کوئی کارنامہ بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دنیاوی علوم جن کو سائنس کہتے ہیں، آپ کو حیرت ہوگی کہ ہر دس سال میں دنیاوی علوم دُگنے ہو جاتے ہیں؛ اس رفتار سے علم بڑھ رہا ہے۔ جب علم اس تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہو، تو کیا یہ عبرت اور شرم کا مقام نہیں کہ اس میں ہمارا تعاون، ہماری شرکت، ہمارا حصہ، تقریباً صفر ہو۔ یہ صفر محض اس بنا پر ہے کہ ہم نے علم سے منھ موڑ لیا ہے۔ علی گڑھ تحریک جو پیام لے کر آئی تھی، اس ندی کی طرح جو ریگ زار میں جا کے خشک

ہو جائے، وہ پیام خشک ہو گیا اور ہم اس سبق کو بھول گئے، جو سید والا گہر نے ہمیں دیا تھا۔ مسلمان اگر اپنی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اور اپنے وطن عزیز کی پیشرفت میں اپنے بھائیوں کے ساتھ شانہ بشانہ اور قدم بقدم چلنا چاہتے ہیں، اور دنیا میں امتیاز حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو ان کو وہ سبق دُہرانا ہوگا! ان کو علم کی اسی رسّی کو پھر سے پکڑنا ہوگا جس کو آپ "عُرْوَةُ الْوُثْقٰی" کہہ سکتے ہیں۔

وہ رسّی اگر آپ نے پکڑ لی تو پھر، نہ آپ کو پسماندگی کا گلہ ہوگا، نہ آپ کو فلک ناہنجار سے شکایت ہوگی۔ بلکہ، آپ مطمئن ہوں گے کہ جو کچھ آپ کے مقدور میں تھا، جو کچھ آپ کی قدرت میں تھا، وہ آپ نے انجام دیا۔

لہٰذا میری آخری التماس آپ سب حضرات سے یہ ہے کہ ہم یاس اور محرومی کا ماتم کرنا چھوڑ دیں۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ماتم کرنے سے جوانمردی ختم ہوتی ہے، ماتم کرنے سے قوتِ عمل شل ہو جاتی ہے، شکایت کرنے سے انسان کا ظرف اُتھلا ہو جاتا ہے، انسان میں وزن نہیں رہتا۔ جو لوگ مردِ میدان ہیں، وہ کام کرتے ہیں، وہ قدم آگے بڑھاتے ہیں؛ وہ شکوہ نہیں کرتے، وہ شکایت نہیں کرتے۔ آپ کے آئینی حقوق بہت سے ہیں۔ آپ کے بہت سے رہنما ہیں جو آپ کے آئینی حقوق کا مطالبہ کرتے رہیں گے۔ لیکن آپ کی بنیادیں جب تک مضبوط نہیں ہوں گی جب تک کہ آپ علم کا دامن مضبوطی کے ساتھ نہ پکڑ لیں اور میں نے جو معروضات کیے ہیں کہ اقلیت کے لئے تین شرطوں کی پابندی ضروری ہے، اگر اس سے غفلت برتی گئی تو، پھر کوئی اقلیت اس کی حقدار نہیں ہوگی کہ وہ شکوہ کرے کہ ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، ہم پیچھے رہے جا رہے ہیں، ہمارے خلاف امتیاز برتا جا رہا ہے: اس قسم کے واقعات ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کی رائے عامّہ یا جزرائے عامّہ تو ہو! آپ کے پاس ہندوستانی مسلمانوں کے پاس کوئی اخبار بھی ایسا نہیں ہے۔ آپ کی حیثیت گونگوں کی سی ہے۔ آپ اپنی ترجمانی بھی نہیں کر سکتے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے پاس اخبار ہونا چاہیے، آپ کے مسلک کو واضح ہونا چاہیے۔ مسلمان، ہندوستان کے سینہ پر بار بن کر نہیں جینا چاہتے، وہ اپنے وطنِ عزیز کو ترقی دینا چاہتے ہیں، اسی جذبہ اور اسی حوصلہ کے ساتھ کہ وہ اس میں کسی سے پیچھے نہ رہیں! دعا ہے کہ خدا اس مدعا کو پورا کرے!

●●

# کہ آشیاں کسی شاخِ شجر پہ بار نہ ہو

یہ بات کچھ زیادہ پرانی نہیں کہ ہم ہندوستانی مسلمان مطمئن تھے۔ اپنے ماضی پر نازاں، حال سے بے فکر اور مستقبل سے غافل تھے۔ کسی کو احساس تک نہ تھا کہ ہم نے کیا کھویا ہے اور ہم ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ہمیں احساسِ زیاں تو ہے! ہمارے رفیق میدان میں اُترے تو ہیں۔ اُنھوں نے کسی شہرت کی خاطر نہیں، کچھ کر گزرنے کے خیال سے اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ یہ احساس ہوا تو ہے کہ سائنس اور ریاضی کی تعلیم ضروری ہے اور اس تعلیم میں جو خامیاں ہیں ان کو دُور کرنا ہے۔ آج ہم اس حقیقت سے واقف تو ہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کا معیار اچھا نہیں۔ ان میں جن اداروں کی حالت نسبتاً بہتر ہے ان میں ہمارے طلبا اقلیت میں ہیں اور جن کی حالت سقیم ہے وہاں ہمارے طالب علم اکثریت میں ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں غیر مسلم بھائیوں کی شرکت ایک اچھی علامت اور اتحاد کی نشانی ہے مگر اس شرکت کا تناسب قابلِ غور ہے۔

اس پر غور کرنا چاہیے کہ امریکا پر یہودیوں کا تسلط کیسے ہوا۔ وہ اپنی محنت اور صلاحیت کی بنا پر تمام بڑے اداروں پر چھا گئے۔ اُنھوں نے اپنے بچّوں کو تربیت دی، ان میں مقابلے کا شوق پیدا کیا، اَوروں پر سبقت لے جانے کا جذبہ بیدار کیا۔ یہ سب ہمیں بھی کرنا ہوگا اور فلک ناہنجار کا شکوہ ترک کرکے میدانِ عمل میں اُترنا ہوگا۔

ہمیں کسی سے عداوت نہیں۔ برادرانِ وطن آگے بڑھتے ہیں تو اس کی شکایت نہیں، بلکہ ہمیں ان کی ترقی سے خوشی ہے کہ یہ ملک کے آگے بڑھنے کا

نشانی ہے۔ اس پر ہمارا ردِّ عمل مثبت ہے اور ہونا چاہیے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کہیں ہم پسماندہ نہ رہ جائیں۔ کہیں ہماری پسماندگی ملک کی ترقی کے راستے میں حائل نہ ہو جائے۔ ہم اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور جس ملک کی اتنی بڑی تعداد پسماندہ ہو وہ ترقی یافتہ کیسے کہلا سکتا ہے؟ اگر ہم نے اپنی پسماندگی کو دور نہ کیا تو ہم پر یہ الزام عائد ہوگا کہ ہم اپنے ملک کی خوشحالی کے راستے میں رکاوٹ اور اس کی معیشت پر بوجھ بن گئے!

(مسلم اسکولوں کے سربراہوں کی کانفرنس کے خطبۂ صدارت سے ۔ اگست

# ہمارے مسائل

سو سال سے زیادہ ہوئے سرسید نے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے نام سے جاری کیا تھا۔ یہ تین بار نکلا اور بند ہوا۔ تہذیب الاخلاق کی کُل مدت حیات دس برس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ سرسید نے پہلی بار اسے اس لئے بند کیا کہ جن اصلاحی خیالات کا اظہار وہ اس کے ذریعہ کر رہے تھے وہ بعض اُن بااثر اور قدامت پسند اشخاص کو ناگوار تھے جن کی مدد سرسید ایم۔ اے۔ او کالج کے قیام اور فروغ کے لئے لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ رسالہ بادل ناخواستہ بند کیا، اگرچہ اُن اشخاص کا اور خود اسی تحریک کا بھرم رکھنے کے لئے انھوں نے اپنے اس لختِ جگر کو پیوندِ خاک کرتے ہوئے کہا تو یہی کہ وہ اپنا مقصد پورا کر چکا تھا۔ مقصد کی ایک گونہ تحصیل ضرور ہوئی تھی یعنی پڑھے لکھے مسلمانوں کے ایک طبقہ میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ ہمیں مایوسی، جہالت، جھوٹی قناعت اور اندھی قدامت سے دل کے دامن کو بچانا ہے، ان برائیوں سے نجات حاصل کرنا ہے، ہمیں زمانہ کے تقاضوں کو سمجھنا ہے اور انھیں پورا کرنا ہے، اگر ہم نے جدید تعلیم سے منھ موڑا تو زندگی کی دوڑ میں ہم پیچھے رہ جائیں گے اور پیچھے رہ جانے کا انجام شروع میں تحقیر اور رسوائی اور آخر میں فنا ہے۔ لیکن یہ احساس ابھی عام نہ ہوا تھا کہ یہ رسالہ بند ہو گیا۔ سرسید نے سوچا ہوگا کہ جب کالج اور جب یونیورسٹی کا خواب انھوں نے دیکھا ہے اس کے قیام کے بعد یہ ادارہ خود سرچشمۂ تہذیب و ہدایت بن جائے گا اس نور کے منبع سے جو کرنیں پھوٹیں گی وہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشے کو منور کریں گی، اس ادارے کا کام نہ صرف تعلیم دینا اور تحقیق کرنا ہوگا، بلکہ تربیت دینا اور اخلاق کو سنوارنا بھی ہوگا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو قائم ہوئے ۱۰۴ سال ہو گئے اور اسے یونیورسٹی بنے ہوئے دو اوپر ساٹھ سال۔ تہذیب الاخلاق کو جو کام کرنا تھا وہ یہ ادارہ نہ کر پایا۔ اس میں شک نہیں کہ اس ادارہ نے حوصلہ پیدا کیا، روشنی بخشی، اس نے ایسے فرزندوں کو جنم دیا جو ملک و ملت کے لئے سرمایۂ افتخار رہے۔ جو کچھ روشنی ہم ہندوستانی مسلمانوں میں دیکھتے ہیں وہ بڑی حد تک اسی ادارہ کی دین ہے۔ لیکن آگے چل کر یونیورسٹی کے ولولے سرد ہو گئے۔ ملک کی تقسیم کے لئے اُسے الزام دیا گیا۔ یہ اس کے ساتھ ناانصافی تھی۔ یہ خیال کہ ہم پر شبہ کیا جا رہا ہے، ہمیں عداوت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے، صحت کے لئے مضر ہے۔ ہمارے طالب علم سمجھنے لگے کہ ہمارے ساتھ اپنے ملک میں انصاف نہیں ہوگا۔ ہمیں یہاں

روزگار نہیں ملے گا۔ اور واقعی جب انھوں نے روزگار کے دروازہ کو یہاں بند پایا تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ روزگار کی تلاش میں سرحد کو پار کریں۔ وہ اس طرح گئے تو نہ جانے والوں کو اور شبہ کرگئے اور شبہ رہنے کے بعد حوصلہ کہاں باقی رہتا ہے۔ چنانچہ جس ملت کو سرسید نے سرگرم عمل ہونا اور آگے بڑھنا اور زمانہ کے ساتھ چلنا سکھایا تھا وہ ملت اپنے خول میں واپس چلی گئی۔ خول کے اندھیرے سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی۔ روشنی کھٹکنے لگی۔ مایوسی نے انوکھے مشورے دیے۔ خود پر ترس کھانے لگے۔ طبیعت شکایت کی خوگر ہوگئی۔ شبہ کا جواب بدگمانی سے دیا گیا۔ غرض کہ حالات کے صحت مند اور نارمل ردّعمل سے ہم لوگ محروم ہو گئے۔ فسادات اور تجربات نے اس لَے کو اور تیز کر دیا۔

یونیورسٹی جو کھٹوں میں پڑ گئی تھی۔ اس کو ایک بڑے رہنما اور اس کے ایک مشیر کی بصیرت نے بچا لیا۔ یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ کی تعداد، اس کی عمارتوں اور ساز و سامان، اس کے بجٹ میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کے سارے مصارف کی حکومت کفیل بن گئی۔ لیکن اس دارالعلوم میں وہ روح پلٹ کر نہ آئی جس نے اسے تعلیم و تہذیب کی ایک بڑی تحریک کا مرکز بنا دیا تھا۔ اس کے فرزند اس اعتماد اور ولولے سے محروم رہے، جو ان کی پہلی پیڑھیوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھوں نے ریاضت سے دامن بچایا، مقابلے سے آنکھ چرائی۔ انھوں نے مقدار کو معیار کا بدل سمجھا۔ بساط سے زیادہ داخلے کئے گئے۔ ہم آگے بڑھے صرف تعداد میں۔ اس اطمینان نے بھی کہ حکومت وقت سارے اخراجات کی ضامن ہے ہمت کو پابہ زنجیر کر دیا۔ انجام کار یونیورسٹی عام یونیورسٹی کی صف میں بیٹھ گئی۔ جسے عہد آفریں ہونا تھا، وہ عہد شکن ثابت ہوئی، اس عہد کو توڑنے والی جو اس نے اپنے بانی سے کیا تھا، یعنی یہ پیمان کردہ شجر سے پیوستہ رہتے ہوئے جدید ترین ترقیوں کو جذب کرے گی، تعلیم اور تہذیب کی نقیب اور کارواں سالار بنے گی۔ افسوس کہ یہ جیتا جاگتا، امنگوں، خوابوں اور زندگی سے بھرپور ادارہ ضابطہ، آسایش، بے امنگی اور معیار فراموشی کے شکنجے میں جکڑ گیا۔ اب یہ خود کو سنبھال لے، اپنے طالب علموں کو روشنی اور حوصلہ بخشے تو بڑی بات ہے۔ پوری ملت کی رہنمائی کا اس کا ہوتا نہیں ہے حالاں کہ یونیورسٹی کے ایکٹ میں حال ہی میں جو ترمیمیں ہوئی ہیں ان میں ایک کی رُو سے یونیورسٹی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی بہبود اور ترقی کے لئے جد و جہد کرے یہ دفعہ اہم اور دھیان دینے کے لائق ہے۔

اس کام میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کانفرنس نے ایک زمانہ میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس کے سالانہ اجلاس ہندوستانی مسلمانوں کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان اجلاس کے صدارتی خطبے مسلمانان ہند کے تمام اہم مسائل کا احاطہ کرتے تھے اور ان سے عہدبرآ ہونے کی تجاویز پیش کرتے تھے۔

تہذیب الاخلاق کی طرح کانفرنس علی گڑھ تحریک کا اہم جزو تھی ۔ وقت کا تقاضا ہے کہ تہذیب الاخلاق کو نئے سرے سے زندہ کیا جائے اور کانفرنس کی مردہ رگوں میں خون زندگی دوڑایا جائے ۔

ہم تہذیب الاخلاق کو کوئی دوسرا نام دے سکتے تھے لیکن وہی نام رکھنے کی جسارت تسلسل کی خاطر کی جارہی ہے اور توانائی اور روشنی حاصل کرنے کے لئے بھی ۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں یہ موڑ بہت کچھ ویسا ہی ہے جیسے ۱۸۵۷ء کی بغاوت یا جنگ آزادی کے بعد کا موڑ ۔ اسی انداز سے آزادی کے بعد مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے کہ پہلی جنگ آزادی کے بعد پہلی بار ان کے اطوار و افعال اور زاویہ نگاہ کو انگریزوں نے شکست اور ان کے مظالم نے مسخ کر ڈالا تھا ۔ بٹوارہ اور آزادی کے بعد ایک بار پھر ان کے اعتماد کو زبردست دھکا لگا ۔ انھوں نے بیرحم دنیا سے بدلہ اس طرح لیا کہ اس ہماہمی اور اس کی پیش رفت سے کنارہ کش ہو گئے ۔ بند پانی میں فساد کی بُو آتی ہے ۔ پانی مرتا ہے تو سڑنے لگتا ہے ۔ کارواں رُک جاتا ہو تو ناکارہ ہو جاتا ہے ۔

ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت ہیں ۔ انھیں اقلیت کہنا نامناسب ہوگا ۔ صدیوں تک صاحب اقتدار و اختیار رہ چکے ہیں ۔ ان کا تعلق ایک ایسی ملت سے ہے جس نے علم و عمل کی شعلیں روشن کیں ، جس نے اخوت ، حریت اور مساوات کے دیئے جلائے ، ان مشعلوں ، ان چراغوں کو لے کر چشم زدن میں دنیا کو منور کر دیا ۔ تاریخ کا یہ بڑا طنز ہے کہ چند صدیاں گزرنے کے بعد وہی لوگ جو مشاہدہ ، تجربہ اور غور و فکر کے علمبردار ، علم و اخلاق کے کارواں سالار تھے ، جہالت ، جمود اور اندھی تقلید کے حصار میں آ بیٹھے ۔ جہالت نے انھیں کہیں کا نہ رکھا ۔ اپنے بھلے بُرے کا انھیں شعور نہ رہا ۔ جب تک کہ تعلیم عام نہیں ہوتی ، مسلمان تہذیب کی برکتوں سے محروم رہیں گے ۔ علم ہماری گمشدہ میراث ہے اسے حاصل کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے ، اس پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے ۔ یہ کام "تہذیب الاخلاق" انجام دے گا ۔

اردو میں اخبار اور رسائل کی کمی نہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے ، جو سنجیدہ انداز میں مسلمانوں کے تعلیمی ، سماجی اور اقتصادی مسائل پر غور کرتا ہو ؛ جس کا مقصد ہو مسلمانوں میں وہ خواص پیدا کرنا جو انھیں تنزل سے ہٹا کر ترقی کی طرف لے جائیں ۔ یہ بات کہتے ہوئے ہماری گردن شرم سے جھک جاتی ہے کہ مسلمان اس ملک کا سب سے پسماندہ فرقہ ہیں ۔ اس سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ انھیں اپنی پسماندگی کا علم ہے نہ احساس ۔

ہماری دوسری شان امتیاز کاہلی ہے ۔ اگر ہمارا کوئی عضو سرگرم عمل ہے تو زبان ۔ زیادہ بولنے والے دُوطرح ٹوٹے میں رہتے ہیں ۔ اس عادت سے ایک تو قوت عمل کو زنگ لگتا ہے ۔ دوسرے یہ سننے ، غور کرنے

اور سمجھنے کا موقع نہیں دیتی۔ ہم قول کو فعل کا بدل سمجھنے لگتے ہیں۔ یہیں سے خود فریبی کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جو کردار کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور انسان کو جھوٹ کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ آرام طلبی ہماری طبیعت بن گئی ہے۔ محنت، ریاضت اور جفاکشی سے ہم جی چراتے ہیں۔ ہم وقتی جوش میں کبھی کبھی خون بہانے کی بات تو کرتے ہیں، اگر پسینہ بہانے سے گھبراتے ہیں۔ پتہ مارنے کے بجائے ہم ڈینگ مارتے ہیں۔ بادشاہی، جاگیرداری اور زمینداری کے زمانے ختم ہوئے، لیکن وہ مزاج ہنوز باقی ہے۔ رسی جل گئی، بل نہ گیا:

ملے خاک میں پر رعونت وہی ہے ؛ ہوئی صبح اور خوابِ راحت وہی ہے

شراب کی طرح کاہلی بھی ام الخبائث ہے۔ ان گنت برائیوں کی جڑ ہے۔

اور رعونت وہ تیسرا روگ ہے جو گھن کی طرح ہمیں لگ گیا ہے۔ جسے دیکھئے فرعون بے سامان بنا ہوا ہے۔ اگر سامان ہوتا تو نہ جانے کیا کرتے۔ یا شاید بے سر و ساماں ہونے کی نفسیاتی تلافی مریضانہ گھمنڈ کے ذریعہ کی جارہی ہے۔ انانیت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بڑے بڑے اہم ملی مسائل میں کیا رخ اختیار کیا جائے اس کا فیصلہ صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ جو شخص براہ راست اس مسئلہ سے متعلق ہے وہ آپ کی طرف کس حد تک ملتفت ہوا۔ اس نے قصداً یا سہواً آپ کو نظر انداز کر دیا تو آپ نہ صرف اس کے دشمن ہو جائیں گے بلکہ اس مسلک کی مخالفت پر تل جائیں گے جو اس غریب نے اپنایا ہے۔ امور کے متعلق ردعمل کا یہ انداز خام کاری اور تنگ ظرفی کی دلیل ہے۔ یہ طریق کار، افراد کی یہ سوجی اور پھولی ہوئی انانیت، جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ جبرت کی جگہ ہے کہ انفرادی نخوت نے اجتماعی عزتِ نفس کا خون کر دیا ہے، بلکہ خود جمعیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے:-

فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں ؛ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

یہی رعونت نفاق کی جڑ ہے۔ اتحاد نہ ہوگا تو طاقت کہاں سے آئے گی، جسے دیکھئے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہے۔ بے جا انفرادیت نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ طغیان آمادہ انانیت اور بے زنجیر انفرادیت پر انکس لگانا ہے۔

انانیت نے ایک اور بہروپ بھرا ہے: حسد۔ اس کے جو زیادہ قریب ہوتا ہے وہی زیادہ موردِ التفات ہوتا ہے۔ بیگانے ترقی کریں، پھلیں پھولیں، کوئی فکر نہیں۔ لیکن اپنوں میں کوئی بڑھنے نہ پائے۔ آگے بڑھنے نہ پائے۔ اس سے یہ راز کھلا کہ بیچارے مسلمانوں پر جو برق گرتی ہے وہ انھیں کی خود ساختہ پرداختہ ہوتی ہے۔ اسلام نے اجتماعیت اور قناعت پر بڑا زور دیا ہے۔ یہ دونوں سبق ہم فراموش کر چکے۔

دوسرے حیوانوں پر انسان کی برتری عقل کی وجہ سے ہے۔ عقل ہی جذبات کو قابو میں رکھتی ہے، ان کی

عناں گیر ہوتی ہے، ان کو راہ پر لگاتی ہے، ان کو اچھے کاموں میں استعمال کرتی ہے۔ عقل ہی بُرے بھلے کو پہچانتی ہے، دبی اندھیرے میں راستہ دکھاتی ہے۔ ہم نے عقل کو معزول کر رکھا ہے۔ ہمارے یہاں سارا کھیل جذبات کا ہے۔ کوئی خطیب، کوئی چابکدست اہلِ قلم، کوئی سیاست داں، کوئی بانیٔ شر جب چاہے ہمارے جذبات کا رخ جس طرف چاہے موڑ دے۔ جذبات کا طوفان ہمیں اونچ نیچ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ جو چاہے ہمیں برانگیختہ کر دے، بیوقوف بنا دے، خودکشی پر آمادہ کر دے۔ جذبات کے سیلاب میں بہنا کون سی اچھی بات ہے۔ سیلاب میں تو خس و خاشاک بھی بہتے ہیں۔ ہمیں چٹان کی طرح قدم گاڑ کر رہنا ہے۔ یہی عزتِ نفس کا تقاضا ہے۔ بقا بھی اسی میں ہے۔ عقل بھی یہی سکھاتی ہے۔ عقل کی بازیابی، عقل کی بالادستی ہمارا مقصود ہے۔

یہاں تک تو ہم نے اپنے مزاج، اپنی افتادِ طبع کو آئینہ دکھایا ہے، وہ افتادِ طبع جو ہماری خوش حالی ہماری ترقی کے خلاف جاتی ہے۔ اب ہم ان باتوں کا ذکر کریں گے جن پر رسالے میں خاص طور پر دھیان دیا جائے گا۔ پہلے ان توہمات کو لیجیے، جنھوں نے ہمیں کمزور، اپاہج اور ڈھلمُل یقین بنا دیا ہے۔ خدا کے بنائے ہوئے مہینے اور دن انسان کو امکانات اور مواقع فراہم کرنے میں یکساں ہیں۔ ہم نے اپنی ضعیف الاعتقادی کے باعث اُن پر مبارک اور منحوس کے لیبل لگا دیے ہیں۔ بہت سی تباہ کن، وقت، پیسہ اور اعتماد ضائع کرنے والی رسموں کو ہم نے پتھر کی لکیر مان لیا ہے۔ عقلی اور علمی ترقی کے دَور میں ہم جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکے پر ایمان لائے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات کے لئے ہم دوسروں کے دست نگر بن جاتے ہیں اور اپنے اور اپنے خدا کے درمیان فاصلوں کو طول دیتے رہتے ہیں۔ خدا کے ماسوا ہر ایک سے ہم ڈرتے ہیں۔ مل کر ہم کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ہماری شرکت کی ہانڈی ہمیشہ چوراہے پر پھوٹتی ہے۔ اسی لئے ہمارے کاریگر اور ہنرور امداد باہمی اور سہکاریتا اور اشتراکِ عمل سے طاقت اخذ نہیں کر پاتے۔ جہالت اور نفاق اور کم حوصلگی ہنر کے باوصف انھیں آگے بڑھنے نہیں دیتی۔

علی گڈھ کا ادبی اور لسانی پہلو کس قدر درخشاں تھا۔ اُردو زبان اور ادب کو اس تحریک نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ لیکن یہ احسان یک طرفہ نہ تھا۔ اگر اُردو زبان اور ادب کی پُرزور تائید اسے حاصل نہ ہوتی تو یہ تحریک کھلا کر رہ جاتی۔ سر سید اور ان کے رفقا، حالیؔ، شبلیؔ، ذکاء اللہ، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک وغیرہ نے اردو تحریر و تقریر کو سر سید کے مقاصد اور منصوبوں کی تکمیل اور اشاعت کے لئے استعمال کیا۔ اس زمانہ میں اردو میں سلیقہ اور خلوص سے جو بات کہی یا لکھی گئی، مسلمانوں کے دلوں میں اُترتی چلی گئی۔ اس زمانہ میں یہ عالم ہے کہ دن بدن مسلمانوں میں اُردو جاننے والوں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کے

اہل قلم کے گھروں کو ٹٹولئے تو بیشتر کے بچوں کو اُردو سے ناواقف پایئے گا۔ اگر زمانہ کی رفتار یہی رہی تو وہ دن دُور نہیں، جب اُردو ایک بحر بیکراں سے سمٹ کر جوئے کم آب رہ جائے گی، یعنی صرف ایک بولی جس کو بولنے والے بہت ہوں گے اور لکھنے پڑھنے والے بہت کم۔ اُردو کو مطالبات سے زیادہ مجاہدات کی ضرورت ہے۔ یہ ریاضت اور ایثار کی طالب ہے، اور ان اجناس کی ہوا تک ہمارے ذخیرہ کو نہیں لگی۔

شادیوں میں داد و ستد کا شرمناک سلسلہ کہیں کہیں ہمارے یہاں بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس رسم کو بڑھنے سے پہلے جڑ سے اکھاڑنا ہوگا، ورنہ لڑکیوں کی زندگی اجیرن ہو جائے گی اور ان کے والدین پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگے گا۔

جمود اور آسایش طلبی اور تن آسانی نے خانہ نشینی کو فروغ دیا ہے۔ وہ لوگ جو ایک صدی میں دنیا میں پھیل گئے تھے، اب گھر چھوڑتے ہوئے گھبراتے ہیں، لہٰذا ترقی سے جس کے لئے نقل و حرکت ضروری ہے محروم رہتے ہیں۔

تعلیم نسواں کی اہمیت ہم نے دیر سے تسلیم کی جس کا اثر آئندہ نسلوں کی تعلیم پر پڑ رہا ہے۔ جب لڑکیوں میں تعلیم پھیلی تو ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو حسب صلاحیت برسر روزگار ہونے میں مشکل ہو گئی۔ ملک کے بٹوارہ کے بعد جب بہت سے لڑکے تلاش معاش میں پاکستان چلے گئے، اس مسئلہ نے اور شدت اختیار کر لی۔ نہ معلوم کتنے مسلم گھرانوں میں لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انتھک کوشش کر کے روزگار کی راہیں لڑکیوں پر کھولی جائیں۔

تہذیب اور شائستگی مسلمانوں کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے لیکن جب یہ حدود سے بڑھ جاتی ہے تو بناوٹ اور تصنع بن جاتی ہے۔ کبھی ظاہر داری کی شکل اختیار کر لیتی ہے، کبھی مبالغہ اور غلو کی، کبھی کھوکھلی لفاظی کی۔ ان سب سے گریز اولیٰ۔

مسلمان اسراف پر ناز کرتے ہیں۔ فضول خرچی کو شاہ خرچی اور فراخ دلی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس آیت کریمہ کو نظر انداز کیا جاتا ہے: إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (فضول خرچ شیاطین کے بھائی ہیں)۔ اس اسراف کی بدولت لاکھوں گھر تباہ ہو گئے۔ اقتصادی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں۔ ہمارے یہاں دُور اندیشی اور منصوبہ بندی جو فی زمانہ افراد کے لئے اتنی ہی ضروری ہیں، جتنی اقوام کے لئے، بخل اور ناقناعتی ضعف ایمان پر محمول کی جاتی ہیں۔

ہم لوگ زبان کے زخم خوردہ ہیں۔ ایک پہلو دراز نفسی اور یادہ گوئی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ زبان کا

چٹخارہ گفتگو تک محدود نہیں رہتا۔ "لذتِ کام و دہن" اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے اور لذت کام و دہن صحت جسمانی اور ذہنی صحت کے زیاں کے علاوہ وقت کی تضیع کا ذمہ دار بھی ہے۔ اوسط مسلمان گھرانے میں عورتوں کا سارا وقت کھانا پکانے میں صرف ہوتا ہے۔ ان کا سابقہ پھکنی اور دست پنے، چولھے اور توے دھوئیں اور انگاروں سے رہتا ہے۔ لذیذ مرغن مسالے دار کھانے عورتوں کے اوقات کو تلخ اور مردوں کے اذہان کو کند کرتے ہیں، اس حد تک کہ مسلسل دماغی ریاضت اور یکسوئی سے ہم بیشتر دامن بچاتے ہیں۔ ریاضی ہمیں اسی لئے آج تک راس نہ آئی۔ سائنس کے مضامین کو ہم سخت خواں سمجھتے ہیں۔ یہ ثقیل غذا ہے، جو ہمیں سہل پسندی اور آرام طلبی کی طرف لے جاتی ہے۔ ہمارے طالب علم اکثر وہ مضامین لیتے ہیں جن میں متواتر اور باقاعدہ محنت کی ضرورت نہ پڑے امتحان کے قریب نصاب کی ورق گردانی کی اور اگلی جماعت میں ڈھکیل دیئے گئے۔ کاش ہمیں احساس ہو کہ وقت اور صحت کام و دہن کی لذت سے زیادہ اہم ہیں اور مہارت اور کامیابی کے لئے لگاتار اور انتھک محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دور سخت اور جانفشاں مقابلہ کا دور ہے۔ جو لوگ محنت سے جی چرائیں گے، وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے جائیں گے۔ یہ دور دماغ کی بالادستی کا دور ہے اگر دماغ پر ہم نے زنگ لگنے دیا یا اُسے دھوئیں یا کہرے میں گھٹ جانے دیا، یا اُسے طویل وقفوں میں جست کے ساتھ کام کرنے کا عادی بنا دیا تو ہمارا انجام پستی میں بالاتر ہو جائے گا اور ذلت کی راہ سے ہم فنا کے دہانہ پر پہنچ جائیں گے۔ جسم اور دماغ کے باہمی ربط کو نظر انداز کر کے کوئی پنپ نہیں سکتا۔ دماغ کو پس پشت ڈال کر کوئی جماعت جانبر نہیں ہو سکتی۔ ہمیں زندگی کے ہر شعبہ میں تکلف اور تصنع سے دامن بچانا ہے، خصوصاً غذا میں۔ سادہ اور صحت مند غذا رواج پا جائے تو ہمارا "دلدّر" دور ہو جائے۔ بہت سی برائیوں سے جن میں سر فہرست 'کاہل الوجودی' ہے، چھٹکارا مل جائے۔ غذا میں سادگی کے ساتھ توازن کا اہتمام بھی کرنا پڑے گا۔ ذائقہ برحق مگر اعتدال کے ساتھ۔ خدا ہمارے چٹورے پن سے بچا لے۔

من حیث القوم ہم جسمانی ورزش سے بھی جی چرانے لگے ہیں۔ "نماز نیند سے بہتر ہے" کی صدا ہمارے کان تک نہیں پہنچتی اور پہنچ بھی جائے تو دوسرے کان سے نکل جاتی ہے۔ کسی بستی میں جا کر دیکھ لیجئے، ان لوگوں میں جو علی الصباح چہل قدمی کے لئے نکلتے ہیں مسلمان ڈھونڈے نہ ملیں گے۔ ؏ کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے۔ اور ان لوگوں میں جو روز سویرے غسل کرتے ہیں، کسی کلمہ گو کا گذر نہ ہوگا۔ زندگی کی دوڑ میں ہم روز پیچھے رہتے ہیں۔ ہمارے دن کا آغاز دیر سے ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ طہارت کی لطافت تک ہم پہنچ جاتے ہیں، لیکن بنیادی صفائی اور حفظانِ صحت سے ہم غفلت برتتے ہیں۔ خواہ اس کا تعلق جسم سے ہو، خواہ گھر سے۔ ہمارے ساتھ کاہلی کے

علاوہ گندگی منسوب کی جانے لگی ہے اور یہ الزام کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔

جذبات کے ہاتھ میں عنان دیدینے سے ہمیں بہت نقصان پہنچے ہیں۔ ہمیں بہکانا اور اکسانا اور بھڑکانا بہت آسان ہوگیا ہے۔ ہم کوئی منصوبہ نہیں بنا سکتے اور اگر بنا بھی لیا تو اس پر عمل نہیں کر سکتے کیونکہ جذبات ہمارا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ منصوبہ عقل بناتی ہے، وہی نشیب و فراز سمجھ سکتی ہے۔ جذبات کو ثبات کب ہے۔ ندی کی طرح چڑھتے ہیں اور اسی طرح اترتے ہیں۔ وہ غور و فکر کا موقع کیا دیتے۔ جذباتیت سے ہمیں اپنا ناتہ توڑنا پڑے گا۔

مذہب کا نفوذ و اثر جتنا مسلمانوں میں ہے، کسی اور قوم میں نہیں۔ لیکن محرومی نے ہمارا یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ہم نے عبادت کے ظواہر تک محدود کر دیا۔ زبان آیات کو فرفر پڑھنے لگی۔ دل تک آنچ بھی نہ پہنچی، دل کو آہٹ بھی نہ ملی۔ جو لوگ ٹکریں مار لیتے ہیں انھیں سجدہ اور عبادت کی قدر و قیمت کا احساس بھی نہیں ہوتا، وہ سجدہ جس کے لئے اقبال نے کہا ہے:

وہی سجدہ ہے لائق احترام ÷ کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

حضور قلب بڑی بات ہے، کاش ہم نماز حضور ذہن کے ساتھ پڑھنے لگیں تو ہمارے اخلاق و اطوار خود بخود سنور جائیں۔ نماز میں جو کچھ پڑھتے ہیں اس کا مفہوم ذہن نشیں ہونا چاہیے۔ ذہن تک بات پہنچ دیجیے، تان بالآخر دل پر ٹوٹے گی۔ فی الحال ہم نہ عبادت کا حق ادا کر رہے ہیں نہ عباد کا۔ خلق خدا کی خدمت اور معاملات میں راستی کو ہم نے ثانوی حیثیت دے رکھی ہے۔

خلق خدا کی خدمت کا جہاں تک تعلق ہے، یہ روایت ہمارے یہاں متروک ہو چکی ہے۔ بہت کم تنظیمیں ہمارے یہاں ایسی ہیں اور بہت کم افراد، جو سماج کی خدمت کے لئے میدان میں آئے ہیں۔ سوشل ورکر نام کی کوئی چیز ہمارے یہاں نہیں ہے۔ کیونکہ معاشرہ کی خدمت اور اصلاح کے جذبے نے ہمارے دامن دل کو چھوا تک نہیں۔ یہ کام سخت ہے، نفس کشی، جانفشانی، پامردی اور استقامت کا طالب ہے اور ہم صرف وقتوں کے ساتھ چونکتے ہیں۔ ہمارا مزاج "صحافی" وضع کا بن گیا ہے یعنی شہرت اور سنسنی والا مزاج۔ ملک کی اکثریت سے اپنا موازنہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں سنجیدگی، خاموشی اور محنت سے خلق کی خدمت کرنے والوں کا ہجوم ہے۔ ہمارے یہاں وہ معدوم ہیں۔ محنت اور خدمت کے بجائے یہاں سیاست کا چٹخارہ لگا ہوا ہے، چھوٹی اور ادنیٰ سیاست جو تبادلہ اور پرمٹ سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ جو ارباب اقتدار کے ٹکڑوں پر گزر کرتی ہے۔ ہماری قیادت ٹکاؤ نہیں بکاؤ ہے۔ اپنے آپ کو بازار میں لئے پھرتی ہے، جس کا سودا جو قیمت لگ جائے، قیمت

ہمارے مقامی رہنما ارباب اقتدار کا طواف کرتے رہتے ہیں اور انکی نگاہِ لطف کا انتظار۔ ملک گیر قیادت در کنار اب صوبہ کی سطح کے رہبر بھی ہمیں میسر نہیں۔ مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں اور کلیہ کو بنانے میں ان سے مدد ملتی ہے۔ بہرحال بہ حیثیت مجموعی ہماری رہنمائی حاضر باشوں اور خوشہ چینوں اور ہنگامہ خیزوں کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں احساس نہیں کہ کسی ملت یا جماعت کی تعمیر اور ترقی سیاست سے نہیں ہوتی، تعلیم، تربیت اور محنت سے ہوتی ہے۔ طاقت، امداد باہمی سے آتی ہے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نے صلہ رحمی کو بے دردی کے ساتھ ترک کر دیا ہے۔ تعلیم اور تربیت کے سلسلہ میں اپنے عزیزوں کی مدد کرنا ہمیں گراں گزرتا ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مقابلہ کیجئے تو مسلمانوں کی یہ خامی اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں مشترک خاندان کا تصور ابھی تک باہمی امداد اور مناسب پرداخت کا ضامن ہے۔ ہمارے یہاں سب کچھ انانیت کی طغیانی اور نفسی نفسی کے سیلاب میں بہہ گیا۔ ہمارے یہاں جو افراد ترقی کرتے ہیں ان سے نہ رہبری ملتی ہے، نہ مدد۔

اختلاف نے ملت کو دو نیم کر دیا ہے۔ ہم لوگ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ طبقہ جس نے دینی تعلیم پائی ہے، اور دوسرا وہ گروہ جس نے عام تعلیم انگریزی اسکولوں میں پائی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک وسیع کھائی ہے۔ گویا دونوں الگ الگ دنیاؤں میں رہتے ہیں، ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کھائی کو پاٹنا ہوگا۔ یہ کام بہت دشوار اور زہرہ گداز ہے۔ ایسا نہ ہوا تو ملت کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ دینی تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کا اہتمام کرنا ہوگا اور ان طلبہ کو جو عام اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں جز وقتی طور پر دین کی تعلیم دینا ہوگی۔ یہ نہ ہوا تو ایک دنیا کا نہ رہے گا اور دوسرا دین کا۔

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں ان برائیوں، کمزوریوں اور بیماریوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں خصوصاً شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے زوال اور پستی کے لئے ذمہ دار ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" کے مضامین شرح و بسط کے ساتھ ان کمزوریوں اور دوسری خرابیوں کا ذکر کریں گے اور ان کو دور کرنے کی عملی تجاویز سامنے رکھیں گے۔ حالات اور ان سے زیادہ ہماری کم مائیگی میں "تہذیب الاخلاق" دراڑ ڈال سکے گا یا نہیں، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس رسالہ کا اجراء اور احیا اسی امید کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ ہم ان حضرات سے اپیل کرتے ہیں بلا لحاظ مذہب و ملت جنھوں نے مسلمانوں کے مسائل پر غور کیا ہے جو ان کے انحطاط سے فکر مند ہیں کہ اصلاح کی اس مہم میں ہمارا ہاتھ بٹائیں، ہمارا حوصلہ بڑھائیں۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا تجربہ اور ولولہ کے تحت ہم اس رسالہ کی وضع میں ترمیم اور اس کی افادیت میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر ایک سے زیادہ زبانوں میں شائع کیا جائے۔ بہرکیف "تہذیب الاخلاق" کا مستقبل اور منفعت قارئین کرام کے تعاون اور مدد پر منحصر ہوگی۔

دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان مقاصد میں کامیاب کرے اور یہ رسالہ اصلاح اور ترقی کی ایک ادبی اور ملک گیر مہم کا ترجمان بن جائے۔ آمین

(عہد جدید کا پہلا شمارہ : یکم فروری ۱۹۸۲ء) ●●

# ہماری جذباتیت

ہندوستانی مسلمان سوچ بچار اور غور و فکر کے بجائے جذبات کی رو میں بہتے ہیں۔ جذبات کے طوفان کو روکنے کے لئے انسان کو خدا نے دو چیزیں دی ہیں۔ ایک عقل اور دوسرا ضمیر۔ یہ نہ ہوں تو انسان جانور سے بدتر ہوجائے۔ عقل انسان کو بُرے بھلے، نفع نقصان میں فرق کرنا سکھاتی ہے۔ جس وقت عقل نفس کی شہ پاکر اس کام کو انجام دینا بند کردیتی ہے، جب وہ لالچ اور ہوس کی غلام ہوجاتی ہے، جب وہ عداوت اور غصہ سے دھندلا جاتی ہے، تو وہ انسان کو دھوکا دینے لگتی ہے۔ اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا ثابت کردکھاتی ہے، تاکہ دل کی آرزو پوری ہوجائے، تاکہ ہوس کی پیاس بجھ جائے گویا پاسبان رہزن بن جاتا ہے اور فریب دینے لگتا ہے۔ ایسے آڑے وقت میں ضمیر آگے بڑھتا ہے، عقل کو گمراہی سے بچاتا ہے، زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ شاعر نے کہا تھا:

اب کوئی کس پہ اعتبار کرے  ؞  عقل ہے آرزو کی حلقہ بگوش

ایسے نازک لمحہ میں انسان صرف ضمیر پر اعتبار کرسکتا ہے۔ ضمیر ہی اس کی عقل کو اور خود اس کو تباہی سے بچاتا ہے۔ دل کی آواز اسے بھٹکنے سے روکتی ہے۔ اس کے سامنے ہوس کا چراغ نہیں جلتا۔ فریب خوردہ عقل کی منطق نہیں چلتی۔ ضمیر کا فیصلہ سخت ہوتا ہے، اس کا فیصلہ تلخ ہوتا ہے۔ اس کی بات ماننے کو کڑوے گھونٹ پینا پڑتے ہیں۔ بہت سی آرزوؤں اور امنگوں سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ اس لبریز جام سے بیتاب ہاتھ کھینچنا پڑتا ہے جو آپ کی دسترس میں ہے، آپ کے قبضہ میں، اب آیا، اب آیا۔ ضمیر کی بات ماننے کے لئے بڑا دل گردہ درکار ہوتا ہے۔ تمناؤں کی طغیانی، ہوس کا سیلاب، طمع کی شدت، عیش کی سرکشی، انتقام کی آگ کو یکلخت پیچھے کی طرف ڈھکیلنا ہوتا ہے۔ ان پر آنکس لگانا پڑتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے چابک سوار سرکش اور منہ زور گھوڑے کو رام کرتا ہے، یا سرکس کا ماہر درندوں کو زیرنگیں کرتا ہے۔ دراصل وہ چیز جو انسان کو حیوان سے جدا کرتی ہے بولنے کی طاقت یا نطق سے بھی زیادہ بُرے بھلے کو پرکھنے اور بُری خواہشوں اور میلانوں کو روکنے اور قابو میں رکھنے کی طاقت ہے۔

عام خیال ہے کہ وہ چیز جو انسان کو حیوان مطلق سے جدا کرتی ہے، بولنے کی طاقت یا نطق ہے۔

لیکن ہم یہ کہیں گے کہ وہ طاقت عقل ہے، وہ طاقت ضمیر ہے۔ عقل اس وقت، جبکہ وہ ہوس کے تابع فرمان نہ ہو، بھلائی کو برائی سے، اچھے بُرے اور مضر و مفید میں امتیاز کر سکتی ہے۔ عقل کی حدیں جب وہ جذبات کے گھیرے سے اوپر نکل جاتی ہے، جب وہ آرزو کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے، جب استدلال اس کی گرد راہ بن جاتا ہے، اس وقت عقل کی حدیں ضمیر سے مل جاتی ہیں۔ اس وقت اسی کو ضمیر کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جب عقل ہوس کی غلام ہوتی ہے اور خلش، عداوت، نفرت کی آلۂ کار، تو اسے چالاکی اور مکاری کہتے ہیں۔ اس وقت فریب اس کا شیوہ ہوتا ہے۔ وہ راہ نہیں دکھاتی، گمراہ کرتی ہے اسے عقل سفلی بھی کہہ سکتے ہیں۔ غرض کہ عقل جب ضمیر سے ملتی ہے، تو وہ عقل علوی بن جاتی ہے اور جب جذبات کے ساتھ شیر و شکر ہوتی ہے، تو عقل سفلی۔ یہ عقل سفلی ہے جو بُرے کاموں کے لیے طرح طرح کی تاویلیں کرتی پھرتی ہے۔ یہ ضمیر کو خاموش کرنے کی ترکیبیں ہیں۔ لیکن ضمیر اس بیج کی طرح ہے جو برف پوش زمین میں مہینوں دبا رہنے کے بعد انکر کے پر و بال نکالتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں انکر موسم بہار میں نکلتے ہیں، ضمیر میں انکر موسم خزاں میں یعنی جب جوانی، دولت اور جاہ و اقتدار کا نشہ اترنے لگتا ہے۔ قویٰ میں اضمحلال آجاتا ہے اور انجام کی فکر دامن گیر ہوتی ہے تو وہ برائیاں، وہ بداعمالیاں وہ ناانصافیاں جنھیں عقل نے بھلا کر کے دکھایا تھا، کھٹکنے لگتی ہیں۔ ایک آن چین نہیں آتا۔ اس دن سے ڈرنا چاہیے۔ وہ دن جب نہ تلافی مقدور ہوتی ہے نہ ازالہ۔ وہ دن ہم سب کو دیکھنا ہے۔ جس کسی نے اپنی عنان جذبات کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ اس دن اس کو ایک لمحہ چین نصیب نہیں آتا۔ جو کوئی عقل اور ضمیر سے جذبات کا عنان گیر ہوا تھا، اس کا یہ دن بلکہ سب دن آسان اور بے خلش گزرتے ہیں۔ وہ زندگی کا سفر سر اٹھا کر، سینہ تان کر بے نیازانہ طے کرتا ہے۔ اس کی خاطر ہمیشہ شگفتہ رہتی ہے۔ انسان کے بہت سے میلانات اسے بدی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہوس اسے چین لینے نہیں دیتی ہے۔ ہمسایہ کے چمن کے پھول کو دیکھ کر اسے آرزو ہوتی ہے کہ اسے چرا کر اپنی دستار میں سجا لے۔ اس سے ساری برائیاں شروع ہوتی ہیں۔ انھیں چاہے زر، زن، زمین کی طلب کا نام دیجیے، جس کو حاصل کرنے کے لیے جھوٹ، فریب اور ظلم روا رکھا جاتا ہے، چاہے انھیں حسد اور جلن کہیے۔ بُرے میلانات اور تیز و تند جذبات انسان سے وہ کچھ کرا لیتے ہیں، جنھیں اگر وہ غور و فکر کرتا تو ہرگز گوارا نہ کرتا، جو اس کی اخلاقی گراوٹ اور پشیمانی کا سبب بن جاتے ہیں۔

انسان خود بھی اس چراغ کی طرح ہے جو ہوا کی زد میں ہو۔ ایک طرف اسے تند و تیز میلانات کا، دوسری طرف تحت الشعور کے جوالا مکھی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان پر قابو پانا بڑی مردانگی کا کام ہے۔ ان سرکش میلانات

کو دیکھتے ہوئے جذبات سے کمک پہنچانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ تعزیری زبان میں اسے اقدام خودکشی کہیں گے جہ
بریک لگانا ہو، وہاں پر ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ دینا مہلک حادثہ کو دعوت دینا ہے۔ آگ لگ گئی ہو تو اسے بجھانے کے
بجائے پھونک دینا نری سوز رکھتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ افراد کے لئے جذبات آمادگی کتنی ضرر رساں ہے۔ اس سے زیادہ نقصان دہ
جماعتوں کے لئے ثابت ہوتی ہے۔ ایک فرد جو جذبات کے سیلاب میں بہ رہا ہو کبھی کبھی سنبھل بھی جاتا ہے۔ لیکن
ایک جماعت جسے جذبات کی باڑھ بہالے گئی ہو، نہ سنبھل سکتی ہے نہ چٹان کی طرح قدم گاڑ سکتی ہے۔ جماعت کا ہر
فرد رَو میں پھنس کر ایک دوسرے کو دھکیلتا ہے اور اس سے وہ تُند روی وہ مومینٹم پیدا ہوتا ہے جو کسی گرفت کو
روک کو قبول نہیں کرتا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے اس کی بہتری گھٹتی جاتی ہے، جسے میانہ روی ایک آنکھ
نہیں بھاتی، وہ سلامت روی سے بیگانہ رہتا ہے۔

جذبات پرست لوگ ریاضت سے جی چراتے ہیں۔ کوئی بات جم کر نہیں کر سکتے۔ جد اور مداومت اور مقاو
سے گریز کرتے ہیں۔ پِتّہ مارنا اور پسینہ بہانا اُن کے بس کی بات نہیں اور دونوں کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا
کوئی عمارت بغیر اینٹ پر اینٹ رکھے کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ یہ عمل تدریجی، صبر آزما اور دیر طلب ہے پہلے
ضروریات کا تعیّن ہوگا پھر خاکہ بنے گا، پھر نیو کھُدے گی، پھر مسالے سے ایک رَدّے پر دوسرا رَدّا جما کر دیوار
کھڑی کی جائے گی، اس پر پلاسٹر ہوگا۔ یہ سب عقل کی قلمرو ہے۔ یہ سب عقل کے بغیر ناممکن ہے۔ عقل آگے کے لئے
سوچتی ہے اور اس کے لئے تیاری کرتی ہے۔

اب جذبات کی سُنئے۔ وہ یا تو بنیاد ہی کو بہالے جائیں گے یا سرے سے نیو کھُدنے ہی نہ دیں گے۔
عمارت کا کیا ذکر۔ اور یہی راز ہندی مسلمانوں کی پسماندگی کا ہے۔ انھوں نے جذبات کی خاطر عقل سے دست کشی اختیار
کرلی۔ مسئلہ چھوٹا ہو یا بڑا ہمارا ردِّ عمل جذباتی ہوگا۔ ہم عقل کو موقع ہی نہ دیں گے کہ اونچ نیچ دیکھ سکے اور راستہ دکھا سکے
جذبات کی دلدل میں لوٹنا ہم نے ایک یہی کام سیکھا ہے۔ عقل سے کنارا کشی کرنا ہی ہمارا شیوہ ہے۔ یہ سودا ہم کو
بہت مہنگا پڑ رہا ہے۔ اس سے آسان کوئی طریقہ نہیں کہ جذبات جدھر بہالے جائیں بہتے چلے جائیں۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جذبات شرِ محض ہیں۔ سوال ان کو قابو میں رکھنے کا ہے۔ ان کو بھٹکنے سے بچانے
کا ہے، انھیں بے اعتدالی سے روکنے کا ہے۔ اس کے لئے عقل بھی درکار ہے، ضمیر بھی۔ کوئی شخص آپ کے در
آزار ہوتا ہے۔ سیدھا سادہ آسان ردِّ عمل یہ ہے کہ عداوت کا جواب عداوت سے، جراحت کا جواب جراحت سے

دیا جائے۔ آپ کو اُس نے نقصان پہنچایا ہے اس کا بدلہ لیا جائے۔ آپ بھی اس کی گھات میں رہیے۔ موقع ملے، تو بھرپور وار کیجیے۔ اس سے جذبات کی تشفی ہو جائے گی۔ لیکن نفرت، عداوت اور خوں ریزی کا سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا اور آپ محض دیکھا دیکھی، محض غضب کی حالت میں وہی بُرائی کر بیٹھیں گے جو آپ کے ساتھ کی گئی۔ دشمن کو اس سے بڑھ کر داد کیا دی جا سکتی ہے کہ اس کے کام کی اس کے طرزِ عمل کی تقلید کی جائے۔ لیکن عقل ساتھ دے جائے، ضمیر یاور ہو، بصیرت راستہ دکھائے، تو ایک دوسرا ردِّ عمل بھی ممکن ہے۔ یعنی عداوت کا جواب رافت، دشمنی کا جواب دوستی، نفرت کا جواب بُردباری سے دینا۔ یہ کام دشوار ہے لیکن کام کرنے کا یہی ہے۔ اسی روش کی وجہ سے تہذیب کو ترقی ہوئی، انسانیت کو فروغ ہوا۔ غور کیجیے، تہذیب دراصل جذبات کی عنان گیری اور ان کے ارتفاع کا نام ہے۔ ہم ادنیٰ کو اعلیٰ، سفلی کو علوی بنا سکتے ہیں۔ اگر اسے انسانی فطرت کا جوہر سمجھا جائے تو ہم کہیں گے کہ بنیادی طور پر بحیثیت حیوان کے ہمارے میلانات، ہمارے محرکات، ہوس، طمع، انانیت، جور اور استیلا سے عبارت ہیں۔ عقل اور ضمیر انھیں بھٹی میں پگھلا کر بے غرضی، بے نفسی، رحم اور ایثار میں بدل دیے ہیں۔ یہ تجربہ کہ انسان کو اس کی فطری حالت پر چھوڑ دیا جائے، مضحکہ خیز ہے۔ ایسا کر کے دیکھیے وہ ایک دوسرے کو پھاڑ کھائے گا۔ تہذیب کی نگہبانی کے باوجود اب بھی جب اسے موقع ملتا ہے، وہ پاسبان کو مغلوب کر کے باہمی قطع و برید کے بھیانک مشغلے سے دل بہلاتا ہے۔ تہذیب کی راہ توازن اور اعتدال کی راہ ہے۔ یونانیوں کے اس نظریہ میں عملی صداقت ہے کہ خوبی وسط میں ہوتی ہے اور اس میں زیادتی اور کمی افراط و تفریط اس کے دائیں بائیں بُرائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً شجاعت یعنی بہادری خوبی ہے۔ شجاعت کی کمی ہو تو جُبن یا بزدلی میں بدل جاتی ہے، بُرائی بن جاتی ہے۔ اس شجاعت میں زیادتی ہو، شجاعت اعتدال سے تجاوز کر جائے تو اُسے تہور کہتے ہیں یعنی وہ بہادری جس میں بے ضرورت، خطر طلبی اور جارحیت شامل ہو۔

جذبات اور میلانات کے اشارے پر چلنے والے کبھی جم کر محنت نہیں کر سکتے۔ وہ عقل اور ضمیر کی رہبری کے علاوہ ریاضت اور استقامت سے بھی محروم رہتے ہیں اور بغیر ریاضت اور استقامت کے کوئی فرد آگے نہیں بڑھ سکتا، کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ یہ بات اس زمانہ میں اور صادق آتی ہے جبکہ ہمارا سابقہ زہرہ گداز مقابلے سے ہے۔

یہ سچ ہے کہ جذباتیت کسی قوم یا گروہ کو متحد بھی کر دیتی ہے۔ مگر یہ اتحاد چند روزہ ہوتا ہے۔ چڑھی ہوئی ندی کے اُترنے میں دیر نہیں لگتی۔ باڑھ پیچھے ہٹتی ہے تو دُور تک کشتِ امید کی بربادی کا سماں دکھائی دیتا ہے۔

تند و تیز شعلے بجھتے ہیں تو اپنے پیچھے راکھ کا ڈھیر چھوڑ جاتے ہیں۔ ہر طرف خاک اڑنے لگتی ہے۔ یہی نہیں مزاج پر جذباتیت کا غلبہ ہو تو ہر فرد وقتی جذبے کے تحت مختلف سمت میں چلے گا۔ قدم ملا کر چلنا، اشتراک عمل، تعمیر کے لیے تعاون مشکل ہو جائے۔ اسی کو افراتفری کا عالم کہتے ہیں۔ یہی نفسی نفسی کا سماں ہے، یہی جذباتیت کی دین ہے۔ یہی اقوال و ملل کے زوال کا پیش خیمہ ہے۔

ہم جوشِ ناآسانی کے طلسم میں گرفتار ہیں۔ موقع پاتے ہی اپنی عنان جذبات کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ جذبات کے ساتھ جہاد کرنا، میلانات پر انکس لگانا، خواہش کو ضابطہ کی قید میں لانا، استخوان گداز تمناؤں کو ٹھنڈا کرنا، نفس امارہ کو مارنا، یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ ہر اس کام سے جو آسان نہیں ہے جی چراتے ہیں۔ عقل عنان کھینچتی ہے، ضمیر سخت گیری کرتا ہے، دونوں ہی کا جنجال بن جاتے ہیں، ان کو نہیں بھٹکنے دیں گے۔ ہمیں یکسوئی کوئی کھلتی ہے، ہمیں فراغت کوئی ناگوار ہے، ہمیں کیا ہے کوئی بیر ہے کہ عقل اور ضمیر کو پاس آنے دیں۔ ہمارے لیے جذبات کافی ہیں۔ ان کی رو میں بہنا کسے بُرا لگتا ہے، بے سدھ ہو کر لہروں میں بہتے چلے جاتے ہیں۔

اپنوں میں جہاں کہیں نفاق دیکھیے گا، اور یہ کہاں نہیں ہے، اس کا منبع مجروح انا اور زود مشتعل جذباتیت میں پائیے گا۔ تحریکوں اور اداروں کو دیکھیے، وہ کامیاب اور خوش حال ہوئے حسد اور ہوس کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ادارہ اور تحریک کا مستقبل خاکستر ہو گیا۔ خانہ جنگی اور دھینگا مشتی کی نذر آبرو بھی ہو گئی اور عافیت بھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں زر کا ظرف نہیں، زر ہمیں راس نہیں آتا۔ یہ بھی ایک عنوان بے تعبیر ہے، اور "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" کی جب تک شان امارت میں اس کا سما رہا، ہم زندہ رہے۔ اب امارت ہم کو راس نہیں آتی کہ اس میں فقر کا شائبہ باقی نہ رہا۔ اس کی عبرت ناک مثال اس دولت میں ملے گی جو شرق اوسط کو پٹرولیم سے حاصل ہوئی ہے اور پٹرو ڈالر کہلاتی ہے۔

لیکن اس دور میں وسائل کے بغیر کام ہی نہیں چلتا۔ ضرورت صرف اس بات

کی ہے کہ ہم مسائل کے غلام نہ بنیں، ان کے امام بنیں۔ جذبات ہم پر مستولی نہ ہوں، ہمیں جذبات پر استیلا حاصل ہو۔ خدا ہمیں جذباتی مزاج سے نجات دے۔

آیئے ہم ارزاں جذباتیت کے خلاف علم جہاد بلند کریں، تن آسانی اور خود فراموشی اور بے خودی سے دامن بچائیں؛ جانکاہی، جاں فشانی، عرق ریزی سے عقل کو جلا بخشیں؛ صلاحیتوں کو چمکائیں۔ ہمیں ضرورت ہے بصیرت بردوش عقل کی اور ایسے ضمیر کی جو کائنات کو محیط ہو۔

ہمیں چاہیے کہ اپنے بچّوں کو ایسی تربیت دیں کہ ان کا ردّ عمل جذباتی ہونے کے بجائے عقلی، ان کی گفتگو پُرجوش ہونے کے بجائے مدلّل ہو۔ وہ سادہ دلی سے ہر بات کو باور کرنے کی جگہ تحقیق کے خوگر ہو جائیں۔ ہر بات، ہر افواہ، ہر دعوے کو پہلے عقل کی کسوٹی پر پرکھیں، پھر اس پر یقین کریں۔

●●

# زبان کا چٹخارہ

زبان کے چٹخارے نے ہمیں دو طرح سے گھائل کیا۔ ہماری زبان کترنی کی طرح چلتی رہتی ہے، جو کوئی اس کی زد میں آجائے اُسے کاٹتی ہوئی۔ ہم گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہی ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ گھنٹوں باتیں ہوں گی تو مجروح کون ہوگا۔ پہلے تو خود وقت عزیز جس کا کوئی بدل نہیں۔ اس کے بعد حقیقت جس کا اس طرح کی بات چیت سے خون ہوتا ہے اور آخر کار خود وہ لوگ جو گفتگو کا موضوع بنے ہوں۔ اسے جہالت یا تن آسانی کا ثمرہ کہیے کہ ہماری گفتگو، مسائل پر کم ہوتی ہے، افراد پر زیادہ۔ مسائل پر گفتگو کے لیے غور و فکر اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ افراد کے تذکرے کو اس قسم کی ریاضت درکار نہیں ہوتی۔ عیب جوئی، نکتہ چینی اور مذمت کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ یاوہ گوئی، ہرزہ سرائی، الزام تراشی اور طنز و استہزا ہم سے بداہتہً سرزد ہوتے ہیں اور ہماری محفل کو گرماتے ہیں۔ زبان کو بہتان اور اتہام، دشنام طرازی اور داستان سرائی کی چاٹ لگ جاتی ہے جو چھڑائے نہیں چھوٹتی۔ اس کا انجام تلخی، عداوت، جراحت اور کدورت ہوتا ہے۔ ہر طرف کی طرف سے جوابی وار کیا جاتا ہے اور سب و شتم کا اخلاق سوز سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر زبان کے کہنے پر نہ چلتے۔ اگر زبان کو قابو میں رکھتے، اگر اس کا استعمال گاہ بگاہ نہ کرتے۔ اگر زبان کو احتیاط، اختصار اور سلامت روی کا عادی بنا لیتے تو نہ کسی کو ایذا پہنچتی، نہ کوئی تلملاتا، نہ پھوٹ پڑتی اور نہ بے سبب عداوت کے دروازے کھلتے۔ زبان جیسی چھوٹی سی چیز کتنے فتنوں کو جنم دے سکتی ہے۔ زبان کے ذریعہ نفاق کے صدہا باب کھلے ہیں، وہ بے سبب حرکت میں آئی اور انتشار کے چشمے پھوٹے!

زبان کے غلط استعمال کا ناتا فرصت اور بیکاری کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جو لوگ کاموں میں مصروف رہتے ہیں اُن کے پاس اس کا وقت کہاں کہ دوسروں کی ٹوہ میں رہیں، ان پر نکتہ چینی کریں اور اُن پر تہمت دھریں۔ جو لوگ اپنے فرائض کو ایمانداری کے ساتھ انجام دیتے ہیں، جو فرائض کا حق ادا کرتے ہیں، اُن کے ذہن اور زبان کے دامن لغویات اور خرافات سے لامحالہ بچے رہتے ہیں۔ جو لوگ زیادہ بولتے ہیں انھیں بیشتر مواد جھوٹ سے ملتا ہے۔ سچ ایک سیدھی لکیر کی طرح ہے۔ جھوٹ کی راہیں بے شمار ہیں۔ حقیقت عناں بستہ، دروغ عناں گسستہ ہے۔ زیادہ بولنے والے تنگنائے حقیقت میں محدود نہیں رہ سکتے، اس میں ان کا دم گھٹتا ہے۔ سچی بات کو سیدھے سادے

انداز سے کہہ دیجئے تو کون کان دھرے گا۔ ہاں چٹپٹی بات کہیئے جس میں دروغ کا مسالہ، استہزا کا نمک مرچ اور مبالغہ کی چاشنی ہو تو سب لوگ کام چھوڑ کر سننے لگ جائیں گے۔ اس عادت میں معاشرے کی خرابی اور فطرت کی کجی دونوں کو دخل ہے۔ بہرکیف جو شخص بُرائی کی طلب کی تشفی کرتا ہے وہ بُرائی کو فروغ اور بُرائی کے ذوق کو بڑھاوا دیتا ہے۔

سننے والوں پر اس کی براہ راست ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ غیبت، اتہام اور استہزاء پر کان نہ دھریں تو ایسا کرنے والوں کے حوصلے پست ہو جائیں اور وہ بتدریج بادل ناخواستہ سچائی، سنجیدگی اور احتیاط کی راہ پر واپس آ جائیں۔ ہمارا یہ عالم ہے کہ ہر بات کو جس میں کسی کی بُرائی ہو، شوق سے اور مزے لے کر سُنتے ہیں اور بیدریغ سامعہ اور دل کو آلودہ کرتے ہیں۔ غلاظتوں کو غذا بنانا کتنی بڑی نادانی ہے۔ کوئی ایسا کرتے ہوئے نظر آئے تو ہم کراہت سے منھ پھیر لیں۔ لیکن بُری بات ہم کس رغبت اور چاؤ کے ساتھ سنتے ہیں اس غلاظت کو ہم کیونکر برداشت کرتے ہیں اور نہ منفعل ہوتے ہیں اور نہ بدحظ۔ لوگوں کو بدزبانی، دراز نفسی اور دریدہ دہنی سے روکنے کا طریقہ یہی ہے کہ ایسی باتیں سُن کر ہی چیں بر جبیں اور ایسی صحبتوں سے کنارہ کش ہوں۔ ورنہ کچھ عرصہ کے بعد ہمارا ذوق سماعت اس قدر مسخ ہو جائے گا کہ پاکیزہ، سنجیدہ اور سیدھی سچی بات سننے کو ہم تیار نہ ہوں گے۔ ہمارے کان اور ہمارا ذہن چٹپٹی اور صحت سوز غذا طلب کرے گا۔ "ھل من مزید" کی صدا بلند ہوگی، یعنی دروغ اور مزید دروغ، مبالغہ اور شدید مبالغہ، کینہ اور متواتر کینہ، غبار اور گھنگھور غبار۔ بُرائی سننا بند کیجئے، بُری باتیں کرنے والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ اس نوع کی شکوہ سنجی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ "ہمارا سماج اس قدر بگڑ گیا ہے، اس کا ذوق اتنا مسخ ہو گیا ہے کہ اچھی باتیں، کام کی باتیں سننے کے لئے کوئی تیار نہیں، مزاج غیبت کے لذّت آشنا اور خوگر ہو گئے ہیں"۔ سماج کی اصلاح ہم نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔ ہم سب اپنی اصلاح شروع کریں، معاشرہ خود سنبھل جائے گا، سُدھر جائے گا۔ "مردے از غیب" کا ذکر اور اس کے آنے کی امید ایک حیلہ ہے جو کاہلی اور تن آسانی تراشتی ہے۔ جس محفل میں مجنونی مذمت، بے حس عیب جوئی اور بے درد نکتہ چینی کا دور دورہ دیکھئے، وہاں سے اُٹھ جایئے۔ اور اگر اس خاموش احتجاج کی ہمت نہیں ہے تو گفتگو کا رخ بدل دیجئے۔ بدگو بزدل ہوتا ہے، ورنہ پیٹھ پیچھے بُرائی کیوں کرتا۔ اشارہ نہ سمجھے تو فہمائش کیجئے۔ جس طرح رشوت دینا اور رشوت لینا دونوں جرم ہیں اسی طرح تہمتوں اور نکتہ چینیوں پر کان دھرنا اور تہمت لگانا اور نکتہ چینی کرنا دونوں گناہ ہیں۔ بعض لوگ تہمت

اس لئے لگاتے ہیں کہ وہ کسی کے درپئے آزار ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک ہولناک مقصد ہوتا ہے۔ ہمارا روئے سخن اس وقت اُن لوگوں کی طرف نہیں ہے۔ یہاں ذکر ان لوگوں کا ہے جو بغیر کسی عناد کے صرف زبان کے چٹخارے کے لئے غیبت اور بہتان سے دل بہلاتے ہیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ زبان کا گھاؤ کتنا گہرا ہوتا ہے اور شہر تیں کتنی آسانی سے مسمار ہو سکتی ہیں اور پھوٹ کتنی جلدی ڈالی جا سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہے۔ ہمارے مسلم معاشرے نے اس عادت کو خصوصاً بڑھاوا دیا ہے۔ بیکاری، ناعاقبت اندیشی اور خود داری کے سایہ میں یہ بُری عادت پروان چڑھی ہے۔ اس کو فروغ ہماری جذباتیت سے ملا ہے۔ عقل عناں کھینچتی ہے اعتدال اور میانہ روی کی تلقین کرتی ہے۔ اس کے برعکس جذباتیت غلو کی طرف لے جاتی ہے۔ جذباتیت ہمیں آمادہ کرتی ہے کہ اس شخص یا ادارہ کی بابت جس سے ہم بدظن ہیں، ہر مبالغہ آمیز برائی بغیر پرکھے باور کرلی جائے اور اس اتہام کو دوسروں تک بڑھا چڑھا کر پہنچا دیا جائے۔ مبالغہ جھوٹ کا ہراول دستہ ہے اگر یہ سامنے آگیا تو جھوٹ بھی زیادہ پیچھے نہ رہے گا۔

زبان کے چٹخارہ میں ایک خرابی اور ہے۔ اس کے زیر اثر ہم قول کے سحر میں اس طرح گرفتار ہو جاتے ہیں کہ اسے فعل کا بدل سمجھنے لگتے ہیں۔ بات کرنے کی عادت بڑھتی ہے تو کام کرنے کی عادت گھٹتی چلی جاتی ہے ایسا شخص بہت سی باتیں روانی کے ساتھ کہہ جاتا ہے۔ باتوں کے دوران مضمرات کا جائزہ لئے بغیر وعدے کر لیتا ہے۔ اسے یاد بھی نہیں رہتا کس وقت میں نے کس سے کیا بات کہی تھی، کیا وعدہ کیا تھا۔ بات کی لاج نہیں رکھی جاتی۔ وعدہ وفا نہیں ہوتا تو انسان نظروں سے گر جاتا ہے۔ اس کی شخصیت میں وزن نہیں رہتا۔ کم کہو اور اس پر جم کر رہو، بجائے اس کے کہ زیادہ کہو اور کم کرو۔ آخرالذکر سے ساکھ ختم ہو جاتی ہے شخصیت میں کچھ باقی نہیں رہتا۔ زیادہ بولنے والا ہمیشہ ٹوٹے میں رہتا ہے۔ لوگ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اس میں کارکردگی، ایفائے عہد اور تکمیل منصوبہ کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اُس کے ظاہر اور باطن کے درمیان طویل فاصلہ حائل ہو جاتا ہے۔ اب کیا دیر ہے، شخصیت دونیم ہو کر رہے گی۔

غور کیجئے، زبان کے چٹخارہ کی خاطر ہم دوسروں کو جراحت پہنچاتے ہیں، اُن کی دل شکنی کرتے ہیں، اپنوں اور بیگانوں میں پھوٹ ڈالتے ہیں، اپنی اجتماعی طاقت کو زک دیتے ہیں، اور خود اپنی شخصیت کے خلوص، توانائی اور سالمیت کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ خدا ہمیں زبان کے چٹخارے سے بچائے۔

انسان کو حیوان سے جدا کرنے کے لئے، اسے حیوان ناطق کہتے ہیں، یعنی وہ جانور جو گویائی رکھتا ہو۔

نطق کے شانہ بشانہ عقل اور استدلال کا تصور بھی ہے۔ غیرت کا مقام ہے کہ انسان جس کا مابہ الامتیاز نطق ہے اس کا غلط استعمال کر کے حیوانوں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ گویا دو دھاری تلوار ہے، اس سے ظلم و جہل، نفاق اور شر کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے اور اُن میں اضافہ بھی۔ زبان کے چٹخارہ سے البتہ فساد کا اندیشہ زیادہ ہے اصلاح کی امید کم۔

یہی زبان کا چٹخارہ تھا جس نے ایک عرصے تک اردو نظم و نثر کو گمراہ کیا۔ ہماری توجہ معانی و مفاہیم سے زیادہ الفاظ و عبارت پر جانے لگی۔ الفاظ کے شکوہ، عبارت آرائی، رعایت لفظی، تکلف اور تصنع کے طلسم میں اردو ادب گرفتار ہو گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے، معنویت کا خون ہوا۔ یہی نہیں ادب کے متوازن ارتقا اور اس کی سالمیت کو ٹھیس پہنچی۔ شکر ہے کہ اس دور سے ہم نکل چکے ہیں۔ حتیٰ کہ مشاعروں میں بھی الفاظ کے دروبست سے زیادہ شعر کے معنوی جمال کو ستائش کا خراج ملنے لگا ہے۔ الفاظ نے جس طرح ہمارے ادب میں باطنی اوصاف کو پس پشت ڈالا، اسی طرح ہماری شخصیتوں میں گفتار نے کردار کی جگہ لے لی۔

زبان کے چٹخارے کا دوسرا پہلو کم مضرت رساں ثابت نہیں ہوا یعنی ایسی غذا کا استعمال جس میں مرچ مسالا اور روغن کی افراط ہو۔ ایسے کھانوں سے آنتوں، آنکھوں اور عام صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ مرغن کھانے دل کے لئے سخت مضر ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں جب کہ جسمانی ورزش کا رواج اور مواقع کم ہوتے جاتے ہیں، یہ کھانے ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر اتفاقاً سنگین امراض سے بچے بھی رہے تو یہ نقصان کیا کم ہے کہ جسم سست پڑ جائے اور ذہن دھندلا جائے، اور قوتِ عمل گھٹ جائے اور ہوس کو مہمیز لگے اور ان سب پر مستزاد وہ بپتا جو ان لذائذ کی تیاری میں خواہ وہ مرچ مسالے والے سالن ہوں، خواہ مرغن حلوے، ہماری خواتین پر پڑتی ہے۔ وہ وقت جو وہ بچوں کی تربیت پر صرف کرتیں مردوں کے کام و دہن کی تشفی کی نذر ہو جاتا ہے۔ خود ان کے ارتقا اور ذوق کی ترقی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری نصف آبادی طباخی پر مامور ہے۔ بچوں کی تربیت کے لئے وقت، یکسوئی اور علم و صلاحیت درکار ہیں، یہ سب زبان کے چٹخارے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ مسلمان بچے ذہنی طور پر ہندوستان کے دوسرے بچوں سے کم نہیں لیکن تعلیمی اعتبار سے وہ اُن سب سے بہت پیچھے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے اُن کی مائیں نہ اپنی تعلیم کو اور نہ اُن کی تربیت کو وقت دے سکتی ہیں اور اس زمانہ میں جب کہ طلبا کی تعداد اور اُن سے اساتذہ کی بے تعلقی بڑھ گئی ہے امید یہ کی جاتی ہے کہ بچے زیادہ کام گھر پر ماں باپ کی نگرانی میں اور ان کی مدد سے کریں گے۔ ہمارے یہاں باپ روایتی طور پر بچوں کی تعلیم سے بے نیاز ہے، ماں تعلیم دینا چاہتی ہے، بچے کے ہوم ورک میں اس کی مدد کرنا چاہتی

ہے مگر یا تو اس کے پاس وقت نہیں یا علم نہیں۔ اگر ہمارے مرد سادہ کھانے پر قناعت کرتے تو عورتیں خود بھی پڑھ سکتیں اور بچوں کو بھی پڑھا سکتیں۔ پھر ان بچوں کو ہوم ورک نہ کرنے کی وجہ سے آئے دن کلاس میں خفت نہ ہوتی۔ خفت سے حوصلہ مجروح ہوتا ہے اور حوصلہ مجروح ہوا تو دوسری صلاحیتوں پر بھی ضرب لگتی ہے۔ آج کل ضابطہ کی پڑھائی سے بھی زیادہ اہم وہ پڑھائی ہے جو انسان اپنے گھر فرصت کے اوقات میں کرتا ہے۔ گویا پڑھنے اور سیکھنے اور خود کو ترقی اور جلا دینے کے سلسلہ کو عمر بھر جاری رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہماری عورتیں جو مردوں کی لذّتِ کام و دہن کی اسیر ہوئی ہیں، اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ان کا بیشتر وقت باورچی خانہ میں گزر جاتا ہے۔ چولھا جلانے، مصالحے پیسنے، آٹا گوندھنے، برتن مانجھنے اور کھانا پکانے میں ان کا سارا وقت چلا جاتا ہے۔ کھانے کے ذائقے میں ذرا سی کسر رہ گئی اور شوہر نے گھر سر پر اٹھا لیا۔ ہماری عورتیں جنھیں اسلام نے مردوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا، کنیزوں اور مزدوروں کی طرح سے خدمت اور محنت پر مامور ہیں۔ انھیں وہ لمحات ملتے ہی نہیں جنھیں وہ اپنا کہہ سکیں جن سے وہ سکون حاصل کر سکیں اور جنھیں وہ اپنے ارتقا کے لئے صرف کر سکیں۔ چھوٹے سے تنگ مکان اور دھوئیں سے بھرے ہوئے باورچی خانہ میں گھٹ گھٹ کر عمر گزارنے کا اثر ظاہر ہے کہ صحت پر کس قدر ناخوشگوار پڑتا ہوگا۔ ان کا سارا وقت اس غذا کی تیاری میں گزر جاتا ہے جو اثرات کے لحاظ سے زہر اور افیون کا آمیزہ ہے۔ اس افیون کا اثر فوراً ظاہر ہوتا ہے اس زہر کا دیر سے۔ چٹورا پن اسراف کی طرف لے جاتا ہے۔ آمدنی سے زیادہ خرچ کی ترغیب دیتا ہے۔ ہمارے یہاں مقابلہ ہوتا ہے۔ کسی نے کسی کی دعوت کی، کسی نے سادگی برتی، تو اس کی شامت آگئی وہ نکّو بن جاتا ہے۔ کنجوس مکھی چوس حتیٰ کہ منحوس کہلاتا ہے۔ ہمارے یہاں کفایت شعاری سے بڑا کوئی عیب اور عاقبت اندیشی سے زیادہ کمیاب کوئی وصف نہیں۔ یہ مزاج یہ افتادِ طبع زبان کے چٹخارہ کی دین ہے۔ سادگی زبان سے شروع کیجئے۔ بتدریج طبیعت میں سرایت کر جائے گی۔ بڑائی سادگی میں ہے، تکلّف میں نہیں۔ بڑائی خواہشات پر قابو پانے میں ہے، ان سے زیر ہو جانے میں نہیں۔ بڑائی کفایت شعاری میں ہے، نام و نمود کے لئے فضول خرچی میں نہیں۔ اسراف نے ہمیں اقتصادی طور پر کھوکھلا کر دیا ہے۔ لیکن ہم ابھی تک اسی کے گن گائے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم زبان کے مارے ہوئے ہیں۔ چٹخارے نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

ہماری غذا کے مضر اثرات سے قطع نظر اس کا منفی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم اس سادہ متوازن اور صحت بخش غذا سے محروم رہ جاتے ہیں جو جسم اور دماغ کے لئے ضروری ہے۔

کھانے میں تھوڑی سی اصلاح کر لیجئے۔ زبان کے چٹخارے سے منہ موڑ لیجئے۔ زندہ رہنے

کے لئے کھائیے، کھانے کے لئے زندہ نہ رہئیے۔ جلد ہی آپ ایک خوشگوار انقلاب کے روبرو ہوں گے۔ یہ نظام آپ کی صحت اور توانائی، چستی اور چابکدستی، آپ کی عورتوں کی صحت، یکسوئی، علمی اور ذہنی پیش رفت اور آپ کے بچوں کی نشو ونما اور تعلیم و تربیت اور ترقی کا ایک حد تک ضامن ہو جائے گا۔

خدارا زبان کے چٹخارے سے بچیے، خواہ اس کا تعلق نُطق سے ہو، خواہ ذائقہ سے۔ لفاظی اور چٹورپن دونوں نے ہمیں شدید نقصان پہنچایا ہے۔

••

# سامری پھر کوئی سرگرمِ فسوں ہے شاید

سعدیؒ نے کہا تھا کہ : "خوش بخت آں کہ خورد و کشت و بدبخت آنکہ مرد و ہشت"۔

جو کھاتا رہا اور بو کر گیا وہ خوش نصیب (جو جمع کرتا رہا اور) چھوڑ کر مرا وہ بدنصیب۔ یعنی زر کا مصرف یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں کو پورا کرے اور حاجت مندوں کی مدد کرے۔ جس نے ایسا نہیں کیا اور دولت جمع کرنے میں لگا رہا، وہ زر کا غلام بن گیا۔ اس کی حالت یونانی کردار "ٹین ٹے لس" کی سی ہے، جو پانی میں گھرا ہونے کے باوجود پیاس بجھانے سے محروم رہا۔ ایسے شخص کے لئے روپیہ مقصد بن جاتا ہے، وہ روپیہ جو دراصل صرف ایک وسیلہ ہے ضروریات پورا کرنے کے لئے۔ روپیہ اس پر حکومت کرنے لگتا ہے۔ وہ روپیہ کے اشاروں پر چلتا ہے۔ جس کسی میں عزتِ نفس ہوگی وہ روپے کی غلامی کیوں کرنے لگا۔ لیکن ہم آئے دن یہ تماشا دیکھ رہے ہیں کہ اچھے بھلے، شائستہ مہذب لوگ دیوانہ وار زر کا تعاقب، زر کا طواف، زر کی پرستش کرتے رہتے ہیں۔ اس تعاقب، طواف اور پرستش میں وہ عزتِ نفس گنوا بیٹھتے ہیں، انسانیت سے ہاتھ دھو لیتے ہیں، قدروں سے منھ موڑ لیتے ہیں۔ اب تک سُنتا تھا کہ موجودات میں جمادات سے بڑھ کر نباتات، نباتات سے افضل حیوانات اور حیوانات میں سب سے اعلیٰ انسان ہے۔ اب یہ ترتیب بدل گئی ہے۔ انسان جمادات کے زیرنگیں ہو گیا ہے اور وہ سونے چاندی کے سامنے سربسجود ہے۔

موجودہ تہذیب کی سرحدیں بربریت سے ملنے لگی ہیں اور انسان اُن قدروں اور عادات و اطوار کو چھوڑ رہا ہے جو اُسے تہذیب کے جلوس میں ملے تھے اور اُن خصائل اور اطوار کی بازیابی کے لئے کوشاں ہے، جو آغازِ داستان اور ابتدائے آفرینش میں اس کے حلیف تھے۔ لباس اب اس کے تن پر راس نہیں آتا اور وہ اسے مختصر کرنے اور بالآخر اُتار پھینکنے کی فکر میں ہے۔ اس لباس میں حیا کا جامہ اور ادب کی قبا بھی شامل ہے۔ ضمیر نے تہذیب کی مدد سے ہوا و ہوس میں جو پابندیاں لگا دی تھیں وہ ایک ایک کر کے رخصت ہوتی جا رہی ہیں۔ یعنی تہذیب کا قافلہ جہاں سے چلا تھا، پورا چکر لگا کر وہیں واپس ہو رہا ہے۔ اور تعاقبِ اختلاط جب ساری انسانیت پر محیط ہے تو اس بات پر حیرت کیوں کہ انسان خود کو جمادات سے فروتر سمجھنے لگا ہے،

نقرہ و زر کی پرستش کرنے لگا ہے گویا ارتقا کی انتہا پستی کی ابتدا ہو گئی۔ جگر پیدا ہو گیا۔ لیکن شاعر کا ردِ عمل سماج کا پابند نہیں، نہ اس کی آنکھیں ملمع سے خیرہ، نہ اس کی زبان مصلحت کی اسیر۔ چنانچہ زر کی یہ ریل پیل۔ یہ گہما گہمی، یہ اقتدار دیکھ کر وہ چلّا اٹھتا ہے:

سامری پھر کوئی سرگرم فسوں ہے شاید　　سب کا معبود ہوا جاتا ہے زر کاہے کو؟

بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ نے توحید کا درس دیا تھا۔ ان کی عارضی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر جادوگر سامری نے سونے کا ایک بچھڑا بنایا اور بنی اسرائیل کو اس کی پوجا میں لگا دیا۔ واپسی پر حضرت موسیٰؑ نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرنے کے بعد اس طلسم کو توڑا۔ ایک بذلہ سنج کا قول ہے کہ زر کی محبت جو سامری کے فسوں نے ان کے دلوں میں پھونک دی تھی، بنی اسرائیل سے زیادہ دن جدا نہ رہ سکی۔ لیکن تاریخ کچھ اور بھی کہہ رہی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ عرب کے ریگ زار، وہاں کے بے آب و گیاہ علاقہ، وہاں کی وادی غیر ذی زرع میں چھٹی صدی عیسوی میں ایک ہادیٔ برحق آیا۔ جس نے ساتویں صدی کے آغاز میں دنیا کی کایا پلٹ دی۔ جس نے مادیت کے اصنام کو توڑ ڈالا جس نے روح کی بالادستی کو ایک عالم سے منوا لیا۔ جس نے فقر پر فخر کیا اور جس نے زر کی ساکھ چشم زدن میں گرا دی۔ جس نے علم اور اخلاق، اخوت اور مساوات، تفکر اور تدبر، حریت اور توحید کا پرچم بلند کیا:

سمانِ "الفقر فخری" کا رہا شانِ امارت میں　　بہ آب و رنگ و خال و خد چہ حاجت روئے زیبا را

حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ اس ہادیٔ برحق کی امت اس کی تعلیمات کو بھول گئی اور اس نے بنی اسرائیل کی طرح سامری کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ زبان پر خدا کا نام اور افکار و اقوال پر سامری کی مہر۔ جسے دیکھیے وہ دینی، دنیاوی اور منصبی فرائض کو چھوڑ کر زر کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہا ہے، غافل اس سے کہ اس حرکت میں ارتفاع نہیں ابتذال ہے، ترقی نہیں زوال ہے۔ زر کسی معبود کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ "مشرک نامیرؔ سا کر اس کے حضور میں نہیں جا سکتے"۔ زر جہاں ایک دروازہ سے داخل ہوا، سادگی، معصومیت، پاکیزگی، خدا کا خوف، رسولؐ کی محبت، انسان کی دوستی، دردمندی، حریت، اخوت، مساوات، غرض کہ ساری صالح قدریں، دوسرے دروازے سے نکل گئیں۔ زر جماد ہے، اس کی محبت دل کو پتھر کر دیتی ہے۔ جو لوگ پہلو میں پتھر چھپائے پھرتے ہیں، وہ انسان نما کہیے

روحانی اور مادی طاقت میں جو فرق ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ آج سے تقریباً تیرہ سو سال پہلے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا آخری رسولؐ پیدا ہوا اور اس نے ساری دنیا کو راستی اور انصاف، علم اور

انسانیت کی روشنی سے منور کر دیا۔ عرب جہاں گئے رحمت، علم اور عدالت، اخلاق اور شرافت کے پیامبر بن کر گئے۔ انسانیت ہنوز اُن کی رہین منت ہے۔ اس واقعہ کو تیرہ سو سال گزرنے کے بعد جزیرہ نمائے عرب اور دوسرے عرب ممالک میں سب سے بڑی مادّی دولت کا انکشاف ہوا۔ جس کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب۔ زرِ سیال نے عرب کو اور بھی بنا دیا۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک عربوں کے دست نگر بن گئے۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ دنیا کو کیا ملا۔ خود عرب کو کیا حاصل ہوا۔ عربوں کو بے مصرف دولت ملی۔ دنیا کو وقتی تشویش، نتیجہ صفر۔ عرب جب روحانی طاقت لے کر اٹھے، دنیا پر چھا گئے۔ انسانیت کو سنوار گئے۔ مادی طاقت ہاتھ میں آئی تو ایک چھوٹے سے ملک سے بزدآزما اور عہدہ برآنہ ہو سکے۔ زر کے لیے ہاتھ خالی کرنا تھا، میراث کو ہاتھ سے گرا دیا۔ عجم کو زرِ سیال ہاتھ آیا گیا بہائے گیا۔ منصفانہ تقسیم نہ ہو تو زر، سمِ قاتل بن جاتا ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ہمارا روئے سخن تو ہندوستانی مسلمانوں کی طرف ہے۔ یہاں رونا اس کا نہیں کہ کثرتِ زر نے اخلاق کو گرا دیا ہے۔ یہاں شکایت اس بات کی ہے کہ زر کی کمی اور اس کی ہوس نے اقدار کو مسمار کر دیا ہے۔ صہبا کی طرح زر بھی ظرف کا طالب ہے۔ نا اہلوں کے پاس جہاں پیسہ جوتی میں دال بٹی کسی ایک فرد کی جھولی بھر گئی تو وہ جامہ میں نہیں سمایا۔ آنکھوں پر پردے اور عقل پر پتھر پڑ گئے۔ شرافت کام آ گئی، انسانیت رخصت ہو گئی۔ مثل ہے کہ اللہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ کم ظرفوں کو مل جائے تو چھپر کے ساتھ کلیجہ بھی پھٹ جاتا ہے، کردار شق ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے دو عبرت ناک مثالیں موجود ہیں؛

ان سطور کو زر کی ہجو نہ سمجھا جائے۔ موجودہ زمانہ میں جب عالم کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور وسائل کی بنا پر ملک باہم اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ تخلیہ میں خلل پڑتا ہے، جب انسان کے انسان پر انحصار کا سلسلہ عالمگیر ہو گیا ہے، جب زر کے بغیر داد و ستد ممکن نہیں، ایسی صورت میں زر سے نفرت کی تلاش بے سود ہو گی۔ زور، زر سے فرار پر نہیں، زر کے صحیح استعمال پر دینا چاہیے۔ اسلام کی تعلیم، جہاں رہبانیت کا گزر نہیں، اس باب میں بالکل واضح ہے۔ چنانچہ سعدیؒ نے خوردن کے ساتھ کشتن، کھانے کے ساتھ بونے پر زور دیا ہے۔ یعنی سمندر میں رہو لیکن پُشت پانی سے اوپر رہے۔ کنارے پر کھڑے ہو کر دامن بچانے والے بزدل ہوتے ہیں۔ محنت کرو، کماؤ، خود کھاؤ اور حاجتمندوں کی مدد کرو کہ یہی آخرت کی کھیتی ہے جب تک کہ حقداروں اور حاجتمندوں کی مدد کرتے رہو گے زر کی چربی نہ ذہن پر چڑھنے پائے گی نہ آنکھوں پر۔ زر تمہارا خادم رہے گا، آقا نہ بن پائے گا۔ جہاں پتھر آقا بن گیا، تم آزاد انسان نہ رہو گے۔ غلاموں بلکہ چوپایوں سے بدتر ہو جاؤ گے —— زر کو صنم بنایا ہے تو کھلم کھلا پتھر کی پرستش کیوں نہیں کر لیتے۔ اسلام پرانام تو نہ

نفس غیر کے ساتھ، مادیت روحانیت کے ساتھ، ازل سے ستیزہ کار رہے ہیں۔ لیکن مادیت کو جیسا فروغ بیسویں صدی میں حاصل ہوا ہے، پہلے کبھی نہ ہوا تھا اور یہ سب کچھ صنعتی اور تکنیکی انقلاب اور زر کے نظام تبادلہ کے ذریعہ ہوا ہے۔ دنیا کی مختلف بستیوں میں جب فاصلہ تھا تو طاعون کی طرح اخلاقی فساد بھی محدود ہو کر رہ جاتا تھا صحت مند جز اثر پذیر نہ ہوتے۔ لیکن اب جسمانی بیماریاں ہوں یا روحانی اور اخلاقی وبائیں، ملکوں کی سرحدوں کا احترام نہیں کرتیں۔ ہر وبا، ہر برائی جہانگیر ہو جاتی ہے۔

زر کے ذریعہ ایک خرابی اور آئی۔ جب تک زر کا چلن اور بین الاقوامی کرنسی اور تبادلۂ زر کا نظام وجود میں نہ آیا تھا، ہوس پیشہ اور استیلا کا مادہ اور جویائے اقتدار انسان اُن اشیا کو تصرف میں لا کر مطمئن ہو جاتے تھے جن سے اُن کی انفرادی ضروریات اور ہوس کی تشفی ہوتی۔ زر نے کاغذ کے جن پرزوں اور بینکوں کے جن کھاتوں کو جنم دیا ہے انھوں نے انسان کی ہوسِ زر کو بیکراں اور اس کو دوسرے انسانوں کے لیے بےحس اور بے درد بنا دیا ہے۔ زر کی طاقت افراد و اقوام کو ایک طرف گھمنڈ اور دوسری طرف استحصال کی جانب لیجاتی ہے۔ پہلے زر اندوزی کی حدبندی چوری اور ڈکیتی کے خوف سے بھی ہوتی تھی۔ بینکوں نے یہ خوف بھی دور کر دیا۔

بہرکیف ہمیں یہ مان کر چلنا ہو گا کہ روپیہ ضروری اور ناگزیر ہے۔ ہمیں آغاز سفر میں ہی یہ طے کر لینا ہو گا کہ روپیہ کو اس کی اوقات سے نہ بڑھنے دیں یعنی اُسے وسیلہ بنا کر رکھیں، مقصد نہ بننے دیں اور جب یہ طے کر لیا کہ زر صرف ایک ذریعہ ہے ضروریات کو پورا کرنے کا تو ہمیں یہ بھی مان لینا ہو گا کہ وہ صرف انفرادی اور نجی ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ بن کر نہیں رہ سکتا۔ اس طرح تو نفسی نفسی کا دور شروع ہو جائے گا اور تصادم، جنگ اور انتشار کی راہیں کھل جائیں گی۔ صرفِ زر کو انفرادی ضروریات کے ساتھ اجتماعی مقاصد کو ملحوظ رکھنا پڑے گا، ورنہ زر اور انسانیت میں ضد کا ناتا قائم ہو جائے گا۔ اگر وہ رہا تو یہ نہ رہے گی۔ اجتماعی ضروریات کا پاس رکھتے ہوئے حاجتمندوں کی انفرادی امداد کے علاوہ ان اداروں کی مدد یا ان کا قیام لازم ہے جن کا مقصد منظم ڈھنگ سے بنی نوع انسان کے دُکھ درد کو دُور کرنا، ان کی اصلاح، خوشی اور خوش حالی کے لیے تدابیر کرنا ہے۔ کارِ خیر گھر سے شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلام کی رو سے انسان پر پہلی ذمّہ داری اقربا کی ہے، پھر یتیموں، مسافروں اور دوسرے حاجتمندوں کی۔ زر کی ہوس ساری ذمّہ داریوں کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔

دنیا میں کم اجتماع اتنے خطرناک ہوں گے جتنا زر کے ساتھ بیکاری یا زر کے ساتھ جہالت اور بےخبری کا جمع ہونا: ع "ہوئے یہ جمع جہاں، آگ لگ گئی گویا" گیاہِ خشک و شرر، زر کے ساتھ بیکاری،

جو روپیہ بغیر محنت کے ہاتھ آئے وہ جائز ہی کب ہوا۔

پھر وہ بیشمار برائیوں کو جنم دیتا ہے۔ قمار خانوں، قحبہ خانوں اور شراب خانوں کی آبادی اسی کے دم سے ہے۔ یہ چیز معاشرے کے لئے اتنی ہی مہلک ہے جیسے ذمہ داری کے بغیر اقتدار۔ اپنے ملک میں دور انحطاط کے دولتمندوں یا بعض ممالک کے نو دولتوں پر نگاہ ڈالئے، یہ بات آئینہ ہوجائیگی۔ سُود کو حرام اسی لئے کیا گیا ہے۔

زر کے ساتھ جہالت یا بے خبری جمع ہونے کی مثال ہمارے اہلِ حرفہ ہیں۔ ان میں سے ایک کثیر تعداد کو اب اپنی محنت کا معقول اجر ملنے لگا ہے۔ وہ روپیہ پس انداز کر سکتے ہیں، اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دے سکتے ہیں، اپنی صنعت کی تجدید کر سکتے ہیں، نئے ڈیزائن، نئے ساز و سامان، نئے بازار اُن کی دسترس میں ہیں۔ لیکن وہ ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ بے خبری ایک نشہ کی طرح ہے جو آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ ہمارے حرفت کار جو پاتے ہیں اُڑا دیتے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا:

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی　　اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

ہمارے اہلِ حرفہ کے حُسن آفریں ہاتھ صورتِ سوال پھیلے ہوئے ہیں، مہاجنوں سے آس لگائے ہوئے۔ ان کی صنعت نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ جائے اور اُن کے اور اُن کے بچوں کے دن پھر جائیں اگر وہ جہالت کی نشیلی تیرگی کو چھوڑ کر علم و خبر کی بیدار کن روشنی میں آجائیں۔

کسی شاعر نے زور بیان میں زر کو حلاّل مشکلات بلکہ قاضی الحاجات تک بنادیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زر سے ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ چنانچہ بہت سی دوسری چیزوں کی طرح زر کی بُرائی یا بھلائی اُس کے محلِ استعمال پر منحصر ہے۔ ہم اس کی خواہش کو حدود میں رکھیں، اس کے عناں گیر ہوں، اسے کارِ خیر، تحصیلِ علم اور تعمیر و اصلاح میں صَرف کریں تو اس میں دین اور دنیا کی بھلائی ہے۔ اور اگر اسے پا کر نشہ میں بہک جائیں، بخیلی اور بیدردی اختیار کر لیں، جامہ سے باہر ہوجائیں تو اُس سے بُری کوئی شے نہیں۔ یہیں افراد کا امتحان بھی ہوتا ہے اور جماعت کا بھی:

زر کو پرکھ لے ہیں کسوٹی پہ اہلِ زر　　غافل کہ آدمی کی کسوٹی بھی زر میں ہے

اقبال مند قوموں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ زر کا ناتا علم سے جوڑتی ہیں۔ ان کے برعکس ادبار آمادہ قومیں زر سے جہالت کی پرورش کرتی ہیں۔ زر کا ناتا علم سے جُڑتا ہے تو علم اور ٹکنولوجی کو فروغ ہوتا ہے اور یہ فروغ مزید زر کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک سے دوسرے کو مدد اور ترقی ملتی ہے۔ تائوان، جاپان، کوریا اور اسرائیل کی مثالیں سامنے ہیں۔ افسوس کہ امداد باہمی کے اس زرخیز اور علم آفریں سلسلہ سے ہم نے دامن کھینچ لیا ہے۔

زر کے خطرات کئی ہیں۔ ایک تو اخلاقی برائیاں، دوسرے تن آسانی، عیش کوشی، کمزوری جس
سایہ میں انسان جفاکشی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس جفاکشی سے جو خدا کی بہت بڑی دین ہے، تیسرا خطرہ
دہ مہیب ہے کہ وہ زرداروں اور بے زروں دونوں کو متاثر کرتا ہے یعنی قدریں بدل جاتی ہیں۔ صالح
یات کھٹکنے لگتی ہیں۔ اچھی قدریں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ تجارتی ذہنیت دل و دماغ کے دریچوں کو بند کر
تا ہے۔ محبت اور شفقت کی جگہ قساوت اور شقاوت لے لیتی ہیں اور انسان بہرا، گونگا اور اندھا ہو جاتا ہے،
اخلاقی طور پر مفلس اور کنگال۔ خدا ہمیں اس افلاس سے بچائے جو زر نہ ہونے کا دوسرا نام ہے اور
س افلاس اور محرومی سے بھی جو زر کے سائے میں شروع ہوتا ہے۔

••

# اَنَا وَلَاغَیرِی

"ہوں تو میں ہوں، میرے سوائے کوئی نہیں" کسی جماعت میں اگر افراد یہ رُخ اختیار کرلیں تو
سمجھ لیجئے کہ اب اس کا شیرازہ بکھرنے میں کوئی دیر نہیں۔

دو باتیں ہیں جو کسی جماعت کو یکجا رکھتی ہیں۔ ایک تو مسلک، مقاصد، مفادات، روایات اور اوہام
کا اشتراک۔ ان کا احترام جماعت کے سب افراد کرتے ہیں اور ان کی خاطر وہ اپنے ذاتی مقصد اور مفاد کو ثانوی
حیثیت دیتے اور بعض صورتوں میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اگر افراد کے مقاصد باہم ٹکرائیں تو ہر فرد حریف کے نقطۂ نظر کو سمجھے اور اپنے مطالبات
کو کم کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

ہندوستانی مسلمان ان دونوں شرطوں میں سے کسی ایک کو بھی پورا نہیں کر رہے ہیں۔ وہ اشخاص جو اپنے
متعلق حسنِ ظن میں غلو کرتے ہیں وہ نہ افراد کے جذبات کا خیال رکھتے ہیں نہ جماعت کے مفاد کا۔ انانیت، نخوت
اور گھمنڈ کے نشے میں چور ہو کر وہ مصالح اور انجام کار سے غافل ہو جاتے ہیں۔ زبان پر جو کچھ آیا کہہ دیا، نوکِ قلم پر
جو کچھ آیا، لکھ دیا۔ دل میں جو کچھ آیا، کر ڈالا۔

انانیت کی صہبا کا اثر میخواروں پر بقدرِ ظرف ہوتا ہے۔ ایک طبقہ جو صلاحیتوں میں بالکل کورا ہے،
بلا پئے بہکتا ہے۔ کم صلاحیت والوں کے لیے وہی ایک جرعہ کافی ہے۔ باصلاحیت افراد میں سے کچھ تو پھل دار شاخ
کی طرح انکسار اور تواضع میں جھکتے جاتے ہیں اور کچھ رعونت کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ انانیت کا نشہ جہالت
کے ساتھ مل جائے تو دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ علم انکسار کی طرف لے جاتا ہے۔

انسان کی فطرت ہے کہ جو شخص اپنی بڑائی کا اظہار (اپنے قول، فعل، طور طریقوں سے) کرے اس کی
بڑائی تسلیم نہیں کرتے۔ مشک کی خوشبو عطار کے اعلان کی محتاج نہیں۔ جس نے ڈینگ لی وہی کھوکھلا سمجھا گیا

؎ جو ظرف کہ خالی ہو صدا دیتا ہے اکثر۔

انانیت کی کئی قسمیں ہیں خود پسندی، خود بینی، خود نمائی، خود ستائی، خود غرضی، خود پرستی
ان میں سے خود غرضی اور خود پسندی اسی وقت انانیت کے حدود میں آتی ہیں جب وہ اعتدال کا دامن

جھوڑ دیتی ہیں۔

خودستائی اپنی تعریف کرنے کو کہتے ہیں، اسے ڈینگ اور شیخی کہہ کر بھی پکارا جاتا ہے۔ خودستائی سے سامعین حظ اندوز ہوتے ہیں۔ زیر لب مسکراتے ہیں لیکن جلد ہی لبوں کا تبسم غروب ہو جاتا ہے اور جبین پر شکن طلوع۔ جو شخص اپنا تذکرہ اور اپنی تعریف کرتا ہے 'بور' کہلاتا ہے اور زیادہ دیر تک اس کو انگیز کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ سننے والوں کا پیمانۂ صبر چھلک جاتا ہے اور تعلق کا ظرف ٹوٹ جاتا ہے۔

انانیت کی مذکورہ قسموں میں سے خود پسندی بے ضرر ہے، اگر وہ اظہار کے لئے بیتاب نہ ہو جائے۔ جہاں تک تلافیٔ مافات کے طور پر خود کو پسند کر کے دل کو خوش کرنے کی بات ہے، کسی کو اعتراض کیوں ہونے لگا۔ خود غرضی کو بھی دنیا چنداں قابل اعتراض نہیں سمجھتی بشرطیکہ وہ خدمت اور خلوص کا دعویٰ کرتی ہوئی نہ آئے۔ ایک شرط اور ہے خود غرضی کبھی کبھی کمینہ پن، بے دردی و محسن کشی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کا شمار بدترین برائیوں میں ہوتا ہے۔ انانیت سے خود غرضی کا تعلق صرف اتنا ہے کہ اس کے زیر اثر انسان کو خود سے اتنا شغف رہتا ہے کہ وہ دوسروں کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔

خود نمائی وہاں تک گوارا بلکہ دلفریب ہوتی ہے جہاں تک وہ نشو و نما کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ انسان خود نمائی، خود افزائی کے لئے مجبور ہے۔ حسن اظہار کے لئے بے تاب رہتا ہے' خواہ وہ فطری حسن ہو' خواہ تخلیقی۔ فنون لطیفہ، تحقیق، اختراع، ایجاد، کشف و ریاضت، وہ خود نمائی جس کے سرے عمل تخلیق یا اظہار نشو و نما سے حسن سے ملتے ہیں حسین اور ہوش ربا ہوتی ہے۔ لیکن وہ خود نمائی جس کا مقصد دوسروں کو مرعوب کرنا ہے، نہ مرعوب کر پاتی ہے، نہ متاثر، متنفر ضرور کر دیتی ہے — شعر و حکمت سے سرشار ہو کر جوش تخلیق میں فیضی چلا اٹھا تھا:

امروز نہ شاعرم حکیمم دانندۂ حادث و قدیمم
بانگ قلمم درین شب تار صد معنیٔ خفتہ کرد بیدار

(آج میں شاعر نہیں، حکیم ہوں، قدیم اور حادث کا رمز آشنا۔ اس اندھیری رات میں میرے قلم کی آواز نے صدہا خوابیدہ معانی کو جگا دیا ہے)

یہی تخلیقی خود نمائی غالب کے یہاں اس طرح جلوہ گر ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

شاعر نے جوشِ تخلیق میں یہ محسوس کیا کہ اس کے دل و دماغ پر براہ راست نزولِ انوار ہو رہا ہے۔

خود بینی اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان خود ہی کو دیکھتا ہے اور اس عمل سے حظ اندوز ہوتا ہے اس کی نگاہ دوسروں کی طرف نہ جائے اور اسے دوسروں کے جذبات و احساسات کا خیال نہ ہے۔ خود بینی کے راستے سے خود غرضی کی راہ بھی نکلتی ہے۔ غالب نے خود بینی کی توجیہ اس انداز سے کی تھی کہ اگر تم اپنی جبیں کا آئینہ یہ سامنے نہ کر دیتے تو میں خود بینی پر کیوں مجبور ہوتا۔

کہتے ہو کہ خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں — بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

خود بینی لطافت کے ساتھ ہو تو گلکاری کرتی ہے اور بھونڈے انداز سے تو دلآزاری۔ دلآزاری سے ہی انا کی حدیں قائم ہوتی ہیں۔ انا اپنا اظہار کسی طرح کرے، اس کا بے ضرر اور دلکش روپ وہ ہے جس میں دلآزاری شائبہ تک نہ ہو اور بھونڈا اور کریہہ اور کرخت روپ وہ جس میں اہانت حقارت اور دل آزاری شامل ہوں۔ ایک طرف تخلیقی سرشاری اور فرطِ اعتماد کی خبر لاتی ہے تو دوسرے سرے پر چھچھورے پن، بے حسی، بے دردی، بے راہ روی، اکڑ، گھمنڈ اور اتراہٹ کی شکل اختیار کرتی ہے۔

گھمنڈ سے زیادہ مضحکہ خیز کوئی چیز نہیں۔ خود دنیا میں انسان کا وجود مکانی اعتبار سے ایک ذرہ اور زمانی اعتبار سے ایک لمحے سے کم ہے۔ اور یہ ذرہ ہر وقت حادثہ کی زد میں ہے اور ایک بلبلہ کی طرح جو نہ جانے کب ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر خود یہ دنیا جس کی گولائی کو بھی ہم نہیں دیکھ سکتے، نظامِ شمسی میں ایک بہت چھوٹا سیارہ ہے جو ہمیشہ سورج کے طواف میں مشغول رہتا ہے اور اسی سے گرمی اور روشنی حاصل کرتا ہے۔ حیرت یا خنکی کا خیال کر طواف بھی سیدھے سادے انداز سے نہیں کرتا بلکہ ناچتے ہوئے، اپنی کیلی پر تھرکتے ہوئے۔ اور جیسا ہمارا نظامِ شمسی ہے، کائنات میں ایسے اربوں نظام ہیں۔ چنانچہ انگنت ستاروں کی روشنی باوجود تیزی رفتار کے ابھی تک دنیا میں نہیں پہنچی۔ غور کیجئے اگر کائنات کا نقشہ بنایا جائے تو دنیا اتنی چھوٹی اور حقیر ہے کہ اسے نقشہ پر دکھایا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر دنیا میں پیدا ہونے والے ایک حقیر سے انسان کی کیا اوقات۔ وہ اگر اترائے گھمنڈ کرے، لقا کبوتر کی طرح اکڑتا پھرے اڑ کے آنے کی طرح اینٹھا جائے تو کس کو ہنسی نہ آئے گی اور کون ایسے انسان کی قسمت کو نہ روئے گا۔

انانیت بعض اوقات جھوٹے انکسار کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ شکل بھی تقریباً اتنی ہی مکروہ ہے جیسے ملمع کاری یا ریاکاری جو نفس پرستی کو خدمت اور ہوس کو خلوص کا نام دیتی ہے۔ اس نوع کے انکسار کو

تقادِ مغلوب کیجئے۔ خود کو بیچمداں کہیں گے اور توقع کریں گے کہ اس طرح دنیا انھیں فخر العلما سمجھے، خود کو عاصی و پُرمعاصی کہیں گے اور امید یہ کریں گے کہ دنیا زاہد پارسا سمجھے۔ جھوٹا انکسار ہر بُری چیز اور ہر بے جا تصنّع کی طرح بُرا چیز۔ اس میں ایک بُرائی یہ بھی ہے کہ جھوٹے انکسار میں اپنی جھوٹی مذمت اس لیے کیجاتی ہے کہ مخاطب اطلاقاً اور مروتاً جھوٹی مدح سرائی کرے۔ گویا انکسار کے پردے میں جھوٹ کا پرچار کیا جا رہا ہے۔

انانیت کئی سرچشموں سے پھوٹتی ہے۔ کوئی مال پر افتخار کر رہا ہے، کوئی جمال پر۔ غافل، سعدی کی اس تنبیہ سے،

بر مال و جمال خویشتن غرہ مشو  کاں را بہ شبے برند و ایں را بہ تبے

اپنے مال اور حسن پر گھمنڈ نہ کرو، پہلا ایک رات میں لُٹ جاتا ہے۔ دوسرا بخار میں جاتا رہتا ہے۔ پرستارانِ حسن غرورِ حُسن میں افزائشِ جمال کو دیکھ لیتے ہیں۔ غرور زر میں البتہ حسن کا کوئی شائبہ نہیں ملتا جو چیز خلق سے نیچے نہیں اُترتی وعلم کا غرور ہے اور اس سے بھی زیادہ پارسائی کا زعم۔ غور کیجئے غرور کرنے والوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ انھوں نے شکر کھویا اور جگ ہنسائی پائی۔ اور اگر انا کے اظہار میں دل دُکھا دیئے تو نفرت اور بد دعائیں لیں اور انتقام کا خوف بھی شاملِ حال ہو گیا۔ ستم ہے کہ جن خصائل اور خوبیوں اور نعمتوں پر شکر کرنا چاہیئے تھا ان باتوں پر ہم غرور کرتے ہیں۔ کفرانِ نعمت کا رشتہ بد اطواری سے جوڑتے ہیں، دلوں کو بلا وجہ توڑتے ہیں۔

یہاں تک تو انانیت کے انفرادی پہلوؤں کا ذکر تھا۔ اب ہم آغازِ داستاں کی طرف لوٹتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں نے انانیت کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھائے ہیں۔ ہم میں ہر شخص کی انا اس قدر بڑھی بڑھی ہوئی ہے کہ اسے ذرا سی ٹھیس پہونچی اور وہ توازن کھو بیٹھا۔ انفرادی انا پر ہم اجتماعی مفاد کو قربان کر دیتے ہیں اور ماتھے پر بل تک نہیں آتا۔ ہم افراد کے متعلق رائے معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز سے قائم نہیں کرتے کوئی شخص خواہ کتنا ہی بُرا، اخلاق باختہ اور سماج دشمن کیوں نہ ہو اگر وہ اپنے برتاؤ سے ہماری انا کی تشفی کر سکتا ہے، تو ہم اس کا اس کے مذموم مقاصد کے حصول میں ساتھ دیں گے۔ کوئی شخص کتنا ہی اچھا، پارسا اور انسان دوست ہو اور اس کے مقاصد کتنے ہی ارفع اور اعلیٰ ہوں اگر اس نے قصداً یا سہواً کبھی ہمیں نظر انداز کر دیا تو ہم اس کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو کام وہ کر رہا ہے وہ ملک و ملت کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ مفید اور ضروری ہے۔ اکثر اس غریب کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو گی کہ یہ تغافل، یہ عداوت، یہ مخالفت آخر کیوں؟

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اَنا دلوں کے درمیان حائل ہوتی ہے۔ شدّت اختیار کرے تو دلوں کو
ہے، عام ہوجائے تو شیرازہ کو بکھیر دیتی ہے۔ جمیعت کو پراگندہ کردیتی ہے۔ انکسار افراد کو قریب لاتا ہے۔ دلوں
کو جوڑتا ہے۔ جماعت کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ تلخی کو خوش دلی اور طیش کو محبت میں بدل دیتا ہے۔

آیئے، ہم عہد کریں کہ ان امور میں جو اجتماعی مفاد کے ہیں اپنی ذات کو بیچ میں نہ آنے دیں گے۔
مقاصد و اقدار کو پیش نظر رکھیں گے۔ افراد کی حیثیت ثانوی ہے اور اس سے بھی کم وزن ہے ان افراد کا
ساتھ تعلق یا برتاؤ۔ اَنا نے ہمیں کبھی مل کر کام نہیں کرنے دیا، پیش رفت میں سدا ہماری اَنا سدِ راہ ہوئی۔ اُس
ہمارے نقطۂ نگاہ کو مسخ کردیا۔ اس کے فریب میں آکر ہم اقدار کو بھول گئے، حصولِ مقصد سے ہٹ گئے
کو اس نے بے دخل کیا۔ نفاق کو تخت پر بٹھا دیا۔ ہمارے دلوں کو کلیوں کی طرح کھلنا تھا، وہ انگاروں کی
دہکنے لگے۔ جو کام کرنے کے لئے اٹھے، ان کی راہ میں ہماری انا نے کانٹے بوئے اور خود ان کی اَنا نے انھیں
سے دست کش کردیا کہ وہ بُرائی الزام اور دشنام کی تاب نہ لاسکے۔ انھوں نے اس مقصد کو جو انھیں عزیز
تھا اور جس میں دنیا اور آخرت کی فلاح تھی، اس لئے تج دیا کہ اُن کی اَنا نے انھیں گالی کھانے، بُرا
رُسوائی سہنے کی اجازت نہیں دی۔ مسلمانوں میں سماجی خدمت کی روایت مفقود ہے اور یہ بڑی حد تک
کی تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی پسماندگی کا سبب ہے۔ روایت مفقود اس بنا پر ہوئی کہ جو مقصد
کام کرنے اُٹھے، تنگ نظر اور اخلاق باختہ نکتہ چینیوں کی دشنام طرازیوں اور بہتان تراشیوں کی تاب نہ لا
اَنا نے انھیں خدمتِ خلق اور مقصدِ زندگی سے محروم کردیا۔

ہمارے افراد کی اَنا ہمارے ملّی اتحاد اور ہماری پیش رفت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اچھا ہوتا جو انا
راستے سے ہٹا دیتے، اقبال نے کہا تھا:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ربطِ ملت کو پراگندہ کرنے والی اندھی انا ہماری نخوت، ہماری رعونت ہے۔ اس نے ہمیں دریا سے جدا کردیا،
ہماری طاقت کو پارہ پارہ کردیا۔ انا کی بدولت موجوں نے دریا کا دامن چھوڑ دیا۔ جھاگ بن کر ہوا میں بکھر
گئیں، وہ جھاگ جن میں نہ سمندر کا جلال ہے نہ موج کی طاقت اور اضطراب!

یہ انانیت اسی جذباتیت کی پروردہ ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ کہیں اوپر آچکا ہے۔
انانیت جہالت کے بطن سے پیدا ہوتی ہے اور عداوت، نفاق، نفسانیت اور انتقام کو جنم دیتی ہے۔ ایسے

دشمن سے حذر اولیٰ۔ ہمیں غرور کی تباہ کاریوں سے بچنا چاہیے۔ جس جماعت میں افراد غرور میں مبتلا ہوں اس کو نفاق کی آگ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ اتحاد کے لیے نسخۂ کیمیا انکسار ہے۔ بے نفسی انفرادی انکسار سے اجتماعی افتخار کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ جماعت کی کامیابی فرد کی بے نفسی پر مبنی ہے۔ انکسار جوڑتا ہے، غرور توڑتا ہے۔ انکسار فرد کو مقصد کے تابع کر دیتا ہے، انا مقصد کو فرد کے تابع کر دیتی ہے۔ ایک فرد نہیں ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں افراد کی خواہشات اور رجحانات کے تابع۔ جتنے افراد اتنی ہی راہیں۔ ایسی حالت میں حصول مقصد معلوم۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ وہ مسلمان جو سرکاری ملازمتوں یا تعلیمی اداروں سے سبکدوش ہوتے ہیں، ریٹائر ہوتے ہی خانہ نشیں ہو جاتے ہیں۔ اپنی پگڑی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے انھیں یہ اندیشہ ستاتا ہے کہ گھر سے باہر نکلے تو کوئی پگڑی نہ اچھال دے۔ گویا زندگی کا سارا سرمایہ پگڑی میں چھپا ہوا ہے۔ یہ پگڑی، یہ آن، یہ نام نہاد عزت، یہ جھوٹا رعب داب یہ سب انانیت کے دھندے ہیں۔ انانیت نہ ہوتی تو یہ بھی نہ رہیں۔ اللہ کے بندے یہ نہیں سوچتے کہ ان کی ساری عمر مزدوری میں گزر گئی۔ مزدوری ملتی رہی، کام کرتے رہے۔ زرخرید غلامی ختم ہوئی تو کام کرنا بند کر دیا۔ گویا پیسے کے سوا اُن کے لیے کام کا کوئی محرک نہیں ہے۔ بغیر پیسہ کے لالچ کے کوئی کام کرتے تو یہ بات ثابت ہو جاتی کہ وہ زرخرید غلام نہیں ہیں۔ آزاد اور خوددار اور ذی حس انسان ہیں۔ جن کے دل میں انسانوں کا درد ہے اور جو زر کی طمع اور صلہ کی خواہش کے بغیر خدا کی راہ میں اس کی مخلوق کی خدمت کر سکتے ہیں۔ انھیں ایک موقع ملا غلامی کی زنجیریں توڑنے کا، مخلوق کی خدمت کرنے کا، اپنے بھائیوں کی پسماندگی دور کرنے کا۔ انھوں نے اس زریں موقع کو ہاتھ سے جانے دیا۔ محض اس لیے کہ ان کی انا نے یہ گوارا نہیں کیا کہ کوئی ان پر انگلی اٹھائے، نکتہ چینی کرے، کوئی انھیں بُرا بھلا کہے، کوئی انھیں گالیاں دے، کوئی ان کی نیت پر شبہ کرے۔ کیوں کہ ایسا ہوتا تو ان کی عزت چلی جاتی۔ وہ نہیں جانتے کہ عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ فیصلہ قادر مطلق ہی کرتا ہے۔ کسی اچھے مقصد کے لیے بدنامی مول لینا، گالیاں کھانا، خطرات سے مقابلہ کرنا اور گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہونا، خطرات سے سراسیمہ نہ ہونا، مصائب و حوادث سے سینہ سپر ہونا، عداوت کے نرغے میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ سے نصرت کی دعا مانگنا، نماز اور ثابت قدمی کے ساتھ، کسی جہاد سے کم نہیں۔ حافظ شیراز کہتا تھا:

اے صاحب کرامت! شکرانۂ سلامت      روزے تفقدے کن درویش بے نوا را

یعنی سلامتی کا شکرانہ یہ ہے کہ بے نوا درویش پر مہربانی کی جائے۔ شکرانۂ سلامت یہ ہے کہ انسانوں کی بھلائی

کے لیے وقت اور پیسہ اور محنت صرف کریں۔ اجتماعی خیر، انفرادی خیر سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا اصلاح، تعلیم، تربیت اور امداد کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ پارسیوں، عیسائیوں اور سکھوں کو دیکھئے! پیش رفت اور اصلاح کے کام ہر طرف دیکھنے میں آتے ہیں اور یہی حال ہمارے اور ہندوستانیوں کا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں جہاں اس طرح کی تحریک شروع ہوئی وہیں پھوٹ پڑ گئی۔ افراد کی انانیت یہ گوارا نہیں کر پاتی کہ دوسرے افراد کو کارہائے خیر کے سلسلے میں کوئی نیک نامی حاصل ہو جائے۔ نکتہ چینی، حسد، الزام، بہتان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی راز ہماری پسماندگی کا ہے۔ کاش اصلاحی مقاصد کے درمیان ہم اپنی ذات کو نہ لائیں اور خود کو مٹا کر مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری پیش رفت کی راہ میں کوہِ گراں ہماری انانیت ہے۔

اپنی ذات کے متعلق ہمارے حس کی مریضانہ ذکاوت نے ہمیں کسی کام کا نہیں رکھا۔ ہمارا ردِ عمل صحت مند نہیں رہا۔ ہم تدبّر اور تفکّر پر جذبات کے دھند لکے کو ترجیح دیتے ہیں۔ پھر تعجب کیوں کہ ہمارے فیصلے صحیح نہیں ہوتے۔

انانیت اور عزتِ نفس کے درمیان بُعد المشرقین ہے۔ عزتِ نفس کا تقاضا ہے کہ ذاتی اغراض کے لیے کسی انسان کے سامنے سر نہ جھکاؤ، لیکن انسانی فلاح کے لیے خود کو جھکانا اور مٹانا بھی پڑے تو اس سے گریز نہ کرو۔ یہی فرق در اصل خود غرضی اور خودداری کے درمیان ہے۔

'انا' ایک فطری جذبہ ہے۔ ہمیں کوشش سے اس کو قابو میں رکھنا ہے، اس کو زیر کرنا ہے۔ اس کا ارتفاع کر کے اسی تخلیقی کاموں میں لگانا ہے۔ اسے عزتِ نفس کے منصب پر بٹھانا ہے۔ دوسری جانب خدمتِ خلق کے لیے اُسے زیر کرنا ہے، تاکہ انا اشتراکِ عمل کا راستہ نہ روک پائے۔

••

# خطبۂ افتتاحیہ

## بہرائچ دینی تعلیمی کانفرنس

اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ اس دور میں جبکہ بالعموم انسان تجارت اور سیاست کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے کچھ بندگانِ خدا ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے دل کے دامن کو سیاست کی گرد اور تجارتی ذہنیت کے غبار سے محفوظ رکھا ہے۔ باری تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس عہد میں جبکہ ہندستانی مسلمان مایوسی، بے عملی، خود غرضی اور کج بحثی کا شکار ہیں خود ان ہی میں سے کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس عزم جزم کے ساتھ کہ ان کو تباہی کے جبڑے سے نکال کر آبِ حیوان کی طرف لے جائیں گے۔ خالقِ کائنات کا بڑا کرم ہے کہ اس پُر آشوب زمانہ میں جبکہ مسلمان جو خدا کا آخری پیغام ہیں اپنے دین سے بے تعلق اور اس کی بنیادی تعلیم سے بے بہرہ ہو چلے تھے، کچھ نفوس نے جن کے دل درد کی دولت سے مالا مال تھے، اس بات کا بیڑہ اٹھایا کہ مسلمانوں کو دین سے بے خبر نہ ہونے دیں گے، کیونکہ اگر دین نہ رہا تو پھر وہ کہاں رہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کے امین ہیں جو انسان کے لئے ابد تک سرچشمۂ ہدایت بنا رہے گا۔ اللہ تعالےٰ کی ثنا کے بعد ہم ان حضرات کے سپاس گزار ہیں کہ انھوں نے گذشتہ ۲۲ سال میں انتہائی نیک نیتی، بے نفسی، خاموشی اور ایثار کے ساتھ مسلمانوں میں دینی تعلیم کو عام کرنے کا کام کیا۔ فی زمانہ انسان کے کام کرنے کے محرکات چار ہیں: زر، اعتراف، اشتہار، اقتدار۔ جن صاحب دلوں نے دینی تعلیم کی اشاعت میں حصہ لیا نہ انھیں زر کی خواہش ہے، نہ اعتراف کی جستجو، نہ شہرت کی طلب، نہ اقتدار کی ہوس۔ ان سب سے مستغنی ہو کر وہ صمیم قلب، اور نیت اور نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ اپنے بھائیوں کو جہالت، بے دینی اور گمراہی سے بچانے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ رب العزت انھیں اس کا اجر عطا فرمائے، ان کی کوششوں کو کامیابی سے نوازے اور ان کے حوصلوں کو مضبوط اور بلند کرے۔ آمین!

میرا اشارہ صرف ان اکابر کی طرف نہیں جنھوں نے دینی تعلیمی کونسل کی تاسیس اور رہبری میں نمایاں حصہ لیا اور جن میں سے گزشتہ دو سال میں ہم جناب ظفر احمد صدیقی اور جناب قاضی عدیل عباسی کو کھو بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ میرا روئے سخن خصوصاً ان غیر معروف کارکنوں کی طرف ہے جو اس تحریک کے قالب میں دوران خون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے مشکلات کا ہجوم مہمیز کا کام کرتا ہے، حوادث جسے ارادہ کو ڈگمگا نہیں پاتے، ناسازگار حالات سے جو خائف نہیں ہوتے، مایوسی اور شک جنھیں چھو نہیں سکتے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لئے

اقبال نے کہا تھا:

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا — بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

صدہا موانع و مشکلات کے باوجود دینی و تعلیمی مہم کی کامیابی کا راز اس کے سربراہوں اور کارکنوں کے خلوص، یقین، شہرت ناطلبی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست اگھن لگا دینے والی اخلاص سوز سیاست اس میں داخل نہیں ہوئی۔ اس تحریک کو ہمیں سیاست سے ہر قیمت پر بچانا ہے۔ ہمارے بعض بڑے ادارے جس طرح سیاست اور انانیت اور ہوس کے ہاتھوں برباد ہوئے ان کی داستان بہت عبرتناک ہے جسے دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ دینی تعلیم کی یہ تحریک ہزارہا بندگانِ خدا کے اخلاص ایثار اور محنت سے پروان چڑھی ہے۔ آپ اس تحریک کو اسی نہج پر چلنے دیجیے۔ اس تحریک کو چلتی ہوئی ہوا اور بہتے ہوئے پانی اور گرماتی اور اُجالا کرتی ہوئی کرنوں کی طرح بے اداری حصار میں سمیٹ کر محدود نہ کیجیے کہ عناصر کی طرح اخلاص و ایثار کو بھی حد بندی گوارا نہیں ہوتی۔ یہ تحریک ضرورت کے سوتوں اور ایمان کے سرچشموں سے پھوٹی ہے۔ اسے روایت اور سخت گیر انتظامی ڈھانچے اور مرکزی گرفت سے پابند نہ کیجیے کیونکہ ایسی صورت میں بڑا خطرہ اس بات کا ہوتا ہے کہ کہیں سیاست نہ در آئے، خدمت کے جذبے اور فطری جوش و خروش کو گھن نہ لگ جائے۔ ضابطہ کا آہن روح میں نہ اُتر آئے، آمد اور آورد کا رنگ، اختیار کو تصنع کہیں حاوی نہ آجائے۔ علاوہ بریں فی زمانہ مسلمانانِ ہند میں یہ صلاحیت ڈھونڈے نہیں ملتی کہ کسی بڑی ملک گیر تحریک کو ایک مرکز سے چلا سکیں۔ ان بکھرے دانوں کو ایک تسبیح میں پرونا اب کسی بشر کے بس کی بات نہیں۔ لیکن دانے جو بکھرے ہوئے ہیں جہاں ہیں وہیں تسبیح و تہلیل کے کام آئیں گے۔ ہر دانے سے ہزاروں دانے نکلیں گے اور یہی راہ اب ہمارے لئے کامیابی اور سرخروئی کی راہ ہے۔ اس طرح نہ صرف مذکورہ خطرات سے ہم بچے رہیں گے، بلکہ جابجا مقامی خلوص کی نشوونما ہوگی اور مقامی اقدامیت کو پنپنے کا موقع ملے گا۔ کونسل کا کام رہبری، رہنمائی، نگہبانی اور حوصلہ افزائی ہوگا۔ اس کا رول یہ ہوگا کہ ہر کارِ خیر میں خود کو قرب دے، ہر بیج میں زمین کا سینہ چیر کر انکر نکالنے کی جو طاقت ہوتی ہے اس کو بروئے کار لانے میں مدد دے اور بالیدگی کے لئے جو غذا درکار ہے اس کی فراہمی کا حسبِ مقدور انتظام کرے۔ اور ایک تربیت دلیں کہ کام مقامی کوششوں اور ذاتی پیش رفت پر بڑھے اور زندگی اور نور کے اس پیغام کو پھیلانے میں

بات کم عبرتناک نہیں کہ سرسید احمد خاں، ان کے رفقا، اور متبعین کی کوششوں کے باوصف ہندوستانی مسلمان ہنوز تعلیمی طور پر پسماندہ ہیں۔ تعلیم کے اعتبار سے ان سے زیادہ پچھڑی ہوئی قوم اس ملک میں نہیں۔ ستم یہ ہے کہ وہ مسلمان جو کبھی علم و جستجو کے کاروان سالار تھے ترقی کی گردِ راہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ہندوستان کی یہ دوسری بڑی اکثریت

ہندستانی قوموں میں سب سے پچھڑی اور سب سے زیادہ جاہل ہے حتی کہ ہریجن بھائیوں میں علم کا ذوق اور ترقی کا حوصلہ اور آگے بڑھنے کی لگن اور تعلیم میں اضافہ کی شرح ہم سے بہت زیادہ ہے۔ ہم علم سے غافل ہو گئے ہیں۔ دوسری قومیں علم کا سفر تیز رفتاری کے ساتھ طے کر رہی ہیں۔ فاصلہ دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ دینی تعلیمی کونسل عام طور پر تعلیم کی ترویج کے سندیسہ کو گھر گھر پہنچا سکتی ہے وہ نئی نسل کے دلوں میں یہ بات بٹھا سکتی ہے کہ مسلمانوں پر تحصیل علم فرض ہے اور اگر ہم جاہل رہے اور ہم نے اپنے بچوں کو جاہل رکھا یا پڑھنے یا پڑھانے یا پڑھوانے کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا تو دنیا میں کم نصیبی اور بے چارگی اور بدنامی کے علاوہ حشر کے روز شرمسار ہونا پڑے گا۔ کسی دین نے تحصیل علم پر اس قدر زور نہیں دیا ہے جتنا اسلام نے، اسے تاریخ کا طنز کہیے یا ہماری کجروی اور گمراہی کہ مسلمان ہی علم سے بے نیاز ہو بیٹھے، علم کی بازیابی، بالیدگی اور نشاۃ ثانیہ کے فرائض انجام دینے کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور علم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ایک لمحہ کی غفلت سو سال پیچھے کر دیتی ہے۔ حساب لگائیے چار سو سال کی غفلت نے ہمیں کتنے پیچھے ڈال دیا ہوگا۔ بہر کیف قسمت کا گلہ کرنے، ابنائے زمانہ سے شکوہ سنج ہونے سے نہیں چلتا۔ ہمیں ترقی کرنا اور با عزت زندگی بسر کرنا ہے تو علم حاصل کرنا ہوگا۔ ضرورت ہے ایک عہد ساز، ملک گیر کوشش کی، تعلیم کے پیغام کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچایا جائے۔ مسلمان تاریخ کے اس موڑ پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر انھوں نے جہالت کے آسیب سے دامن نہ چھڑایا تو جانبر نہ ہو سکیں گے اور بفرض محال ہو بھی گئے تو عزت کے ساتھ نہ رہ سکیں گے۔

افسوس کہ ہماری آنکھوں پر ابھی تک غفلت اور رعونت کے پردے پڑے ہوئے ہیں ایسا نہ ہوتا تو ہم دیکھتے کہ ہندستانی مسلمان اس راستے پر چل رہے ہیں جو فنا کی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ ہر دن جو گذرتا ہے اس عبرت ناک انجام کو قریب لا رہا ہے۔ اگر ہم کو سنبھلنا ہے اگر ہم کو زندہ رہنا ہے، تو علم حاصل کرنا ہوگا، علم کو عام کرنا ہوگا، صدیوں کا فاصلہ سالوں میں طے کرنا ہوگا ———— ۔ جہالت اس زہر کی مانند ہے جو آہستہ آہستہ رگ و پے میں سرایت کرتا ہے۔ اس طرح کہ آہٹ تک نہیں ملتی اور بالآخر کام تمام ہو جاتا ہے۔ ہماری سب سے بڑی دشمن جہالت ہے۔ اسلام اور جہالت ہم اضداد کو باہم جمع کرنے کے بظاہر مرتکب ہوئے ہیں۔ جہالت تو ثابت ہے البتہ وہ اسلام جو جہالت کو گوارا کرے، اس کی رفاقت کو برداشت کرے، اسلام نہیں اسلام کا مضحکہ خیز اور دردانگیز خاکہ ہوگا۔ دینی تعلیمی کونسل کے پاس اپنا ہی کام بہت ہے لیکن جو لوگ کام کرتے ہیں وہ مقناطیس کی طرح کاموں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ عام تعلیم کی بابت نقطۂ نگاہ درست کرنا اور میدان ہموار کرنا اور اس کی ضرورت کی طرف توجہ دلانا، اتنا کام دینی تعلیمی کونسل اپنے ذمہ لے تو بہت اچھا ہو۔

تعلیم میں دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے۔ علم کے معنی ہیں جاننا۔ جاننے کا نتیجہ ہے پہچاننا۔ جاننے اور پہچاننے سے مراد ہے کسی چیز کی بھلائی اور برائی سے واقف ہونا۔ اور اس کے لئے پرکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ علم کا جوہر جاننے سے زیادہ غور و فکر میں ہے۔ اسی غور و فکر، اسی تدبر اور تفکر کی تاکید کلام مجید میں کی گئی ہے؛ ایک بار نہیں سیکڑوں بار۔ اسی غور و فکر نے مسلمانوں کو عالمی علم کا حامی اور امین اور داعی اور ناشر بنا دیا تھا۔ پیر گرد و پیش کا اور ارض و آفاق کا مشاہدہ کرنا، قدرت کے مظاہر، مشاہدات اور تجربات پر غور و خوض کرنا اور غور و فکر کے بعد نتائج تک پہنچنا یہی ہمارے اسلاف کا شعار تھا اور یہی ان کا نشانِ امتیاز۔ علم میں دین کی بھلائی اس لئے ہے کہ علم نیک و بد میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، ضمیر کے ساتھ مل کر برائی سے روکتا ہے اور بھلائی کی طرف لے جاتا ہے۔ علم میں دنیا کی فلاح کے فوائد ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ علم شعور کو جلا دیتا ہے، زندگی سلیقہ سے بسر کرنے کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ بھلے برے کی تمیز اور برائیوں سے بچنا سکھاتا ہے۔ اس کے علاوہ تخصیص کے اس دور میں کوئی شخص اپنے کام میں خواہ اس کا تعلق دفاتر سے ہو، خواہ کارخانوں سے، خواہ کھیتوں اور کھلیانوں سے، خواہ حمل و نقل کے وسائل سے، خواہ گھریلو صنعت اور ہنر اور دستکاری سے، بغیر علم حاصل کئے ترقی ہی نہیں کر سکتا۔ بات یہاں بھی ختم نہیں ہوتی۔ خود صحت جس پر ہر چیز کا ہر خوشی کا دارومدار ہے، علم کی دست نگر رہتی ہے۔ یہ دعویٰ کہ علم طاقت ہے اب کسی ثبوت کا محتاج نہیں رہا۔ وہ قومیں جو علم کی دوڑ میں آگے ہیں طاقتور ہیں، صاحبِ اقتدار ہیں، دنیا میں ان کا طوطی بولتا ہے، ان کے نام کا سکہ چلتا ہے، ٹکنالوجی ان کے اختیار میں ہے۔ جو قومیں علم لگن کے ساتھ حاصل کرتی ہیں وہ جرم ضعیفی کا ارتکاب کر ہی نہیں سکتیں۔ جس کے سینے میں علم ہے اس کے ہاتھ میں طاقت ہے۔ شعور اور طاقت کے اس سرچشمہ سے ہم خود کو محروم کیوں رکھیں۔ یاد رکھئے علم فراموشی اور خودکشی کے مابین زیادہ فاصلہ نہیں رہتا۔

اب میں دائرہ کو چھوٹا کرتا ہوں، مرکز کی طرف آرہا ہوں۔ دینی تعلیم کے نصاب اور اس کے حلقہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس تیز رفتار دنیا میں جو احتساب اور ترمیم سے غافل ہوا کہنگی اور فرسودگی کا شکار ہو گیا۔ ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ انسان کی شخصیت اور کردار، اس کی افتادِ طبع، اندازِ فکر اور طریق ردِ عمل، ان سب کی تشکیل اور ایک گونہ تکمیل بچپن میں ہو جاتی ہے۔ بعض ماہرین نفسیات کی نگاہ میں زندگی کے ابتدائی پانچ سال اس ضمن میں سب سے اہم ہوتے ہیں اور جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں تعلیم و تربیت اور ماحول کے اثرات کا شخصیت کو ڈھالنے میں حصہ بتدریج کم ہو جاتا ہے۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ والدین کو دین سے روشناس کرانا اور گھروں کے ماحول میں دین کو داخل کرنا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا بچوں کو دین کی تعلیم دینا۔ یہ گوشہ مبلغین کی

چشم التفات کا منتظر ہے۔ ہمارے معاشرے کی زبوں حالی اور محرومی پکار پکار کر کہہ رہی ہے:

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند　　آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

دوسرے یہ کہ بچوں کو پہلے دین کی تعلیم دی جائے، پھر عام رواج یافتہ تعلیم۔ دل و دماغ پر پہلے نقوش دینی تعلیم کے ثبت ہونے چاہئیں، مروّجہ دنیاوی تعلیم تک ہمیں دینی تعلیم کے راستے سے پہنچنا چاہیے۔ جو لوگ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دینی تعلیم کی طرف آتے ہیں وہ دینی تعلیم کے بے واسطہ، بے آمیزش فیض سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے دین کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ دل و دماغ لمعات دینی سے منوّر نہیں ہو پاتے۔ ان پر سرچشمۂ ہدایت اور دستورحیات کا نزول براہ راست نہیں ہوتا۔ لہٰذا بچوں کے نصاب کو دو طرح ترتیب دینے پر غور کیا جائے۔ ایک تو ان بچوں کے لئے جنھیں انگریزی تعلیم کی طرف نہیں جانا ہے اور دوسرے ان بچوں کے واسطے جو ایک قلیل مدت کے لئے دینی تعلیم کے نقوش دل و دماغ پر مُرتسم کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں اور جنھیں اقتضائیات کا نظام اور مقابلہ کی دنیا کا نظام جلد ہی رائج الوقت دنیاوی تعلیم کی طرف لے جائے گا۔

حضرات! آپ اس گتھی کو بھی حل کیجئے کہ جن بچوں کو، اور اکثریت اُن ہی کی ہے، دینی، تعلیمی مدارس میں جانے کی توفیق نہ ہوگی، ان کو عام اسکولوں میں انگریزی یا ہندی تعلیم کے دوران دین سے روشناس کرنے، دین اور روایات سے پیوستہ رکھنے کا طریقہ کیا ہوگا۔ کیا دینی تعلیمی کونسل اس طرف بھی توجہ دے گی؟ کیا یہ ممکن ہوگا کہ ان بچوں کے لئے جز وقتی اور مراسلاتی تعلیم کی سبیل نکالی جائے؟ یہ طبقہ اتنا بڑا ہے کہ ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے، نہ اسے لادینی اور گمراہی اور تشکیک کے حوالے کر کے چین سے بیٹھ سکتے ہیں۔ صورت حال کا المناک تقاضا یہ ہے کہ بہتر صلاحیتوں کے بچے دینی تعلیم کی طرف نہیں آتے۔ اگر وہ حالات کے فشار اور والدین کی غفلت کے تحت دینی تعلیم کی طرف نہیں آتے تو ہم سپر انداز کیوں ہوں؟ بچیوں نہ دینی تعلیم کو ان کے پاس بھیجیں۔ میں درخواست کروں گا کہ دینی تعلیمی کونسل اس مسئلہ کی طرف ملتفت ہو۔

مادیت کو دن بدن فروغ ہو رہا ہے۔ قدریں تیزی سے بدل رہی ہیں۔ شخصیتوں کو زر میں تولا، لباس میں پرکھا اور ظواہر سے آنکا جاتا ہے۔ باطن جو یوں ہی چھپا ہوا تھا، بالکل روپوش ہو گیا ہے۔ دور دورہ اب ظواہر کا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سطحیت کے سیلاب میں زندگی کی بنیادی قدریں بہہ گئی ہیں۔ ہمارے بچے گرد و پیش جو کچھ دیکھتے ہیں اسی سے متاثر ہوتے ہیں۔ جو لوگ انھیں خوش حال اور خوش پوش اور بہ ظاہر خوش اطوار نظر آتے ہیں انھیں کی وہ قدر کرتے ہیں، انھیں سے وہ مرعوب ہوتے ہیں۔ انگریزی لباس اور انگریزی لب و لہجہ

انھیں متاثر کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ دینی تعلیم دیتے ہیں وہ ایک طرف جدید تہذیب کی چمک دمک سے محفوظ ہیں اور دوسری جانب مادی خوشحالی سے محروم۔ چنانچہ بچے اکثر ان کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے۔ استاد کا احترام اگر دل میں نہ ہوا تو شاگرد سیکھے گا کیا بھلا ایسا استاد جو کچھ پڑھائے گا وہ عدم احترام یا عدم توجہ کی نذر ہو جائے گا۔ اس لئے ضروری نظر آتا ہے کہ اسلام کی بنیادی اقدار بچوں کے دلنشیں کر دی جائیں تاکہ ان پر آگے چل کر نہ سامری کا جادو چل سکے نہ ساحر المُوط کا فسوں یہ بات شروع سے دل میں بٹھا دینی چاہیئے کہ ظاہری چمک دمک ایک فریب ہے جو یہ فریب کھا گیا وہ عمر بھر بھٹکتا رہے گا، سکون کو ترستا رہے گا۔ یہ بات ذہن نشیں کر دینی چاہیئے کہ آدمی بڑا وہ ہے جو سچا، بے لوث، درد مند، پاک دامن اور اللہ کا فرماں بردار ہو۔ آدمی بڑا وہ ہرگز نہیں جو اچھے کپڑے پہنتا ہو، اچھے اور آراستہ مکان میں رہتا ہو اور اچھی سواری میں بیٹھتا ہو اور مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو۔ اگر شروع میں ہی بچے کو زندگی کی بنیادی قدروں سے آشنا کر دیا گیا، اس کی گرفت ان پر مضبوط کر دی گئی تو نصاب اور مثال کے ذریعہ دینی تعلیم حاصل کرنے اور مذہب کو جذب کرنے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔ نظام کائنات کے پس منظر میں مشاہدات کے وسیلے سے زندگی کی صالح قدروں کی تعلیم دینی چاہیئے جو لوگ غور و خوض کرتے ہیں انھیں چمن کا پتا پتا بوٹا بوٹا خالق کائنات کی طرف اشارہ اور اس کی حکمت کی نقاب کشائی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سعدی نے کہا تھا:

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار ❖ ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اور جب انسان سوچنے لگتا ہے کہ ساری کائنات احکام الٰہی کے تابع اور ان کی تعمیل کے لئے وقف اور خود انسان کی پرورش اور پرداخت پر مامور ہے، تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ خالق کائنات کے احکام سے سرتابی کرے تو یہ نا انصافی ہوگی، ظلم ہوگا، جہالت ہوگی۔ جب کائنات ایک طرف جائے گی اور وہ دوسری طرف تو نتیجہ ظاہر ہے:

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند ❖ تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار ❖ شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

حاصل کلام نصاب پر اس لحاظ سے نظر ثانی کی شدید ضرورت ہے۔ اس سے کچھ کم اہم اور دور رس نہ ہوں گی والدین کے نقطۂ نگاہ کو بدلنے اور ان کے طرز فکر کو سنوارنے کی کوششیں۔ یہ نسل جو آزادی کے بعد پروان چڑھی ہے اس کو اسلامی روایات میں پلنے کا موقع کم ہی ملا ہے۔ اچھے معلمین کی فراہمی

ان کی تربیت اور دشوار ہے۔

حاضرینِ کرام، دائرہ کار بڑھتا چلا جارہا ہے اور کام دشوار سے دشوار تر ہوتا جارہا ہے۔ بچوں کی پرداخت جو دینی تعلیم کے لئے سامنے آرہے ہیں، آئس برگ کی اس کہاوتی نوک تک نہیں، اس کا سراپائی کے اوپر نظر آتا ہے۔ اس تعلیم کا فیض ان بچوں تک بھی پہنچنا چاہیے جو عام اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ دینی تعلیم کے دور رس اور دیرپا ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اچھے معلمین کی فراہمی اور تربیت پر دھیان دیا جائے اور والدین کو بھی دینی تعلیم کے حلقۂ فیض میں کھینچ لایا جائے۔ ان میں سے ہر کام دشوار اور حوصلہ فرسا ہے۔ لیکن آپ لوگ یہاں نہ سہل انکاری کے لیے جمع ہوئے ہیں نہ سہل آشامی کے لیے۔ دشواری کی کشش ہی آپ کو یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ یہ شعلہ آشامیوں کا انجمن ہے، شیر خواروں کی نہیں۔ اس پروگرام کی کامیابی کے لیے ہمہ جہت کوشش کی ضرورت ہے۔ یک جہتی پروگرام برحق لیکن ناکافی ہے۔ نصاب کا ذکر چھڑ گیا ہے تو ایک بات جو میں ایک موقع پر بھی عرض کر چکا ہوں دہراؤں گا:

تعلیمی صورتِ حالات نے ہماری ملّت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ ایک طبقہ دینی تعلیم حاصل کرتا ہے، دوسرا جدید انگریزی تعلیم۔ ان دونوں کی دنیائیں الگ ہیں۔ دینی تعلیم پانے والے بالعموم جدید تعلیم سے بیگانہ رہتے ہیں اور جدید تعلیم پانے والے عام طور پر مذہب سے بے بہرہ۔ اس طرح ملّت دو نیم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ ہم آہنگی، توازن اور اتحاد سے اس وقت تک محروم رہے گی جب تک کہ دینی اور دنیاوی تعلیم پانے والوں کے درمیان فاصلہ باقی رہتا ہے۔ دنیاوی تعلیم دینے والوں کو یہ فکر کیوں لاحق ہونے لگی کہ ان کی تعلیم یک رخی نہ رہے۔ یہ کام دینی تعلیم دینے والوں کا ہے کہ اس خلیج کو پاٹیں۔ اوّل تو دینی تعلیم کے نصاب کو اس طرح دکھائیں کہ اس میں آگے چل کر دنیاوی تعلیم کے ساتھ توام ہونے کی صلاحیت رہے، دویم عام اسکولوں میں تعلیم پانے والوں کو مذہب کی جز وقتی یا مراسلاتی تعلیم دینے کا انتظام کریں۔ یہ کام بہت بڑا ہے لیکن کرنے کا ہے۔ اس سے کونسل کا دائرہ کار بہت وسیع ہو جائے گا۔ اس کام میں اچانک، بے سوچے سمجھے، بنا تیاری کے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ پہلے وسایل پر غور کرنا ہوگا، مالی اور افرادی اور تنظیمی وسائل۔ نیا کام ہاتھ میں لینے سے پہلے یہ اطمینان کرنا ہوگا کہ اس کام میں پڑنے سے کہیں اس ابتدائی اور بنیادی کام میں خلل تو نہیں پڑے گا، جو دینی تعلیمی کونسل ابتک کرتی چلی آئی ہے۔

جہاں تک دینی تعلیم کی بنیادی مہم کا تعلق ہے اس کے نصاب پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کی ضرو ہے۔ اس نصاب کے ساتھ زمانۂ حاضر اور اس کے مسائل کو پیوست کر کے اس کی جامعیت اور ا میں اضافہ کرنا مناسب ہوگا۔ عقاید کے علاوہ اعمال پر زور دینے سے بات ذہن نشیں کرانے مدد ملے گی اور دین کے عملی پہلو کو تقویت ہوگی۔ بچوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دینی چاہیے کہ دی قلم و صرف حافظہ نہیں، صرف دل و دماغ نہیں، اعمال بھی ہیں۔ اسلام کے متعلق دنیا رائے مسلمان کے معتقدات کی بنا پر قائم نہیں کرے گی، بلکہ ان کے افعال و کردار کی بنا پر۔ انسان کے دل میں کیا ہے، یہ صرف خدا ہی جانتا ہے، یا خود وہ انسان۔ لیکن وہ کیا کرتا ہے، کیا کہتا ہے اُسے دنیا دیکھ ہے، جانتی ہے، اس سے متأثر ہوتی ہے اور نتائج نکالتی ہے اور رائے قائم کرتی ہے۔

کسی اقلیت کی باعزت بقا کے لیے تین تدابیر ضروری ہیں:

۱۔ وہ اپنے مذہب اور تمدن پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔

۲۔ اَن تھک ریاضت کر کے اپنے آپ کو اکثریت سے بہتر ثابت کرے۔

۳۔ اکثریت اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ اپنے تعلقات خوشگوار رکھے۔

اس وقت زیر بحث صرف پہلی تدبیر ہے:

بچوں کے دلوں میں یہ بات شروع ہی سے ڈال دینی چاہیے۔ مذہب کے بنیادی عقاید کے علاوہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے کردار کی بابت ایک جیتا جاگتا تصور ہونا چاہیے۔ کیونکہ تصورات بالاخر شعو اور تحت الشعور، دل و دماغ اور رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں اور افعال و اعمال و اقوال کا کے برگ و بار لاتے ہیں۔ انھیں سمجھنا چاہیے کہ اسلام دین فطرت ہے، وہ فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتا اس کی پابندیاں بے راہ روی کو روکنے کے لیے ہیں۔ اس کی پابندیوں میں کشائش اور بالیدگی پنہاں کائنات خدا نے بنائی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ خدا کی طرح اس کی مخلوق بھی ایک ہے۔ مخلو خدا کا کنبہ ہے۔ اس لیے ہماری محبت کی مستحق ہے۔ اس کے ساتھ مسلمان نیکی، شرافت، رحم ا نرمی کا سلوک روا رکھتا ہے۔ اس کا مسلک ہے:

اللہ کے بندوں کے ساتھ رحم کرو، اللہ تم پر رحم کرے گا۔ سچ بولو کہ سچ حقیقت ہے اور جھوٹ باطل۔ سیدھے راستہ پر چلو۔ ظلم، جہالت، حسد، جھوٹ اور فریب سے گریز کرو

ریبوں، یتیموں، مسافروں اور حاجتمندوں کی مدد کرو۔ صرف خدا سے ڈرو۔ جو مانگنا ہے اسی سے مانگو۔
نت کی کمائی کھاؤ، دل غنی رکھو، عمل کا ایک ذرّہ بھی ضائع نہ ہوگا، جیسا کروگے، ویسا بھروگے۔
نیا اور آخرت دونوں میں بڑوں کا ادب کرو اور چھوٹوں پر شفقت۔ اللہ کے رسول اور آخرت
ایمان لاؤ، بھلائی کے کام کرو اور لوگوں کو سچائی کی طرف بلاؤ۔ اس زندگی میں جہاں قدم قدم پر مصیبتیں
یں، خوف اور لالچ اور ترغیب اور آزمائش ہے، ثابت قدم رہو۔ کوئی خوف تمھیں حق کے راستے سے
نہ سکے، کوئی لالچ تمھیں ورغلا نہ سکے۔ خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکو، دل کو حرص اور حسد سے
ک رکھو، علم حاصل کرو، عقل سے کام لو، غور و فکر کی عادت ڈالو۔ دنیا نہ خواب ہے نہ خیال، ایک
زندہ حقیقت ہے، طویل سفر کی ایک منزل ہے، ایک امتحان گاہ ہے۔ انسانیت انسانوں کے ساتھ
بھلائی کرنے میں ہے۔ جو لوگ دوسرے مذاہب کے ماننے والے ہیں ان سے بدگمان نہ ہو۔ ان کے ساتھ اچھا
رتاؤ کرو۔ انسانیت کے ٹکڑے جغرافیہ یا رنگ و نسل کی بنا پر نہ ہونے دو۔ اسے افضل و اعلیٰ، ارذل
و اسفل کے خانوں میں نہ بانٹو۔ تمھارا لطف، تمھاری ہمدردی اسی طرح عام ہونی چاہیے جیسے ہوا اور
پانی، حرارت اور روشنی۔ محنت کرو اور پھل کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو۔ قناعت کا مطلب ہے ضرورتوں
کو نہ بڑھاؤ۔ توکل کا مطلب ہے خدا کے مسبّب الاسباب اور کارساز ہونے پر یقین رکھو۔ اپنے قویٰ اور
اپنی صلاحیتوں کو کماحقہٗ استعمال نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے، توکل نہیں۔ توکل اور قناعت دونوں کا مفہوم
ہے اکلِ حلال کے لیے محنت اور کوشش، انتھک محنت اور لگاتار کوشش! اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دینا!!
اگر کوشش کامیاب نہیں ہوتی تو کبیدہ خاطر اور شکوہ سنج نہ ہو۔ مایوسی سے دامن بچانا کہ مایوسی کفر ہے۔
اس کا مطلب ہے خدا کی رحمت سے انکار۔ ہر فرد اپنے افعال کا ذمّہ دار ہے۔ اس کے اعمال کا جواب کوئی دوسرا
نہیں دیگا، خود اسے دینا پڑے گا۔ انتہا پسندی، شدّت اور سختی سے بچو۔ اعتدال اور سلامت روی اختیار کرو۔
زیادہ گوئی اور الزام تراشی اور تضیع وقت سے احتراز لازم ہے۔ پیٹھ پیچھے کسی کو بُرا نہ کہو۔ ظلم اور بیدردی
سے بچو اور نرمی اختیار کرو۔ لیکن حق گوئی اور باطل کی مدافعت کے سلسلہ میں کسی خوف یا تامّل کو راہ نہ دو۔
یہ تھی ایک مسلمان کی شبیہ۔ یہ اُن تاثرات سے کتنی مختلف ہے جو مسلمانوں کے متعلق عام ہیں۔
اگر ممکن ہو تو دینی تعلیم کے نصاب کے آئینہ میں اس شبیہ کو اُتار لیا جائے۔ نصاب میں اس عنوان کی ترمیم
کی جائے کہ عقاید و عبادات کے علاوہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور ان پر عمل کرنے والوں کی شبیہ بھی

کے تصورات اور طرزِ فکر میں پیوست ہو جائے۔

دینی تعلیمی کونسل نے گزشتہ بائیس ۲۲ سالوں میں جو کام کیا ہے وہ لائق صد ستائش ہے لیکن مسائل کی وسعت، اہمیت اور نزاکت کو دیکھتے ہوئے یہ کام ناکافی ہے۔ یہاں مجھے اپنی بات کو وزن اور وسعت دینے کے لیے چند سابق دینی تعلیمی کانفرنسوں کے خطبات صدارت میں سے اقتباسات کی اجازت دیجیے۔ ۱۹۷۵ء کے خطبۂ صدارت میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہٗ العالی اسلام کی نظر میں تحصیل علم کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کیا ایسی ملت کے لیے کسی وقت اور کسی جگہ بھی اس کا جواز ہے کہ وہ اپنی بقدر ضرورت دینی واقفیت اور اپنی آیندہ نسل کے شعوری وعلمی طور پر اسلام پر باقی رہنے کی جدوجہد اور اس کے تحفظ کے مسئلے سے زیادہ کسی اور مسئلے پر اپنی توجہ اور دلچسپی، اپنی سعی وجہد اور اپنی ایثار وقربانی کا اظہار کرے اور اس تعلیمی محاذ پر دفاع اور اقدام، اور ہر اس سعی ومثبت تدبیر کو کام میں نہ لائے جو وقت کا تقاضا اور مسئلہ کا مطالبہ ہے۔"

دینی تعلیمی کونسل کے یکے از مؤسس قاضی محمد عدیل عباسی صاحب نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا تھا:

"خیرانٹر کالج بستی کے ایک لکچرر نے مجھ سے کہا کہ ہندو لڑکے اپنے مذہب کی تمام باتیں جانتے ہیں لیکن مسلمان لڑکوں کی دینی معلومات اور اپنے اسلاف کے حالات اور تاریخ کا علم بمنزلہ صفر ہے۔۔۔۔ ہندو لڑکیاں اپنے مذہبی ماحول کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، لیکن مسلمان لڑکیاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہیں۔ ان کا نہ کوئی اصول ہے، نہ نصب العین۔ بادِ حوادث کا جھونکا تنکے کی طرح ان کو اِدھر سے اُدھر اُڑائے پھرتا ہے۔ اُنھوں نے پھر کہا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ اسکولوں کا کورس ہندو مذہب کی تعلیمات اور دیومالا سے بھرا پڑا ہے اور مسلمان لڑکے اور لڑکیاں بھی انھی اسباق کے پڑھنے پر مجبور ہیں۔ پھر انھوں نے سوال کیا کہ کیا حشر ہوگا آیندہ نسل کا جو ان ہی لڑکیوں کی گود میں پلےگی۔۔۔۔"

آگے چل کر قاضی صاحب مرحوم ومغفور لکھتے ہیں:

"دینی تعلیمی تحریک ان ہی مذکورہ مشکلات اور پریشان کن سوالات کے حل کے لیے جاری ہوئی تھی۔ دینی کونسل بنی ضلع ضلع کونسل کی شاخیں انجمن تعلیمات دین قائم ہوئیں۔۔۔۔ کونسل جبریہ تعلیم کی کامیابی کے ساتھ لڑی اور درجہ ۶ میں اپنے بچوں کا داخلہ منظور کرایا۔ ۱۹۵۹ء کا پراسپیکٹس منسوخ کرایا۔ اصلاح نصاب کے لیے انتہائی زبردست شورش کی۔۔۔۔ گاؤں گاؤں مکاتب قائم ہوگئے۔

پانچ چھ لاکھ بچے بذریعہ اُردو تعلیم پا رہے ہیں۔ ان سب باتوں سے تعلیم یافتہ طبقے کی بے خبری کیوں ہے۔ کیوں ہر جگہ اس تحریک کی افادیت، ضرورت اور اہمیت کا تذکرہ نہیں ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ آج پورا ملک اس صدا سے گونج رہا ہوتا کہ ایک بچہ یا ایک بچی ایسی نہ رہ جائے جسے دین کی تعلیم بذریعہ اُردو نہ دی جا رہی ہو۔ ہر محفل میں اس کا تذکرہ ہوتا — ہر وعظ میں یہ ایک عنوان ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔ کیوں؟ اے رفیقانِ کار مقامِ غور و فکر ہے!"

قاضی صاحب نے کہا کہ "مقامِ غور و فکر" ہے۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ "ماتم یا عبرت" کا مقام ہے۔ مردانِ کار کبھی وقتِ عزیز کو ماتم اور شکوہ سنجی میں ضائع نہیں کرتے۔ وہ محاسبہ کرتے ہیں اور منصوبہ بناتے ہیں اور منصوبہ کے خبد میں عمل کی روح پھونکتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ دینی تعلیمی تحریک ایک عنوان سے ہندوستانی مسلمانوں کی اہم ترین تحریک ہے۔ اس کا تانا بانا عوام نے بُنا ہے۔ یہ کوئی کاغذی اور خیالی تحریک نہیں جس کا تصور آرام کرسی پر دراز ہو کر کیا گیا ہو۔ اس تحریک کو تنگ نظری اور عناد کی ہوا تک نہیں لگی۔ اس کی بنیاد فراخدلی، انسان دوستی، ہدایت، پیش رفت اور اجتماعی عزتِ نفس پر ہے۔ اسے دُور کا بھی تعلق بھی ابن الوقتی، موقع پرستی، بزدلی، خویشتن سوزی، ریاکاری اور شہرت طلبی سے نہیں۔ میں ایک عرصہ تک ساحل پر کھڑا موجوں سے لڑنے والوں کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ حالات نے مجھے بھی بحرِ ذخار میں ڈھکیل دیا، "تلاطم سے برد آزما کر دیا۔ مجھے مسلمانانِ ہند کے مرکزی تعلیمی ادارہ سے وابستہ ہونے کی سعادت بخشی گئی ہے۔ اس ادارہ کا ناتا دینی تعلیمی تحریک سے جڑنا چاہیے تھا۔ آپ نے مجھے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے یہاں بلایا ہے۔ میں یونیورسٹی کی طرف سے دینی تعلیمی کونسل کی خدمت میں دعائے خیر اور سپاس و عقیدت کا ہدیہ پیش کر رہا ہوں۔ اسے خدارا منجملہ آدابِ مجلس نہ سمجھیے۔ خدا نے چاہا تو یہ ایک معنی خیز تخلیقی اور تعمیری رابطہ کا نقطۂ آغاز ثابت ہوگا۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ اپنے سفیر ہمارے یہاں بھیجیں اور یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ کو دینی تحریک سے روشناس کرائیں۔ تاکہ جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر نکلیں تو دوسرے فرائض کے ساتھ اس اخلاقی فریضہ کو ذوق اور محنت اور لگن کے ساتھ اپنے قرب و جوار میں ادا کریں۔ ہمارے ذہنوں میں یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے تعلیمی اداروں کی شیرازہ بندی اور ان کے معیار کے ارتقاع کا کام اپنے ذمہ لے لے۔ نئے ایکٹ نے تو یونیورسٹی کے مقاصد میں اس بات کو شامل کر دیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لیے سرگرم عمل ہو۔

کیا عجب کہ مقامی جذبہ اور اقدامیت کی اہمیت کو گھٹائے بغیر مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم کے سلسلہ میں مفید مشورے دے سکے اور کارآمد اقدامات کر سکے۔

اعداد وشمار کے فریب میں گرفتار ہونا پُرخطر ہے۔ لیکن اعداد وشمار سے کام لینا منصوبہ بندی اور احتساب دونوں کے لیے ناگزیر ہے۔ ہمیں ضروری اعداد وشمار جمع اور مشتہر کرنا چاہئیں اور ان کا تجزیہ کرنا چاہیے تاکہ پیش رفت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہ زمانہ منصوبہ بندی کا ہے۔ پہلے اہداف طے کیے جاتے ہیں، پھر ان کے حصول کے لیے مدت معین کی جاتی ہے۔ زمانی اعتبار سے منصوبے تین طرح کے ہوتے ہیں۔ قلیل مدتی منصوبہ جو بالعموم ایک سال پر حاوی ہوتا ہے، درمیانی جو عموماً تین یا پانچ یا چھ سال کے لیے بنایا جاتا ہے اور طویل جو ۱۵، ۲۰، یا ۲۵ سال تک کا احاطہ کرتا ہے۔ طویل منصوبہ PROSPECTIVE PLAN کہلاتا ہے۔ اس کا مقصد سمتوں کا تعین ہوتا ہے۔ درمیانی منصوبہ سمت کے علاوہ جُز‌وی اہداف اور ان کے لیے مالی وسائل کا تعین کرتا ہے۔ عملی منصوبہ عموماً یکسالہ ہوتا ہے۔ دینی تعلیم کے لیے ہمیں ان تینوں منصوبوں کی تشکیل کرنی ہوگی۔ آئندہ سال ہم کیا کرنے جارہے ہیں۔ آئندہ پانچ سالوں میں ہم کیا کریں گے اور سن ۲۰۰۰ء تک یعنی ۱۸ سال میں ہماری پیش رفت کی شرحِ ترقی اور نہضت کی سمتیں کیا ہوں گی۔ منصوبے کی تشکیل اور اہداف اور سمتوں کے تعین سے دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو کارکنوں اور رضاکاروں کے سامنے ایک واضح مقصد ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ ہفت‌خوان طے کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ جائزہ اور احتساب کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ ہر سال کے آخر میں یہ حساب لگایا جا سکتا ہے کہ کام کی رفتار کیسی رہی۔ اگر اہداف ہاتھ نہ آئے تو طریقِ کار میں کیا کمیاں تھیں انھیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

منصوبہ بندی کے تجارب نے ماہرین کو اس نتیجہ پر پہنچا دیا ہے کہ کام آگے جبھی بڑھتا ہے جب مرکزیت کی شدت کو کم کیا جائے۔ اختیارات کارکنوں کو تفویض کیے جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ مرکز میں اطلاعات آتی رہیں تاکہ اس پر نگاہ رہے کہ کام کس طرح چل رہا ہے۔ جہاں لال بتی نے آنکھ جھپکائی وہیں غلطی کی اصلاح کر دی گئی۔ دینی تعلیمی تحریک کو بھی اسی طرح کی نگرانی یا MONITORING سے استوار کیا جا سکتا ہے۔ جب کام پھیلتا ہے تو اس کو ڈھنگ سے چلانے کے لیے نگہبانی کا یہ دستور ناگزیر ہو جاتا ہے۔ نگہبانی کے ایوان میں دو ستون ہیں اوّل تحریری اطلاعات، زمانی تعین کے ساتھ۔ دوم معائنہ۔ یہ عمل سوزِ رجحان اکثر اداروں اور شعبوں میں دیکھنے میں آیا ہے کہ مرکز اتنی زیادہ تحریری اطلاعات مانگتا ہے

کہ میدان میں کام کرنے والوں کا وقت کاغذوں کی خانہ پُری میں گزرنے لگتا ہے اور کبھی کبھی فرضی اعداد وشمار کی تخلیق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ دینی تعلیم کے رضاکار جنھیں نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلہ کی پروا، اعداد وشمار کے ساتھ کھیلیں گے نہیں۔ دینی تعلیمی کونسل کو البتہ یہ چاہیئے کہ صرف چند معنی خیز اُمور کے متعلق سال میں ایک یا دو اطلاعات طلب کرے۔ حاصل کلام منصوبہ بندی، جائزہ، احتساب، احصاء اور معائنہ کے ادوات کا استعمال غالباً کونسل کے لیے سودمند ہوگا۔

میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ نصاب میں تبدیلیاں کرنا ہوں گی اور نصاب کو بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں ہمہ وقت زیرِ نظر رکھنا ہوگا۔ اس مشینی دَور میں NODULES کا تصور راہ پا گیا ہے۔ یعنی اس طرح کے مرکّب اجزا جو مختلف مشینوں میں لگائے جا سکتے ہوں اس سے محنت اور پیسہ اور وقت بچتے ہیں۔ ہمارا دینی تعلیمی نصاب اگر اس تصور کو قبول کرلے تو دوسرے مروّجہ نصابوں کے ساتھ تال میل میں آسانی ہو جائے اور دینی تعلیم کے سند یافتہ بآسانی مروّجہ انگریزی تعلیم کے نصاب میں کھپ سکیں۔

مقصود اس دراز نفسی سے صرف یہ تھا کہ دینی تعلیم کے فیض کو عام کیا جائے۔ تاکہ اس دونیم ملت کی وحدت بحال ہو سکے اور محدود ذرائع بہترین اور نتائج خیز ڈھنگ سے استعمال ہو سکیں۔ تحقیق کے ایک اور آلہ کا ذکر کردوں، یہ ہے سروے یا پایان کے قریب عملی جائزہ۔ ہمہ شماری سینسس "کائنات" کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کا عمل دیر طلب، زر طلب اور دشوار ہوتا ہے۔ سامپل سروے میں ایک نمائندہ نمونے کر اس سے "کائنات" کے بارے میں نتائج نکالے جاتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ضلع ضلع میں اس قسم کے عملی جائزے لیں جن سے یہ معلوم ہو کہ مسلمان بچے کس تناسب سے دینی تعلیم سے بہرہ پا رہے ہیں۔ اس کے بعد نقشے بنائے جائیں، جغرافیائی نقشے۔ اور ان کو پیش نظر رکھ کر آئندہ کی کارروائی کے منصوبے تیار ہوں۔ منصوبوں کے لحاظ سے نقشوں میں کوئی جگہ ایسی نہ رہ جائے جہاں مسلمانوں کی معقول آبادی کے باوجود دینی تعلیم کا بندوبست نہ ہو۔ نقشہ کی خالی جگہوں کو کتنے وقت میں پُر کرنا ہے اس کا انحصار آپ کے حوصلے پر ہوگا۔ حوصلہ اگر ہے تو وسائل کی کمی کبھی سدِّ راہ نہیں ہوتی۔

پایانِ گفتگو میں اجازت دیجیے کہ میں اپنے معروضات کو دہراؤں۔ دینی تعلیم پر ہماری بقا، پیش رفت، "اور عزتِ نفس کا انحصار ہے۔ ہمیں اس کے پیغام کو عام کرنا چاہیئے اور اس کی کامیابی اور توسیع کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا چاہیے۔ دینی تعلیم کے نصاب میں عبادات و عقاید کے علاوہ اطوار، اخلاق اور اقدار پر

زور دیا جائے۔ دینی تعلیمی نظام اور مروّجہ نظام میں تال میل کی سبیل نکالی جائے تاکہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مروّجہ تعلیمی رَو میں شریک ہونا دشوار نہ ہو۔ دینی تعلیمی جز وقتی اور مراسلاتی فیوض کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ منصوبہ بندی سے آلات وادوات اور اس کی تکنیک کا استعمال اس طرح سے کیا جائے کہ نشانات تک پہنچنے اور غلطیوں اور کمیوں کو دور کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ تعلیم کے مختلف طریقوں نے تمت کو دوئیم کر دیا ہے، اس خلیج کو پاٹنے کی ضرورت ہے۔ تمام اسکولوں میں تعلیم پانے والے بچّوں کو جز وقتی تعلیم دینے کی اہمیت بلا التفات ہے۔ والدین اور معلّمین کی تربیت کو دینی تعلیم کا اہم جز سمجھنا چاہیے۔

نشانوں کا تعین، منصوبوں کی تشکیل، پیشرفت کا جائزہ، شرح ترقی کی رفتار یہ سب امور توجہ طلب ہو گئے ہیں۔ مزید ترقی اور توسیع میں یہ اندازِ کار شاید معاون ہو۔

ہم ان صاحبوں اور ان کارگزار دردمندوں کو خراج تشکر اور نذرانۂ عقیدت ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس تحریک کو شروع کیا، چلایا اور آگے بڑھایا۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ جو مہم ہمیں سر کرنی ہے، جو قلعہ ہمیں تسخیر کرنی ہے ابھی ہم اس کے حاشیہ پر ہیں۔ جتنا کام ہوا ہے اس کا ہزار ہا گنا کام ابھی کرنے کو ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہم میں سے ہر مرد و زن کو توفیق عطا فرمائے کہ اپنی ذمّہ داری کو محسوس کریں، اپنے فرض کو ادا کریں۔ شکم پُر کو تو چوپائے بھی کر لیتے ہیں، ہمیں اس حالت سے اوپر اٹھنا ہے، دوسروں کے درد کو اپنے دل میں جگہ دینا ہے۔ ہمیں ہدایت اور روشنی کی شعاعوں کو جذب کرنا ہے اور گرد و پیش کو ان سے مستنیر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم نصرت کے طالب ہیں۔ وہ منظر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے:

| | |
|---|---|
| اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا | جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے اور آپ دیکھ لیں کہ لوگ جوق درجوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، تو اپنے رب کی حمد کیجیے اس کی تسبیح کیجیے اور اس سے مغفرت کی دعا مانگیے۔ وہ بیشک توبہ قبول کرنے والا ہے |

اللہ تعالیٰ ہمیں توبہ کی توفیق عطا فرما تاکہ ہمیں اپنی کوتاہیوں کا احساس اور حیی کی پشیمانی، مضطرب اور سرگرم عمل کر دے۔ اللہ تعالیٰ دینی تعلیم کے میدان میں انسانوں کو جوق درجوق داخل فرما! خدایا انسان دوستی، دردمندی، دینی غیرت اور دینی آگاہی کی اس مہم کے فیوض کو عام کر دے!!

●●

# سیّد احمد خاں کی یاد میں

سیّد احمد خاں علیہ الرحمہ کی شخصیت ہشت پہلو تھی۔ انھوں نے اپنی ذات میں بہت سی حیثیتوں کو جمع کیا تھا اور ہر حیثیت میں امتیاز اور اختصاص حاصل کیا تھا۔

اس وقت میں ان کے صرف ایک وصف کا ذکر کروں گا۔ یہ تھی ان کی فراست اور حکمتِ عملی، ہر مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر اور تحقیق کی عادت۔ اس میں وہ اسلام سے بہت قریب تھے اور ہندوستانی مسلمانوں سے بہت دور۔ یہ کہنا چنداں ضروری نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں نے جذبات کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ ذرا سی تحریک ہوئی اور وہ جذبات کی رَو میں بہ گئے۔ جذبات سے عقل کا آئینہ دھندلا ہو جاتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ جذباتی انسان کے لیے نفع و نقصان اور دوست دشمن کی شناخت بھی دشوار ہو جاتی ہے۔ ایسے انسان کو ہر وقت بہکایا جا سکتا ہے۔ وہ جذبات کے سیلاب میں بہتا ہے اور عقل پر ضرب نہیں پڑنے دیتا۔ وہ سوچ کر نہ منصوبہ بنا سکتا ہے نہ لگ کر محنت کر سکتا ہے۔ جذبہ کی زَد میں اس سے وہ باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جن سے اسے بالآخر نقصان ہی پہنچتا ہے اور جن پر اسے اکثر پشیمان ہونا پڑتا ہے۔ جذباتی آدمی کی شخصیت، وزن، وقار، ریاضت اور استقامت سے محروم رہتی ہے۔ وہ شعر کہہ سکتا ہے، شاعری سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ لیکن جستجو اور تحقیق، سائنس اور علم اس کی دسترس سے باہر رہتے ہیں۔

سیّد احمد خاں نے سائنسی اور علمی طرزِ فکر پر زور دیا۔ اس سے ان کا مقصد نہ صرف یہ تھا کہ مسلمان جدید علوم سے بہرہ ور اور زمانہ سے ہم آہنگ ہو سکیں، بلکہ یہ بھی کہ ان میں سوجھ بوجھ کا مادہ اور نفع نقصان اور اچھائی برائی کو پرکھنے کی صفت پیدا ہو سکے۔ وہ جوش کی ناہموار زمین سے نکل کر ہوش کی ہموار شاہراہ پر قدم رکھ سکیں۔

افسوس یہ ہے کہ اس بڑے معلّم کو اپنے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی اور ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو جذبات کے شکنجے سے نہ نکال سکے۔ انھوں نے عقل اور تحقیق، جستجو اور تفتیش اور غور و خوض کا خیر مقدم نہیں کیا۔ انھیں کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ کہر میں نگاہ کی پہنچ کتنی محدود ہو جاتی ہے اور جذبہ اور جوش میں چند قدم

دور کی چیز بھی صاف نظر نہیں آتی۔ انھوں نے دلفریب ابہام اور عقل آشوب جذبات اور نعروں سے ناتا
لیا اور بقا اور ترقی اور روشنی کو پس پشت ڈال دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمت اور ریاضت کے علاوہ ایک بہت بڑا سبق جو ہم سید احمد خاں سے لے سک
ہیں وہ ہر بات اور ہر مسئلہ کو ٹھنڈے دل سے عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی عادت ہے۔

چونکہ ہم نے یہ سبق سیکھنے سے انکار کر دیا، اس لئے سرسید کو چھوڑ کر ہمارے بیشتر رہنما جذبات
بہتے بھی ہیں اور جذبات سے اپیل کرتے ہیں۔ جذبات کا تسلط خام کاری کی دلیل ہے۔ ایسا انسان ہمیشہ د
سے دھوکا کھاتا ہے اور اکثر خود کو دھوکا دیتا بھی ہے۔

سید احمد خاں کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ جذبات سے انسان عاری ہو جائے۔ جذبات ہی سے زندگی م
حرکت اور آب و رنگ آتا ہے۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ جذبات پر انسان حکومت کرے، ان کا محکوم نہ بنے۔ انھوں
ایک مرکزی جذبے سے رشتہ جوڑ لیا تھا: قوم کی محبت اور اس کی ترقی کی آرزو! اس کے بعد انھوں نے عقل سے پوچھا
حصول مقصد کے لئے کیا کیا جائے، اور عقل کی رہبری میں انھوں نے منزل طے کی۔ اقبالؒ نے جو یہ کہا ہے:

وہی سجدہ ہے لائقِ احترام ∴ کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

اس کا مفہوم بھی سید عالی گہر کے مسلک سے ملتا جلتا ہے کہ ایک شریف جذبہ، ایک اعلیٰ مقصد کو زندگی بنا
عقل کی روشنی میں اس کے حصول کی تمام عمر کوشش کرتے رہو۔

بس میرے عزیزو! چھوٹا منہ، بڑی بات، میری گزارش بھی تم سے وہی ہے جو اس کے بانی نے
قوم سے کی تھی کہ مایوسی، اور بے حسی، غم و غصہ، قدامت پرستی اور جمود سے ناتا توڑ کر جستجو، تحقیق اور زمانہ
سے ہم آہنگی اور شرافت سے دلبستگی اور عقل کی روشنی میں مسائل کو جانچنے کی عادت ڈالیں۔ جذبات کو ایک
عقل اور دوسری طرف ضمیر کے قابو میں رکھیں اور انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دینا ترک کر دیں۔

# سرسیّد احمد خاں

## ایک مستقل سرچشمۂ فیض

انسانی دنیا میں اکثر ایسے رہ نما ہوتے ہیں جن کی معنویت ان کی زندگی ہی میں ان سے جدا ہو جاتی ہے۔ زمانہ کی سازگار ہوا کے جھونکے انھیں امتیازی درجہ عطا کر دیتے ہیں۔ مگر یہ امتیازی درجہ بہت جلد ان سے منھ موڑ لیتا ہے۔ جب ان کی شہرت درجۂ کمال میں پہنچ جاتی ہے، اس وقت کوئی شخص تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ یہ شہرت اتنی جلد زوال پذیر ہوگی۔ کچھ ایسے رہ نما بھی ہوتے ہیں جن کی شہرت نسبتاً پائدار ہوتی ہے۔ ان کی شہرت اور معنویت کی حیثیت عارضی نقش کی طرح نہیں ہوتی۔ انکی موت کے بعد ایک نسل یا دو نسل تک ان کا ذکرِ خیر باقی رہتا ہے۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ ان کی شہرت معدوم ہونے لگتی ہے۔ کچھ رہنما ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندۂ جاوید قرار پاتے ہیں۔ ایک احسان مند طبقہ کے ذہن میں ان کی یادیں محفوظ رہتی ہیں خواہ صدیاں گزر جائیں مگر ان کی قوتِ معنویت اور لچک ختم نہیں ہوتا۔ ان پر فرسودگی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے۔ وہ لوگ اپنی ذہنی ساخت کے اعتبار سے ٹھوس قدروں کے حامل ہوتے ہیں اور ان میں بہت سی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی بڑی سکت ہوتی ہے۔ بنابریں وہ لافانی ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ چونکہ غیر فانی اور محکم اصولوں کی نمائندگی کرتے ہیں اس لئے ان کی عظمت مرورِ ایام سے متاثر نہیں ہوتی۔ وہ عہد ساز ہوتے ہیں اور ان کی معنویت اپنے عہد سے آگے متجاوز ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک انسان سر سیّد احمد خاں تھے۔ وہ لافانی ہیں کیونکہ انھوں نے ایک قوم کی فکر کو بدل کر رکھ دیا۔ اسے قعرِ مذلت سے نکالا۔ اسے زمانۂ حال میں جینا سکھایا اور مستقبل کو سنوارنے کا حوصلہ بخشا۔ عصرِ جدید میں ہندوستان نے ان جیسے چند ہی بلند قامت لوگ پیدا کیے ہیں۔ وہ درحقیقت عہدِ حاضر کے سب سے زیادہ قد آور ہندوستانی مسلمان ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے انسانوں میں ایک بطلِ جلیل تھے۔ جو لوگ ان کے بعد آئے وہ قد و قامت میں ان سے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ان کی عقل کا عملی رجحان ہے۔ ان کی بصیرت کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب حالات اور

حقائق سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت کے اظہار کا موقع ہو۔ ایسے موقع پر ان کی بصیرت تخلیقی عمل کی صورت اختیار کر لیتی تھی اور اس سے حالات میں تبدیلی رونما ہوتی تھی۔ آیئے ہم غور کریں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ حالات میں سرسید احمد خاں کا کیا ردِ عمل ہوتا ہمیں موجودہ حالات کا جائزہ لینا چاہیے:

اوّلاً یہ کہ ہندوستانی مسلمان ایک ایسے گھر کی مانند ہے جس کے رہنے والوں میں شدید اختلاف ہو۔ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو تعلیمی لحاظ سے عمودی شکل میں تفرقہ سے دوچار ہے۔

(الف) کچھ لوگ جدید تعلیم سے آراستہ ہیں۔

(ب) کچھ لوگ روایتی طریقہ سے تعلیم حاصل کئے ہوئے ہیں۔ مؤخرالذکر لوگوں کو غیر تعلیم یافتہ عوام کا کلی طور پر اعتماد و تعاون حاصل ہے۔

ثانیاً یہ کہ ایسا لگتا ہے کہ سرسید احمد خاں کی تحریک ختم ہو چکی ہے اور مسلمان اپنے آپ کو تعلیم کی انتہا پر پہنچا ہوا سمجھ رہے ہیں۔

ثالثاً یہ کہ مسلمان معاشی اعتبار سے پسماندہ ہیں۔ تجارت میں ان کا حصہ ملک کی آبادی میں ان کے تناسب کے لحاظ سے کم ہے۔ ملک کے صنعتی نقشہ پر بھی ان کا نام نمایاں نہیں ہے۔ مختلف پیشوں میں ان کی نمائندگی تقریباً برائے نام ہے۔ حکومت کے دفتروں میں خواہ پالیسی سازی کے شعبے میں ہوں، یا احکام کے نفاذ سے متعلق ادارے میں ہوں، ان کا کوئی شمار نہیں۔ منظم پرائیویٹ سیکٹر اور پبلک سیکٹر میں ان کو ملازمتوں کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔

رابعاً یہ کہ جہاں تک ان کے طرزِ عمل کا تعلق ہے وہ زیادہ حسیاتی اور جذباتی ہے، عقل پسندانہ اور دانش مندانہ کم۔ اگر اس رفتار سے مقابلہ کیا جائے جو باقی معاشرہ کی ہے، تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی مسلمان رینگ رہے ہیں۔ وہ ان تمام تر وسیع ذرائع و وسائل سے جو ملک کی ترقی میں استعمال کئے جا رہے ہیں، پورا فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ ملک کی تقسیم سے ان کا اعتماد مجروح ہو گیا۔ ایک نئی نسل تقسیم ملک کے ایک عرصہ کے بعد پوری خود اعتمادی اور خودداری کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ بدقسمتی سے خود اعتمادی بھی بسا اوقات فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے مجروح ہو جاتی ہے۔ یہ فرقہ وارانہ فسادات ہی ملک کی پیش رفت میں حصہ لینے اور ملک کی کامیابیوں پر فخر و ناز کرنے سے مسلمانوں کو روکتے ہیں۔ مسلم جماعت کے پاس منظم اور معتبر رائے عامہ کا اثاثہ نہیں اور نہ اُسے پختہ کار قیادت مل رہی ہے۔ قیادت کو ملت کے ذہن کا

صحیح اندازہ نہیں۔ یہ قیادت جو ملت کو حاصل ہے عارضی فوائد کو مستقل مفادات پر ترجیح دیتی ہے۔ محرومیوں اور ناکامیوں کی صورت میں یہ اپنے خول میں چھپ جاتی ہے، ورنہ تنگ نظر ہو کر یہ دیکھنے لگتی ہے کہ حالات اس کے سخت ناموافق ہیں اور یہ کہ اسے اس کا حق کبھی نہیں مل پائے گا۔ سید احمد خاں ایسی صورت میں کیا کرتے؟ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو یہی مشورہ دیتے کہ وہ باعزت طریقہ پر حکومت اور بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتا کریں۔ وہ ان کو غم و غصہ اور جذبات کے جوش و خروش کی صلاح نہیں دیتے۔ بلکہ خود اعتمادی اور امید کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے۔ وہ اس نکتہ کو سمجھاتے کہ شکایات کا پیچ در پیچ سلسلہ خواہ کتنی ہی مستحکم بنیادوں پر مبنی ہو، مریضانہ ذہنیت اور منفی رویہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ انھیں تنبیہ کرتے کہ "یہ بڑبڑانا کیسا! یہ کراہنے کی آواز کیسی؟ کیوں حالات کا بار دیگر اندازہ نہیں لگاتے۔ کیوں دونوں ہاتھوں میں قوت پیدا نہیں کرتے، کیوں اعلان نہیں کرتے ان حقوق کا جو تمہارے ہیں؟ کیوں اعلان نہیں کرتے اپنے حقوق کا مناسب اجتماعات میں؟ بغیر کسی عناد و عداوت کے اپنے حقوق مانگو۔ عظیم قوم کے حصہ دار کی حیثیت سے اپنے حقوق طلب کرو۔ اپنے حقوق کا مطالبہ جاری رکھو۔ ہر وقت اور ہر حالت میں سخت مقابلہ کی دنیا میں سبقت لے جانے کے لئے تیاریاں کرتے رہو۔" وہ موجودہ حکومت اور اکثریتی فرقہ کے سامنے اتنی ہی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے جتنا کہ انھوں نے حکومت برطانیہ کے روبرو کیا۔ وہ ان سے کہہ ڈالتے کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان کی آبادی کا ایک خاصا بڑا حصہ ہیں۔ اگر وہ پس ماندہ اور جمود کا شکار رہے تو ملک کی ترقی کے لئے رکاوٹ ثابت ہوں گے۔ اگر انھوں نے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کا احساس کھو دیا تو سیکولرازم کے تمام دعوے اور دستور کی جملہ ضمانتیں بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ اس لئے قوم کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر انھیں ملک میں وہ تمام سہولتیں اور امدادیں دینی ہوں گی، جو ترقی پذیر ممالک طلب کرتے رہے ہیں اور کسی نہ کسی حد تک ترقی یافتہ ممالک سے پاتے بھی رہے ہیں۔ وہ اس حقیقت پر زور دیتے کہ ترقی کی رفتار اپنے آپ میں نہایت بے رحم ہوتی ہے جو اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں وہ اور زیادہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دوڑ میں آگے بڑھنے والوں کے برابر پہنچ جانے سے ناامید ہو جاتے ہیں اور پھر کوشش ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ وہ اپنے ترغیب آمیز دلائل کے ساتھ بحث کر کے واضح کر دیتے کہ انھیں مشترکہ کامیابیوں کی سطح تک لانے کے لئے مخصوص کوشش کی جائیں۔ وہ پھر اپنے ہم مذہبوں کی طرف متوجہ ہوتے اور ان سے جذبات و تعصبات کو ترک کر دینے کا مطالبہ کرتے، کیونکہ یہ بصیرت

کی روشنی کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ وہ ضرورت ظاہر کرتے ٹھنڈے دل، اور کھلی ہوئی آنکھوں سے جائزہ لینے کی۔ جوشیلے نعرے اور گروہی تعصبات سے مملو کلمات، جذبات کو برانگیختہ ضرور کر سکتے ہیں اور خون کے دوران کو تیز تر کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ کسی جماعت کے معیاروں کو بلند کر سکتے ہیں، نہ اس کی نزاکت میں اضافہ۔ وہ ان سے برابر یہ کہتے رہتے کہ یہ زمانہ عقل و دانش کا ہے، ابلاغ و ترسیل کا ہے اور سائنس و ٹکنالوجی کا ہے۔ جو لوگ زمانہ کے ان تقاضوں کو نظر انداز کر رہے ہیں، وہ دنیا سے نیست و نابود ہونے کا مختصر ترین راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ زبان کے اشتعال انگیز مسئلہ کے متعلق وہ کثیر الاوصاف نابغۂ عصر وہ جدید اردو نثر کا معمار اولیں، وہ صاحب طرز انشا پرداز جس کی انشا پردازی سے آج بھی اردو مالا مال ہے، ہندی میں کمال قابلیت حاصل کرنے پر اتنا ہی زور دیتا جتنا کہ اس نے اپنے وقت میں انگریزی پر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو مسلسل یہی مشورہ دیتے کہ اکثریتی فرقہ سے اپنے تعلقات بہتر سے بہتر بناؤ، اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ صلح و آشتی کے ماحول میں زندگی گزارو اور باہمی عزت و احترام کی فضا پیدا کرو، تاکہ مشترکہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔

وہ اپنے یہی مشورے دوسرے فرقہ کو بھی دیتے جنھیں ادب و احترام کے ساتھ سماعت کیا جاتا۔ کیونکہ بڑے انسانوں پر کسی ایک جماعت کا اجارہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کوئی ایک ملک بھی ان کا اجارہ دار نہیں بن سکتا۔ کیونکہ عقل و حکمت کی ترغیب انگیز صدا اور اخلاص کی بے خطا مضراب سے ایک عالم کے دلوں کے تار جھنجھنانے لگتے ہیں۔

یہ یقینی بات ہے کہ سید احمد خاں تعلیمی اور سماجی ترقی کی عظیم تحریک کا احیاء کرتے جو کہ افسوس ہے ان کی موت کے کچھ عرصہ کے بعد ہی اپنا اثر کھو بیٹھی۔ وہ اس تحریک کو نقطۂ عروج تک پہنچانے کے لئے اپنی جبلی توانائی کے ساتھ سرگرم عمل ہو جاتے اور پورے ملک کو اس کی لپیٹ میں لے لیتے۔ چونکہ اس راہ کی رکاوٹیں ان کی زندگی ہی میں دور ہو چکی تھیں۔ اس لئے تعلیمی و سماجی اصلاح کی یہ تحریک اب تک بہت زیادہ ترقی کر چکی ہوتی۔ اہل نظر کی تنقیدی رائے یہ ہے کہ جو عظیم کام سید احمد خاں نے تقریباً تنہا اور اس قدر کامیابی کے ساتھ پورا کر دکھایا، اس کے مقابلہ میں آسان تر کام بھی ملک کے سب مسلمان وہ تمام کر انجام نہ دے سکے۔ انھوں نے سید مرحوم کی تحریک کے چشمۂ رواں کو جاری رکھنا تو کجا، نہایت بے اعتنائی سے اسے خشک ہو جانے دیا۔ سید احمد خاں مسلمانوں کو تنبیہ کرتے کہ وہ روٹی کے ٹکڑوں کے لئے بھیک نہ مانگیں، بلکہ خود اعتمادی، بے نیازی،

...ے بیباک آزادی کا ثبوت دیا۔ وہ انھیں سستی، کاہلی، اوہام پرستی، تنگ نظری، عدم بیزاری، نااتفاقی، ...ت آفرینی، خود غرضی، کوتاہ اندیشانہ تعصب پسندی اور کینہ پروری سے پیچھا چھڑانے کی ہدایت کرتے۔

اس میں ذرا شک و شبہ نہیں کہ وہ ان دو طبقوں کے درمیان حائل خلیج کو کم سے کم کرنے کی کوشش ...تے جن میں مسلم جماعت بٹی ہوئی ہے۔ یہ کام وہ اس طرح انجام دیتے کہ اولاً نصاب تعلیم کی تجدید و ...صلاح کرتے اور ثانیاً وہ ایک جز وقتی تدریس کی تحریک شروع کرتے۔ یہ جز وقتی تدریس کی تحریک عبارت ...ان تکلے یا ضمیمے کے طور پر پڑھائی ہے جس سے پڑھنے والوں کی معلومات میں نئے اضافے ہوتے۔ جہاں ...سے ملازمتوں کا تعلق ہے وہ قومی وسائل دولت کے نظم و نسق سے مختلف سیکڑوں کے ملازمت دینے ...والوں سے رابطہ قائم کرتے اور بحث و استدلال سے انھیں وسیع تر قومی مفاد کے پیش نظر مسلمانوں ...کو ملازمتیں دینے کی افادیت سمجھاتے۔ وہ اپنے وسیع تر ذہنی ذخیرہ میں محفوظ سارے دلائل و براہین ارباب ...حکومت کو یہ جتانے اور منوانے میں صرف کر دیتے کہ مسلمانوں کو ایک قابل لحاظ تناسب کے ساتھ پولیس اور ...فوج میں بھرتی کیا جائے۔ یہ فرقہ وارانہ فسادات کے بدنما داغ کو مٹانے کے لئے ایک موثر ترین قدم ...ہوگا۔ دوسری طرف یہ عمل مسلمانوں کو ملک کے دفاع اور اس کے باشندوں کی سلامتی کی کوششوں ...میں فخر و مباہات کے ساتھ شرکت کا احساس بخشے گا۔

مسلمانوں کی طرف دوبارہ نظر ڈال کر انھیں ان کے بعد ہونے والی ترقی کی روشنی میں ...ٹیکنیکل ایجوکیشن پر زور دینا پڑتا اور لڑکیوں کی تعلیم پر بھی اپنی توجہ مرکوز کرنا ہوتی جسے وہ نی الواقع ...نظر انداز کر گئے تھے۔ انھیں ان کی اس بھول کی وجہ سے ہدف تنقید بنایا جاتا رہا ہے۔ یہ درحقیقت ...ان کی عملیت پسندی، عقل اور ان کے کبھی نہ خطا کرنے والے عصری شعور کا مظہر ہے۔ اسی طرح وہ بہت ...جلد اپنے بنائے ہوئے ادارہ کے مصنوعی تکلفات سے آراستہ کردار کو بھی خیرباد کہہ دیتے۔ کیونکہ اس ...طرح کے کردار سے شخصیت میں توانائی نہیں آتی۔ وہ یونیورسٹی سے یہ امید کرتے کہ اس کی خدمات ...اور اثرات کی روشنی قرب و جوار کے علاقے میں بھی پھیلے۔ وہ تعلیمی معیار کے گر جانے پر غضبناک ...ہوتے اور وہ نئے داخلوں کی کثرت کو مطمح نظر بنانے اور اس وجہ سے استعداد میں تخفیف کرنے پر ...ششدر ہوتے۔ وہ تعقل سے گریز اور تفکر سے فرار کی وجہ سے بجد رنجیدہ ہوتے۔ اس گزیدہ فراد ...وکالت جن شواہد و دلائل سے کی جاتی ہے، انھیں ان کی نظر نہیں تسلیم کرتی۔

ہر شخص غیر محدود طور پر تصور کر سکتا ہے کہ سید احمد خاں کا ردِ عمل موجودہ حالات میں کیا
یہ ان کی عظمت کا پیمانہ ہے کہ ان کے کارناموں کی عمر زیادہ ہو جانے کے باوجود آج بھی ہر شخص انھیں
دیکھتا ہے اور یقین کے ساتھ جان سکتا ہے کہ اگر وہ ہوتے تو کس طرح آگے بڑھتے اور یہ کہ ان کا
فکر و عمل آج کے زمانے سے بھی مربوط ہے۔ یہ عمل پسند عقل کا جوہرِ اصلی ہے۔ یہ نظر ہے جو نظریۂ طلب
کی حامل ہے۔ یہ فکر و تعقل ہے جس میں ہمدردی اور محبت کا امتزاج ہے۔ یہ کوشش ہے دوسرے
انسان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی اور اپنے نقطۂ کو سمجھانے کی۔ یہ کاوش ہے مفاہمت اور ہم آہنگی کو بڑھانے
دینے کی اور علم و آگہی کو پھیلانے کی۔

سید احمد خاں فرشتہ نہ تھے۔ انھوں نے غلطیاں بھی کی ہیں۔ یہ غلطیاں رائے زنی سے متعلق
ہیں یا زورِ احساس و عمل سے، تاہم یہ ان کے کمالِ بصیرت کو متاثر نہیں کرتیں۔ یہ انھیں اس راستے سے
منحرف نہیں کرتیں جو انھوں نے ذہن کی صفائی اور صحتِ فکر کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ یہ راستہ ان کو
ترقی و بہبودی، خود اعتمادی و خودداری اور علم پروری و بیداری کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

# ناموں میں کیا رکھا ہے

سرخی صورتِ سوال ہے۔ جواب ملے گا "بہت کچھ"۔ افراد کو چھوڑیے، اداروں پر نظر ڈالیے، ان کے ناموں سے نام رکھنے والوں کی ذہنیت اور طرزِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔

سماج نے ایک ادارہ کو پاگل خانہ کا نام دیا تھا۔ "یعنی پاگلوں کا گھر"۔ اس نام میں تضحیک اور تحقیر ملے گی۔ ہمدردی اور انسانیت اور رحم دور، دور تک نظر نہ آئے گا۔ گویا بیچارے پاگل، انسان نہیں، جانور ہیں۔ یہ نام سن کر وہ سماں سامنے آجاتا ہے کہ پھٹے کپڑوں میں ایک سہما ہوا انسان جس کی آنکھوں سے خوف اور دہشت ٹپک رہی ہے، بھاگا ہوا جا رہا ہے اور لڑکے پتھروں اور آوازوں سے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ یہ سماں عبرت ناک ہے اور شرمناک بھی۔ ظالم سماج نے پہلے تو ایک فرد پر ظلم ڈھا کر اس کے دماغی توازن کو برباد کر دیا اور پھر اس خطا پر کہ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے، وہی سماج شکاری کتوں کی طرح اس کے پیچھے پڑ گیا۔ ذہن روم کے باشندوں کی اس شیطانی تفریح کی طرف جاتا ہے کہ جب کسی شخص خصوصاً نچلے طبقہ کے فرد نے قواعد کی خلاف ورزی کی یا استبداد کے خلاف سر اٹھایا، اس کو بھوکے شیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور "ایمفی تھیٹر" میں بیٹھے ہوئے ہزارہا انسان اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں کہ سہمے ہوئے آدمی کو شیر کس طرح چشم زدن میں پھاڑ کھاتا ہے، ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

انوکھی بات ہے، الفاظ کی ترتیب سے ان کے مفاہیم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ "خانہ" اگر کسی ترکیب کا آخری جزو ہو تو اس میں بسا اوقات اس میں ایک پہلو تحقیر یا برائی کا آجاتا ہے۔ مثلاً: شراب خانہ، پاگل خانہ، قحبہ خانہ (کبھی کبھی نہیں بھی آتا ہے۔ جیسے: دواخانہ، شفاخانہ)

جسے "پاگل خانہ" کہا جاتا تھا، اسے اب "دماغی ہسپتال" کہنے لگے ہیں۔ کیا نام یہ بتاتا ہے کہ سماج اب ان لوگوں کو جو ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں، حقارت اور بربریت کے ساتھ نہیں دیکھتا۔ اسے احساس ہے کہ جو لوگ پاگل ہیں وہ گنہگار نہیں ہیں۔ گنہگار اور ذمہ دار خود سماج ہے اور سماج

پر اس کی ذمہ داری ہے کہ ان کے ساتھ انسانیت اور رحم کا برتاؤ کرے اور ان کا علاج کرائے اور
وہ اس کے دیار میں واپس لاکر آباد کرے۔

آج کی صحبت میں ہم صرف ایک اور نام کا ذکر کریں گے۔ یتیم خانہ، یعنی یتیموں کے رہنے کی
میں لیے اناتھالے (अनाथ आलय) اور انگریزی میں (ORPHANAGE) کہتے ہیں۔ ان سب میں
تحقیر نہیں تو بے حسی اور بے تعلقی کا شائبہ ملتا ہے۔ یہ نام اس مکان کے مکینوں کو عام انسانوں
سے نکال باہر کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسی ادارہ کے لیے ایک دوسرا نام سنیے۔ "بچوں کا گھر"
اچھا اور پیارا نام ہے یہ۔ جو بچے "بچوں کے گھر" میں رہتے ہیں ان کو یہ احساس ہوتا ہوگا کہ وہ اپنے گ
رہ رہے ہیں۔ وہ بے آسرا اور بے سہارا یتیم نہیں، جیسے اور بچے ہیں ویسے ہی وہ ہیں۔ دنیا ان
ساتھ دوسرے بچوں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔ ان کے لیے بھی وہی امکانات ہیں جو دوسرے بچوں کے
دیکھیے ان بچوں کی نفسیات پر، جو اس ادارہ میں پلے بڑھیں گے اور خود سماج کے نقطۂ نظر پر اس
کا کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ نام میں بہت کچھ رکھا ہے۔ سعدی کا قطعہ یاد آ رہا ہے:

پدر مردہ را سایہ بر سر فگن　　　غبارش بیفشان و خارش بکن

جس بچے کا باپ نہ رہا ہو، اس پر اپنی شفقت سے سایہ کرو۔ اس کے غبار کو جھاڑ دو اور
کی خاک کو دور کر دو۔ غبار اور خاک سے یہاں دل اور جسم دونوں کی طرف اشارہ ہے۔

ان سطور کا آغاز سوال اور جواب سے ہوا تھا۔ مناسب ہے اگر انجام بھی اسی پر ہو۔ آ
بتا سکتے ہیں جس ادارہ کو ہم بے دردی اور بے حسی سے یتیم خانہ کہتے ہیں، اسے "بچوں کے گھر" جیسا
بھرا نام جس شخص نے دیا، خود اس کا نام کیا تھا؟

جواب: "ذاکر صاحب"

# "کنگ لیئر"

شیکسپیئر کے چار بڑے اَلمیے "ہیملٹ"، "میکبتھ"، "اوتھیلو" اور "کنگ لیئر" ہیں۔ آج کی صحبت آخر الذکر کے لیے وقف ہے۔

شاہ لیئر کی تین بیٹیاں ہیں: گونیرل، ریگن، کارڈیلیا۔ اولادِ نرینہ نہ ہونے کا اُسے غم بھی نہیں۔ اُس کی بیٹیاں اُسے چاہتی ہیں اور وہ بھی اُن سے محبت کرتا ہے، اور کارڈیلیا سے سب سے زیادہ۔ گونیرل اور ریگن کی شادی ہو چکی ہے، کارڈیلیا کی ہونا باقی ہے۔ دو شاہی پیام زیرِ غور ہیں۔ خواستگار خود حاضر ہیں۔

لیئر زندگی کی اس منزل میں پہنچ گیا تھا جب انسان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ اُس نے یہ ٹھان لی کہ راج کاج اولاد کے حوالے کر دے۔ ایک روز اس نے تینوں بیٹیوں کو بُلایا اور دل کی بات اُن کے سامنے رکھی۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں چاہے جانے کی آرزو ہوتی ہے۔ لیئر جو ایک زبردست اُولوالعزم اور مضبوط اور عالی حوصلہ اور رُوئیں تن بادشاہ تھا وہ بھی اِس انسانی کمزوری سے نہ بچ سکا۔ ملک تقسیم کرنے سے پہلے اُس نے کہا آؤ دیکھیں ہماری بیٹیاں ہمیں کتنا چاہتی ہیں اور کون سب سے زیادہ چاہتی ہے۔ اسی حساب سے وہ ملک کے حصے بخرے کرے گا۔

وہ اسے کتنا چاہتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں گونیرل نے کہا کہ "وہ اسے ہر شے سے زیادہ چاہتی ہے، بینائی اور آزادی سے بھی زیادہ۔ دنیا میں کوئی اس کو اس قدر عزیز نہیں، جتنا اس کا چہیتا باپ۔" ریگن نے نہلے پر دہلا لگایا، گویا باپ کے بغیر زندگی بے کار ہے۔ باری اب چہیتی بیٹی کارڈیلیا کی تھی۔ اس نے کہا "میں آپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں، جتنی ایک بیٹی کو باپ سے کرنی چاہیے۔ نہ کم، نہ زیادہ۔" یہ سننا تھا کہ تند خو بادشاہ کے بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ "دُور ہو جا میری نظروں سے۔ اب مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھانا۔" طیش میں آ کر [illegible] سے بھی محروم کر دیا۔ ملک بڑی اور منجھلی بیٹی کو بانٹ دیا گیا۔ لیئر نے طے کیا کہ باری باری ان کے [illegible] رہے گا۔

حکومت کا ہاتھ میں آنا تھا کہ گونیرل اور ریگن کی نگاہیں بدل گئیں۔ بے التفاتی سے شروعات

ہوئی اور اہانت، عداوت، اور ظلم وستم پہ خاتمہ۔ لیئر کو اتنے آدمی اپنے ساتھ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان لوگوں نے گھر کے نظام اور سکون کو برہم کر دیا ہے۔" گونیرل نے جس کو باپ کی میزبانی کا شرف حاصل تھا اور کرکے لیئر پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اس بیدرد نے باپ کو اس قدر ذلیل کیا کہ وہ اس کا گھر چھوڑ کر چلا گیا انتہائی بے آبروئی کے ساتھ۔ منجھلی لڑکی کے یہاں پہنچا تو اس سے پہلے بڑی بیٹی کا پیغام پہنچ چکا تھا، وہاں بھی ٹھکانا نہ ملا اور ملا کیا تحقیر اور بیرخی۔ کل تک جو جلیل القدر بادشاہ تھا آج در در کی خاک چھان رہا تھا خود اس کی بیٹیوں نے اسے راندۂ درگاہ بنا دیا۔

فراخ دل، عالی ظرف قد آور، گرمجوش لیئر اپنی بڑی بیٹیوں کے تغیر رنگ، محسن کشی، دغا دشمنی اور کمینہ پن کی تاب نہ لاسکا۔ ان کے ہاتھوں اہانت اور تذلیل اس سے برداشت نہ ہو سکی۔ دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہو گئی۔ اسے باور نہ آتا کہ خود اس کی بیٹیاں جو اسی کی آنکھوں کا نور، اس کے جگر کا ٹکڑا تھیں، جو کل تک اس کی محبت کا دم بھرتی تھیں اُسے اس طرح دغا دیں گی۔ محبت کا اعلان کیا سب فریب تھا؟ اس کا مقصد کیا صرف دولت اور حکومت حاصل کرنا تھا؟ لیئر کا اعتبار زندگی اور اس کی قدروں، انسان اور اس کی زبان، رشتوں اور ان کی پاکیزگی، فطرت اور اس کی استواری سے بالکل اُٹھ گیا۔ کوئی پُرپیچ یا فریب آشنا یا دنیا دار انسان ہوتا تو اسے اولاد کی بے مہری اور محسن کشی سے اتنا دھکا نہ پہنچتا۔ لیئر سادہ دل، دیو قامت، پاک نہاد یک رخ انسان تھا۔ فریب کھانا اس کے لیے آسان تھا۔ لیکن فریب اور تنگ ظرفی اور احسان ناشناسی کے طشت از بام ہو جانے کے بعد اسے برداشت کر لینا لیئر کے بس کی بات نہ تھی۔ ایسا زلزلہ آیا کہ دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا طغیانی پر ہے۔ سمندر میں جوار بھاٹا کا سا سماں تھا۔ ایک جوالا مکھی تھا جو آگ اور لاوا اُگل رہا ہو۔

لیئر کے اندر جو طوفان بپا تھا، ایسا لگتا تھا کہ اس پُرفریب دنیا کو تہس نہس کر دے گا۔ اس ظالم طوفان نے دنیا کو تو تہس نہس نہیں کیا۔ لیئر کی شخصیت، اس کوہ پیکر انسان کی سالمیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ وہ دماغی توازن کھو بیٹھا اور دیوانوں کی طرح فلک شگاف چیخیں بلند کرنے لگا دھکا ایسا لگا کہ وہ چیخ اٹھا:

"اے آبشارو! اے طوفانو! پانی کے دھارے اُگل ڈالو۔ ڈوب جانے دو ان میں اس قصر کے کنگروں کو، گندھک کے آبخرات کو بکھیرنے والی آگ اور فکر آشام شعلو اور تنآور اوک کو

آرے کی طرح دو نیم کرنے والی بجلیو! جھلس ڈالو میرے سفید سر کو۔ ——————

——— جھنجھوڑ ڈالنے والی گرج، ہلا دینے والی رعد گرد اور اس فربہ زمین کی گولائی کو پچکا کر چورس کر دو۔"

اپنی غدار اور شقی بیٹیوں کو اس نے کوسنا اور بددعائیں دینا شروع کر دیا:

"اے احسان فراموش چڑیل! تیرے پاس دل نہیں پتھر ہے!"

خدایا اس عورت کے رحم میں بانجھ پن کو اُتار دے اور اس میں جنم دینے والے سوتوں کو خشک کر دے۔

الٰہی اس کے ذلیل بدن سے کبھی کوئی بچہ پیدا نہ ہو، جو اُسے ماں کے پاکیزہ نام سے پکارے۔

خدا کرے کہ تیرے باپ کی بددعاؤں کے نیزے تیرے حواس کو چھید چھید کر چھلنی کر دیں"

"زگین تو نے تیز دانتوں والی بے مہری کو گِدھ کی طرح اس جگہ (اپنے دل کی طرف اشارہ کرتا ہے) باندھ رکھا ہے۔"

دنیا میں اب رہ کیا گیا تھا اور دنیا خود رہنے کے قابل کب رہی تھی۔ گھاؤ ایسا کاری لگا تھا کہ لیئر سنبھل نہ سکا۔ اس کو سنبھالنے کے لیے تھا بھی کیا؟ کوئی کام ایسا نہ تھا جسے اس نے زندگی کا مقصد بنا لیا ہو اور جو ذاتی حوادث کے لیے سپر کا کام دے سکے۔ جس کے آگے ذات اور سانحات اور واردات کی حیثیت جزئی، فروعی، ثانوی رہ جائے۔

کنگ لیئر کو اس احساس نے بھی جھنجھوڑا ہوگا، کچوکے پر کچوکے لگائے ہوں گے کہ اس کے ساتھ بے لوث، بے صدا، بے ریا محبت اس کی چھوٹی بیٹی کارڈیلیا کرتی تھی۔ وہی کارڈیلیا جس کو اس نے حق گوئی کی اتنی بڑی سزا دی تھی، جس کو اس نے ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا تھا، جس کو وراثت سے محروم کر دیا تھا، وہی کارڈیلیا جس نے سزا کا بدلہ اس طرح دیا کہ باپ کی مصیبت کے ایام میں اپنے آپ کو اسے سنبھالنے میں مٹا دیا۔ باپ کی تالیفِ قلب، اس کے زخموں کا اندمال، اس کی افتادِ طبع اور دماغی توازن کی بازیابی، اس کو دلاسا دینا، اُس کے ہیجان کو دور کرنا، اسے سکون پہنچانا، کارڈیلیا کی زندگی اسی کوشش پر مشتمل رہ گئی تھی۔

کسی کے ساتھ احسان پر احسان کیے جائیں اور وہ جواب میں خنجر بھونک دے، اس کو برداشت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لیکن بہت بار ایسا ہوا ہے کہ احسان کا بدلہ اسی طرح چکایا گیا ہے۔

جب ہی تو اللہ تعالیٰ دریافت کرتا ہے :- هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ — احسان کا بدلہ
احسان کے سوا کیا ہے!

یعنی لوگ احسان کا بدلہ احسان کے سوا چکاتے آئے ہیں اور یہ لوگ گمراہ ہیں!!

دراصل کسی انسان کو پرکھنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی احسان
کر دیجیے اور پھر کچھ عرصے اس کے تیور، اس کا ردِّ عمل دیکھتے رہیے، پتا چل جائے گا کہ وہ نالائق
ہے یا جنس کا سرا، نیک طینت ہے یا کج نہاد۔ اگر ہماری زندگی میں احسان شناسی اور محسن کشی
چند مثالوں تک محدود رہتی تو شیکسپیئر جیسا عالی مرتبہ ڈرامہ نگار جس نے فطرت کو آئینہ دکھایا ہے
اپنی ایک عظیم تمثیل 'کنگ لیئر' کا موضوع نہ بناتا۔

ایک بادشاہ کی داستان آپ سن چکے جو تخت و تاج کا وارث تھا اور جب
تاج پر لات ماری اور اس کے بعد دنیا اور انسان اور عقل و ہوش پر۔ اب ایک ایسے بادشاہ کی کہا
جس کو تخت و تاج سے کوئی سروکار نہ تھا، لیکن جو شخصیت اور طبیعت، حوصلے اور عزائم توانائی اور
صلاحیتوں میں بادشاہوں کا بادشاہ تھا۔ وہ پیدا اس وقت ہوا جبکہ ہندوستان میں مغل بادشاہت کا
چل چلاؤ تھا اور ابھی اس نے اپنی نصف عمر طے کی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی بادشاہت کا آغاز
لیکن نہ وہ مغل بادشاہ جس کے دربار سے وہ وابستہ تھا نہ وہ انگریز ملک جس کی حکومت سے اسے منسلک
ہونا پڑا، شاہانہ قد و قامت میں اس کی حریف تھی۔

یہ شاہ قامت انسان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء میں دلّی میں میر متقی کے گھر میں پیدا ہوا اور وہیں پر
پروان چڑھا۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رہ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ مغل شہنشاہیت کا یہ دم واپسیں ہے
اور مستقبل اب ان طاقتوں کے ساتھ ہے جنھوں نے مشاہدہ، تجربہ، اور غور و فکر کو شعار بنایا ہے، جنھوں
نے بھاپ اور بجلی کے بازوؤں پر پرواز کی ہے، جنھوں نے صنعتی انقلاب برپا کیا ہے اور جنھوں نے
سے تسخیر کا کام لیا ہے۔ وہ غدر کے پر آشوب اور حوصلہ فرسا دور سے گزرا، مسلمانوں کے ہاتھوں سے
بادشاہت بھی گئی، اقتدار اور اعتماد بھی گیا، حوصلہ اور ولولہ بھی جاتا رہا۔ اس بیدار مغز اور دوررس
پر بصیرت اور دردمند انسان نے یہ ٹھان لی کہ انھیں یاس اور علیحدگی، غم اور غصّہ سے نکال کر نئی
دنیا کے تقاضوں سے روشناس اور عصری ترقیوں سے ہمرکاب کرے گا۔ اس فرزانے نے، جس کی عملی بصیرت

دوراندیش حکمت کی ہندوستانی مسلمانوں نے کوئی دوسری مثال پیدا نہیں کی، اپنی زندگی کو دیوانہ وار مقاصد کے حصول کی خاطر وقف کردیا۔ وہ اپنے وطن عزیز کو دنیا کی محفل میں عزت کا مقام دلانا چاہتا اور اس کی آرزو تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو جہالت، مایوسی، تنگ نظری اور قدامت پرستی سے نکال علم، روشنی، خود اعتمادی اور صحیح جوئی سے لیس کردے۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے اسکو یہی فکر دامنگیر تھی۔

اس نے قوم کی فکر میں خود کو فنا کردیا۔ زندگی کا کون سا شعبہ تھا جسے اس نے مسلمانوں کی اصلاح و پیش رفت کے لیے نہ کھنگالا ہو، کون سی صعوبت تھی جسے اس نے قوم کی خاطر گوارا نہ کیا ہو۔ مدرسے قائم کیے، کالج بنایا، رسالہ نکالا، اخبار شروع کیا، سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ دلّی کی اسلامی تعمیرات پر ایسی کتاب لکھ ڈالی جو آج تک سند ہے۔ یہ سب کچھ اس قوم کے لیے کیا جو اس کی منظور نظر تھی۔ اس نے اسلام پر ایک مغربی مصنف کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے گھر کا سامان بیچ کر ولایت کا سفر کیا اور لائبریریوں میں مطالعہ اور تحقیق کرنے کے بعد مدلل اور مسکت جواب لکھا۔

اس احسان (اور یہاں احسان کے ساتھ ایثار بھی شامل تھا) کا جواب خدا کے اس بندے کو ایسا دیا گیا جو اس جواب سے کہیں زیادہ تلخ اور جارحانہ تھا، جس پر تلملا کر پیر بادشاہ نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا۔ قدم قدم پر اس کا مذاق اڑایا گیا۔ اسے نیچری، دہریہ، کافر، قوم فروش اور انگریز پرست بتایا گیا۔ ہمارے سب سے بڑے مزاح نگار شاعر نے اپنے ترکش کے بہت سے تیروں کا ہدف سید احمد کو بنایا۔ مصلح کو مجرم، خیر خواہ کو بدخواہ، قوم پرست کو خود غرض قرار دیا گیا۔ اس کی حکمت پر نکتہ چینی کی۔ اس کی نیت پر حملہ کیا۔ اس بطل جلیل نے علیگڑھ کالج کو قائم کرنے کے لیے دربدر بھیک مانگی۔ چندہ کرنے کے لیے وہ اسٹیج پر گھنگھرو باندھ کر آگیا۔ اس نے گالیاں کھائیں، پھبتیاں سُنیں، تہمتیں اٹھائیں، لیکن اُف نہیں کی۔ توازن کھونا درکنار اس کے پائے ثبات کو جنبش نہ ہوئی۔ اس کی استقامت پر آنچ نہیں آئی۔ اس شخص پر جس نے اپنا سارا اثاثہ قوم کے لیے برباد کردیا تھا خیانت کا الزام لگایا گیا، اسے کافر قرار دیا گیا۔ کفر کے فتوے، پھبتی اور عداوت کی صبر شکن اور اعصاب دوز آوازیں ہر طرف سے کانوں میں آئیں۔ فضا ان آوازوں سے بھر گئی۔ کوئی اور ہوتا تو دیوار سے سر ٹکرا کر مر جاتا کہ ناسپاسوں کی تہمت اور استہزا کے ان تیروں سے نجات

پانے کا، جو کلیجو کو چھید رہے تھے، صرف ایک ہی راستہ نظر آتا تھا، لیکن اس کے ماتھے پر شکن بھی نہیں آئی۔ وہ اپنے دیدہ دہن اور بے شعور اور تنگ بین نکتہ چینیوں کے سامنے ہاتھ جوڑتا اور ہاتھ پھیلاتا رہا، گڑگڑاتا رہا کہ مجھے جتنا بُرا سمجھنا چاہو، تمھیں اختیار ہے سمجھو اور کہو لیکن خدارا اس کام میں میری یاوری کرو۔ اس نے ایم۔ او کالج کے لیے ایسی عمارتیں بنوائیں جو آج بھی یونیورسٹی کے سر کا تاج ہیں۔ اپنی دُور اندیش بصیرت سے کام لے کر اس نے مستقبل کا احاطہ کیا۔ مستقبل اس کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح تھا۔ آگے چل کر بیسویں صدی میں اقبال نے کہا:

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں　　آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اقبال نے آنے والے دَور کی دھندلی سی تصویر دیکھی یا الفاظ کے آب و رنگ سے تیار کی تھی۔ سیّد احمد کی تیز اور دُور رس نگاہ نے مستقبل کی تصویر کے خدوخال کو روشن کر دیا تھا۔ اس نے آج سے ایک سو پانچ سال پہلے ایم۔ اے۔ او کالج کے لیے زمین اور تعمیر کا اہتمام اس انداز سے کیا کہ وہ سو سال کام آئیں۔ اس کے بعد جو لوگ آئے وہ چند سال آگے کی سوچتے رہے اور اب تو ایک عرصہ سے لمحہ بہ لمحہ جی رہے ہیں۔ روایت ہے کہ سیّد احمد نے یہ عمارتیں باوجود اپنی کثیر اور گراں قدر مصروفیات کے خود کھڑے ہو کر بنوائیں اور یہاں تک التزام کیا کہ راج ردّے میں کوئی اینٹ بھگوئے بغیر نہ لگانے پائے۔ روزانہ صرف کا تفصیل کے ساتھ بنفس نفیس حساب لکھا۔ ان حسابات کے رجسٹر یونیورسٹی میں آج تک محفوظ ہیں۔ لیکن اس عدیم المثال ریاضت، ایثار اور اخلاص اور انضباط کا جواب کیا ملا۔ کسی بے درد اور تیرہ باطن موّرخ نے کہا کہ عمارتیں اس لیے بنوائی جا رہی ہیں کہ اپنے لیے کچھ پس انداز کر لیں۔ ظالمو! اس نے جو کچھ پس انداز کیا، آخرت کے لیے کیا۔ حالانکہ توشۂ آخرت بھی اس کا منظور و مقصود نہ تھا۔ اس کا مقصود صرف ایک تھا: ہندوستانی مسلمانوں میں قومی حمیت بیدار کرنا، انھیں جدید تعلیم سے سنوارنا، انھیں ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑا کر دینا۔ ان میں بھلے اور بُرے کا شعور پیدا کرنا۔

اور جب وہ مرنے کے قریب ہوا تو خود اس کے گھر میں اس کے لیے جگہ نہ تھی۔ دیروں کا دلبر دل شکستہ مرا۔

اب قارئین ہی بتائیں کہ 'کنگ لیئر' پر جو بیتی کیا وہ اس کے برابر تھی جو سیّد احمد پر گزری۔ اس قوم نے جس کے لیے اس نے عمر بھر پاپڑ بیلے، ہزارہا مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھائیں اس قوم نے اپنے

اس کے ساتھ کون سا ظلم تھا جو نہ کیا۔ لیکن ان محسن کشوں کی یلغار میں بھی سید احمد نے وہ دماغی توازن کھویا جس سے کنگ لیئر نے اپنی بڑی بیٹیوں کی بے مہری اور احسان فراموشی کے کارن ہاتھ دھو لیا تھا۔ جو ظاہر ہے۔ لیئر نے انسانی محبت کی رسی کو اس مضبوطی کے ساتھ نہیں پکڑا تھا جیسے سید احمد نے؛ ں محبت آفات و احساسات کے مقابلہ میں آخر الذکر کی ڈھال بن گئی۔ لیئر شاید شاہی آن بان کے احساس کو یکسر قلم مٹا نہ سکا۔ سید احمد نے اپنی انا کو اس طرح توڑ ڈالا، اپنی ذات کو اس طرح مٹا ڈالا، د کو مقصد میں اس طرح ضم کر دیا کہ اس کی ذات اور نام نہاد عزت اس کے لیے غیر مربوط، بے معنی اور دمی سے بھی کمتر ہو گئی۔ اس نے لیئر کی طرح دھوکا بھی نہ کھایا، نہ اس نے کسی کو جراحت پہنچائی تھی۔ ن تھے دونوں احسان فراموشی کے زخم خوردہ!

مسلمانوں کی پسماندگی کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہر اس شخص کو جو ان کی بھلائی کے لیے کوشاں، ان کی اصلاح پیش رفت کے لیے سرگرم ہو، بدگمانی، الزام، اتہام، اور استہزا کی صلیب تھما دیتے ہیں کہ جب تک زندہ ہو ے شانوں پہ لے کر چلو، اور مرنے کے بعد بھی بشرطیکہ اگلی پیڑھیوں کو بھی ہماری طرح صلیب سازی اور صلیب رداری کی توفیق ہوئی۔ ایسی قوم اچھی قیادت سے خود کو ہمیشہ کے لیے محروم کر لیتی ہے۔ فراست، عظمت، ور بصیرت سے قطع نظر کوئی دوسرا سید احمد کا سا کلیجہ کہاں سے لائے کہ گالیاں سنے اور مسکرائے:

اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آئے۔

کوئی قوم ترقی جبھی کرتی ہے جب اس کا ماحول اپنے رہنماؤں کو قبول کر سکتا ہے اور جب اس میں اداروں کو بنانے اور ڈھنگ اور اتحاد سے چلانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں نہ رہنما سرخرو ہوتے ہوتے ہیں، نہ ادارے کامیاب۔ اور اب ہمیں ایسے ہی رہبر ملنے لگے ہیں جن کے ہم مستحق ہیں: خیرہ، ناشناس، تنگ حوصلہ، خوشہ چیں، کوتاہ اندیش، تنگ نظر، خود غرض، خود نگر، خود پرست! یہ سید احمد کا ایثار تھا اور اس کا حسن نیت کہ اس کا ادارہ بے شمار حوادث اور خطروں کے باوجود آج تک قائم ہے اور نواں پھل پھول رہا ہے۔ مذکورہ خطروں میں سب سے بڑا خطرہ اس ادارہ سے وابستہ افراد میں سے کچھ کی خود غرضی اور بے حسی سے ہے۔ ان پر سامری کا سحر بری طرح چل گیا ہے۔ ان کے دل کی آنکھوں زر کی چمک نے خیرہ کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد اور تناسب کا فیصلہ میں قارئین کے ظن و تخمین پر چھوڑتا ہوں۔

حالی نے حیاتِ جاوید لکھی اور خوب لکھی، لیکن اس کے پاس شیکسپیر جیسے ڈراما نگار کا قلم کہ ان زلزلوں، طوفانوں، اور آتش فشاں قیامتوں کی شبیہ اُتار سکتا جو ایک بے حس اور بے شعور کی محسن کشی نے سید احمد کے دل میں برپا کر دی تھیں لیکن، یہ طوفان اور یہ قیامتیں دل کی دل میں رہ گئیں، دماغ تک نہیں پہنچیں، زبان تک نہیں آئیں۔ سید والا گہر کی مقصدیت اور لگن، بے نفس اور عملی بصیرت نے انھیں آگے بڑھنے نہ دیا۔ قوم کی محبت نے طوفانوں کو جذب کر لیا، غیض و غضب کو پی لیا۔ اس نے ساری محبت اپنی چہیتی قوم کو دی، خود قوم سے محبت کا مطالبہ نہیں کیا۔ وہ اس مایوسی اور صدمے سے محفوظ رہا، جس نے کنگ لیئر کو مار ڈالا۔ جس نے توقع ہی نہیں کی صلہ ہی نہیں مانگا، اسے شکایت کیوں ہو۔ اس نے اس ظالم ناشکری قوم کو جس نے اس کو قدم پر ایذا پہنچائی، نہ برا بھلا کہا، نہ گالی دی، نہ بد دعا دی، نہ کوسا۔ جو سراپا دعا بن کر آیا تھا وہ کیسے دیتا۔ جو سدھارنے اور سنوارنے آیا تھا وہ بگاڑنے اور برباد کرنے کی بات زبان پر کیوں جس کا ہر لمحہ، جس کا ہر فعل ایک مقصد کے تابع تھا، اُس کے ذہن میں اور زبان پر کوئی دو بات کیسے آسکتی تھی کہ یونیورسٹی کی جامع مسجد کے پہلو میں آسودہ اس بطلِ جلیل کی روح آج مضطرب نہ ہوگی۔ اتنی مضطرب وہ عارضی زندگی میں بھی نہ ہوئی ہوگی۔ اس کی زندگی میں اس کی اس کے ادارہ کی خدمت کا دعویٰ کرنے والا کون تھا، خدمت کرنے والے، محبت کرنے والے خاموشی سے اپنا کام کر رہے تھے۔ آج اس کے دعویدار ہر گوشہ میں نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ دعوے کوچۂ لیلیٰ رنگین کے دعووں کی طرح پُر فریب اور کھوکھلے نہیں۔ اس ادارہ میں جس کی بنیاد وفا اور ایثار تھی کیا اس نام کی کوئی چیز باقی ہے؟ کیا کوئی ہے جو مدار کار ڈھیا کسی گوشے سے نکل کر ڈوبے کو دلاسا دے سکتی ہے؟

# نکتہ چیں ہے، غمِ دل.....

غالب کو محبوب سے سدا شکایت رہی: غم کا مداوا نہ کرتا تو صبر کر لیتے، ظلم کی تلافی نہ کرتا تو بھی برداشت کر لیتے، بے اعتنائی برتتا تو وہ بھی کسی صورت گوارا ہو جاتی۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ وہ ان کا حالِ زار سننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ جہاں انھوں نے غمِ دل سنانا شروع کیا اس نے بال کی کھال نکالی۔ الفاظ پر اعتراض، مفہوم پر استہزا، خود ان کی ہیئتِ کذائی پر ابتسام۔ بات آگے کیوں کر بڑھتی۔ گئے تھے دردِ دل بیان کرنے، محبوب کی نکتہ چینیوں میں اُلجھ کر رہ گئے، ایک قدم آگے نہ بڑھا سکے۔ بات بننے اور مراد پانے کا ذکر کیا، خدائے سخن کو بات نبانے اور مدعا ادا کرنے کا موقع بھی نہ دیا گیا۔

یہ تو ذکر تھا "اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"۔ محبوب کی نکتہ چینی میں شوخی اور ستمگری، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی، چھیڑ چھاڑ اور تفننِ طبع شامل تھا، لیکن جس نکتہ چینی کا ہم ذکر کرنے جا رہے ہیں اس میں شوخی اور شگفتگی، ظرافت اور زندہ دلی نام کو نہیں۔ اس کا مدعا دفاع اور جان بچانا نہیں، اس کا مقصد عیب تلاش کرنا اور جراحت پہنچانا ہے۔ اس نکتہ چینی کا محرک ہے برائی ڈھونڈنے کا جذبہ۔ فارسی کی ایک مثل ہے "کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"۔ انگریزی زبان میں بھی ایک مثل بالکل اسی مضمون کی ہے۔ اس مثل کو ذرا پھیلائیے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دوسروں میں برائی وہی شخص ڈھونڈے گا جس کی طبیعت میں بدی ہے۔ جس انسان کی طبیعت میں بھلائی اور اچھائی ہوتی ہے، اس کی نگاہ دوسروں کی اچھائیوں پر پڑتی ہے۔ انگریزی ناقد اور شاعر کولرج نے اپنے رفیق ورڈسورتھ سے کہا تھا کہ ہم وہی پاتے ہیں جو کچھ ہم نے دیا ہے۔ یعنی ہر شخص اپنے دل میں جھانکتا ہے اور دنیا اسے ویسی ہی نظر آتی ہے۔ برائی ڈھونڈنے والے کو ہر طرف برائی ملتی ہے اور بیرونِ در کی برائی سے درونِ خانہ کی برائی کو کمک اور غذا ملتی ہے۔ داخلی برائیوں اور خارجی برائیوں میں لین دین کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اکثر عمر بھر بعض منقاریں گلی سڑی چیزوں کو کریدتی رہتی ہیں، وہی فضا ان کو راس آتی ہے۔ صاف ستھری اشیا اور تازہ ہوا میں ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ سُوَر صاف شفاف ہری بھری گھاس کو حقارت سے چھوڑتا ہوا غلاظت کی جانب دوڑتا ہے کہ ———— یہی اس کی

فطرت کا تقاضہ، یہی اس کی ترجیحات کا تقاضا ہے۔ وہ غریب مجبور ہے۔ لیکن کیا عیب جو انسان بھی اسی طرح مجبور ہے؟ کیا شعور اس کی رہنمائی نہیں کرسکتا؟ کیا ضمیر اسے برائیاں ڈھونڈنے اور غلاظت کریدنے سے نہیں روک سکتا؟

انسان کا دل آئینہ کی طرح ہے۔ اس میں جس طرح کا عکس پڑے گا ویسی شکل اس کی ہو جائے گی لوگوں میں اچھائیاں دیکھیے، خوبیاں ڈھونڈیے تو ان اچھائیوں کی صحبت میں آپ کا دل بھی اچھائیوں کی طرف مائل ہو جائے گا۔ برائیاں ڈھونڈیے گا تو برائی دل پر چھا جائے گی اور رگ و پے میں سرایت کر جائے گی۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ عیب جوئی صرف انفرادی نہیں اجتماعی بیماری ہے۔ ایک تو یہ متعدی ہے۔ دوسرے انجمن میں فروغ پاتی ہے۔ جہاں دو آدمی جمع ہوئے، کسی تیسرے پر نکتہ چینی شروع ہوئی۔ مصرع پر مصرع اور گرہ پر گرہ لگتی چلی گئی۔ یہ سب فرصت اور بے ضمیری کے مشغلے ہیں۔ فرصت اور بیکاری ہی اس بری عادت کی طرف لے جاتی ہے جسے ٹوہ کہتے ہیں۔ ٹوہ کا پہلا تختۂ مشق پڑوسی ہوتا ہے اور اس کے بعد یہ دائرہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔ کون ہے جو اس کی زد میں نہیں آتا۔ شاعر چلّاتا ہی رہ گیا: "تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"۔ لیکن عیب جوئیوں کی جس انجمن میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی ہو، وہاں شاعر کی آواز کون سنے گا۔

ترتیب کا فرق ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ شروع میں تفنّنِ طبع کے طور پر نکتہ چینی شروع کرتے ہیں، زبان کا چٹخارہ جلد ہی انھیں عیب جوئی کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور پھر جس دن انھیں کسی میں برائی نظر نہیں آتی انھیں چین نہیں پڑتا۔ ان کی طبیعت کو برائیوں کی طلب اسی طرح ہونے لگتی ہے جیسے عادیوں کو تمباکو، شراب یا دوسرے نشوں کی طلب۔ یہ ایک مریضانہ حالت ہے۔ جیسے جیسے اس کو غذا ملتی ہے مرض زور پکڑتا جاتا ہے۔

نکتہ چینی اور عیب جوئی کو بڑھاوا دو چیزوں سے ملتا ہے، جن میں ایک داخلی ہے، ایک خارجی۔ یعنی طبیعت کی کجی یا تنگ دلی یا بخل اور فرصت یا بیکاری۔ بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جو دوسروں کی اچھائی یا ان کی نیک نامی کو گوارا نہیں کر پاتیں۔ وہ دوسروں کی اچھائیاں اور کامیابیاں دیکھ کر جلتی ہیں اور دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے ان میں کوئی پہلو برائی کا نکال لیتی ہیں۔ دوسروں کی مصیبت یا برائی پر خوش ہونا سنگین اخلاقی مرض ہے۔ اس نوع کی خوشی اکثر نکتہ چینی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اگر تنگ دلی کا ساتھ وقت کی وسعت دے دے تو گویا سونے پر سہاگا ہو گیا۔ وہ لوگ جو گاڑھے پسینہ کی کمائی کھاتے ہیں، جو شام کو تھک ہار کر گھر آتے ہیں انھیں کہاں اس کی فرصت، کہاں اس کا دلولہ کہ دوسروں کے مزاج اور چال چلن میں عیب ڈھونڈ نکلیں۔

وہ لوگ جن کی نظر وسیع ہے اور جو بنی نوع انسان کے مسائل سے ناآشنا نہیں، انھیں فرصت اگر ملتی ہے تو عالمی یا ملکی، یا ملّی یا مقامی مسائل کی نذر یا تخلیقی اور تہذیبی اور خدمتی اور فلاحی کاموں میں صرف ہو جاتی ہے۔ نکتہ چینی اور عیب جوئی کے ہنر کو برتنے والے تو وہ لوگ ہیں جو یا تو کسبِ معاش یا حلال کی کمائی سے بے نیاز ہیں۔ آخر الذکر گروہ ان لوگوں میں پایا جاتا ہے اور اس کی تعداد روز افزوں ہے، جو دفاتر یا اعلیٰ تعلیمی اداروں میں کام کرتے ہیں، لیکن صرف اتنا کہ ملازمت محفوظ رہے، روزی پر آنچ نہ آئے۔ اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر وہ دوسروں میں کیڑے ڈالتے ہیں، ان پر تہمت دھرتے ہیں، ان کی ہر طرح کی بے راہ روی کی داستانیں تراشتے اور سناتے ہیں۔ رائی کا پہاڑ بناتے ہیں اور اپنی تخلیقی طاقت پر ناز کرتے ہیں، کوئی انکشاف کرتا ہے، کوئی اختراع۔ اللہ تعالےٰ ستار ہے، گنہگاروں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اسی اللہ کے یہ بندے پردہ دری سے لذت اندوز ہوتے ہیں، ذرا دیر کے لیے یہ نہیں سوچتے کہ دوسروں کی پردہ دری کرنے والا اس کا مستحق نہیں رہتا کہ پروردگار اس کے عیوب اور بداعمالیوں کی پردہ پوشی کرے۔

ہمارے معاشرہ میں بے تکلف دوستوں میں جو باتیں ہوتی ہیں، اس کا صرف ایک نمونہ لے لیجیے، ٹیپ کر لیجیے اور تجزیہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ یہ گفتگو زیادہ تر افراد کے متعلق ہے جس میں مزے لے لے کر برائیاں کی گئی ہیں۔ اگر کسی ایسے آدمی میں جس کی شہرت اچھی ہے کوئی برائی نظر آ گئی تو گویا کشف و کرامات کی منزل پر پہنچ گئے؛ ایک نیا برّ اعظم دریافت کر لیا۔ کولمبس کو امریکہ دریافت کرنے پر کیا اتنی خوشی ہوئی ہو گی جتنی ان منّل ساز عیب جویوں کو کسی بھلے آدمی کی کسی دیرینہ یا حالیہ لغزش کا سراغ لگانے پر۔ انسان خطا اور عصیان کا بنا ہوا ہے۔ بہتان پرداز اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں جہاں کوئی خطا نظر آئی بغلیں بجانے لگے، رنگ رلیاں منانے لگے۔ ہاں، ان کی نکتہ چینی سے ایک ذات محفوظ ہے: ان کی اپنی ذات۔

نکتہ چینی جن لوگوں کی خو بن جاتی ہے وہ اپنے آپ کو فراخدلی، عالی ظرفی اور حلم سے تو محروم کرتے ہی ہیں، سچائی اور سنجیدگی کے دروازے بھی اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔ خامیاں نہیں ملتیں تو انھیں وضع اور اختراع کرتے ہیں۔ نکتہ چینی کو دلکش بنانے کے لیے وہ داستان طرازی، دروغ بافی اور مبالغہ سے کام لینے لگتے ہیں اور وہ حجاب جو فطرتاً انسان کو جھوٹ بولنے میں ہوتا ہے، اس طرح اٹھ جاتا ہے اور زبان رواں ہونے لگتی ہے۔ مبالغہ اور جھوٹ کی سان پر ایک دفعہ زبان چڑھ گئی، پھر سچائی کی لکنت اور ضمیر کی روک اور حقیقت کی بے کیفی اسے گوارا نہیں ہوتی۔

نکتہ چینی اور عیب جوئی، غیبت اور بدگوئی کو بازگشت سے کوئی نہیں روک سکتا،

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

یہ بھی تجربہ ہے کہ آپ جس شخص سے کسی کی بُرائی کریں گے وہ سامنے اِن میں ہاں ملائے گا اور پھر جا کر لگے ہاتھ
اس شخص سے کہدے گا کہ فلاں تمھیں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس کی بُرائی کی جا رہی ہے یہ
کچھ سُن کر وہ کیوں نہ پیچ و تاب کھائے گا اور دنداں شکن جواب کیوں نہ دیگا۔ گیند کے اکثر کھیلوں خصو
ٹینس اور کرکیٹ میں فریق مخالف نے گیند جس شدت سے پھینکی ہو، اس میں جتنی طاقت بھر دی ہو اُتنی
زور آور اور اُتنی ہی طاقت سے اچھا کھلاڑی بغیر اپنی طاقت استعمال کئے اُسے واپس بھیج سکتا ہے۔
نکتہ چینی اور مہاجات کا بھی کچھ ایسا طریق ہے۔ سبکدستی کے ساتھ ایک کنکری پانی کی سطح کے متوازی پھینکے
ایک چھوٹے دائرہ کو حصار میں لیتے ہوئے بہت سے بڑے دائرے بنتے چلے جائیں گے۔ بدگوئی بھی اپنے آپ
اسی طرح پھیلاتی چلتی ہے۔ ایک تیسری مثال اس سلسلہ کی اور سُن لیجیے وہ ہے 'بوم رینگ' کی یعنی ایسا
چلانے والے کے پاس واپس آجائے۔ نکتہ چینی اور بدگوئی سے زیادہ سچا کوئی 'بوم رینگ' نہیں۔ یہ
زیادہ خود چلانے والے کو گھائل کرتی ہے۔ یہ بھی دو طرح: ایک تو اس عنوان سے کہ پھر بُرائی جواب میں
بُرائی حصہ میں آتی ہے۔ دوسرے اس طرح کہ بُرائی کرنے والا صرف ایک بات ثابت کر پاتا ہے وہ یہ تو
نہیں کر سکتا کہ جس شخص میں وہ کیڑے ڈال رہا ہے وہ دراصل ہے بھی ویسا ہی! البتہ وہ یہ ضرور ثابت کر د
ہے کہ وہ خود بُرا ہے، نکتہ چیں ہے، عیب جو ہے، دوسروں کی تعریف سن کر وہ جل بھن کر کباب ہو جاتا
دوسروں کی اچھائیاں اسے گوارا نہیں، اس کی طبیعت بُرائیاں ڈھونڈنے میں لگی رہتی ہے۔ یہ سب کچھ
کی کجی پر دلالت کرتا ہے۔

اسی پر بس نہیں۔ جو لوگ نکتہ چینی کا روگ پکڑ لیتے ہیں ان میں عمل کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے
حرکت کا مفہوم ان لوگوں کی نظر میں صرف زبان چلانا رہ جاتا ہے۔ جو زیادہ گرجتے ہیں وہ برستے نہیں
زیادہ بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں، جو زیادہ باتیں کرتے ہیں وہ کام کم کرتے ہیں، جو شخص دوسروں کی ٹوہ
رہتا ہے، وہ خود کو سنبھال نہیں پاتا، سدھار نہیں سکتا، سنوار نہیں پاتا، نکتہ چینی اور خوردہ گیری کی طرف
طبیعت جھک جائے تو اقدامیت اور عمل کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ ایسا انسان بیٹھ کر گھنٹوں باتیں
سکتا ہے، چٹپٹی، مزیدار، چٹخارے دار باتیں، لیکن ذرا دیر کے لیے اٹھ کر کام نہیں کر سکتا۔ زبان چلانے پر

سنا اس کے بس کا نہیں۔ زبان کا رسیا کسی کام کا نہیں رہتا۔ انسان کے پاس صرف زبان ہی نہیں ہے
نے اسے دماغ بھی دیا ہے، ہاتھ بھی دیے ہیں اور پاؤں بھی۔ چنانچہ جو آدمی باتیں زیادہ کرتا ہے،
ں ملاقات میں ہی آپ کی نگاہ میں اس کی عملی صلاحیت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ گفتار کے غازی کو دنیا حقارت
نگاہ سے دیکھتی ہے۔ گفتگو کی آبرو عمل سے ہے۔ جہاں اس نے عمل کو بے دخل کیا، خود بیجان ہو گئی۔ فارسی
ل ہے: "کردن صد عیب، نکردن یک عیب" کچھ نہ کرنا تو صرف ایک برائی ہوئی، کرنے میں سو برائیاں ہیں۔
تار کے غازی شاید اسی کہاوت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ زبان چلاتے ہیں، ہاتھ پیر چلانے سے پرہیز کرتے ہیں۔
بان استعمال سے ہاتھ پیر کی طاقت، کام کرنے، آگے بڑھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

آپ نے دیکھا نکتہ چینی کے یہ چٹخارے، عیب جوئی کی یہ پھلجھڑیاں، بدگوئی کے یہ پٹاخے کتنے مہنگے پڑتے
۔ زبان کا گھاؤ بہت گہرا ہوتا ہے، کبھی نہیں بھرتا۔ نکتہ چیں اٹھتے بیٹھتے دل دکھاتا رہتا ہے، بجائے اس کے
نہیں کہ کچھ تعریف کے جملے سے دل بڑھائے، ڈھارس بندھائے وہ برائی کر کے دلوں کو توڑتا چلتا ہے۔

جو شخص اپنی زبان کے سحر میں گرفتار ہو گیا، وہ خود اپنے دل سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کے جینے کی
طح لسان سے آگے نہیں بڑھتی۔ وہ عیب چنتا رہتا ہے، داستان بنتا رہتا ہے۔ دل کو وہ طاق پر بٹھا دیتا ہے۔
بان کی سطح پر جینے کا نتیجہ معلوم۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ برا بنانے یا بتانے سے طبیعت میں کجی آتی ہے۔ برائی
گفتگو میں گھر جانے سے جینے کی سطح اتھلی ہو جاتی ہے، شخصیت تہہ دار نہیں بننے پاتی، بے تہی رہ جاتی ہے۔

(نکتہ چیں، عیب جو، خوردہ گیر، الزام تراش، غیبت آشنا، بدگو، بدزبان، دریدہ دہن سبکے ہیں
زبان کے یہ سب ایک ہی سفر کی منزلیں ہیں) خود محروم جیتا ہے اور محرومی کا کاروبار اور ذہنی ناگی کی اشاعت کرتا ہے۔
شخص گفتگو کو عمل کا بدل سمجھنے لگے، جو اپنے معائب سے غافل ہو کر دوسروں کی خامیوں میں گم ہو جائے، اس میں عمل کی
صلاحیت تو ختم ہوتی ہی ہے، اصلاح کے امکانات بھی معدوم ہو جاتے ہیں۔ جو اوقات خود کو سنوارنے میں صرف ہونے
نہیں وہ دوسروں کے عیب ڈھونڈنے میں ضائع ہو جاتے ہیں:

فرصت ملی جو تزکیۂ نفس کے لیے  وہ صرف نکتہ چینیٔ اغیار ہو نہ جائے

نکتہ چینی، خوردہ گیری اور زبان درازی کی تباہ کن عادت اگر فرد سے جماعت میں پھیل جائے تو حالت
تشویشناک ہو جاتی ہے۔ پھر اس بڑی علت سے کوئی بچ نہیں پاتا۔ اس حمام میں سب ننگے ہو جاتے ہیں۔ سادے
بہت سے رنگ پکڑنے لگتے ہیں۔ جن افراد کا رجحان خودنمائی، داد جستجو اور نازیبا گفتگو کی طرف نہیں ہوتا وہ بھی

اور ماحول سے متاثر ہو کر اس بُری عادت' اس مہلک روگ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کسی قوم میں اگر نکتہ چینی
یادہ گوئی کا چلن عام ہو جائے تو سنبھلنے اور ترقی کرنے کی راہیں اس پر بند ہو جاتی ہیں۔ غور کیجے جس
سے ہمارا تعلق ہے' اس نے ہندوستان بھر میں بالعموم اور شمالی ہندوستان میں بالخصوص اپنا دامن
درازدستی اور عمل کی کوتاہی کے ساتھ جوڑ لیا ہے۔ ارزاں اور لذت خیز نکتہ چینی اور محنت اور عمل سے
ہمارا شعار بن گئی ہے۔ نکتہ چینی نے دل توڑے ہیں اور اتحاد کے شیرازہ کو بکھیر دیا ہے۔ غالباً ٹھیک
نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں نکتہ چینی کا عمل ہو وہاں نہ فرد کی بات بن سکتی ہے نہ قوم کی —— وہاں کاہلی وجودی
اور نفاق اور دروغ کا دور دورہ ہوتا ہے۔

اجتماعی زاویہ سے دیکھیے: نکتہ چینی نے یقین کو مجروح کر دیا ہے۔ ہم ہر شخص کی نیت اور خلوص
کرنے لگے ہیں۔ اسی لیے نہ ہم کسی فرد کی قیادت کو قبول کر سکتے ہیں، نہ کسی ادارے کو ہم آہنگی' خوش
خوش اسلوبی کے ساتھ چلا سکتے ہیں۔ کسی اجتماعی مقصد کے لیے سر جوڑ کر ہم نہیں بیٹھ سکتے' اور نہ قدم ملا کر
بڑھ سکتے ہیں۔

اور اس تباہ کن نقطۂ نگاہ' اس مہلک جنبشِ زبان، اس تعرّض پر داز افتادِ طبع' اس حوصلہ
زیاں کاری کی انتہائی عبرتناک مثالیں ڈھونڈنے ہمیں زیادہ دُور جانا نہیں پڑے گا!

نکتہ چینی اور عیب جوئی کا سرچشمہ یا نخوت ہے یا حسد یا شرارت یا محض بیکاری اور اس کی
بے دردی ہے اور بھی۔ وہ لوگ زیاں کار ہیں جو ذرا سی لذت کے لیے دوسروں کی شہرت اور اپنے
کو برباد کرتے ہیں' جو چلتے پھرتے نفاق کا بیج بوتے ہیں' جو بُرائیوں سے کھیلتے رہتے ہیں' جو سنجیدگی
اور وقار اور گہرائی اور انضباط سے اپنی شخصیت کو محروم کر دیتے ہیں جو بیہودہ دری کو شعار بنا لیتے ہیں
جو اپنے اور دوسروں کے لیے تلخی کی کاشت کرتے ہیں۔ ایک پل کی ارزاں لذت کے لیے کیا یہ سودا گراں

# ہری پُتلیوں والا عفریت

تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارہ میں "ہمارے مسائل" کے عنوان سے وہ معایب گنائے گئے تھے جو ہندوستانی مسلمانوں کے گلے کا ہار اور ان کی راہ کا روڑا بن گئے ہیں۔ ان میں سرِ فہرست حسد ہے۔ انگریزی نہ جانے کیوں اسے Green Eyed Monster کہتے ہیں۔ میں نے اس کا ترجمہ "ہری پتلیوں والا عفریت" کیا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ Monster اور عفریت میں باہم کوئی تعلق نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین اس سے بہتر ترجمہ کریں گے اور ترجمہ کے علاوہ اصل کی وجہ تسمیہ پر بھی غور فرمائیں گے۔

حسد کی حیثیت ساری برائیوں میں منفرد ہے۔ دوسری کسی اخلاقی برائی کو لے لیجیے، بظاہر اس میں ہر کسی منفعت کا کوئی پہلو، خواہ کتنا دور از کار اور پُر فریب کیوں نہ ہو، ضرور نکل آئے گا جو اس کو اپنی طرف کھینچے گا۔ اس طرح اسے یک گونہ جواز مل جائے گا۔

حرص یا طمع یا ہوس یا ہوک یا لالچ کو لے لیجیے۔ جس شخص کو یہ جذبہ لاحق ہوتا ہے وہ کسی چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ خواہ وہ دولت ہو، خواہ اقتدار، خواہ جاہ و ثروت، خواہ خدم و حشم، خواہ زمین و مکان۔ زن، زر، زمین کی طمع سے کم لوگ اپنا دامن بچا سکے ہیں اور یہ طمع اکثر فتنہ و فساد، اختلاف و نفاق کا باعث ہوتی ہے۔ وہ چیز اسے ملے یا نہ ملے لیکن جذبہ کا جواز یہ ہے کہ انسان کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ خرابی یہ ہے کہ اس کی خواہش اور کوشش اعتدال سے تجاوز کر جائے اور اس کی شدت اسے طمانیت قلبی اور سکون سے محروم کر دے یا وہ کوئی چیز اس مقدار میں چاہے جس کو وہ استعمال نہ کر سکے اور اس کی چاہ دوسروں کی محرومی کا سبب بن جائے۔ یا وہ کوئی ایسی چیز چاہے جس پر اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا ہو، یا وہ کسی ایسی چیز پر للچائے جو اس کے لئے مضر اور تباہ کن ہو۔ طمع بہرحال سکون اور بسا اوقات راحت روحی سے محروم کر دیتی ہے۔

اخلاقی معایب میں غصہ اکثر پشیمانی کی طرف لے جاتا ہے۔ غصہ کی باڑھ اتر جاتی ہے، تو غصہ کرنے والے کو اپنے دونوں طرف افسردگی اور اضمحلال کی ریت بچھی ہوئی نظر آتی ہے۔ "آخر مجھے کیا ہو گیا تھا کہ اپنے

آپے میں نہ رہا، جو کچھ منہ میں آیا بک دیا، نہ جانے کتنوں کا دل دکھا ہوگا"۔ غصہ انسان کو بے قابو کر دیتا ہے اسے خود پر اختیار نہیں رہتا۔ غصہ میں دوسروں کو جراحت پہنچانے کی نیت بالکل نہیں ہوتی، لیکن پہنچ جاتی ہے اس اخلاقی عیب میں خود غرضی شامل نہیں۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے قطع نظر غصہ اخلاقی معائب میں نسبتاً کم سنگین ہے جس طرح خود غرضی۔ یہ عفو طلب ہے اور اس میں ایذا رسانی کی نیت بھی نہیں ہوتی۔

جسمانی یا جنسی خواہش نسل کی بقا اور افزائش کی ضامن ہے۔ اس کے تقاضوں کو رد کرنا اس پر بند باندھنا ہے۔ لیکن اس کو بے مہار چھوڑنے کے معنی ہیں انسانیت اور تہذیب دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دینا۔ زر، زن، زمین کی آشوب پرور تثلیث میں اس جذبہ کا روئے سخن زن کی طرف ہے۔ لیکن جب فریق مرد اور زن ہوں تو زن کو ہی مورد الزام کیوں قرار دیجیے۔ قلم یا موقلم ابھی تک مردوں کے ہاتھ میں تھا، نقشہ جس طرح چاہا کھینچ دی۔ ظاہر ہے کہ عورت گھاٹے میں رہی اور فساد اسی سے منسوب کیا گیا۔ حالانکہ قصور زیادہ مرد کا ہے۔ اب عورت کے ہاتھ میں بھی برش آگیا ہے اور خامہ بھی۔ اب جو تصویر بنے گی وہ حقیقت سے قریب ہوگی۔ بہر کیف جنسی خواہش جسے اہل نظر نے ہوس کا نام دیا ہے، دراصل بری شے نہیں۔ حدود سے تجاوز کر کے بعد بری ہو جاتی ہے اور اس کی بدولت انسان اسفلِ سافلین کی ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔

بُغض اور کینہ سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور فتنہ و فساد کی نئی نئی راہیں نکلتی ہیں۔ اس کی شروعات غبار اور کدورت سے ہوتی ہے، شاعر نے کہا تھا:

کر دیجیے معاف، یہ پاکیزہ صاف دل ۔۔ ہے کس لیے غبار کو مہماں کیے ہوئے

غبار کی تہ پر تہ جمتی چلی جائے تو وہ کدورت کی راہ سے کینہ، بغض اور عداوت تک پہنچ جاتی ہے۔ کینہ انسان کو بلندی سے پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ نگاہ کا انداز بگڑ جاتا ہے۔ کینہ جس کے خلاف ہے اس میں کینہ ور کو کوئی بات اچھی نظر نہیں آتی۔ اس کی خوبیاں برائیوں میں بدل جاتی ہیں۔ طرزِ فکر مسخ ہو جاتا ہے۔ لیکن کینہ خواہ کتنا ہی غارت گر کیوں نہ ہو، بے سبب نہیں ہوتا۔ کوئی سبب واقعی یا خیالی ضرور ہوتا ہے، جو غبار بن کر دل کے آئینہ کو مکدر کر دیتا ہے۔ کدورت کو عداوت بنتے دیر نہیں لگتی۔

بُخل کے شکنجے سے خدا بچائے۔ اس کی بہن حرص برابر اس کا ساتھ دیتی ہے۔ اس کا دستور ہے کہ جو کچھ نظر آئے، جہاں تک ہاتھ پہنچے سب کچھ سمیٹ لو اور کسی دوسرے کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دو۔ کنجوس جو کچھ کماتا ہے یا جوڑتا ہے، اس کا فائدہ خدا کی مخلوق تک پہنچنا تو درکنار، خود اس تک بھی نہیں پہنچتا۔ وہ

خزانہ پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ بخیل اور تنگ نظری میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بخیل آدمی کسی کی تعریف بھی نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ممتحن ہے تو اچھے نمبر دیتے ہوئے اس کی جان پر بن جاتی ہے۔ اس کے سامنے کسی کی تعریف کی جائے تو اس کی جبیں پر شکن آجاتی ہے اور شکن نہ بھی آئے تو تیور صاف بتا دیتے ہیں کہ تعریف اسے ذرا بھی نہیں بھائی۔ بخل سے شخصیت ممی کی طرح سکڑ جاتی ہے، بے جان ہو جاتی ہے ایسا لگتا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ولولہ، ذوق، حوصلہ، امنگ، آرزو سب کمھلا جاتے ہیں۔

گھمنڈ کا شمار کلیدی عیوب میں ہے۔ انسان کی، اس ذرۂ ذلیل کی بساط ہی کیا جس پر اتراتا پھرے وسیع کائنات میں زمین خود ایک ذرہ سے زیادہ نہیں۔ پھر اس میں انسان، جسے ایک لمحہ ثبات نہیں، ہنستا اور اکڑتا ہوا دکھائی دے، یہ منظر کتنا مضحکہ خیز ہے! مضحکہ خیز ہی نہیں عبرت ناک بھی!! پھر گھمنڈ ایک نشہ ہے جس کی جھونک میں انسان بھلے برے، دوست دشمن میں فرق نہیں کر سکتا اور دوست دشمن دونوں کو اہانت آمیز برتاؤ سے جراحت پہنچاتا ہے۔ گھمنڈی انسان اس مرغ کی طرح ہے جو پر پھڑپھڑا کر سینہ تان کر، گردن اٹھا کر ساری دنیا کی طرح چیلنج پھینک کر بانگ دیتا ہے۔ اس سے غافل کہ بلی اس کی گھات میں ہے اور اس کی اکڑی ہوئی گردن کے لئے دانت تیز کر رہی ہے۔ گھمنڈ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا سوائے عداوتوں اور خود فریبیوں کے۔

ایک اور عیب ہے بے حسی، بے تعلقی، بے پروائی۔ یہاں ایک شعر یاد آ گیا جو بیت بازی کے ہنگام میں اکثر کام آتا ہے:-

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ⁂ ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

ہمدردی اور دردمندی کے لئے تو انسان پیدا کیا گیا اور وہ اسی سے کنارہ کش ہو جائے!

گر از نیستی دیگری شد ہلاک ⁂ مرا ہست بط را ز طوفاں چہ باک

اگر کوئی دوسرا اس لئے مر گیا کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا تو کیا ہوا، میرے پاس تو ہے، باڑھ سے بطخ کو کیا ڈر)۔ بے حسی کو جذبہ کیوں کہیے، یہ تو ایک منفی کیفیت ہے جسے جذباتی افلاس" کہنا اولیٰ ہے۔ جس آدمی میں کوئی جان نہیں ہوتی، کوئی دم خم نہیں ہوتا۔ وہ گوبر گنیش یا مٹی کے مادھو کی طرح زمین پر بوجھ بنا رہتا ہے۔ سوئیاں چبھو دیجیے تو بھی اس پر کوئی اثر نہیں۔ لیکن گنیش کو اس ہاتھی سے کوئی نسبت نہیں جسے نومبر میں ہونے والے ایشیائی کھیلوں کا نشان بنایا گیا ہے اور جسے اپّو کا سامعہ نواز نام اور بامزہ نواد

شکل دی گئی ہے۔ ایو کی چشم تنگ میں آسمان کی تجلیاں اور زمین کی ساری شرارتیں بھری ہوئی ہیں۔ ایسا جان پڑتا ہے کہ اس نے ابھی ابھی کوئی شرارت کر کے دم لیا ہے یا کوئی شرارت سوجھی ہے۔

بہر حال بے حسی، بے تعلقی، بے پروائی، عیب ضرور ہے۔ لیکن بے ضرر۔ یہی عیب جب خود غرضی کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، تو طرح طرح سے غضب ڈھاتا ہے۔ دوسروں کو روندتا ہوا چلا جاتا ہے اور مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ لیکن خود غرضی بھی کسی مقصد کے تحت ہوتی ہے، خواہ وہ کتنا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو۔

ریاکاری کا مرض بہت عام ہے۔ اس کا روگی گیہوں دکھاتا ہے اور جو بیچتا ہے۔ اس کے دل میں زہر اور زبان پر امرت ہوتا ہے۔ جو کچھ اس میں ہے اُسے چھپاتا ہے اور جو کچھ نہیں ہے اس کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کے اقوال، افکار اور افعال میں تضاد کا رشتہ ہوتا ہے۔ ریاکار کے کردار کا گھناؤنا پن جلد یا بدیر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ ریاکاری ایک مقصد کے تحت ہوتی ہے۔ اپنی شبیہ کو سجا کر پیش کرنا اور اپنی پاکبازی اور راست روی اور خدا ترسی اور انسان دوستی کے ڈنکے بجانا اور ممکن ہو تو اس طرح شہرت، عزت اور اقتدار حاصل کرنا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے دور نے ریاکاری کو قبول عام کی خلعت دے دی اور ہمارے زمانے کا یہ سب سے بڑا خطرناک وصف ہے جسے اہل سیاست بالخصوص فنکارانہ انداز سے برتتے ہیں۔ ہمارے عہد کے نوجوانوں میں بغاوت، سرکشی اور اقدار فراموشی اور تشکیک اور استہزا اور نظم شکنی کا رشتہ مبصرین بزرگوں کی کھوکھلی ریاکاری کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ ریاکار سمجھتا ہے کہ وہ دنیا کو دھوکا دے رہا ہے، دیتا خود کو ہے۔ ریاکاری فریب کی ہی ایک شکل ہے۔ فریب کا بھانڈا چوراہے پر پھوٹتا ہے یا زنداں میں۔ ریاکاری، مکر و فریب سب دروغ کے گھرانے کے افراد ہیں۔ جھوٹ کی سرزمین میں یہ پیدا ہوتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ سچ کی "سموم" کے ایک جھونکے سے مرجھا جاتے ہیں۔

اخلاقی برائیوں میں پھیلنے اور خود کو بڑھاوا دینے کی ایک غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ دو اخلاقی برائیاں کسی میں جمع ہو جائیں تو یہ جوڑ کا نہیں ضرب کا عمل ہوتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے اس قدر شہ ملتی ہے کہ ان کا اجتماعی اثر ان کے مجموعہ سے کہیں آگے نکل جاتا ہے۔

مذکورہ عیوب میں سے سوائے غصہ اور گھمنڈ کے، کوئی بے مقصد نہیں۔ ان میں کوئی نہ کوئی پہلو خیالی، عارضی یا ذاتی منفعت کا نکل آتا ہے۔ غصہ اور گھمنڈ کے پیچھے ایذارسانی کی نیت نہیں ہوتی۔ غصہ اچانک آتا ہے سیلاب کی طرح اور ہوش و حواس کو بہا لے جاتا ہے۔ گھمنڈ میں انسان اپنی خوبیوں سے متاثر ہو کر غبارے

کی طرح پھونے لگتا ہے۔ اس سے دوسروں کو تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ لیکن گھمنڈ اپنے حامل سے ایذا رسانی کا مطالبہ کبھی نہیں کرتا۔ تنہا حسد ایک ایسا عیب ہے جس کا سرے سے کوئی وجہ جواز نہیں، جس سے حسد کرنے والے کو کسی فائدے کے پہنچنے کا احتمال تک نہیں اور جو خود کو ہمہ وقت جلاتا ہے اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے۔ یہ عجیب حالت ہے یہ ایک انوکھی بیماری ہے کہ انسان کو اچھائیاں بری لگنے لگیں۔ دوسروں کی خوشیاں اس کے لیے غم بن کر آئیں۔ ہمسایہ کی کامیابی اور خوش حالی اسے جلا کر خاک کر دے۔ یہ کیسا اوندھا آئینہ ہے جس میں ہر تصویر الٹی نظر آتی ہے۔ دوسروں کی مصیبت اور تکلیف سے حاسد خوش ہوتا ہے۔ ان کی شکست اور رسوائی پر بغلیں بجاتا ہے۔ بات یہیں تک رہتی تو بھی ہم صبر کر لیتے۔ لیکن حسد کرنے والا دوسروں کو آگے بڑھتا ہوا دیکھتا ہے تو نچلا نہیں بیٹھتا۔ انھیں ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہے، گرا دیتا ہے۔ خود جل بھن کر کباب ہو جاتا تو اچھا تھا، اس کے خبث نفس سے ہمنفسوں کو نجات ملتی لیکن جو آگ اس کے دل میں سلگتی ہے، بھڑکتی ہے، اس کی منزل مقصود دوسروں کے گھر ہوتے ہیں۔ جب تک وہ نہ جل جائیں اس کے کلیجہ میں ٹھنڈک نہیں پڑتی۔ آپ ہر شخص کو رام کر سکتے ہیں، سوائے حاسد کے:

توانم آنکہ نیازارم اندرون کسی ؛ حسود را چہ کنم کو ز خود برنج در است

(میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ کسی کا دل نہ دکھاؤں، لیکن حاسد کو کیا کروں کہ خواہ مخواہ خود بخود رنجیدہ ہے)

حاسد سدا خود سوزی میں مبتلا رہتا ہے اور جاں سوزی کے لیے مستعد۔ اسے پھول کانٹا نظر آتا ہے اور اگر دراصل کانٹے سامنے آئیں تو اس کے دل کا چمن لہلہا اٹھتا ہے:

بنا لیا ہے نگاہ حسود کو معیار ؛ وہ پھول پھول نہیں ہے جو خار ہو نہ سکا

اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوگی کہ انسان بلا وجہ بنی نوع انسان کا دشمن بن جائے اور ان کی خوشی اسے ایک آنکھ نہ بھائے اور ان کی تکلیفوں پر شکر ادا کرے۔ اب اس قوم کی بدنصیبی پر قیاس کیجیے۔ جس کے بیشتر افراد اس روگ میں مبتلا ہوں۔ ہندوستانی مسلمان (میں ملک کی حدود کو چھوڑنا نہیں چاہتا) من حیث القوم حسد کی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے ہیں۔ ان کے زوال اور ادبار کا ناٹک اگر کبھی اسٹیج پر کھیلا گیا، تو اس میں حسد کا کردار سب سے اہم ہوگا۔ بات لمبی ہو گئی ورنہ بتایا جاتا کہ حسد نے کس کس عنوان اور کس کس شکل میں ہماری جڑوں کو کھودا ہے۔ حسد، نفاق، انتشار اور پراگندگی کو جنم دیتا ہے۔ حسد کو

اغیار کا پھلنا پھولنا گوارا ہوتا ہے، لیکن اپنوں میں سے اگر کوئی ترقی کر گیا یا خوش حال ہو گیا تو حاسد کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اپنوں میں سب سے پہلے قریبی اعزّہ اور ہمسائے آتے ہیں۔ قرب کے دائرے وسیع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی مسلمان ترقی کرتا یا امتیاز، یا خوش حالی یا شہرت حاصل کرتا ہوا نظر آئے، تو مسلمان اس میں کیڑے ڈالنے اور عیب ڈھونڈنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی تنظیم زیادہ عرصے تک ڈھنگ سے کام نہیں کر پاتی۔ کوئی ادارہ ٹھیک سے نہیں چل پاتا۔ جہاں کسی ادارے یا انجمن نے کامیابی حاصل کی، اس کے سربراہوں پر حسد کے زہریلے دہانے کھول دیے جاتے ہیں اور ان غریبوں کو عافیت صرف کنارہ کشی اور روپوشی میں نظر آتی ہے۔ ہمارے ایک بڑے محترم بزرگ نے اس دور میں مسلمانوں کی پسماندگی اور زبوں حالی کی ایک وجہ یہ بتائی کہ ان میں اچھے اداروں کو بنانے اور چلانے کی صلاحیت کا فقدان ہے۔ اس کی بڑی وجہ حسد ہے۔ جو ہمارا قومی وصف بن گیا ہے۔ ہمارا شعار ہے خود سلگنا اور دوسروں کو جلانا۔ حسد کی اس جہاں سوزی کے آگے نہ قاید ٹھہر پاتے ہیں، نہ ادارہ، نہ انجمن۔

اگر طبیعت میں حسد ہو تو اسے یکقلم خارج تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسے کم اور اس کی آنچ کو دھیما ضرور کر سکتے ہیں۔ جہاں تک خود سلگنے اور جلنے بھننے کا تعلق ہے، عقل کو بروئے کار لایا جائے اور سوچا جائے کہ خود کو سلگانے اور تباہ کرنے سے ہمیں کیا مل جائے گا۔ عقل سمجھائے گی کہ اگر ہمسائے کے چمن میں پھول کھل رہے ہیں تو ہمارے دل میں کانٹا کیوں چبھ رہا ہے۔ اگر پھولوں کو دیکھ کر ہم حظ اندوز نہیں ہو سکتے تو ان کی طرف سے نظر کیوں نہیں ہٹا لیتے۔ اس طرح طبیعت مکدر ہونے سے بچ جائے گی۔ جہاں تک خود سلگنے کے بعد دوسروں کو جلانے کا سوال ہے۔ وہاں ضمیر کو بروئے کار لانا پڑے گا۔ اپنوں کو تباہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ وہ زندگی میں کامیاب ہوں گے، انسانی پیش رفت میں معاونت کا شرف حاصل کریں گے تو ساری قوم کی عزت بڑھے گی۔ ہمیں تو اس پر فخر کرنا چاہیے، خوش ہونا چاہیے اور کسی ایسے شخص کو نقصان پہنچانا جس نے ہمیں کوئی تکلیف نہ دی ہو، ہمارا حق نہ چھینا ہو، صریحاً ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ ہم اپنے سفلی جذبات کو جڑ سے اکھاڑ نہیں سکتے۔ لیکن ان کو سفلی سے علوی میں بدل سکتے ہیں۔ ادنیٰ کو اعلیٰ بنا سکتے ہیں۔ حسد کے جذبہ کو ہم ارتفاع کے ذریعہ رشک

سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ تاکہ جب ہم دوسروں کو ترقی کے زینہ پر چڑھتا دیکھیں، تو انھیں ٹانگ پکڑ کر کھینچنے کے بجائے ہمارے دل میں یہ صحت مند جذبہ پیدا ہو کہ ہم بھی اس زینہ پر چڑھیں؛ اور کچھ اور تیزی کے ساتھ!! اشتعال کی ضرورت ہو تو وہ بھی دور نہیں۔ کچھ عرصہ ہوا میں جنوبی ہند کے دورے پر گیا تھا۔ یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ جنوبی ہند کے مسلمانوں میں اس وقت سب سے زیادہ جوش وخروش تعمیری اور تعلیمی کاموں کے لئے حیدرآباد میں پایا جاتا ہے۔ نئی نئی انجمنیں وجود میں آرہی ہیں۔ کوئی انجینئرنگ کالج قائم کررہی ہے، کوئی بیت المال، کوئی پولی ٹکنیک؛ اور کوئی میڈیکل کالج قائم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ میں وہاں ایک محفل میں اپنے ان تاثرات کا پرستائش اظہار کررہا تھا کہ ایک صاحب نے میرے کان میں کہا کہ "یہ کارگزاری حسد اور رقابت کی دین ہے جس نے رشک اور مسابقت کا روپ دھارا ہے"۔ تخریب کو تعمیر بنتے دیر نہیں لگتی۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ مسائل پہ ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور گرم جذبات کو تباہی کے بجائے آبادکاری پر لگایا جائے۔ ہری پتلیوں والے عفریت کو شیشہ میں اُتارا جاسکتا ہے، اسے قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ اس سے جہاں سوزی کے بجائے چمن بندی کا کام لے سکتے ہیں۔ یہ ہوکل کیا نہیں کرسکتا۔ شرط ہے اس کو قابو میں رکھنا اور سیدھی راہ پر ڈالنا!

●●

# عُمر کا جمال

قدرت کا قانون اٹل ہے۔ وہ اپنے تقاضے پورے کرتی ہے۔ یہ تقاضے انسان اور حیوان میں کوئی ف[رق] نہیں کرتے۔ جوانی کے جلو میں جمال چلتا ہے۔ وہ ایک نئی آب و تاب، ایک دل آویز، چمک دمک، ایک بو[قلمون] خوش قامتی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جسمانی ساخت کے جھول، زاویوں کی کمی، عدم تناسب کی باصرہ خراشی، چشم (دو[ز]) دُور ہو جاتے ہیں: ع "کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست"

لیکن جوانی کا لایا ہوا اجال چار دن کی چاندنی کی طرح ہے۔ جوانی کے ڈھلتے ہی چہرہ کی چمک، جسم کا گ[داز]، اعضا کا تناسب، رگ و پے کا تناؤ، سبک موزونیت، سیمابی انداز، صباحت کی صیقل، ملاحت کی فتنہ سا[مانی] سب اُترنے، کُملانے لگتی ہے۔ چالیس سال کی سرحد پار کی، زیادہ سے زیادہ پچاس سے آگے بڑھے اور سار[ی] قلعی کھُل گئی۔ ایسا لگنے لگا کہ جسے ہم حُسن سمجھے ہوئے تھے سب ملمع تھا۔ عمر کی خراش لگی اور ملمع اُتر گیا۔

لیکن ہر جگہ کچھ لوگ ایسے نظر آتے ہیں، عمر جن سے خوبصورتی نہیں چھین پاتی۔ اب ان کا حسن نہ حشر سا[ماں] ہوتا ہے نہ حشر انگیز۔ ان کا جمال سکون، وقار، تمکین، وجاہت اور اطمینان کی تصویر ہوتا ہے۔ اس طبقے میں وہ لوگ بھی ہیں جن کے چہروں سے نیکی اور نور کی بارش ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ تجربہ کی بھٹی نے انھیں ہر آلائش، ہر کھوٹ سے پاک کر دیا ہے؛ اور اب یہ خیر محض بن گئے ہیں۔ ان کے چہرے، ان کے اطوار و گفتار سے ایقانِ خیر کی تائید اور پیمانِ خیر کی تجدید ہوتی ہے۔ انھیں دیکھ کر وہ بدگمانیاں جو انسان کی فطرت کے متعلق تجربہ نے سمیٹی تھیں اس طرح چھٹنے لگتی ہیں جیسے سورج کی کرنوں سے اندھیرا۔ ان لوگوں کا حُسن لازوال ہے، سدا بہار ہے۔ عمر کا کاتب ان کے چہرے پر خستگی، فرسودگی، تھکاوٹ، اضمحلال، مایوسی اور جھنجلا[ہٹ] کے نقوش بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہر بار مات کھاتا ہے۔ آپ نے اکثر سُنا ہوگا کہ کوئی پُل یا کوئی عمارت یا کوئی سڑک، جس کے بنانے کی بار بار کوشش کی گئی اور ہر بار ناکام ہوئی، اس لیے نہ بن سکی کہ اس کے نیچے کوئی بزرگ دفن تھے۔ ہمیں اس وقت ان روایات کی صحت یا عدم صحت سے سروکار نہیں ہے۔ اس وقت ان کا ذکر تمثیلاً کیا گیا ہے کہ بزرگی اور بھلائی شکست ناپذیر ہیں اور ان کے نقوش

خواہ وہ ارض کے بطن میں ہوں، خواہ انسان کے خد و خال پر کوئی مٹا نہیں سکتا۔

لیکن عمر کا حسن ان لوگوں کی وجاہت اور لمعات تک محدود نہیں، جن کی زندگی خالق کی عبادت اور مخلوق کی خدمت، خیر کی تائید اور شر کی تردید میں گزری ہے:

ہمیں ان لوگوں کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اور ان کی تعداد زیادہ ہے ــ جو شر سے برد آزما ہوئے بغیر اپنے جمال کو لیل و نہار کی دستبرد سے صاف بچالے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے یا تو دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھ کر اپنی طمانیت پر کبھی زیادہ آنچ نہیں آنے دی اور زمانہ کے سرد و گرم کو سکون اور اطمینان اور سلامت روی کے ساتھ برداشت کیا۔ انھوں نے تمازت اور حدت کو اپنے چہرے اور اپنے دل دونوں سے دور رکھا۔ ایسا کرنے میں انھیں اپنے مزاج سے مدد ملی۔ لیکن اس میں ان کے ارادے کو برابر کا دخل رہا۔

ان ملکوں میں جہاں درجۂ حرارت افراط و تفریط کی مسافت طے کرتا رہتا ہے، آدمی گرمیوں میں تپتا رہتا جھلستا ہے، جلتا ہے اور سردیوں میں ٹھٹھرتا ہے، کانپتا ہے، سکڑتا ہے۔ جب لیل و نہار یہ ہوں تو پتھر کی عمارت کی طرح بدن کی عمارت بھی ٹوٹنے لگتی ہے۔ کل کی بات ہے گرمی شباب پر تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خوبصورت جامع مسجد کا فرش غروب آفتاب کے وقت بھی تپ رہا تھا۔ راقم سے تپتے ہوئے فرش کی شکایت کی گئی اور مشورہ دیا گیا کہ ٹیوب ویل سے ایک نل براہ راست مسجد میں لایا جائے۔ تاکہ روز شام کو مسجد کے صحن کو پانی سے بھرا جا سکے۔ تجویز بظاہر معقول تھی۔ یونیورسٹی انجینئر سے رائے لی گئی تو انھوں نے بتایا کہ اس عمل سے فرش کے پتھر تڑخ جائیں گے؛ اوپر کا حصہ سیراب ہو کر ٹھنڈا ہو جائے گا اور سکڑے گا اور نیچے کا دیر میں ٹھنڈا ہوگا؛ ایک حصہ سکڑے گا، ایک گرمی کے اثر سے اسی طرح پھیلا رہے گا تو پتھر ٹوٹ جائے گا۔ یہی اثر گرمی اور سردی کے ردّ و بدل کا انسانوں کے جسم پر ہوتا ہے۔

بہرکیف ہمارے معاشرہ میں وہ لوگ بھی ہیں جن میں سرد و گرم کو جذب کرنے کی صلاحیت پتھروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے زندگی سے صلح کر رکھی ہے۔ آفات ارضی و سماوی سے کسی کو مفر نہیں۔ یہ لوگ اپنی سلامت روی سے ان آفات کے فشار اور تباہی کو کم کر دیتے ہیں اور اپنی باقاعدگی اور زندگی کے انضباط اور عزم اعتدال سے وہ ان تباہیوں اور گھبراہٹوں، حادثوں اور پریشانیوں سے بچے رہتے ہیں جن کو بیشتر انسان اپنی بے قاعدگی، لاپرواہی یا انتہا پسندی یا ہوس یا حسد کے ذریعہ دعوت دیتے ہیں۔ یہ ہوشمند جانتے ہیں کہ زندگی کے بہت سے مراحل آسانی سے سَر ہو جاتے ہیں اگر انسان اچھی عادتیں اختیار کرے۔

اس کے بعد سب کام وقت سے بغیر کسی کوشش کے خود بخود چلے جاتے ہیں۔ ایسی شخصیتوں کو منظم اور منضبط کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس داخلی توڑ پھوڑ سے محفوظ رہتے ہیں جن سے زیادہ تر انسانوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ اور جو توڑ پھوڑ ان کے جسم اور خد و خال کو بھی اپنے شکنجے میں کس لیتی ہے۔ بیماریوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انسان جب کمزور ہو جاتا ہے، وہ اسے دبا لیتی ہے۔ یہی حال شکل کے بگڑنے کا ہے۔ عمر کسی اور جسم اور شکل میں بگڑنے کے جو سامان تجربے اور صلاحیتیں ہیں سب کے سب بروئے کار آجاتے ہیں۔ ہم اکثر کہتے ہیں کہ یہ شخص جوانی میں کس قدر خوبصورت تھا، اسے کیا ہو گیا۔ کتنی جلدی اکثر لوگ حسن سے قبح خوش قامتی سے بدقوارگی کی منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ کتنا عبرتناک ہے یہ سفر جسے زیادہ تر انسان طے کرتے رہتے ہیں، نادانستہ! بلا ارادہ بغیر سفر کے!!

وہ لوگ جو خود پرستی میں مبتلا ہو گئے یا جنھوں نے دل شکنی، ہوس اور بیدردی کو اپنا شعار بنایا ان کی شکل کو مسخ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ شاعر نے تنبیہ کی تھی کہ نفس کی خباثت کا پتہ سالہا سال نہیں چلتا لیکن وہ لوگ جو قیافہ شناس ہیں اس کا پتہ ایک پل میں لگا لیتے ہیں اور ذرا عمر بڑھ جائے تو انسان کی طبیعت کے شر کی دریافت ہر عام آدمی بھی آسانی سے کر سکتا ہے۔ رُخ کو مصحف کہا گیا ہے۔ یہ شاعروں اور عاشقوں کی عقیدت مندی ہے، وہ مصحف جاناں کے خد و خال کو پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن عام آدمی کے لیے "رُخ" نامۂ اعمال ہے۔ انسان کے اعمال اس کی شکل سے جھانکتے رہتے ہیں۔ چہروں پر عمر کے ساتھ جو سختی اور کرختگی آجاتی ہے وہ سب انسان کے اپنے اعمال کی دین ہے۔ عمر کے ساتھ شر آمادہ طبیعتیں بدی میں رواں ہو جاتی ہیں۔ بہرکیف حسن وہی ہے جو دیرپا ہو اور جس کا رشتہ خد و خال کے بجائے افکار و اعمال اور نقطۂ نگاہ کے ساتھ جڑا ہو۔ بہت سے لوگ ساحل پر رہ کر اپنی پیٹھ ٹھونکتے ہیں کہ دامن کو تر نہیں ہونے دیا۔ لیکن داد ان کو ملنی چاہیے جو گرداب سے برسرِ آزما ہو کر بھی شگفتگی، ہمدردی، خوش دلی کے دامن کو آلودہ یا شکن آلود نہیں ہونے دیتے۔ یہ لوگ خواہ ہر لحظہ موج کے تھپیڑوں کی زد میں رہیں، نہ طمانیت سے ہاتھ دھوتے ہیں نہ سکون سے۔ عمر کے ساتھ ان کے جمال اور وجاہت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

# اُٹھائے کچھ ورق لالہ نے ....

حضرت امیر خسروؒ کے عرس کے موقع پر خواجہ حسن نظامی دوسری تقریبات کے علاوہ، ایک ادبی محفل بھی برپا کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ اس بار صدارت میں کروں۔ چنانچہ بیک وقت بغلیں اور کتابیں جھانکنا شروع کر دیں۔ مولانا آزاد لائبریری سے امیر خسروؒ کی مثنویاں نکلوائیں۔ خیال آیا کہ انگریزی ادب کی چند طویل نظمیں بھی پڑھی جائیں جو اس دور کے قریب لکھی گئی ہوں۔ جیوفرے چاسر کی حیثیت انگریزی نظم کے بابا آدم کی ہے۔ خسرو اور چاسر کے درمیان تقریباً ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ "کینٹربری کی کہانیاں" (CANTERBURY TALES) چاسر کی سب سے مشہور اور مقبول طویل نظم ہے۔ نظم کی ساخت سادہ سی ہے۔ کینٹربری کی زیارت کے لیے قافلہ روانہ ہو رہا ہے۔ مسافر سفر کو بہلانے کے لیے طے کرتے ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک راہ میں دو کہانیاں سنائے گا۔ زائرین عمر، عادات، کردار، اطوار، افتادِ طبع، پیشہ، مشاغل، حیثیت اور تجربات کے لحاظ سے رنگا رنگ ہیں۔ شاعر نے ان کے کردار کی عکاسی میں کردار نگاری اور داستان گوئی کی آمیزش اور آویزش سے ایک جیتا جاگتا نگار خانہ، ایک چلتی پھرتی ہنستی بولتی دنیا پیدا کر دی ہے۔ انگریزی ادب میں اس پایہ کی خلاقی صرف ایک اور فن کار کے حصہ میں آئی جس کا نام شیکسپیئر تھا۔

"کینٹربری کی کہانیاں" کی ورق گردانی کے بعد خیال آیا کہ خسرو کی عشقیہ مثنویوں کی ردیف میں چاسر کی طویل عشقیہ نظم TROILUS & CRISEYDE کا مطالعہ زیادہ برمحل ہوگا۔ اس کتاب کو دیکھنا شروع کیا۔ بلکہ چاسر پر ایک کتاب میں اس طویل نظم سے متعلق تبصرہ کو۔ اس نظم میں کرداروں کی جو دلنواز اور معنی خیز تصویر کشی چاسر نے کی ہے اور جس طرح کرداروں کا باہم ردِ عمل اور ارتقا دکھایا ہے، اور کردار اور داستان میں جو ربط باہم پیدا کیا ہے اس کی مثال فارسی اور اُردو مثنویوں میں نہیں ملتی۔

قارئین حیران ہوں گے کہ ان سطور کا عنوان سے کیا تعلق۔ واقعی تمہید اتنی ہی طویل ہو گئی جتنی ہم میں سے اکثر ہندوستانی عموماً گفتگو کے دوران روا رکھتے ہیں۔ نفسِ مضمون کی دور دور تک آہٹ نہیں ملتی۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو صاحب آپ سے ملنے کسی غرض سے آئے ہیں وہ دنیا اور ملک و وقت کے بہت سے مسائل پر تبصرہ

کرنے اور آپ کے کام کے متعلق ناخواندہ مشورہ کا آپ پر احسان رکھنے کے بعد بر سر مطلب آتے ہیں اور پھر وہ دراصل ان کی شانِ نزول تھا اس کا ذکر اٹھتے اٹھتے اور چلتے ہوئے اس انداز سے کرتے ہیں جیسے وہ فروعی اور ضمنی بات انھیں اتفاقاً یاد آگئی ہو۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ اس فریب سے کیا حاصل۔ وہ دھوکا کسے دے رہے ہیں اس شخص کو جس کا قیمتی وقت انھوں نے طوالت تمہید کی آڑ میں برباد کیا' یا اپنی ذات کو جو دوسروں کو نا بے وقوف سمجھنے پر تُلی ہوئی ہے۔ ان تمہید سازوں کو یہ نہیں معلوم کہ ان کے جانے کے بعد ان کے مخاطب کے دل سے دھواں اٹھتا ہے اور اس کی زبان کے سرے پر وہ الفاظ تلملاتے ہیں جو اگر ادا ہو جائیں تو بلوے کو جنم دیں اور شائستگی کو پیغام مرگ۔

الغرض تمہید سے حذر اولیٰ۔ ان دونوں کتابوں کو کھولنے کے بعد یہ دُور نہ جا سکا تھا کہ ان کو کام ہوا پایا۔ ایک بہت چوڑی سی کھائی نظر آئی، جسے پار کرنا ممکن نہ تھا۔ یعنی پڑھنے والوں نے دونوں کتابوں سے بہت سے ورق پھاڑ لیے تھے۔ اب کیجیے آپ جو کر سکتے ہوں۔ پھاڑنے والے نے یہ نہیں سوچا کہ ان ا کا لب لباب قلم بند کیا جا سکتا تھا اور اگر دماغ کو محنت کے لیے آمادہ کرنا ممکن نہ تھا تو ان اوراق کو نقل میں کیا دشواری تھی۔ لیکن اس عہدی طالب علم نے وہ راہ اختیار کی جو بظاہر آسایش کی راہ تھی، لیکن در یہ راستہ بے حسی، خود غرضی، چوری، کج خلقی اور بربادی کا راستہ ہے۔

علم کی خدمت اور اشاعت کا کام کلاس روم سے زیادہ لائبریری انجام دیتی ہے۔ انسانی آگاہی ا بصیرت کے دریا کو کوزہ میں بند کرنا لائبریری کے سوا کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ ترقی کے سارے اشاریوں کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا دیجیے، اور یہ دیکھنے کی کوشش کیجیے کہ آبادی اور کتب خانوں اور فی کس اُن کے استعمال کا تناسب کیا ہے۔ پتہ چل جائے گا کہ وہ شہر یا ملک کس حد تک ترقی یافتہ ہے اور م ترقی کے کیا امکانات رکھتا ہے۔

کتاب سے ورق پھاڑنے والے ظالم اور جاہل ہیں۔ اُن پر علم کے قتل کرنے کا الزام عاید ہوتا ہے وہ روشنی کے دشمن اور اندھیرے کے دوست ہیں۔ وہ بصارت اور بصیرت کا خون کرتے ہیں۔ گوشت سے ناخن کو جدا کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ کتاب کی وحدت کو پارہ پارہ کرکے وہ لذت اندوز ہوتے ہیں۔ کتاب جامعیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے وہ مزے لے لے کر کوٹتے ہیں۔ وہ محسن کش اور علم دشمن ہیں۔ ان کی نگاہ میں علم کی چنداں وقعت نہیں۔ کتابوں پر مجرمانہ حملہ کرنے والے طہارت اور پاکیزگی سے روگرداں ہیں، یہ احسان فراموش

سیڑھی کو لات مارتے ہیں جس نے انھیں بام پر پہنچایا تھا، یا پہنچانے کا وسیلہ فراہم کیا تھا۔ کتاب علم و دانش کا خزانہ ہے، روشنی اور ہدایت کی حامل ہے، تہذیب و تمدن کا ذخیرہ ہے۔ کتاب کے ساتھ ظلم کرنے والے زندگی کی اعلیٰ اقدار کے منکر ہیں۔ قلب و نظر کی پاکیزگی سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ وہ وفا نا آشنا ہیں۔ کتاب کے ساتھ جس نے بیدردی برتی، وہ مادرِ درس گاہ کا حق کب ادا کر سکے گا۔ اس کے سینے میں خنجر گھونپنے میں اسے کیوں تامل ہونے لگا۔ ایسا کندۂ ناتراش بھلا استادوں کی عزت کیوں کرنے لگا، بزرگوں کو خاطر میں کیوں لانے لگا۔

ہم لوگ بچپن کی بات ہے، اگر کبھی کتاب ہاتھ سے گر گئی، تو اسے اٹھا کر آنکھوں سے لگاتے تھے، ہونٹوں سے چومتے تھے، احترام اور محبت اور پشیمانی کے نمونے اثر۔ اور اب یہ عالم ہے کہ ہمارے بعض نونہالوں کو اس کا جگر چاک کرنے میں تامل نہیں۔ اسے گیند کی طرح پھینکنے میں باک نہیں۔ کتاب کی قیمت اب صرف اتنی رہ گئی ہے جتنی اس پر لکھی ہو۔ اس میں جو کچھ لکھا ہے، کتاب کی قدر و قیمت کو اب اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ کتاب کے ساتھ اس نوع کا تعلق بازاری تعلق ہے۔ یہ دھندے اور کاروبار، بالاخانہ اور بہیمیت کی باتیں ہیں۔ علم، روشنی، اور تہذیب کی نہیں۔ تہذیب کا لب لباب کیا ہے؟ حرمتیں، پاکیزگیاں، لطافتیں۔ یہ نہ رہیں تو کچھ نہ رہا۔

ہوائی اڈے پر یہ منظر اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ کاونٹر کے سامنے مسافروں کی طویل قطار بصورتِ سوال کھڑی ہے۔ ہاتھ میں بریف کیس ہے۔ بریف کیس میں کیا ہوتا ہے؟ بالعموم کاغذات اور کتابیں۔ مسافر اسے اپنے ہیں میں زمین پر رکھ دیتے ہیں کہ جب لکیر یا قطار کو دوبارہ جنبش ہوگی تو اسے اٹھا کر چند قدم آگے بڑھیں گے اور پھر زمین پر رکھ دیں گے۔ لیکن ان میں ایسے مسافر بھی نظر آتے ہیں جو بریف کیس کو اٹھانے کے بجائے اسے پیروں سے سرکاتے ہیں۔ یہاں جان پر بن جاتی ہے۔ انھیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کتنے بڑے ظلم، کیسی شرمناک جہالت کا ارتکاب کر رہے ہیں اور یہ لوگ نوخواندہ، ناتراشیدہ طالبِ علم نہیں بلکہ معاشرہ کے ترقی یافتہ، تربیت یافتہ، صحبت یافتہ افراد۔ آپ اعتراض کیجیے تو برہم ہو جائیں گے " آخر ہاتھ اور پاؤں میں فرق ہی کیا ہے۔ دونوں ایک ہی جسم کے حصے ہیں۔ ہاتھ سے نہ اٹھایا، پاؤں سے سرکا دیا تو کون سی آفت آ گئی " اس دلیل کا آپ کیا جواب دیں گے۔ بغلیں جھانک کر رہ جائیں گے۔ منطق کے بغیر مفر بھی نہیں۔ لیکن زندگی میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں منطق کا گزر بھی نہیں۔ بہت سی لطافتیں ہیں۔ بہت سی خوب صورتیاں، بہت سی نفاستیں جنھیں منطق کے شکنجے میں کسا نہیں جاتا۔ جو لوگ ذہنی غذا کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں، انھیں جسمانی غذا کو بھی پاؤں سے دھکیلنے میں کوئی سنکوچ نہ ہوگا، اگر یہ

خوف نہ ہو کہ اس طرح گرد اور جراثیم ان کی غذا میں شامل ہو جائیں گے۔ رزق اور علم دونوں کا احترام واجب ہے، دونوں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ اس احترام میں ان کے پیدا کرنے والے، اُن سے بہرہ ور کرنے والے کا احترام اور سپاس بھی شامل ہوتا ہے۔ احترام اور حرمت کے مفہوم میں اثبات کے ساتھ نفی چھپی ہے۔ اسی نفی سے ہم گریز کریں گے تو اثبات تک کیونکر پہنچیں گے۔ اسلام کا تو یہ شیوہ ہے کہ نفی سے اثبات کی طرف رد سے قبول کی جانب لے جاتا ہے، تاکہ اشتباہ، احتمال اور غلط بحث کی گنجائش نہ رہے۔ خدائے واحد کی خدائی کا اعلان بھی دوسرے خداؤں کے امکان کی نفی کے بعد کیا گیا ہے۔ اوامر اور نواہی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ چاسر سے متعلق وہ دونوں کتابیں جراحت خوردہ تھیں، اور وہ شخص بھی جو انھیں پڑھ رہا تھا اور ٹوٹے ہوئے سلسلے کو جوڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ غزل ہوتی تو کام چل جاتا کہ اس میں تسلسل چنداں اہم نہیں لیکن یہاں تو سابقہ مثنویوں سے تھا۔ کہانیوں سے بیچ کی کڑیاں غائب کر دی جائیں تو کیا رہ گیا۔ وہ شخص اکثر سوچا کرتا ہے کہ اُردو ادب نے غزل کے بجائے مثنویوں کو منظورِ نظر بنایا ہوتا تو اُردو والوں کے مزاج کی افتاد بدلی ہوئی ہوتی۔ ان کی باتیں زیادہ مربوط ہوتیں، ان کی کاوشیں زیادہ طویل، ان کے عزائم زیادہ بلند۔ ان میں تیز تیز دوڑنے کے بجائے میراتھان (MARA THON) دوڑنے والے کا دم ہوتا۔ زندگی کے مراحل میں پسینہ بہانے سے وہ گریز نہ کیا کرتے۔ خاکہ اور منصوبہ بنا کر آگے بڑھنے سے انھیں وحشت نہ ہوتی۔ لیکن اس شخص کا جھگڑا غزل سے نہیں، اُس بے حرمتی اور بے اتفاقی سے ہے جو کتابوں کے ساتھ روا رکھی جاتی ہے اور جس کی سب سے مکروہ اور شرمناک شکل وہ ہے جو اس دراز نفسی کی محرک ہوئی۔ ہمارے کتب خانوں کی بہت سی کتابیں زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں :

اُٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

●●

# رمضان شریف

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، رمضان خیر و برکت کا مہینہ ہے؛ خیر و برکت، عبادت، ریاضت، ضبط اور نفس کشی کا مہینہ۔ اس سے یہ نہ سمجھیے کہ یہ باتیں صرف ایک ماہ کے لیے ہیں اور باقی گیارہ مہینے ان پابندیوں سے آزاد ہیں۔ مہینوں اور دنوں میں اس قسم کا فرق ہو ہی نہیں سکتا۔ جو باتیں اچھی ہیں، جو باتیں ضروری ہیں، وہ ہمیشہ ہر لمحے اچھی ہیں، ضروری ہیں۔ ہاں ایک مہینہ اس لیے چن لیا گیا ہے کہ ان باتوں کی طرف یکسوئی کے ساتھ بھرپور اور بھرسک دھیان دیا جائے۔ گویا ایک سبق بار بار دہرایا جا رہا ہے تاکہ آنے والے گیارہ مہینوں میں اس کے نقوش دھندلے نہ ہو پائیں۔ گھڑی میں چابی دی جاتی ہے تو وہ ایک مقررہ مدت تک چلتی رہتی ہے۔ بیٹری کو بھی ایک عرصہ کے بعد پھر چارج کیا جاتا ہے۔ کوئی انسان تنہا بیٹھ کر عبادت کرے، ریاضت کرے، یہ ایک اچھی بات ہے، اس کے نتیجہ میں اس کی اخلاقی اصلاح اور تربیت ضرور ہوگی۔ لیکن اگر ایک ماہ کو اجتماعی عبادت و ریاضت کے لیے مخصوص کر دیا جائے، اس طرح کہ جدھر دیکھو لوگ اپنے پیدا کرنے والے اپنے پالنے والے کو یاد کر رہے ہیں اور اس کی راہ میں سختیاں جھیل رہے ہیں۔ بُری خواہشات کو دبا رہے ہیں، کچل رہے ہیں اور خود کو نفس کی نہوں، روح کی گہرائیوں تک نظم و ضبط کا عادی بنا رہے ہیں، تو اس کا اثر سو گنا زیادہ ہوگا۔ گویا افراد کی تعداد سے ان کی نیکیوں اور عبادتوں کو ضرب دیا جا رہا ہے۔ روحانی امداد باہمی کا یہ زریں سلسلہ ایک ماہ تک رات دن دہرایا جاتا ہے۔ خدا کے بندے اس کی تسبیح و تہلیل میں کچھ اس طرح مصروف نظر آ رہے ہیں جیسے پو پھٹتے وقت چڑیاں مل کر اپنے پیدا کرنے والے کی حمد و ثنا کے گیت گاتی ہیں۔

فارسی شاعر شیخ سعدیؒ نے لکھا تھا کہ بادل اور ہوا، چاند اور سورج اور آسمان ہر وقت کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ انسان روٹی پائے اور اسے غفلت کے ساتھ نہ کھائے۔ ساری کائنات جس کے لیے سرگرم عمل ہے تابع فرمان ہے، اس انسان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ خالق کے حکم سے سرتابی کرے۔ رمضان میں اجتماعی عبادتوں اور ریاضتوں کی کثرت اور شدت پیمانِ وفا کی تجدید ہے کہ اے خالق! ہم تیرے بندے ہیں، تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد اور نصرت کے طلب گار ہیں۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم تیری عبادت

اور تیرے بندوں کی خدمت کریں۔ ہمیں حوصلہ دے کہ ہم بُری خواہشوں سے دامن جھٹک دیں۔ ہمیں طاقت دے کہ خود کو اس طرح تپائیں کہ ساری آلائشیں جل کر بھسم ہو جائیں اور ہم کندن کی طرح نکھر جائیں۔

لہٰذا روزہ صرف دن بھر کھانا نہ کھانے، پانی نہ پینے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو بیشمار پابندیوں میں سے صرف ایک پابندی ہے جو روزہ دار اپنے اُوپر عاید کرتے ہیں۔ بلکہ یہ ان ہمہ گیر پابندیوں کی ایک ظاہری شکل ہے۔ ظاہری شکل میں کھو کر باطنی مقصد کو بھول جانا ہرگز روا نہ ہوگا۔ روزہ کا مقصد ہے خود کو رضاے الٰہی کے تابع کرنا، اندر کی بُرائیوں کے خلاف جہاد کرنا۔ اس نظم و ضبط کو اپنے اندر اُتار لینا، کائنات جس پر قائم ہے۔ خود غرضی، نفرت، بغض، کینہ، حسد اور بدی سے دامنِ دل کو پاک کرنا اور انسانوں کی خدمت، مدد اور دستگیری کرنا۔ مسلمانوں پر یہ بڑی پابندی لگائی گئی ہے کہ اپنی عبادت کے فوائد کو اپنی ذات تک محدود نہ رکھے۔ عبادت کو خود غرضی کی تہمت سے بچائے۔ اسے معاملات کے ساتھ شیر و شکر کر دے۔ خالق کی عبادت، انسانوں کی خدمت اور ان کی محبت کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھو کہ تمہاری عبادت میں کچھ کھوٹ، نیت میں کچھ فتور ضرور ہے۔ پھر تو تمہاری عبادت ایک ایسا جسم ہے، روح جسے چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ عبادت سچائی، اندیا کاری، ایفاے عہد، اور دردمندی کو اپنے جلو میں لاتی ہے۔ اگر نہ آئے تو سمجھ لو کہ اس میں یا تو انانیت، یا خود غرضی، یا بے حسی، یا ریاکاری شامل ہو گئی ہے۔

ریاکاری سے زیادہ مہلک کوئی اخلاقی بیماری نہیں۔ اگر عبادت دنیا کو دکھانے کے لیے کی گئی تو وہ محض فریب ہے۔ جب ہی تو اسلام نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہمارا جینا اور مرنا، گہوارے سے قبر تک کا سفر سب اللہ کے لیے ہے۔ اگر عبادت ظاہری سطح پر کی گئی تو وہ گناہ تو نہیں، لیکن اسے ثواب میں داخل نہیں کر سکتے جس طرح ٹکریں مارنے سے نماز نہیں ہوتی؛ اسی طرح فاقہ کر لینے سے روزہ نہیں ہوتا۔

نماز پڑھتے وقت، روزہ رکھتے وقت ذہن اور دل اس مقصد سے معمور ہونا چاہئیں جس کے لیے یہ عبادتیں کی جا رہی ہیں۔ عبادتوں کا مقصد ہے روح کو بُرائیوں سے پاک کرنا، اخلاق کو سنوارنا، گھمنڈ اور خود غرضی سے نجات دلانا اور دل میں انسانیت کا درد پیدا کرنا کہ یہی ذریعہ خالق تک رسائی کا ہے اور یہی طریقہ ہے اُس کا شکر ادا کرنے کا۔

بعض لوگ روزہ اس انداز سے رکھتے ہیں گویا وہ خدا اور اس کے بندوں پر احسان کر رہے ہیں۔ روزہ اگر نفس کی فربہی کی طرف لے جائے، تو پھر تن کی لاغری کام نہ آئے گی۔ اس بات پر گھمنڈ کرنا کہ

ہم روزہ رکھ لیے ہیں اور ان لوگوں کو جو روزہ نہیں رکھ سکے، حقارت سے دیکھنا روزہ کی توہین اور تخریب ہے۔ دل میں یہ بھی خیال آنا کہ ہم بہتوں سے اچھے ہیں، وہ روزہ نہیں رکھتے ہم رکھ لیے ہیں، روزہ کو مکروہ اور بے اثر کر دینے کے لیے کافی ہے۔

وہ لوگ نادان ہیں، جو روزہ کو، جو سراپا رحمت ہے، خلق کے لئے باعثِ زحمت بنا دیتے ہیں۔ جو بات اکثر محلوں میں رمضان شریف کے دوران رات بھر چہل پہل اور گہما گہمی رہتی ہے۔ یہاں تک بھی ٹھیک ہے لیکن اس چہل پہل کے ساتھ شور و غل بھی ہوتا ہے، جو بسا اوقات ان ہمسایوں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے، جو مذہباً روزے کے پابند نہیں، یا پابند ہونے کے باوجود روزہ نہیں رکھ پائے ہیں۔ اس عنوان سے شور مچانا اور خلقِ خدا کو تکلیف پہنچانا اور سکون میں خلل ڈالنا رمضان شریف جیسے پاکیزہ مہینہ کو بدنام کرنا اور مذہب کی روح کو بدنام کرنا ہے۔ تم خلقِ خدا کے لیے رحمت بن کر آئے ہو، تمھارے اعمال اور تمھاری عبادات کا اثر دوسروں پر خوشگوار اور خوش انجام پڑنا چاہیے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لوگ روزہ کو فاقہ میں بدل دیتے ہیں۔ سحری کھائی، دن کسی طرح بھوکے پیاسے گزار دیا، روزہ افطار کیا اور کھانا کھانے بیٹھ گئے اور کھانا پھر اس طور پر کھایا، گویا دن بھر کے بھوکے رہنے کی تلافی ان پر واجب ہو گئی ہو۔ روزہ کو عبادت اور نفس کشی کا مرتبہ جب ہی حاصل ہوتا ہے، جب نمازیں پابندی کے ساتھ پڑھی جائیں اور جب دھیان شکم اور حلق سے زیادہ، کہیں زیادہ، اللہ کی طرف اور اس کی مخلوق کو راحت پہنچانے کی ہو۔ جو لوگ روزہ رکھ کر جھنجھلاتے ہیں، غصہ کرتے ہیں، کاٹنے کو دوڑتے ہیں، انھیں روزہ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو لوگ روزہ کے دوران بری باتیں زبان پر لاتے ہیں، برے خیالات سے زبان کو آلودہ کرتے رہتے ہیں، وہ نفع کے بجائے ٹوٹے کا سودا کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو افطار کرتے ہی ان اخلاقی پابندیوں کو خیرباد کہ دیتے ہیں جو دن میں انھوں نے اپنے اوپر روا رکھی تھیں، روزہ کی روح سے ناآشنا رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے حقوق سے غفلت کو نظر انداز بھی کر دے مگر بندوں کے حقوق سے پہلوتہی کو معاف نہیں کرتا۔ اس الزام سے حذر کرو کہ فلاں شخص اپنی عبادت کی وجہ سے اپنے فرائضِ منصبی سے غفلت برتا ہے۔ حق العباد کا مواخذہ بہت سخت ہوتا ہے اور اس بازپرس کے وقت عبادت بھی کام نہیں آتی۔ عبادات کی پابندی کرتے وقت اس کا اہتمام لازم ہے کہ فرائضِ منصبی کو اور زیادہ انہماک کے ساتھ انجام دیا جائے۔ نماز اور روزہ کو کام نہ کرنے یا نہ پڑھنے یا کم پڑھنے کا بہانہ نہ بناؤ۔

برادرانِ وطن میں یہ تصوّر بہت عام ہے کہ مسلمان دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر کھانا کھاتے ہیں ہمارے روزہ کو وہ اکثر دن کے فاقہ اور رات کی پُرخوری سے تعبیر کرتے ہیں۔ کچھ تو برادرانِ وطن ہمارے ساتھ زیادتی کرتے ہیں اور کچھ ہم۔ روزہ کے ساتھ دونوں طرح کی زیادتیوں کو بند کرنا ہے۔ انھیں بتانا ہے کہ روزہ ضبطِ نفس کے سوا کچھ نہیں۔ اور خود کو یہ راہ دکھانا ہے کہ عبادت رسوم کا نام نہیں۔ عبادت وہ رشتہ ہے جو فرد کو خالق اور مخلوق کے ساتھ جوڑتا ہے، جو بُرائیوں کی کمر توڑتا ہے اور انسان کو اچھے رجحانات کی طرف لے جاتا ہے۔

غور کیجیے، تہذیب نام ہی ضبطِ نفس کا ہے۔ جانوروں اور جاہلوں کو ضبط کرتے ہوئے کس نے دیکھا اخلاق باختہ اور دریدہ دہن لوگ کب ضبط کر پاتے ہیں۔ گھمنڈ کے نشہ میں ہوش ہی نہیں، عنان بھی ہاتھ سے جا اپنے روزمرّہ کا جائزہ لیجیے۔ دوسروں سے ہر قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔ وہ کبھی آپ کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں، کبھی آپ کے احساسات کو مجروح کرتے ہیں، کبھی خود آپ کو ان کی بے ضرر بات بھی ناگوار ہوتی ہے۔ اور جب آپ ہوتے ہیں تو آپ کے دل میں اچھے بُرے ہر طرح کے خیالات آتے ہیں۔ اس بات کی کسوٹی کہ آپ کس حد تک ہیں۔ اکثر صرف یہ ہوتی ہے کہ آپ دوسروں کے رویّہ پر اپنی خفگی، جھنجھلاہٹ اور غصّہ کو اور اپنے بُرے خیالات وسوسوں کو کس طرح دباتے ہیں، کیونکر ان پر قابو پاتے ہیں۔ اگر انسان جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے اسے ضبط نہ کرے تو جینا دوبھر ہو جائے۔ ہر وقت تصادم اور سر پھٹول ہوتی رہے۔ تو دو آدمی دست و گ نظر آئیں گے، پہلے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخیں گے، پھر ہاتھاپائی کی نوبت آئے گی، ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے انسان کا ناموس، اس کا بھرم، اس کی اجتماعی تسخیرات سب ضبطِ نفس کی رہینِ منت ہیں۔ باہمی تعاون اسی کا ثمرہ اور ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک مل جل کر بنی نوعِ انسان نے جو ترقیاں کی ہیں اور جو خوشیاں سمیٹی ہیں اور د کو جس طرح سجایا ہے سنوارا ہے وہ سب ضبطِ نفس کی دین ہے۔ روزہ ضبطِ نفس کی سب سے موثر تربیت ہے ا رمضان شریف کا مبارک مہینہ اور ضبط و تشفی کا یہ تواتر روح کی طہارت اور تقویت اور اخلاق کی تہذ کا سب سے کارگر ذریعہ ہے۔

# خود سوزی

اخباروں میں آئے دن خبریں آتی رہتی ہیں، کہ فلاں عورت باورچی خانہ میں جل کر مرگئی۔ ان میں سے بعض موتیں دراصل لاپرواہی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ آگ قریب ہو تو اتنی ہی احتیاط برتنی چاہیے جتنی اس وقت جب انسان بُرے لوگوں کی سنگت میں ہو۔ آگ لگتے اور بُرائی پکڑنے میں دیر نہیں لگتی۔ اسی وجہ سے ہمیشہ اصرار کیا جاتا ہے کہ عورتوں کو رسوئی گھر میں نائلون کی ساڑی پہن کر نہ جانا چاہیے اور انسانوں کو بُرے لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہیے۔

ایسی موتوں کے متعلق لوگ قیاس آرائی کرتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ شوہر اور ساس یا نند نے اس غریب کو اس لیے جلا دیا کہ اس کے ماں باپ جہیز کی مانگ کو پورا نہ کر سکے تھے۔ بسا اوقات یہ بات صحیح ثابت ہوئی ہے۔ سوچیے اس سے زیادہ شرمناک، اس سے زیادہ بے غیرتی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ انسان زندگی کی ساتھی کو اس بنیاد پر پرکھے کہ وہ کتنی دولت لے کر آئی ہے۔ دولت کے یہ پجاری اگر پہلی فرصت میں بیوی سے پیشہ کرانے لگیں تو حیرت نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ پیشہ کرانا جہیز مانگنے سے کم بُرا ہے، یہ دونوں کام لالچ کی بنا پر کیے جاتے ہیں، لیکن جہیز مانگنے والے ایک پاکیزہ رشتہ کو شروع ہی سے ناپاک کر دیتے ہیں، اور نہ صرف بیوی بلکہ اس کے خاندان پر بھی بے غیرتی اور بے رحمی سے وار کرتے ہیں۔ پیشہ کرانے والا شادی کے بعد بھٹکتا ہے۔ اس کے علاوہ جہیز مانگنے والے کو اکثر احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک بہت بڑا گناہ، ایک سنگین جرم کر رہا ہے اور پیشہ کرانے والا باوجود بے غیرتی سے سر چھپاتا پھرتا ہے۔ وہ اپنے جرم کو محسوس کرتا ہے۔ جس گناہ کا احساس ہو، اس سے توبہ کی جا سکتی ہے، اس کا کفارہ ادا کر سکتے ہیں؛ جہاں گناہ کا احساس ہی نہ ہو، وہاں توبہ، کفارہ، پشیمانی اور اصلاح کا ذکر بیہودہ ہے۔

یہ لالچی شوہر کیا کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کی اولاد اپنے ماں باپ کو کتنی حقارت سے دیکھے گی جب اُسے معلوم ہوگا کہ ان کی ماں اس لائق نہیں تھی کہ مال و دولت کے بغیر کوئی اسے قبول کرتا اور ان کا باپ کتنا بے غیرت اور لالچی تھا کہ اس نے شادی کو دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تھا! اس پاکیزہ

رشتے سود و زیاں کے تصور سے بالاتر ہے، اس نے پیسہ بٹورنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ ایسی ماں اور ایسے باپ کی کیا عزت اولاد کے دلوں میں رہ جائے گی۔ اس گھناؤنی رسم کے حق میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ عام ہے اور کسی کا دھیان اس کی بنیادی بدطینتی اور کراہت کی طرف نہیں جاتا۔ کسی بُری رسم کے عام ہونے کی بات کرنے والے کیا یہ نہیں سوچیں گے کہ گمراہ عورتوں کے لیے جسے 'پیشہ' کہا جاتا ہے اس کی روایت اور زیادہ عام ہے، ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسے تو انسانیت کے سب سے بڑے پیشہ کا نام دیا جاتا ہے۔ پیشہ کی بُرائی اس بنا پر کم نہیں ہو جاتی کہ وہ عام ہے یا قدیم ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ جہیز مانگنا اس سے بھی زیادہ بُرا ہے، کہ اس کا پھیلاؤ زیادہ ہے، زیادہ لوگ اس کی زد میں آتے ہیں۔ لڑکی کے گھر والوں پر اس کا تباہ کُن اثر تو پڑتا ہی ہے، بے غیرتی اور لالچ کے اس کاروبار میں لڑکے کے گھر والے بھی شریک ہوتے ہیں، بلکہ یہ شرمناک حرکت ان ہی کے اصرار پر سرزد ہوتی ہے۔

آپ اعتراض کریں گے، تو لڑکے کے بے غیرت والد کہیں گے کہ ہمیں جو اپنی لڑکی کو جہیز دینا پڑا تھا اس نقصان کو پورا کیسے کریں۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ نقصان کو پورا نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اس کے سلسلہ کو طول دے رہے ہیں۔ بُری بات کو جتنے زیادہ لوگ دہرائیں وہ اتنی ہی زیادہ بُری ہو جاتی ہے۔ مرض کو وبا کی شکل دینے والے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مرض عام ہو گیا اس لیے اسے مرض کہنا ہی نہ چاہیے۔ یہ روگ سماج کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ جس معاشرہ میں گھر کی بنیاد لالچ پر رکھی جائے اور جہاں نسل کی افزائش کا ناتا سیم و زر کے ساتھ جوڑا جائے اس کی اُٹھان صحت مند کیونکر ہو سکتی ہے۔

لیکن یہ مان لینا صحیح نہ ہوگا کہ گھروں میں جلنے سے موتیں ہوتی ہیں وہ یا تو لاپرواہی کی بنا پر یا سسرال والوں کے ہاتھوں سرزد ہوتی ہیں۔ ان سے بھی زیادہ دردناک وہ موتیں ہیں جب دُلہن اس فکر میں کہ اس کے ماں باپ اس کی سسرال کے مطالبات کو ماننے کی حیثیت میں نہیں ہیں، خود کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ چاہے سسرال والے اس کو جلائیں، یا وہ خود کو جلا ڈالے، قاتل ایک ہی ہیں۔ خود سوزی کی یہ ایک مثال تھی۔ عبرت کا مقام ہے کہ والدین نے جس لڑکی کی شادی اتنی آرزوؤں امنگوں کے ساتھ کی، خود لڑکی کتنی تمناؤں اور ولولوں کے ساتھ دُلہن بن کر اپنے رفیقِ حیات، اپنے سوامی کے گھر گئی: اسے چاندنی کی چار راتیں بھی نہیں ملیں۔ لالچ اور ظلم کے گھور اندھیرے نے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ اُسے روشنی کی صرف ایک راہ نظر آئی، پروانے کی طرح خود کو جلا ڈالے۔ پروانہ خود کو شمع کی

محبت میں جلاتا ہے۔ اس غریب نے خود کو محبت میں نہیں، محبت کی چتا میں جلا ڈالا۔

راقم نے اپنے مضامین اب تک ان بیماریوں کا ذکر کیا تھا جو ہندوستانی مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہیں، اس بار قلم بھٹک کر ایک ایسے زخم کو کریدنے لگا جو ہمارے ہندو بھائیوں کے لیے ناسور بن گیا ہے۔ مضمون شروع کرتے وقت ارادہ یہ نہ تھا، جیسا کہ اس مضمون کی دوسری قسط سے ظاہر ہوگا۔ لیکن ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے لے حق ہے کہ کبھی کبھی وہ ان مسائل کی طرف بھی دھیان دے جو مسلمانوں تک محدود نہیں ہیں۔ شرط صرف ایک ہے، ہمدردی اور اصلاح کی خواہش۔ جہیز مانگنے کی رسم سے ہندوستانی مسلمان ابھی تک بچے ہوئے ہیں!

## ۲

پہلی قسط میں ہم نے اس مکروہ رسم کا ذکر کیا تھا، جس نے لاکھوں گھروں میں اندھیرا کر رکھا ہے۔ لڑکی کیا پیدا ہوئی، ماں باپ کے لیے فکروں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صرف پالنے پوسنے کی بات ہوتی تو غریبی کے باوجود کام چل جاتا۔ لیکن پال پوس کر، پڑھا لکھا کر، بڑا کر دینے کے بعد کیا کریں گے۔ لالچی لڑکے اور ان سے زیادہ لالچی ان کے ماں باپ منھ پھاڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ جہیز مانگیں گے۔ جہیز کے معنی وہ ضروری سامان نہیں جو والدین شادی کے وقت بیٹی کے ساتھ خوشی خوشی کر دیتے ہیں کہ اُسے گھر بسانے میں مدد ملے اور میکے کی نشانیاں اس کے پاس رہیں۔ اپنی وسعت بھر بلکہ اس سے زیادہ اُمنگوں اور ارمانوں کے ساتھ بیٹی کو جہیز دیتے ہیں۔ اب جہیز کے معنی دوسرے ہی ہیں۔ لڑکے بلکہ اس کے والدین کو ان کے مانگنے پر بدرجۂ مجبوری ایک بڑی کارقم اس بات کے لیے دینا کہ ہم نے تمھاری بیٹی کو بادل نخواستہ اپنی کنیز بنانا منظور کر لیا ہے! اس سے بڑی اہانت عورت ذات کی ہو نہیں سکتی۔ وہ ایسا کھوٹا سامانِ تجارت بن گئی ہے جسے پیسہ دیکر نہیں، پیسہ لے کر خریدا جاتا ہے۔ جب تک اس کا رشتہ طے نہیں ہوتا، اس کے ماں باپ اور بھائیوں کی جان سُولی پر رہتی ہے۔ اس غریب کی حیثیت گویا ملبہ کی سی ہے کہ جو لوگ اُسے اٹھا کر لے جاتے ہیں، اُسے ملبہ کے ساتھ پیسہ دیا جاتا ہے۔ ورنہ ملبہ اٹھانے کی تکلیف کون گوارا کرے۔ جہاں سیانی ہوئی اُسے خود اس کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے منحوس وجود نے ماں باپ کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ بھائی اور بھاوج الگ پریشان ہیں۔ ایسی صورت میں اس کی اُٹھان اور نشو و نما کیا ہوگی۔ اپنی عزتِ نفس، طمانیت اور خوشی کو وہ کیونکر محفوظ رکھ سکے گی۔ اس کے ماں باپ اُسے سامانِ تجارت کی طرح لے کر گھر گھر دکھائیں گے۔

گھمنڈی لڑکے، جن کی نہ صورت، نہ شکل، نہ شخصیت، نہ اہلیت اور لالچی ماں باپ جو لڑکے کو
کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اس بے چاری لڑکی کو چاندی کے گز سے ناپیں گے اور بے دردی سے رد کر دیں گے
احساس مند لڑکیاں یہ رسوائی اور ماں باپ کی یہ تکلیف کیسے برداشت کرتی ہوں گی۔ ان کی جان پر بنی
ہو گی۔ چنانچہ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض لڑکیوں کے ہاتھ پیلے بھی نہ ہو پائے کہ انھوں نے اس کرب اور
فشار سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ زمین پر بوجھ بن کر وہ رہنا نہیں چاہتی تھیں، زندگی بھر سلگتی رہیں
اور چتا میں جل کر راکھ ہو گئیں، جیسے ندی اور بالآخر سمندر نے اپنے فراخ بازوؤں میں لے لیا۔

یہ دور اہل کار وا، کا دور ہے جنھیں انگریزی میں بیوروکریسی کہا جاتا ہے اور جسے ہندی
نے نوکرشاہی کا نام دیا ہے۔ کون سی نوکری، کون سا منصب، عوام کی نگاہ میں کتنا اہم ہے، اس کا
اندازہ شادی کے بازار میں لگتا ہے۔ اگر لڑکا کلرک ہے تو اس کی یہ قیمت ہے، انسپکٹر یا اوورسیر ہے
تو یہ اُجرت، انجینئر ہے تو یہ بھاؤ، ڈاکٹر ہے تو یہ نرخ، اسسٹنٹ سول سروس میں ہے تو یہ شرح اور
انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کا رکن ہے تو یہ در۔ یہ تو مقررہ ریٹ ہیں۔ لڑکی والوں سے اس کے علاوہ اور
جو کچھ حاصل کیا جا سکے اسے لبھاؤ جانیے، بونس سمجھیے یا مختانہ شمار کیجیے۔

بُرائی کو بُرائی سمجھا جائے تو وہ تیزی کے ساتھ نہیں پھیل پاتی۔ لوگ اسے چوری چھپے کرتے
ہیں، وہ بُرائی جسے رواج کی سند مل جائے، وہ آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے سماج
میں یہ گھناؤنی رسم ہر طرف جڑ پکڑ چکی ہے۔ وہ نیک بخت جس کا اس طرح سودا ہوا ہے، جب لڑکے
کی ماں بنتی ہے تو سماج سے اس ظلم، اس تحقیر کا بدلہ لے کر رہتی ہے۔ بدلہ یہی کہ "میرے ماں باپ نے مجھے
بیاہنے کے لیے جو جہیز دیا تھا، میں اپنے بیٹے کے لیے اس سے کئی گنا لوں گی، دیکھوں گی کیسے نہیں دیتے
ہیں"— بُرائی کا یہ سلسلہ جو ہر نئے سودے کے ساتھ اور زور پکڑتا ہے، الٰہی کس طرح ختم ہو گا!

انسان مظلوم ہے، لیکن قضا و قدر سے زیادہ خود اپنا۔ وہ ظالم ہے اور جاہل ہے
ظلم کرتا ہے اور بے خبر رہتا ہے۔ اس کیفیت کو چاہے بے خبری کہیے، چاہے جہالت، اسے معلوم نہیں
جہیز مانگ کر وہ کتنا بڑا ظلم کرتا ہے۔ وہ اپنی ماں کو خوار اور رسوا کرتا ہے۔ اس ماں کو جس کی کوکھ
سے اس نے جنم لیا ہے۔ وہ عورت کو جتاتا ہے وہ ماں نہیں کنیز ہے۔ اور ایسی کنیز جس کو اس لیے
گوارا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ روپیہ لے کر آتی ہے۔ وہ روپیہ لے کر نہ آتی تو کون اسے گھر میں

گھسنے دینا یہ شرمناک برتاؤ صرف اس لئے کہ عورت کمزور ہے اور مرد مضبوط۔ اور جو کمزور سے فائدہ نہ اٹھائے وہ بے وقوف ہے۔ اور جو کمزور کو نہ ٹھکرائے اُسے شہ زور نہیں کہتے، جو بے بسوں پر ظلم نہ کرے وہ بزدل!!

ہم نے کہا تھا کہ یہ رسم ہمارے ہندو بھائیوں تک محدود ہے ۔ یہ تک جا پہنچے تو یہ بات صحیح نہیں۔ پہلے تو یہ کہ سب ہندوؤں میں اس کا چلن نہیں۔ کچھ ذاتیں اس بری رسم سے بچی ہوئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ آج کل مسلمان بھی اس کی لپیٹ سے جھلسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں یہ رسم ہنوز عام نہیں۔ کچھ غیرت دریدہ اور اخلاق باختہ اور ہوس پیشہ لوگوں کو چھوڑ کر جنھیں مانگنے میں عار نہیں، باقی مسلمان اس وبا سے ایک حد تک محفوظ ہیں۔ کب تک محفوظ رہیں گے یہ ایک تشویشناک سوال پریشان ہے۔ جس کا تذکرہ اس مضمون کی آخری قسط میں ہوگا۔

## (۳)

ہم نے کہا تھا کہ جہیز مانگنے کے روگ سے ہندوستانی مسلمان بچے ہوئے ہیں، یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ایک حد تک بچے ہوئے ہیں۔ سماج کے اثرات کو فرد یا جماعت زیادہ عرصہ تک روک نہیں سکتی، یہ لالچ کو زیر کرنے والے ان مستثنیات میں سے ہیں جن سے کلیہ بنتا ہے۔ لہٰذا شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی لڑکی والوں سے مطالبات کرنے کی بری رسم چور دروازہ سے داخل ہوگئی ہے۔ اوّل تو خواتین کی عزت کا وہ بھرم جو اس دستور میں پنہاں ہے کہ پیغام یا درخواست لڑکے والے کی طرف سے جاتی ہے، آہستہ آہستہ ٹوٹ رہا ہے۔ اچھے، تعلیم یافتہ، اور برسر روزگار مسلمان لڑکوں کی کمی نے مسلمان لڑکیوں کے والدین کے لئے دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ پیام اب بھی لڑکے والوں کی طرف سے جاتا ہے، لیکن اکثر چھپا ہوا اشارہ لڑکی والوں کی طرف سے ہونے لگا ہے۔ گویا فراہمی اور مانگ والا بے رحم اقتصادی قانون اس پاکیزہ رشتہ پر بھی اثر انداز ہوا ہے جو کہ انسانی نسل کی بقا کا ضامن اور تہذیب و تمدن کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کی کجی ظاہر ہے جو حرص و ہوس کے مسالے سے چنی گئی ہو۔ اشارہ کا جواب اکثر اشارہ سے دیا جاتا ہے۔ یعنی پیغام دینے کے لئے تیار ہیں، لیکن آپ کیا دیں گے؟ اس طرح لڑکے والے صراحتِ سوال سے تو بچ جاتے ہیں لیکن حسنِ طلب کی غیرت سوز عادت

سے محفوظ نہیں رہتے۔ لیجیے، طمع کی کارفرمائی یہاں بھی شروع ہو گئی۔ اگرچہ طمع ایک خوشنما نقاب رُخ
پر ڈال کر آئی۔ لالچ ابھی چور کی طرح دبے پاؤں داخل ہوئی ہے۔ تدارک نہ کیا گیا تو فوراً آئے گی۔
ایسا ہوا تو نام بیگانہ مانوس۔

غنیمت ہے کہ پنہاں طلبی اور "سوالیہ اشارہ" کی یہ لعنت مسلمانوں میں عام نہیں ہوئی۔ قیاس کہتا
ہے کہ یہ درمیانی طبقہ کے ایک حصہ تک محدود ہے۔ لیکن چنگاری کو آگ بنتے ہوئے دیر نہیں لگتی اور رنگ
امتیاز بے تمیزی کی خوگر نہیں ہوتی۔ مسلمان والدین پتّا پانی کرنے والی اس فکر سے دوچار نہیں کہ لڑکے والوں
کے مطالبات کیونکر پورے ہوں گے۔ ان میں سے بیشتر کو یہ فکر ضرور دامنگیر ہے کہ لڑکیوں کے بَر کہاں ملیں
اچھے پڑھے لکھے روزگار یافتہ لڑکوں کی کمی اور اچھی تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کثرت، آخر اللہ کر کے ماں باپ کے
سوہان روح بن گئی ہے۔ لیکن یہ بات اس وقت ہمارے موضوع کے دائرہ سے باہر ہے۔

ہمیں اس اثنا میں یہ جان کر تکلیف ہوئی کہ جنوبی ہند میں کیرالہ کے مسلمان جو فنی زلزلہ اور باتوں میں شمالی
کے مسلمانوں سے بدرجہا بہتر ہیں، بے شرمی کے ساتھ جہیز مانگنے کی لعنت میں گرفتار ہیں! کوئی انہیں روکنے
والا نہیں، چنانچہ جس طرح ہمارے ہندو بھائی اپنے لڑکوں پر اس کی روزگاری حیثیت کے مطابق ایک لیبل
قیمت کا لگا دیتے ہیں اسی طرح کیرالہ کے پڑھے لکھے شہری مسلمانوں کا ایک طبقہ لڑکی والوں سے نذرانہ طلب کرتا
لگا ہے۔ کیسی انوکھی بات ہے کہ پرائس ٹیگ (قیمت کا پرچہ) لڑکے پر لگا ہوا ہے اور بک رہی ہے لڑکی۔

ع "وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا"

بک رہی ہے لڑکی اور قیمت لڑکے والوں کے ہاتھوں میں جا رہی ہے۔ ع دم بسوخت زحیرت کہ ایں چہ
بوالعجبی است!

اوپر کی سطروں سے پڑھنے والوں کا دھیان اس بات کی طرف گیا ہو گا کہ شادی کے سلسلے میں
لڑکی کی توہین اور لڑکے والوں کی ہوس کا یہ ننگ انسانیت سلسلہ شہروں تک اور شہروں میں بھی درمیانی
طبقہ کے ایک حصہ تک محدود ہے۔ گاؤں کی آبادی اور شہر کا اَن پڑھ اور غریب طبقہ اس لعنت سے بچا
ہوا ہے۔ اقبال نے خدا کی زبان سے کہلوایا تھا "پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب"
غور کیجیے یہ بات بھی نرالی ہے کہ غریب لوگ اور اَن پڑھ لوگ اس شرمناک لالچ اور جہالت سے
محفوظ ہیں، جو شادیوں کے سلسلے میں ہمارے خوشحال اور پڑھے لکھے ہندو بھائیوں اور بعض علاقوں میں چلے

مسلمان بھائیوں سے سرزد ہوتی ہے جنھیں محفوظ ہونا چاہیے تھا، وہی مبتلا پائے گئے۔ عجیب ستم ہے لیکن ہوس کا سیلاب شہروں اور طبقوں تک محدود نہ رہے گا۔ شروعات شہروں اور پڑھے لکھوں اور خوش حالوں سے ہوتی ہے، لیکن انجام سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

یہ طلسم بھی اب ٹوٹ چکا ہے کہ جس جگہ ریاست ضروریات کو پورا کرنے لگتی ہے وہاں سے لالچ کوچ کر جاتی ہے اور وہاں انصاف حکومت کرتا ہے۔ چین سے خبریں آرہی ہیں کہ چین میں لڑکی کو ضائع کرنے کی کوششیں عام ہیں۔ گویا لڑکیوں کو خوش آمدید کہنے کے بجائے انھیں بارِ گراں سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کیا پیدا ہوئی والدین کی کمر ٹوٹ گئی۔ یہ حال وہاں کا ہے جہاں ریاست مہد سے لحد تک کی ضمانت دیتی ہے! اس یقین کے ساتھ کہ انسان کا خاتمہ لحد پر ہے اور موت کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ یعنی یہ چین والے جاہلیت کے دور کے عربوں سے بھی بدتر نکلے، جو لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسلام نے اس شرمناک رسم کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ اسلام ہی پہلا دین ہے جس نے سماج میں عورتوں کو عزت کا مقام اور وراثت کے حقوق دیے ہیں، اور اب مسلمان بھی اس سیلاب میں بہہ جانے کے خطرہ میں ہیں جو عورتوں کی توہین پر کمربستہ ہے، جو ان کی پیدائش کو آفتِ ناگہانی سمجھنے لگا ہے۔ عبرت کا مقام ہے!

(۴)

قسطوں میں لکھنے کے کچھ فائدے ہیں، کچھ نقصان۔ ایک فائدہ یہ کہ اگر لکھنے والے کے پاس سکون اور فرصت کے لمحات کم ہیں تو بھی وہ اپنے خیالات کو پڑھنے والوں تک پہنچا سکتا ہے! دوسرا یہ کہ کڑوی دوا اور پھیکی میٹھی غذا اگر مقدار میں کم ہو تو گوارا کر لی جائے گی۔ نقصان یہ کہ ایک ہفتہ پندرہ دن یا ایک ماہ کے وقفے میں وہ اثر زائل ہونے لگتا ہے، جو مضمون کے ابتدائی جز نے پہلی قسط کی شکل میں پیدا کیا تھا اور اس غریب پڑھنے والے کا کیا قصور جس نے صرف ایک شمارہ پر نظر ڈالی تھی۔ گویا کہنے کی ایک بات کو قسطوں میں کہنا تجارتی ہتھکنڈہ ہے! پڑھنے والے کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ صرف ایک مضمون کے لئے ایک اور شمارہ خریدے لیکن "تہذیب الاخلاق" ایک اصلاحی پرچہ ہے۔ اسے تجارت سے کیا غرض۔

"خودسوزی" کے اس قسط وار سلسلہ کی شروعات اس طرح ہوئی کہ سید حامد مصروفیت کی بنا پر کئی شماروں میں غیر حاضر رہا اور اس غفلت پر اسے فہمائش کی گئی۔ ایک ساتھ ایک بسیط مضمون لکھنے کا

اسیر کیا اور ہر بار چند سطریں لکھ دیں۔ لکھنے والے کو ہرگز یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ پڑھنے والے اس کے مضمون کی
قسطوں کا انتظار کرتے ہوں گے قسطوں کے لئے درا صل اگر کوئی جواز ہے تو داستان گو کے پاس۔ اس کا مز
یہ تھا کہ کہانی کو ایک نازک اور صبر آزما موڑ پر پہنچا کر باقی داستان کو دوسری صحبت یا دوسری رات کے لیے اٹھا رکھ

آپ کو یاد ہوگی الف لیلیٰ کی بنیادی کہانی کہ ایک بادشاہ ہر روز اپنے شبستان میں ایک نئی دو
کو بہ سبیل عقد طلب کرتا اور صبح ہوتے اسے مروا دیتا۔ عیش و عشرت اور قتل و غارت گری کی صدیاں
گزر گئیں، تب شہرزاد کی باری آئی، جسے خدا نے حسن کے ساتھ ذہانت بھی دی تھی۔ یہ اجتماع کس قدر
نادر ہے کون نہیں جانتا۔ شہرزاد کو داستان سرائی کا ہنر آتا تھا۔ چنانچہ کہانی وہ اس انداز سے شرو
کرتی کہ پو پھٹے وقت کہانی اپنے توڑ پر پہنچتی اور بادشاہ مجبور ہو جاتا کہ ایک رات کے لیے اور اسے جا
کی امان دیدے۔ الف لیلیٰ جس میں ہزار راتوں کا بیان ہے انہی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ایک کہانی سے
دوسری کہانی نکلتی چلی گئی۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

"آنکھ کھولی الف لیلیٰ کا سماں دیکھا کیے ۔۔۔۔ زندگی کو داستاں در داستاں دیکھا کیے"

چاسر نے، جسے انگریزی شاعری کا باوا آدم مانا جاتا ہے، کنٹربری کی کہانیوں میں الف لیلیٰ
کی ترکیب سے ایک گونہ فائدہ اٹھایا ہے۔ کنٹربری جانے والے راستہ بہلانے کے لئے باری باری کہانیاں
ہیں۔ لیکن اس میں الف لیلیٰ کی صناعی اور بات میں سے بات نکلنے اور داستان میں سے داستان پید
ہونے کا لطف نہیں ہے۔ گو کردار نگاری میں الف لیلیٰ کنٹربری ٹیلس کی پاسنگ بھی نہیں۔

بات خود کو جلانے سے شروع ہوئی اور تذکرہ چھڑ گیا شادیوں کے کردہ مطالبات اور بھیانک
نتائج کا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں، شمال والوں اور جنوب والوں کا اس معاملے میں کیا رخ ہے، اس کی
بھی ہوئی۔ تان اس پر ٹوٹ رہی ہے کہ انسان نے عورتوں کے ساتھ طرح طرح کے ظلم روا رکھے ہیں۔ اسلا
پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کے حقوق کو مانا ہے اور ان کو عزت کی جگہ پر بٹھایا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ
مسلمان بھی اپنے دین کو طاق پر رکھ کر عورتوں کی حق تلفی اور ان کی اہانت کرنے لگے ہیں۔ مغرب میں ابھی او
دکن میں حیدرآباد کو لیجیے۔ ان شہروں میں دوسرے ملکوں سے ایسے لوگ آتے ہیں جن کی روایتیں اور
قدریں مٹی کے تیل میں ڈوب چکی ہیں اور جو اپنی بدچلنی کو شریعت کے لبادہ سے ڈھانکنے کی کوشش کر
ہیں۔ یہ پیران فرتوت بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کے والدین کو شادی کا پیام دیتے ہیں اور وہ بے

بے بس اور بے غیرت والدین اپنی لڑکیوں کی شادی ان بوالہوس درندوں کے ساتھ کر دیتے ہیں، اس امید میں کہ شاید اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اور ان کی بیٹی جو سیانی ہو کر بھی گھر میں بیٹھی ہوئی ہے ٹھکانے سے لگ جائے۔ ہندوستان میں بیشمار مسلمان لڑکیاں سیانی ہو کر گھروں میں بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ اس کی ایک الگ المناک داستان ہے جس کی تفصیل کو ایک مستقل مضمون درکار ہوگا۔ اجمالاً اس کا یہ ہے کہ آزادی اور تقسیم ہند کے بعد پڑھے لکھے اور خوش حال مسلمان ماں باپ کے لئے لڑکیوں کی شادی ایک بہت کٹھن مسئلہ بن گئی ہے۔ خوش حال اور ہونہار لڑکوں کی ایک پوری نسل پاکستان چلی گئی۔ لڑکیاں بیچاریاں یہیں والدین کے ساتھ رہ گئیں۔ ظاہر ہے ان کے لئے اس حیثیت کے بر ملنا دشوار ہو گیا جس کی وہ ماں باپ کے گھر عادی رہی ہیں۔

شمالی ہندوستان کے مسلمان جنھوں نے ملازمت اور زمین داری پہ تکیہ کر رکھا تھا دونوں سے محروم ہو گئے۔ اس کے بعد جو مسلمان لڑکے اٹھے وہ بدلے ہوئے حالات اور سکڑتے ہوئے امکانات سے بددل ہو کر محنت اور ولولہ سے دست کش ہو گئے، یا انھوں نے پیشوں اور مناصب کے لئے کوشش کرنا چھوڑ دیا جو اعلیٰ تعلیم کے راستہ سے حاصل ہوتے ہیں۔

لڑکیوں نے تعلیم میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کی کہ تعلیم کے بغیر شادی مشکل تھی اور ایسے لڑکوں کی تعداد کم ہو گئی تھی جن کے پاس علم بھی ہو اور معقول حیثیت بھی ۔۔۔۔ لڑکیاں مسلمان لڑکوں سے تعلیم میں آگے نکل گئیں۔ اب ان کے لئے مناسب رشتہ ملنا اور دشوار ہو گیا کہ وہ خوشحال ماں باپ کی بیٹیاں اور علم اور احساسات و وابستہ امیدوں کی سرمایہ دار تھیں۔ چنانچہ وہ محرومی کی آگ میں جلتی رہتی ہیں اور ان کی آنچ سے ان کے والدین زندگی بھر تپتے اور جھلستے رہتے ہیں۔

مسلمان لڑکوں میں اگر غیرت ہوتی، حوصلہ ہوتا تو وہ اپنے لئے نہ سہی اپنی بہنوں کی خاطر سخت جانفشانی کرتے اور علم اور حیثیت حاصل کرتے تاکہ مسلمان لڑکیوں کے لئے ہم علم، ہم حیثیت اور ہم اطوار لڑکے آسانی سے مل جاتے اور غیر مسلموں سے مسلمان لڑکیوں کی شادی کا فتنہ سر ہی نہ اٹھا پاتا۔

جملہ معترضہ ختم ہوا۔ بمبئی اور حیدرآباد میں جو ناٹک کھیلا جا رہا ہے اس کا خاتمہ المیہ پر ہوتا ہے۔ ہوس کی پیاس بجھانے کے بعد یہ ظالم اجنبی اپنی بیویوں کو طلاق دے دیتے ہیں اور وہ غریب اپنی زندگی ناکامی، تنگی اور رسوائی میں کاٹتی ہیں۔ اس ناٹک میں "ولین" (VILLAIN) کئی ہیں۔ ایک تو وہی

زرداری بوالہوس، جو شادی کا سوانگ رچا کر دراصل زنا بالجبر کا ارتکاب کرتے ہیں ——

—— وہ عقد جس میں زندگی بھر کی رفاقت، انسیت اور ہمہ گیر شرکت اور ہمدردی اور باہمی حر
کا تصور نہ ہو، اُسے عقد کہنا روا نہیں۔ ایسی شادی جس کا مقصد صرف جنسی تشفی ہو کسی نادین کے ذر
نہیں ہو سکتی۔ مرد ہوس آمادہ، عورت ڈری ہوئی، سہمی ہوئی کہ مرد کی ہوس پوری ہونے کے بعد اس
انجام کیا ہوگا۔ یہ صورت حال شادی کے بجائے مجرمانہ حملے سے قریب تر ہے۔ اس میں عیاشی، لذ
اور بہیمیت موجود ہیں، محبت، رفاقت اور محبت کے ثمر یعنی اولاد کا تصور اور اس کو پروان
کی امنگیں مفقود ہیں۔

وہ اخلاق باختہ قاضی جو ان اعمال شنیعہ کو دین کی سند دیدیتے ہیں۔ وہ جانتے ہی
بے، جہالت ہے، گناہ ہے، اور پھر بھی وہ ایسے نکاح پڑھانے میں ذرا سا تامل نہیں کرتے۔ اس
ایک طرف وہ ایک ایسی بیماری کو بڑھاوا دیتے ہیں جو سماج کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ دوسری طرف
سے روپیوں کے لئے مذہب کو بدنام کرتے ہیں۔ دین جو عین حق ہے، اس کا رشتہ وہ جھوٹ اور
جوڑ رہے ہیں اور اس کو ہوسناکی کا آلۂ کار بنا رہے ہیں۔ قصور بیشک اس ماں یا والدین کا بھی ہے
ہے۔ ان کے بعد خطا ان لڑکیوں کی ہے، جو اپنے ماں باپ کی عزت بچانے اور ان کی پریشانی دور کر
لئے ایک ایسی بات پر راضی ہو جاتی ہیں، جو مذہب کے خلاف ہے، انسانیت کے برعکس ہے اور جو ان کی زن
ہمیشہ کے لئے برباد کر دیتی ہے۔ انھیں چاہیئے کہ اس طرح نکاح کا زنا سے صاف انکار کر دیں۔ ال
کے احکام اور ماں باپ کی خواہش کو بالکل نظر انداز کرنا ہوگا۔ معاشرہ کا بھی فرض ہے کہ ان
اس ظلم و جہل اور ہوسناکی سے بچائے۔

خودسوزی، دونوں کرتی ہیں، وہ ہندو لڑکیاں جو طمع کا ہدف بنتی ہیں، اور وہ مسلمان لڑ
جو اس طرح کی عارضی اور بازاری شادی بدرجۂ مجبوری کر کے تمام عمر کڑھتی رہتی ہیں، جلتی رہتی
ہمارا سماج کتنا بیدرد اور کیسا بجس ہو گیا ہے۔

ہم خودسوزی کی ان مثالوں کی طرف اشارہ کرتے گزر جائیں گے جن سے رجوع کسی
مقصد کی تکمیل کے لئے کرنا پڑا۔ یورپ میں بہت سے لوگ جنھوں نے اپنے عقائد تبدیل کرنے
کیا، آگ میں جلا دیئے گئے۔ JESUITS نے اس بیدردی کو قانون کی شکل دینے اور اسے جا

کلیدی کردار ادا کیا۔ ہم ان شہیدوں کو سلام کرتے ہیں جنھوں نے زندہ جلنے کو ہرگز انہ موت کو اصول وعقائد
تبدیلی پر ترجیح دی۔ انسانیت ایسے ہی لوگوں کے دم واپسیں سے باقی ہے۔ انگلستان میں بادشاہ نے رڈلے اور
کو شاہی مذہب کی پیروی نہ کرنے پر زندہ جلادیا جس وقت کہ وہ دونوں جلائے جانے کے لئے باندھے جا رہے
تھے ان کے چہروں پر نہ خوف تھا نہ ہراس، نہ مایوسی، اگر کچھ تھا تو عزم اور اعتماد۔ ایک نے دوسرے سے کہا: "جو
آگ ہم آج روشن کر رہے ہیں، وہ ایک دن ساری دنیا کو روشن کرکے رہے گی" یہ کہا اور جان، جانِ آفریں
کے سپرد کردی، اس طرح کہ آگ کے شعلوں سے گوشت بھون گیا، چربی پگھل گئی اور ہڈیاں تڑاقنے لگیں۔

اس سے بھی شاید بڑی قربانی ان بدھ بھکشوؤں نے کی ہے جنھوں نے ویت نام میں اپنے وطن کی آزادی
کے لئے شعلۂ آتشام موت کو آغوشِ مادر سمجھا۔ ہندوستان میں خودسوزی کے ایک حادثہ نے ایک نئی ریاست کی بنا
ڈالی۔ یہی حادثہ آگے چلکر ہندوستان کی لسانی تقسیم کا باعث بن بیٹھا۔ جلنے والے نے خودسوزی ایک مقصد
کے تحت کی اور وہ مقصد اس کے مرنے کے بعد حاصل ہو بھی گیا۔ مقصد کچھ بھی ہو اس کے نتائج خواہ اچھے رہے
ہوں، خودسوزی کی بنیاد یہاں حسن نیت اور ایثار پر تھی ـــــ اسلام اس قسم کی خودسوزی کو بھی گوارا نہیں
کرتا۔ احتجاج اور اصلاح کے اور بھی طریقے ہیں۔ کسی فرد کو اپنی جان لینے کا اختیار نہیں ہے!

جاپانی جس کام یا طریقے کو لیتے ہیں اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے خودکشی
کو فرار اور بزدلی کی سطح سے اٹھا کر جواں مردی اور ہمت اور عزتِ نفس کے مقام پر پہنچا دیا ہے۔

## (۵)

کسی نے یہ نہ دیکھا ہوگا کہ انسان اپنی گاڑھی کمائی کو آگ لگانے کے لئے صرف کرے لیکن کروڑوں
انسان آج کل یہی کر رہے ہیں۔ وہ سگرٹ پیتے ہیں۔ سگرٹ یا بیڑی پھیپھڑوں کو جلا ڈالتی ہے۔ انسان میں
جسمانی کام کو لگاتار اور بنا تھکے ہوئے کرنے کا دم باقی نہیں رہتا۔ بڑے بڑے ہونہار کھلاڑیوں کے
ارمانوں، امیدوں اور امکانوں کو اس منحوس عادت نے جلا ڈالا ہے۔ یہی نہیں، سگرٹ پینے والا صحت جلد کھو دینے،
جلد مرنے اور سرطان جیسی موذی بیماری میں مبتلا ہونے کا خطرہ مول لیتا ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے "دنیا میں اس
بیماری کے عالم میں رکھا ہی کیا ہے کہ انسان عمرِ خضر کے خواب دیکھے یا دیر تک جینے کا جتن کرے" مان لیا! بابا
اس غمکدہ سے جلد رخصت ہونا اچھا، لیکن ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینے کو کس نے کہا ہے؟ اپاہج اور

معذور بن کر زندگی کے آخری ایام کاٹنا اور عزیزوں پر بوجھ بن کے جینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ وہ دو
جو بیڑی اور سگریٹ پر صرف ہوتا ہے، اگر اچھی غذا کے لئے استعمال ہو تو صحتیں کتنی سنبھل جائیں اچھی پڑ
یا حبا وسائل کو ہم بدن اور تندرستی بنانے کے کام میں لاتے۔ ایسے ہم بدن کو مسمار، دل کو کمزور، پھیپھڑ
کو چھلنی، خون کو آلودہ اور صحت کو برباد کرنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ کوئی یقین کر سکتا ہے کہ ا
بظاہر بھلا چنگا انسان، پڑھا لکھا اچھی عادتوں والا انسان اس قسم کی حرکت کر سکتا ہے؟ وہ اپ
صحت کے خرمن کو اپنے ہاتھوں سے پھونک سکتا ہے؟

ابھی تک ہم نے خودسوزی کی ان قسموں ذکر کیا تھا، جہاں ذرا سی دیر میں جیتا جاگتا انسان
راکھ کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لیکن خودسوزی کی جس قسم کا تذکرہ اب کیا جا رہا ہے وہ سخت جان، صبر آزما
اور خود مطلب ہے۔ اس کی آنچ تلے جو آ گیا، وہ عمر بھر جلتا ہے، ہانپ ہانپ کر جیتا ہے اور سسک سسک
کر مرتا ہے۔ کینسر اس کی پذیرائی کرتا ہے۔ معذوری اور لاچاری اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ تپ بہت جلد اس
کے پیروں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ دھڑ پیروں کا ساتھ کب دیگا، کچھ مہینے یا کچھ سال اس با
کا فیصلہ کر دیں گے۔ ہمارے یہاں یہ بیماری مردوں تک محدود ہے۔ کیونکہ یہاں اتنی عورتیں خود کو پل
میں جلا کر راکھ کر دیتی ہیں کہ دوسری عورتوں کے لئے دھیمی آنچ سے زندگی بھر خود کو جلانے کی ضرورت
نہیں رہتی۔ یہ بھی کوٹا اسی طرح پورا ہو گیا۔

لیکن یہ بات بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے ـــ زیادہ خوشحال پڑھی لکھی اور جدید مزاج خوا
اب ہمارے ملک میں بھی نکوٹین کی ملکہ کے ساتھ پینگ بڑھانے لگی ہیں۔ شاید وہ سمجھتی ہیں کہ سگریٹ پینے
سے چھب میں اضافہ ہوتا ہے، کشش بڑھتی ہے، نوک پلک درست ہوتی ہے اور وہ حجاب اور فاصلہ کم ہو
ہے جو ہمارے سماج میں مرد عورتوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ کش لے کر دھواں اڑانے کی ادا میں دعوت بھی
اور شانِ دلربائی بھی، اشتعال اس پر مستزاد۔

بہر کیف سگریٹ میں، خواہ اُسے مرد منہ لگائیں، خواہ عورتیں، برائی اور نقصان کے علاوہ کچھ بھی نہیں
لڑکے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دھیرے دار کش لیتے رہیں گے، تو ان کی گنتی دانشوروں میں ہوگی۔ عورتیں یہ سمجھتی ہیں
اس طرح ان کے اصل کا حسن اور ہونٹوں کی گرمی اور پیچ و خم واشگاف ہوگی۔ تینوں غلطی پر ہیں۔ وہ سایہ
پیچھا کر رہے ہیں، کھوٹے کا سودا کر رہے ہیں۔ دائی کو زچ کر حاملہ کو پیٹ سے لگا رہے ہیں۔ باطن کو ظاہر پر

کر رہے ہیں۔ 'خودسوزی' کی یہ وبا عالمگیر ہے، نئی نسل اس بُری عادت میں اسیر ہے۔ بی جمالو جو چنگی ڈال کر دور ہو جایا کرتی تھیں، اب چنگی کی زد میں خود آگئی ہیں اور اب پھنکا جا رہی ہیں۔ انسان نے ٹھانی ہے کہ پھیپھڑوں کو جلا ڈالے، دل کو گھایل کر دے، خون میں آلودگی بڑھا دے، قویٰ میں اضمحلال لے آئے، دماغ کو دھندلا دے، انگلیاں ہونٹ اور دانت پیلے پڑ جائیں، منھ سے بدبو آنے لگے۔

سگریٹ پینے والے حالات سے برد آزما ہونے کی صلاحیت بتدریج کھو بیٹھتے ہیں اور جب کبھی ان کی زندگی میں نازک موڑ آتے ہیں، مشکل مسائل یا حوادث کا سامنا ہوتا ہے، تو وہ عقل و ہوش کو گہنا دینے والے سگریٹ کو اور زیادہ کثرت کے ساتھ پیتے ہیں۔ ایک سگریٹ سے دوسرا سگریٹ جلاتے ہیں۔ دشمن سے عہدہ برآ ہونے کا یہ انوکھا انداز ہے کہ اپنے دفاع کو کمزور کر دیا جائے اور دشمن کی رہبری اور پذیرائی کے لئے دود آگیں چراغاں کیا جائے؛ ہوش و حواس کو دھندلاہٹ سے گھیر لیا جائے، اپنے سکون کو مکدر کر دیا جائے؛ اپنے شعور اور سوجھ بوجھ کو ماؤف کرنے کے جتن کیے جائیں۔ انسان ویسے ہی بہت سی مجبوریوں کا اسیر، بہت سے حوادث کا ہدف ہے۔ اس صورت حال کا واحد حل ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے؛ چہ جائیکہ اپنے اختیار اور اعتماد کو کمزور کیا جائے، لعنتوں کو دعوت دی جائے، مجبوریوں کو بڑھایا جائے، بُری عادتیں اختیار کی جائیں۔ کوئی مورکھ ہوگا جو اپنی ڈھال میں خود چھید کرے گا، اپنے تن بدن میں خود آگ لگائے گا۔

## (٦)

ایسا لگتا ہے کہ خودسوزی کا یہ سلسلہ (مضامین) ختم ہونے میں نہیں آئے گا! قاہرہ سے واپسی میں چند گھنٹے دبئی میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ روزنامہ 'اخبار خلیج' میں ایک سرخی پر نظر پڑی "صحافت کی اخلاقیات پر شبہ کا نشان" نیویارک کے پاس ایک قصبہ جیکسن ول میں رونلڈ زیوڈی نے جو چھتوں کی مرمت کیا کرتا تھا اور جس میں بے روزگاری کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہ رہی تھی، مقامی ٹیلی ویژن اسٹیشن کو فون کیا کہ وہ امریکہ میں بے روزگاری کے خلاف احتجاج کے طور پر خود کو نذر آتش کر دے گا۔ اسٹیشن نے پولس کو اطلاع دی، پولس نے مذکورہ جگہ کو چھان ڈالا، مگر کوئی نہ ملا۔ اسی اثنا میں کیمرہ مین رونلڈ سمنس (۳۰) اور ساؤنڈ مین گیری ہیرس (۱۸) وہاں پہنچے تو انڈریوز نظر آیا۔ وہ پٹرول میں تر اور تھا۔ انھوں نے اسے باتوں میں لگائے رکھا، اس امید میں کہ شاید پولس آجائے، وہ لوٹ کر نہ آئی اور انڈریوز نے دیا سلائی جلائی

اور اپنے سینہ کے قریب لے گیا۔ انھوں نے کیمرہ تیار کر لیا۔ اینڈریوز کو دوبارہ دیا سلائی جلانی پڑی۔ تب آگ نے اسے پوری طرح اپنی آغوش میں لے لیا۔ تب کہیں ہیرس اُسے بچانے کے لئے دوڑا۔ نیم سوختہ اینڈریوز ہسپتال میں داخل ہے۔ اس المناک ڈرامے کے ۳۷ سیکنڈ کیمرہ کی گرفت میں آ گئے' اور ٹیلی ویژن پر دکھائے گئے۔ اور اخباروں میں بھی اس واقعہ کا چرچا ہوا۔ اس واقعہ سے اہل صحافت میں بحث چھڑ گئی ہے۔ ضمیر اور قدروں کا سوال اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ سمنس اور ہیرس کا کہنا ہے کہ ان کا ضمیر صاف ہے۔ انھوں نے اپنا فرض ادا کیا' ان کا فرض ہے کہ حادثات کو بوقت وقوع اپنی گرفت میں لے آئیں۔

ایک دوسرے صحافی نے کہا" ان سوالوں میں سے جن کا جواب نہیں دیا جا سکتا' ایک یہ بھی ہے کہ اگر کیمرہ مین نہ پہنچتا تو کیا پھر بھی اینڈریوز خود کو جلاتا۔ اس کے علاوہ کیا اس تشہیر سے دوسرے لوگوں کی ہمت افزائی نہ ہوگی جو توازن اور عدم توازن کی سرحد پر ہے۔

کارٹر نامی' ایک دوسرے صحافی نے تبصرہ کیا کہ ہم طویل اور تلخ اداریے اس موضوع پر لکھتے ہوئے نہیں تھکتے کہ وکیل اور ڈاکٹر اور دوسرے پیشہ ور اخلاقی قلمدانوں سے بیگانہ ہیں۔ لیکن بعض اعتبارات سے ہمیں زندگی اور موت پر وکیلوں اور ڈاکٹروں سے زیادہ اختیار ہے۔ اس کے باوجود ہم کسی ضابطے یا کوڈ کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

بہرکیف زیست سے بیزار ایک بیروزگار کی احتجاجی خودسوزی نے ایک ایسا مسئلہ چھیڑ دیا ہے جو درحقیقت ہمارے دَور کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ بیشتر صحافی یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کسی واقعہ کو جلد از جلد چھپوا دیا، تو ان کا فرض پورا ہو گیا۔ وہ معاشرہ، انسانیت' یا زندگی کے تئیں اپنے آپ کو ذمّہ دار نہیں سمجھتے۔ یہ نادان اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہر شئے جو عرصۂ وجود میں آتی ہے' ہر حادثہ جو وقوع پذیر ہوتا ہے' وہ زندگی کا ایک عضو ہے اور اسے زندگی سے الگ کرنا ایک طرف اسے مفلوج، دوسری طرف خود اس کی زندگی کو مسموم کرنا ہے۔ ایک زمانہ تھا مصنفین کے ایک گروہ نے اپنی تخلیقات کو زندگی سے بالاتر سمجھا چاہا اور ادب برائے ادب کا نعرہ بلند کر دیا۔ انجام کیا ہوا؟ رسوائی' ہوا خیزی۔ جو کچھ وجود میں آتا ہے یا لایا جاتا ہے' جو حرکت بھی ہوتی ہے' زندگی کے دائرہ میں اور زندگی کے لئے ہوتی ہے۔ جب مصنفین کا یہ حال ہوا، تو صحافی کس شمار میں ہیں۔ صحافیوں سے مراد ان سب لوگوں سے ہے جو ابلاغ کا کام کرتے ہیں' جو پیغام پہنچاتے ہیں۔ ابلاغ کے ذرائع میں بڑی طاقت ہے رائے عامہ کو بنانے

اور بگاڑنے کی، عوام پر اثر انداز ہونے اور ان کے نقطۂ نظر اور ردِّ عمل کو ڈھالنے کی یہ طاقت سنبھال سکتی ہے، سدھار سکتی ہے، سنوار سکتی ہے، یہی طاقت بگاڑ سکتی ہے، فسادات اور شر پیدا کر سکتی ہے، برباد کر سکتی ہے۔ ہر ذمہ دار آدمی کو بات کہنے یا کام کرنے سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ اس کام کے نتائج اچھے ہوں گے کہ برے۔ اس ذمہ داری سے اہلِ صحافت کیونکر بچ سکتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں وقت کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

ان کا مقصد ہونا چاہیے انسان کی فلاح، زندگی کی بالیدگی، معاشرہ کی سنجیدہ باخبری لیکن بہت سے صحافیوں اور ابلاغ والوں نے سنسنی خیزی کو مقصود اور نمک مرچ کو ذریعہ بنا لیا ہے۔ کوئی اچھا تعمیری کام جو خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جا رہا ہے، ان کے لئے درخورِ اعتنا نہیں ہوتا کیونکہ ان ہی کی زبان میں اس میں خبر کا پہلو نہیں۔ اگر کسی یونیورسٹی میں نظم و ضبط اور سنجیدگی نظر آئے، تو اُسے گورستان کی خاموشی سے تعبیر کریں گے۔ اگر ہنگامہ برپا ہو گا تو ان کی پو بارہ ہے۔ ایک بیروزگار آدمی زندگی سے تنگ آ کر جان دے رہا ہے، انسانی فتیلہ میں دیا سلائی لگانے کی دیر ہے۔ اور امریکہ کے ذرائع ابلاغ اسے جلنے دے رہے ہیں۔ کہ اگر وہ جلنے کا اعلان کرنے کے بعد بچا لیا جاتا ہے، تو خبر کے لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی اور اگر جلتا ہے اور اس کی تصویر ہاتھ آگئی، تو پھر وارے نیارے ہیں۔ دنیا میں دھوم مچ جائے گی۔

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ خود کو جلانے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ کہ آگ دکھائی اور بھک سے اُڑ گئے۔ دوسرے وہ جو تمام عمر جلتے رہتے ہیں: کبھی غم کی آنچ میں، کبھی لوگوں سے ٹکرا کر، جیسے پتھروں کے ٹکرانے سے چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ قدرت کی طرف سے زخم خوردہ ہیں اور محرومی کی آگ میں جلتے ہیں۔ انھیں شاید جلنے کا حق بھی ہے۔ لیکن جلنے کے بجائے اگر وہ اپنے اچھے پہلوؤں پر اور دوسروں کی محرومیوں پر نظر ڈالتے تو زندگی کو زیادہ سکون کے ساتھ گزار سکتے۔

ہم نے "سوختن" کے مصدر کی گردان کر دی۔ قارئین بھی اس جلنے جلانے سے اُکتا گئے ہوں گے، ہم بھی تنگ آ چکے ہیں۔ جلنے جلانے کی ایک آخری شکل کا ذکر کر کے اس سلسلے کو ختم کرتے ہیں۔ صرف یہی شکل ہے جو رشک کے لائق ہے یعنی دل سوزی: دوسروں کے لئے اپنے دل کو جلانا، دوسروں کے درد سے بیتاب ہو جانا، ہمدردی کرنا، غمخواری کرنا کہ انسانیت اسی سے عبارت ہے اور انسان کی فضیلت اسی میں پنہاں ہے، اور تہذیب کی ترقی کا راز یہی ہے۔

(۷)

مضامین کا یہ سلسلہ جو خود سوزی کے عنوان سے قسط وار 'تہذیب الاخلاق' میں چھپتا رہا، پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن واقعات اور حادثات کو ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ جہیز مانگنے کی لعنت کی دو مثالیں ہمارے علم میں حال ہی میں آئی ہیں۔ انھیں تتمّہ کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے:

الامین سوسائٹی کی دعوت پر بنگلور جانے کا اتفاق گزشتہ ماہ میں ہوا۔ وہاں پتہ چلا کہ جنوب کے مسلمانوں میں جہیز مانگنے کی شرمناک عادت کیرالہ تک محدود نہیں، بلکہ کرناٹک اور آندھرا پردیش میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ اللہ رحم فرمائے۔

آج ۱۰ مئی ۱۹۸۳ء کے قومی آواز لکھنؤ میں ایک سرخی پر نظر پڑی: "عورت کی لاش قبر سے کھود کر نکالی گئی۔ سسرال والوں پر جلا دینے کا الزام"

واقعہ اس طرح بتایا جاتا ہے کہ لکھیم پور ضلع کے باشندے مسٹر محمد طاہر کی شادی سیتاپور کی لڑکی عشرت جہاں کے ساتھ ہوئی تھی۔ شوہر اپنی بیوی سے سائیکل اور گھڑی کا مطالبہ کرتا رہا۔ ایک روز لڑکی کے باپ کو اطلاع ملی کہ ان کی بیٹی کوٹھے سے گر کر مر گئی ہے۔ اس کی لاش کو جلدی سے دفن کر دیا گیا۔ اس کی درخواست پر پولس نے لاش قبر سے نکالی۔ وہ جلی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ بے غیرتی اور سفاکی کا یہ سلسلہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ یہ لعنت شاید کسی اور ملک میں نہ ملے گی ـــــ اور ہم مہذب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں!

●●●

# معہودِ ذہنی

عنوان کی ثقالت سے نہ گھبرایئے جو بات آج کہی جائے گی وہ بہت سادہ سی ہے۔ سرخی اس انداز کی ہے کہ زبان گویا مڑ گیا کہا جائے اور مفہوم اتنا عام فہم کہ سب کی سمجھ میں آجائے۔ "معہودِ ذہنی" سے مراد وہ باتیں ہیں جو کہنے والے کے ذہن میں ہوتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو بات وہ کہنے جاتا ہے وہ سب کی سب نہیں کہتا۔ وہ یہ تصور کر لیتا ہے کہ موضوع گفتگو کے متعلق جو باتیں اس کے ذہن میں ہیں، وہ سننے والے کے ذہن میں بھی ہوں گی۔ سننے والا ان باتوں پر اپنے حساب سے اور اپنی سماعت کے مطابق غور کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ کہنے والے نے جو کچھ کہا ہے اس کے علاوہ کیا کیا سوچ رکھا ہے۔ چنانچہ جو بات اس تک پہنچتی ہے وہ اس بات سے بہت کم ہوتی ہے جو کہنے والا کہنا چاہ رہا تھا، وہ جو کہنا چاہ رہا تھا، وہ کچھ ملفوظ تھا۔ (یعنی لفظوں کی گرفت میں آگیا تھا۔ اور کچھ مقدر (یعنی دل ہی دل میں رہ گیا تھا۔ اس کی بابت قیاس کر سکتے ہیں) جو ملفوظ تھا وہ سننے والے تک پہنچ گیا، جو مقدر تھا، اس کی اسے آہٹ بھی نہ ملی۔ جو خبر اس تک پہنچی وہ ادھوری ہی رہی۔ معانی و مفاہیم بیان کرنے کی تعبیر سے اکثر گھائل ہو جاتے ہیں۔ ابلاغ کی کمی، تفہیم کا نقص، بات کی نارسائی، رابطے کی ناتمامی اور غلط فہمی بار ہا اس طرح بھی جنم لیتی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں معہودِ ذہنی طرح طرح سے تکلیفیں پہنچاتا ہے، ستم ڈھاتا ہے اور چھوٹی بڑی ترشیوں، تلخیوں کی طرف بسا اوقات لے جاتا ہے۔ زبان و بیان کی کوتاہ دستیوں سے قطع نظر بات کو پوری صراحت کے ساتھ نہ کہنے کی عادت عملی زندگی میں خود ہمارے اور دوسروں کے لئے تکلیف، تشویش، الجھن اور پریشانی کا سبب بن جاتی ہے۔ مثلاً آج آپ شام کو سفر پر نکلنے والے ہیں۔ کثرتِ استعمال سے آپ کا پرانا زخم رسیدہ سوٹ کیس کئی جگہ سے کھل گیا ہے۔ آپ نے خادم سے کہا۔ بازار لے جاؤ اور اس کی ٹھیک سے مرمت کرا دو۔ وہ بازار گیا۔ دوکان دار نے کہا اس میں کام بہت ہے۔ ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ خادم نے کہا بھائی صاحب جلدی ضرورت ہے، صاحب سفر پر جا رہے ہیں۔ اس نے کہا اچھا کل اتوار ہے، پرسوں شام کو لے لینا۔ اور سب کام چھوڑ کر تمہارا کام کر دیں گے۔ وہ بیچارہ خوش خوش لوٹا کہ جو کام ایک ہفتہ میں ہونے والا تھا، اسے میں نے دو روز میں کرانے کے ڈول ڈال دیئے۔ شام کو صاحب دفتر سے آئے، پوچھا تو پتہ چلا کہ سوٹ کیس دو روز بعد ملے گا

چھوکرے پر برس پڑے، کہ احمق تجھے معلوم نہیں کہ میں آج شملہ کو جارہا ہوں۔ ابھی واپس جا، جیسا ہے ویسا ہی لے آ۔ ڈوری باندھ کر کام چلالوں گا۔ بیچارہ دوڑا ہوا گیا تو معلوم ہوا کہ دکان بند ہوچکی ہے۔ ڈوریوں سے بندھا ہوا سو پھر بھی بہتر تھا۔ اب کپڑے پوٹلی میں باندھ کر لے جانے پڑیں گے۔ غریب نوکر کی جو شامت آئی، سو الگ رہی۔ اب سوال صرف اتنا سا باقی ہے کہ احمق کون تھا، آقا یا خادم۔ جواب ہم آپ کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ احمق کوئی ہو۔ مجرم وہی معمودِ ذہنی پر تکیہ کرنے کی عادت تھی جو بہت عام ہے اور جو اکثر خلقِ خدا کے اوقات کو تلخ کرتی اور اس کے کاموں کو بگاڑتی رہتی ہے۔ تو بات الگ خراب ہوتی ہے۔ خون کے دباؤ کا اچانک بڑھنا اس پر مستزاد۔ آپ کا کیا جاتا اگر اسے بتا دیتے کہ ہمیں آج ہی سفر پر جانا ہے اور سوٹ کیس کی مرمت اسی لئے کرائی جارہی ہے۔

”خودسوزی“ کے سلسلے میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ لڑکے اور لڑکے والوں کی شرمناک لالچ ہر طرف گھروں میں آگ لگاتی جارہی ہے۔ سماج، بیچاری عورتوں کی بلی دے رہا ہے۔ پہلے مہینوں اور ہفتوں میں ایسی خبریں آتی تھیں، اب کوئی دن خالی نہیں جاتا۔ اس روز اخبار میں تھا کہ صرف دلی[1] میں اس قسم کی موتوں کا اوسط یومیہ دو پڑ رہا ہے۔ لالچ نے لوگوں کو اندھا کر دیا ہے، پاگل بنا دیا ہے۔ قارئین شاید ہمارے ذہنی توازن پر بھی سوالیہ نشان لگا رہے ہوں گے کہ ہم خواہ کچھ بھی لکھیں، اس میں شاہ چارلس کے سر کی طرح خودسوزی کا موضوع ضرور سر اٹھائے گا۔ مان لیا بابا کہ جہیز کی لالچ اور لڑکے کی تجارت انتہائی شرمناک عادت ہے، یہ ہمارے وقار کو مجروح کرتی ہے، اس کے آگے ہمارا روحانیت کا دعویٰ کھوکھلا لگتا ہے، دنیا میں اور کہیں انسانی گوشت کی اس عنوان اور اس بے غیرتی کے ساتھ تجارت نہیں ہوتی، یہ سب کچھ تسلیم لیکن کیا دنیا میں اور کوئی موضوع باقی نہیں رہا جس پر قلم اٹھایا جائے اور اگر موت ہی کو موضوع بنانا ہے، تو سڑک کے حادثوں میں بھی تو روز سیکڑوں موتیں ہوتی ہیں۔ اگر جلنے سے کچھ موتیں ہوگئیں، تو کیا غضب ہوا۔ اور پھر مضمون کی بے ربطی کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ معمودِ ذہنی کی بات کرتے کرتے ذہن اور قلم دونوں بھٹک گئے اور جلنے جلانے کی بات کرنے لگے۔

قارئین کی جھنجھلاہٹ سر آنکھوں پر۔ اگر جان کی امان پائیں، تو عرض کریں کہ جہیز کی موتیں (اس ترکیب کے طنز پر غور کیجیے۔ حکما تو کہتے ہی چلے آئے ہیں کہ شادی اور غم توام ہیں) کھلے ہوئے مطالبہ کی بنا پر کم ہوتی ہیں توقعات، قیاسیات اور ناگفتہ مانگوں کی وجہ سے زیادہ۔ لڑکے والوں نے کہا اسکوٹر دو، ٹی وی سیٹ دو، گھر کا فرنیچر دو اور ۲۰ ہزار روپیہ نقد دو۔ لڑکی کا باپ قرض لے گا، بھیک مانگے گا، چوری کرے گا اور جو کچھ لا کر

۱۔ تمدن شہر سے نکلا ہے اور اب اس کا جنازہ شہر سے نکل رہا ہے۔

بس اندازہ کیا ہے وہ نکالے گا، بیوی کے گہنے بیچےگا، رشوت لے گا اور یہ مانگ پوری کرے گا۔ اور اگر اتنا روپیہ فراہم کرنا اس کے بس کا روگ نہیں، تو مجبور ہو کر دل پر پتھر رکھ کر کہہ دیگا کہ بھی جی ہماری اتنی حیثیت نہیں۔ بیچے رشتہ ہی نہیں ہوا، تو جلنے جلانے کی نوبت کیوں آنے لگی۔ یہ نوبت تو اکثر وہاں آتی ہے، جہاں لڑکے والے کہتے ہیں" گھر پر بھگوان کا دیا سب کچھ ہے، ہمیں کیا ضرورت کہ شادی کر کے تجوری بھریں، ہمیں تو سُندر اور گُن وتی لڑکی کی تلاش تھی سو مِل گئی، ہم زبان سے کچھ نہیں کہیں گے، آپ کی لڑکی ہے آپ اُسے جو دینا چاہیں دیں، ہم بیچ میں کہاں آتے ہیں۔" جس وقت زبان سے یہ ارشاد ہوتا ہے، اُسی وقت ذہن کھچڑی پکانا شروع کر دیتا ہے کہ "سکسینہ راج کی دو ہی تو بیٹیاں ہیں، تین بیٹے ہیں، ایک بیٹے کی شادی ہو چکی ہے، بہو ڈھیروں دولت لائی ہوگی، پھر ان کی نوکری چھوٹی اور تنخواہ کم سہی لیکن اُوپر کی آمدنی تو کافی ہوں گی۔ یہ ضرور ہمارے بیٹے کو نہال کر دیں گے۔" اور جب دیکھتے ہیں کہ بہو نے ان امیدوں اور ان قیاسات اور ان مُیوں کو جو انھوں نے بنائے تھے مسمار کر دیا تو کچھ دن پہلے کا معبود ذہنی جو ابھی تک سراپا تہذیب بنا ہوا تھا، مسمد صیانہ کو نوک زبان سے ٹٹولنا شروع کرتا ہے۔ بیچاری لڑکی سے اپنے ماں باپ کی بے عزتی اور بے بسی نہیں دیکھی جاتی، اُسے جان دیتے ہی بنتی ہے۔ اگر لڑکے والے شروع ہی میں سودے کی بات کر لیتے تو لڑکی اور لڑکی والوں کو یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا۔ ہمارے پاس اس کا وقت نہیں کہ اس کا تجزیہ کریں کہ لڑکے والوں نے چُپ کیوں سادھی تھی۔ کیا تہذیب اور انسانیت نے انھیں مانگ نہ کرنے پر مجبور کیا؟ اگر ایسا تھا تو شادی کے بعد تہذیب اور انسانیت غوطہ کیوں لگا گئیں؟ شاید یہ بات کو لپیٹ کر کہنے کی عادت کا اثر ہوگا جو بعض لوگوں کی سرشت میں داخل ہوتی ہے یا اسے جرأت کی کمی پر محمول کیجیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے ان کے دل میں طمع کے دلدل سے اُوپر اُٹھنے کا جذبہ پیدا ہوا ہو۔ یا ان سب محرکات کا مجموعی اثر تھا جس نے حسن اخلاق اور شائستگی، ایثار اور دل آسائی اور خوش گوئی کے یہ گُل کھلائے۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ لڑکے والوں کی ممتانے کوئی تجویز قبول نہ کی ہوگی۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ لڑکے کا بھاؤ گرانا زیبی نور رکھتا ہے اور اتنا بڑھانا کہ گاہک ہمت بار بیٹھے نِری مخلوط حماقت؛ بات گول رکھو جب لڑکی بیاہ کر آ جائے گی تو اسے یرغمال بنا کر جو چاہیں گے وصول کر لیں گے۔ پھر کسی کی مجال کہ ہماری مانگیں نہ مانے۔ آپ نے ایسے سرجنوں کی لرزہ خیز داستانیں سُنی ہوں گی، جو مریض کا پیٹ چاک کر کے آپریشن کو بیچ میں چھوڑ کر فیس کے متعلق من مانے مطالبات کرتے ہیں اور مریض کے بے بس عزیزوں سے منھ مانگی مراد پاتے ہیں۔ یہی حال لڑکے والوں کا ہے۔ حرام کی کمائی دونوں کھاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک اپنے ہاتھ کے ہنر سے اور دوسرا بیٹے کے وجود سے۔ انسان گرتا ہے تو اسفل السافلین کی خبر لاتا ہے۔

دیکھ لیا آپ نے معہود ذہنی کا ستم۔ بات کو ناگفتہ رکھنے کا ظلم، توقعات کو زبان نہ دینے کا جور، قیاسات کی دنیا میں رہنے کا فتنہ اور ابہام کو رہنما بنانے کا فساد۔

زبان کے متعلق پھبتی کسی گئی ہے کہ یہ خیالات اور جذبات کو چھپانے کا ذریعہ ہے۔ جی ہاں، ہوتے ہیں ضرور ہوتے ہیں۔ ایسے بھی خیالات، ایسے بھی جذبات جن کو چھپانے ہی میں عافیت ہے۔ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب کھری کھری سنانے میں جان یا سکون کا جوکھم ہوتا ہے، یا جب صاف صاف بات کہنے سے مخاطب کو غیر ضروری چوٹ پہنچتی ہے۔ لیکن ڈپلومیسی کو نظر انداز کر دیجیے اور روزمرّہ کی ملاقاتوں کی غیر اہم باتوں کو اور شعر اور شاعری اور فن کاری کو، تو یہ کلیتہً ماننا پڑے گا کہ افراد کے باہمی تعلقات اور معاملات کی صحت کے لئے صراحت اور وضاحت بہت ضروری ہے۔ قیاس اور ابہام کا ان میں دخل نہ ہونا بہتر، معہود ذہنی کا عمل نہ ہونا اَولیٰ؛ ورنہ گاڑی پٹری سے بار بار اُترے گی، حادثے ہوں گے، ترشیاں، تلخیاں، شکر رنجیاں، ہر قدم پر کیا کیا پذیرائی کریں گی۔ زندگی میں غم ویسے ہی کیا کم ہیں کہ انسان اپنی مساعی سے ان میں اضافہ کرے۔

اگر آپ کے دل میں ہماری بات ابھی تک نہ اُتری ہو اور آپ سمجھتے ہوں کہ اس عام عادت میں کوئی خرابی نہیں کہ مخاطب کے متعلق یہ تصور کر لیا جائے "کہ وہ نہ صرف آپ کی گفتگو، بلکہ گفتگو کرتے وقت آپ کے ذہن میں جو کچھ گزر رہا ہے اس سے بھی واقف ہے؛ اور وہ آپ کی بات کو بالکل اسی طرح سمجھ رہا ہے، جیسے آپ سمجھ رہے ہیں" تو ایک اور مثال دینے کی اجازت دیجیے۔ معاہدے جب ہوتے ہیں، خواہ وہ کمپنیوں کے درمیان ہوں، خواہ حکومتوں، خواہ افراد کے مابین، تو پہلے بات چیت کے ذریعہ سمجھوتا کیا جاتا ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر بات طے ہو گئی۔ لیکن جب معاہدہ کو قلمبند کرنے چلتے ہیں، مسودہ تیار ہوتا ہے، اس پر بحث ہوتی ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ دونوں فریق اپنے معہود ذہنی کے مطابق سمجھوتے کو الگ الگ معنی پہنا رہے تھے۔ پھر سے بحث شروع ہو جاتی ہے اور ایک ایک لفظ پر ہوتی ہے۔ تب کہیں ایک دوسرے کا مفہوم اور مقصود واضح ہوتا ہے اور اتفاق اور اتحاد کی راہ نکلتی ہے۔ مضمرات کے متعلق ایک دوسرے کے تصورات کے درمیان بڑی دوری تھی۔

مینجمنٹ اور انتظام کا یہ اہم اصول ہے کہ پالیسی اور احکام بالکل واضح ہوں۔ ان میں ابہام رہتا ہے تو نیچے پہنچتے پہنچتے معنی کچھ کا کچھ ہو جاتے ہیں اور احکام کی تعمیل اور پالیسی کا نفاذ کرنے والے اپنے اپنے ڈھنگ سے اپنی اپنی فہم کے مطابق ان پر عمل اور ان کو نافذ کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا ذہن مرتب اور عادتیں اور افعال سلجھے ہوئے سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں ناپ تول کر صراحت اور قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں۔ اس جن ہو

ان ہی کا طوطی بولتا ہے اور اس دنیا میں ان ہی کے حسنِ تدبیر کا سکہ چلتا ہے۔ ان ہی کی بات مانی جاتی ہے اور کامیابی ان ہی کی قدم چومتی ہے۔ ذہن کی صفائی سے بات میں وضاحت آتی ہے اور بات کی وضاحت سے ذہن صاف ہوتا ہے۔ بات کہیے تو کھری کہیے، کھری کھری کہیے، خدا لگتی کہیے، دل میں اُترتی کہیے، ذہن میں پیوست ہوتی کہیے۔ وہ بات بھی کوئی بات ہوئی جو جناب شیخ کے نقشِ قدم کی طرح یوں بھی ہے اور یوں بھی۔ اس بات سے سننے والے کو نہ روشنی ملیگی، نہ آگاہی، نہ ہدایت۔ ملے گا تو اُلجھن ملے گی اور ابہام اور شش و پنج ملیں گے۔ بات پوری کہیے۔ وہ کیا بات ہوئی جو روشنی کے بجائے تاریکی لائے، اور فیصلہ کے بجائے تردد کا پرچم بلند کرے، جو معہودِ ذہنی کے سیاق و سباق سے ٹوٹ کر زبان پر آئی ہو۔ یاد رکھیے کہ انسان جس طرح خود اپنے تحت الشعور کو نہیں سمجھ پاتا اسی طرح دوسرے اس کے معہودِ ذہنی کو نہیں سمجھ سکتے۔ لہٰذا آپ نہ خود کو آزمائش اور تذبذب میں ڈالیے نہ دوسروں کو۔ آپ اگر کچھ کہہ رہے ہیں تو بات کو پوری تفصیل (دنیا اسے غیر ضروری تفصیل کہے گی، کہنے دیجیے) کے ساتھ دہرائیے، تاکہ سننے والے کو کسی قسم کا شبہ نہ باقی رہے۔ اور وہ پہلو جو اس بات کے حوارین میں ہیں اور تلازمے اور حاشیہ نشین متعلقات بھی روشن ہو جائیں تاکہ بات آئینہ کی طرح واقعہ اور ہدایت رائقہ کی پوری عکاسی کر سکے۔ سننے والے کو بھی چاہیے کہ بات کو اچھی طرح سے ناپ تول کر دیکھ لے اور ضروری متعلقات اور تاریک گوشوں کو سوالات کر کے روشنی میں لے آئے۔ اس طریقہ یا عمل کو ہم نے گردھری ڈھنگ کا نام دیا ہے۔ وجہ تسمیہ پھر کبھی بتائیں گے۔

سعدیؒ نے کہا تھا کہ دو باتیں خلافِ عقل ہیں، یعنی بولنے کے وقت دم سادھ لینا کُھلی بھی ہو سکتا ہے اور جُزائی بھی۔ جو لوگ پوری بات نہیں کہتے، وہ بھی عقل کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اور فتنہ و فساد کے لئے نئی راہیں کھولتے ہیں۔ شعرائے کرام کو یہاں چھوٹ دینی پڑیگی۔ شاعر کے معہودِ ذہنی کی تلاش میں قارئین اور ناقدین کے قافلے مسافتوں پر مسافتیں طے کئے چلے جاتے ہیں اور اسرار ہیں کہ فاش ہونے میں نہیں آتے۔ گتھیاں ہیں کہ سلجھنے کا نام نہیں لیتیں اور اشارہ، کنایہ، تشبیہ، استعارہ، شاعر کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ صراحت سے اُسے گریز ہے۔ اس کی تخلیقی فضا دلنواز ابہام سے تشکیل پاتی ہے۔ دھیمی دھیمی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی سے اس کے شبستان میں روشنی ہوتی ہے جس کا سحر دیکھی ہوئی اور معروف اور معمولی چیزوں اور مناظر کو دلکشی میں نہلا دیتا ہے۔ ایسے طلسم خانہ میں خورشید بے ننگ و عار کا گزر کہاں۔ وہ اگر در آیا تو جمال چور دروازہ سے نکل گیا۔ طلسم ٹوٹ گیا۔ سورج صراحت کا پرچم لیکر آتا ہے۔ چاند لطیف اشاروں اور ابہام احتمال، قیاس اور خواب نوشیں کے سایہ میں زمین کے طواف کو نکلتا ہے۔ پھر حیرت کیوں کہ جنوں کو قمر سے منسوب کرنے لگے ہیں۔ انگریزی ملکہ لاطینی زبان میں چاند اور جنون کا

مادہ ایک ہی ہے۔ چاند کی کشش، اس کی سحر آفرینی تسلیم، لیکن دنیا کے وجود اور زندگی کی بقا کی بات جب
آئے گی، سورج کو چاند پر ترجیح دینا پڑے گی۔ وضاحت سے بات ہوگی، تو زندگی کا کاروبار ڈھنگ سے چلے
بات ڈھکے چھپے انداز سے، جھلکیوں میں لپٹی ہوئی اور دائرہ دار ہوگی، تو وحشت اور نصف جنوں کا عا
میں آئے گا۔ شاعروں کو چھوڑیئے جنھیں قارئین اور ناقدین پر لگا کر اڑاتے ہیں اور اپنے معبود ذہنی سے
معبود ذہنی کو ٹکرا کر وہ چنگاریاں پیدا کرتے ہیں جن سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔
ٹکراؤ سے ایک نیا مرکب وجود میں آتا ہے، جو شاعر کے وہم و گمان سے بھی پرے رہا ہوگا۔

عام اور سادہ رو انسانوں کی عافیت اسی میں ہے کہ پیغام رسانی، ہدایت اور خطاب اور ا
جہاں تک تعلق ہے کہنے کی بات کو ادھوری اور ان کہی نہ چھوڑیں۔ عام آدمی خیریت اسی میں دیکھتا ہے کہ
کی روشنی میں اپنا کام کرے، اور دن چھپے گھر آجائے۔ رات کو باہر رہنے میں زر اور وقت کے ساتھ عز
شہرت کا زیاں (اور بڑے شہروں خصوصاً ترقی یافتہ ممالک کے بڑے شہروں میں) اور جان کا خطرہ بھی
روزمرہ کی زندگی میں آپ کا ساتھ نہ تحت الشعور دے گا نہ معبود ذہنی ساتھ دیں گے تو صرف عقل کی رو
صاف صاف کہے ہوئے دو بول۔

# ... جا بجا سے

- ادبار ہمیشہ قحط الرجال اپنے ساتھ لاتا ہے؛ اور فی زمانہ بالائی سطح پر ہندوستانی مسلمانوں میں بہت سے لوگوں کو، بعنوانِ نمائندگی، وہ مناصب مل گئے ہیں جن کے وہ کسی صورت اہل نہیں تھے۔

- یہ بدنصیب ملّت کافر گری کے شغل سے کب باز آئے گی۔ اسلاف اور اخلاف میں جو فرق ہے اس کی طرف دھیان دیجیے؛ وہ کافروں کو مسلمان بناتے تھے یہ مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے انہوں نے اسلام کے میدان کو وسیع کیا، یہ اس کے دائرے کو تنگ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان حضرات سے جو کفر کی تبلیغ بنا نکھ جھپائے کرتے رہتے ہیں کوئی پوچھے کہ انھیں داورِ محشر نے یہ پروانہ کب اور کیوں عطا کر دیا کہ لوگوں کے اعمال اور ان کی نیتوں کا محاسبہ کرنے بیٹھ جائیں اور اچھے بھلے انسانوں میں کیڑے ڈالنے لگیں۔

- انسان اکثر اپنی برائیاں دوسروں میں منعکس دیکھتا ہے۔ غلطیاں کس شخص سے سرزد نہیں ہوتیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان غلطیوں کی نوعیت کیا ہے؟ کیا ان سے طبیعت کے شر، طینت کی کجی اور باطن کی خباثت کا پتا چلتا ہے، یا یہ غلطیاں ایسی ہیں جو ایک شریف النفس انسان سے سرزد ہو سکتی ہیں۔

- ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ شخص جو اپنے ظواہر کو دین کی وضع سے آراستہ کر کے نکلا ہے کہیں وہ سب کچھ اپنے خبثِ نفس، اپنی سیہ کاری، اپنی دراز دستی کو چھپانے کے لیے تو نہیں کر رہا ہے۔ ظن و تخمین کی راہ میں ہمیں انسانیت، شرافت اور بھلمنساہٹ کو اونچا مقام دینا ہوگا کہ دین کی روح یہی ہے۔ دنیا کی فلاح بھی اسی میں ہے۔

- عمل کو ہم عقیدہ اور عبادت سے جدا کر دیں گے، تو عقیدہ اور عبادت کھوکھلے ہو جائیں گے۔ خالق بندوں کے گناہوں، ان کی خطاؤں سے چشم پوشی کرتا ہے؛ اس کے بندے خطاؤں اور گناہوں کو بے نقاب کرنے میں لگے رہتے ہیں، غافل اس سے کہ وہ خود نہ بیگناہ ہیں نہ بے خطا۔

- ملّی اداروں کی سربراہی کے لیے ہمیں اپنے معیار اور زاویۂ نگاہ پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ عام کردار اور اکتسابات اور افتادِ طبع کے متعلق اطمینان حاصل کر لینا کافی ہے۔ شجرہ کھنگالنا اور ماضی بعید کو کریدنا اور گڑے مُردے اکھاڑنا، قسائیوں، گورکنوں اور کیڑوں مکوڑوں کا کام ہے۔

- ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان امور میں مداہنت ناروا ہے جہاں غیرتِ ملّی پر آنچ آتی ہو۔ انہیں چھوڑ کر،

ہر چھوٹی چھوٹی بات پر سخت گیری کرنا تنگ نظری اور بے بصری کی دلیل ہے۔ تعصب کی روایتی شخصیت بھی کوئی دلپذیر نہ تھی، چہ جائیکہ ان افراد کی شخصیت جو اپنے داغوں کو بھول کر دوسروں کی قبا کے دھبوں کی نمائش شارع عام پر کرتے رہتے ہیں۔

• اس ادارے کی میراث سرسید کی میراث ہے اور سرسید کی میراث عقل و تدبیر کی میراث ہے، جذبات اور جوش کی میراث نہیں۔ اگر ہم ذرا بھی بہک گئے تو سرسید کے مسلک سے دور ہو جائیں گے۔ ہمیں اپنے ادارے کو دنیا بھر میں ممتاز بنانے کے لیے ایسی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے جن سے کہ یونیورسٹی پر آنچ آئے اور مادر درسگاہ کی بے حرمتی ہو۔

• ہندستان میں مسلمانوں کی حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔ اگر پندرہ سال میں ہم نہ سنبھلے تو بقا کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ہم کو خوش خرامی سے ہٹ کر سخت محنت کرنی چاہیے کیوں کہ آج کا دور سخت مقابلے کا دور ہے۔ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ہم کو دوسروں کے مقابلے میں آگے بڑھنا ہے تاکہ ہندستان جیسے ترقی پذیر ملک میں مسلمانوں کا بھی کچھ حصہ ہو۔

سید حامد

# قطعِ حیات

"جب میں ۷۴ سال کی ہو جاؤں گی" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں نرگس دلال نے ان خاندانوں کی ایک دکھتی رگ کو چھیڑا ہے جن میں کوئی ضعیف رشتہ دار پلنگ سے لگ گیا ہو، جس میں اپنی دیکھ بھال کرنے کی سکت باقی نہ رہی ہو۔ وہ لکھتی ہیں کہ ایسی صورتِ حالات میں کتنی اذیت پہنچتی ہے اور کتنا صرفہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئیسلر، جس نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا تھا (جس کا نام EXIT ہے اور جس میں زندگی کو بغیر تکلیف ختم کرنے کے طریقوں کی کھوج کی گئی ہے) نے خود اپنی زندگی کو ختم کیا تھا کہ وہ دنیا سے وقار کے ساتھ اٹھے۔

اس مضمون میں یہ رُخ اختیار کیا گیا ہے کہ تکلیف سے نجات پانے یا دلانے کے لئے مارنا جائز ہے۔ میری نگاہ میں دونوں ناجائز ہیں۔ ایک خودکشی ہے۔ دوسرا قتل۔ انسان نے خود کو بنایا ہوتا، تو اسے حق تھا کہ خود کو ختم بھی کر دے۔ وہ اپنی زندگی کا حامل اور نگہبان ہے، اس کا مالک نہیں ہے۔ کیتھولک مذہب نے اس قسم کی موت کی مذمت کی ہے۔

"پوپ پیاس دوازدہم نے اپنے ۲۴ نومبر ۱۹۵۷ء کے بیان میں سنگین بیماریوں کے علاج کے لئے معمولی اور غیر معمولی ذرائع کے درمیان امتیاز کیا ہے۔ غیر معمولی ذرائع سے مراد ہیں وہ دوائیں اور علاج جن سے فائدہ کی کچھ زیادہ امید نہ ہو سکتی ہو اور جن پر بہت صرفہ آتا ہو۔ اور جن کے استعمال میں شدید درد اور ناآسانی اور بے چینی پیدا ہوتی ہو۔ انھوں نے کہا ہے کہ (علاج کا) فرض صرف اوّل الذکر صورت میں عاید ہوتا ہے۔

۱۹۸۰ء کے ایک اعلان میں "ویٹیکن"[۱] نے مرگِ ترحم کو ناجائز اور غیر اخلاقی ٹھہرایا ہے۔ اس بار "معمولی اور غیر معمولی" ذرائع کے بجائے "مناسب اور غیر مناسب ذرائع" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ذرائع کے متعلق صحیح جائزہ لگانے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ مجوزہ علاج اور اس کی پیچیدگی اور خطرہ کی شدت اور اس پر صرفہ اور اس طریقۂ علاج کو اختیار کرنے کے امکان پر غور کیا جائے۔ ایسا کرتے وقت مریض کی حالت اور اس کی جسمانی اور اخلاقی صلاحیتوں کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔" ویٹیکن نے آگے چل کر کہا ہے:

"سنگین بیماریوں میں مبتلا لوگ جب موت کی مانگ کرتے ہیں تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ زندگی کو ختم کرنے کے لئے

---

۱- VATICAN پاپائے روم کا صدر مقام یا پایۂ تخت۔

التجا کر رہے ہیں۔ در حقیقت اکثر و بیشتر، وہ مدد اور محبت کے لیے دکھ بھری فریاد کر رہے ہوتے ہیں۔ بیمار آدمی دوا کے علاوہ جس چیز کا بھوکا ہوتا ہے وہ محبت ہے، وہ انسیت اور گرمجوشی جو مریض کے اقربا، والدین، اولاد، ڈاکٹر اور نرسوں کے دل و دماغ افعال و اقوال سے پھوٹتی ہے اور مریض کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔"

کلیسا نے اوائل ایام سے ہی بے یار و مددگار بوڑھوں اور مرتے ہوئے انسانوں کی دیکھ بھال اور غمگساری کو اپنا خوشگوار فریضہ سمجھا ہے۔ کلیسا کے بہت سے عالمی اجتماعات ایسے لوگوں کی خدمت کے لیے وقف ہیں۔ مثلاً: مدر ٹریزا کے ادارے، مبلغین خیر (MISSIONARIES OF CHARITY) "غریبوں کی بہنیں" LITTLE SISTERS OF THE POOR) "مسافروں اور رفیقوں کی پناہ گاہیں" HOSPICE (یہ نام بچوں کے گھر کی یاد دلاتا ہے جس کا ذکر ایک شمارہ میں آچکا ہے)، جہاں بوڑھوں لاعلاج اور ان لوگوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے، جو مرض الموت میں مبتلا ہیں۔ یہ تحریک اب عالمگیر ہو چکی ہے۔ بمبئی میں کینسر کا ایک سرجن، احباب اور اہل خیر کی مدد سے جلد ہی ان بیماریوں کے لیے اسی طرح کا ٹھکانہ بنانے جا رہا ہے۔ جن کی طرف موت منہ کھولے ہوئے بڑھ رہی ہے۔

کلیسا نے اپنا موقف بالکل واضح کر دیا ہے "ایسی صورت میں جبکہ علاج کے باوجود موت قطعی نظر آ رہی ہو، تو اس بات کی اجازت ہے کہ علاج کے ایسے طریقوں کو بند کر دیا جائے جن کا حاصل صرف یہ ہو گا کہ زندگی ایک پُر خطر اور غیر معتبر طول کی سمت میں گھسٹتی رہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ عام طبی امداد سے ایسے مریض کو بہر حال محروم نہ کیا جائے۔ اس صورت میں معالج کے ضمیر پر کوئی بار نہیں پڑے گا۔"

۲۶ جون کے ٹائمز آف انڈیا میگزین سیکشن میں فادر جو اے مینیزیس (Fr. JOE A MENEZES) کے تبصرہ سے اتنا طویل اقتباس اس لیے کیا گیا ہے کہ "تہذیب الاخلاق" کے قارئین کو جدید دنیا کے اس مسئلہ سے روشناس کرایا جائے، جو بڑھتی ہوئی عمروں اور گھٹتی ہوئی وفاداریوں کا شاخسانہ ہے۔

ہمارے معاشرہ میں رواج تھا (کسی حد تک اب بھی ہے) کہ لوگ سلامتی ایمان کے اور چلتے ہاتھ پیر اٹھنے کی دعا مانگتے تھے۔ واقعی دست نگر بن کر جینے سے موت بہتر، ہزار بار بہتر ہے۔ یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ لوگ، جو لمبی عمر کی دعا دیتے ہیں، وہ دعا دیتے ہیں کہ بد دعا۔ وہ ادھوری دعا ضرور دیتے ہیں۔ ان کو اس میں مذکورہ بالا ٹکڑا جوڑنا پڑے گا۔ ایمان کا توازن اس قدر نازک، اور اس پر گرفت اس قدر پُر خطر ہے کہ انسان کسی عمر بھٹک سکتا ہے، بھٹک سکتا ہے۔ بے داغ پارسائی اور سر افراز ایمان داری کا غرور آنکھ جھپکتے ٹوٹ جاتا ہے اور تندرستی کے قلعہ کو بھی منہدم ہوتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے بوڑھوں، محتاجوں اور جان لیوا بیماریوں میں پھنسے ہوئے انسانوں کے لئے اتنا کچھ کیا ہے، مسلمانوں نے اس طرف توجہ کیوں نہیں کی؟ کیا ان میں انفرادیت اس قدر طغیانی پر ہے کہ وہ کسی اجتماعی کام کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ وہ دین جو دنیا کے لئے رحمت بن کر آیا تھا اور جس کا سارا ڈھانچہ اجتماعی ہے، اس نے اس قسم کے ادارے کیوں نہیں قائم کئے جو محتاجوں، اپاہجوں، عمر رسیدوں اور مرگ رسیدوں کی خبرگیری کرتے۔ ہم بھول رہے ہیں دنیا میں شفاخانوں کے قائم کرنے میں پہل ہم نے کی تھی اور یہ تصور بھی ہمارا لایا ہوا ہے کہ شفاخانے طبی تعلیم کا مرکز ہوتے ہیں۔ لیکن جستجو اور علم کے ساتھ رحم اور خیر کو بھی ہم نے خیر باد کہ دیا۔ عجب بات ہے کہ اہل عرب جنھیں خاندانی روابط سے گریز ہے۔ وہ عام انسان کی مصیبت کا احساس اور اس کی تلافی کے لئے کوشش ہماری نسبت کہیں زیادہ کرتے ہیں۔ انھوں نے وابستگی، ذمہ داری (وہ بھی ایک حد تک) اور محبت کو خاندان کی اس سکڑی ہوئی شکل تک محدود کر دیا ہے جسے گھر کہتے ہیں۔ ہم نے خاندان کے تصور کو یک گونہ وسیع رکھا پر لیکن ہم خاندان سے آگے نہیں بڑھے اور تصور ان کو اس بڑے خاندان کی طرف لے گیا جس سے انسانیت مراد ہے۔

اس طویل تمہید کے بعد ہم نفس مضمون کی طرف آتے ہیں۔ مغرب نے محتاجوں، بیماروں، لاوارثوں اور مرگ رسیدوں کے مسئلہ کو کچھ تو اس لئے زیادہ محسوس کیا کہ وہاں بعض شدائد اور بے اعتنائیوں کے باوجود بنی نوع انسان کا تصور ہمارے مقابلہ میں زیادہ واضح اور زیادہ زندہ تصور ہے۔ ہمارے یہاں وہ خاندان کے تصور کے نیچے دب گیا ہے، کچھ اس بنا پر کہ عام خوش حالی کے زیر اثر وہاں محتاجی، اپاہجی، کنگالی، اور لاوارثی کی مثالیں کثیر نہیں۔ وہ لوگ ان کے عادی نہیں ہیں۔ لہٰذا جب یہ مثالیں سامنے آتی ہیں تو ان کو ہم سے زیادہ گراں گزرتی ہیں اور امداد کے لئے اکساتی ہیں؛ کچھ اس لئے بھی کہ مشرق میں خاندانی رشتوں کا احترام اور خاندان والوں کے لئے ذمہ داری کا احساس ہنوز باقی ہے۔ جب کہ مغرب میں یہ معدوم ہو چکا، نہ سہی، پتلا ہے۔ وہاں آخری ایام گذرنے، دور نرسنگ ہوم میں گزارنے کی مثالیں وافر ہیں اور یہاں شاذ۔ لیکن اگر رنگ زمانہ یہی رہا اور مغربی اثرات کا نفوذ اور مشرق میں ان کی تقلید کا یہی حال رہا تو ایسی مثالیں یہاں بھی عام ہو جائیں گی۔ وہاں ہر شخص باوجود شاہ خرچی کے زندگی کے آخری ایام کے لئے کچھ نہ کچھ پس انداز ضرور کر لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ بڑھاپے میں سوائے زر کے اور کوئی ساتھ نہ دے گا۔ اس لئے وہاں لوگ سڑکوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان نہیں دیتے۔ حکومت کی فلاحی اسکیمیں بھی آڑے وقت میں دستگیری کرتی ہیں۔ لیکن اس طرح کسمپرسی اور لاوارثی اور کوڑے کے ڈھیر پر ڈال دیئے جانے کے احساس میں کوئی خاص کمی نہیں ہوتی۔ محبت کی پیاس اور توجہ کی بھوک سسکیاں لیتی رہتی ہے اور جانکنی کے کرب کو یہ احساس اور شدید کر دیتا ہے۔

لیکن سوسائٹی کے رنگ اور روایات کے اختلافات کے باوصف انسانی مسائل عالمگیر ہیں۔ دور اور کثرت اور زاویہ کے فرق سے ان کی ہمہ گیری کا متاثر نہیں ہوتی۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ جن مریضوں کو شفا کی کوئی امید نہیں رہی، جن کے آخری لمحات شدید درد اور تکلیف میں گزر رہے ہیں، جو حرکت نہیں کر سکتے اور چھوٹی سی چھوٹی بات کے لئے دوسروں کے دست نگر ہیں۔ جن کی تکلیف نہ اپنوں سے دیکھی جاتی ہے نہ بیگانوں سے، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور جدید طب کی مجموعی طاقتیں ان کی عمر اور تکلیف کو طول دینے پر صرف نہ کی جائیں؟۔ ذرا اور آگے بڑھیے، کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ "ترحمانہ اختتام زندگی ان کو بے بسی اور بے کسی اور تنہائی کے جگر دوز احساس اور درد کی شدت سے نجات دلادے۔ کلیسا نے اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن ایک عنوان سے ترحمانہ قطعِ حیات کی ایک منفی شکل کو جائز قرار دیا ہے۔ یعنی مرض الموت کے لئے عام طبی امداد کا سلسلہ جاری رکھو۔ لیکن جدید طب کے ان ذرائع کو صرف نہ کرو جو بے بسی، بےچارگی اور اذیت کے ایام کو طول دیتے ہیں۔

لیکن زندگی اور موت کی کشمکش کے ضمن میں معمولی اور غیر معمولی یا مناسب اور غیر مناسب ذرائع علاج کی بات ہمارے حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ نہ انسانی حمیت اس بات کو گوارا کرے گی کہ مرنے کا تخمینہ لگایا جائے اور اسے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے، اور دوسرے میں افاقہ کی امید کو۔ اگر کلیسا نے یہاں مرنے کا ذکر نہ کیا ہوتا تو اچھا تھا کہ کلیسا کی زبان سے مادی وسائل کا تذکرہ، وہ بھی ایک اخلاقی مسئلہ میں، کچھ نامناسب اور بے محل سا لگتا ہے۔ علاج کی پیچیدگی یا سادگی بھی اگر معرض بحث میں نہ آتی تو کوئی سہو نہ ہوتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب انسان میں کچھ نہ رہا ہو۔ نہ ہوش نہ حواس، نہ نقل و حرکت کی طاقت، نہ جینے کا ولولہ، نہ زندگی کا احساس، نہ بچانے کی طاقت۔ اور جب وہ سوچ نہ سکتا ہو، نہ ارادہ کرسکتا ہو، نہ فیصلہ کرسکتا ہو، تو اسے طب کی مجموعی طاقتوں کے ذریعہ اس انداز سے کچھ دن اور اس طرح زندہ رکھنا کہ سانس کی آمد و شد ہی زندگی کی پہچان رہ جائے اس کے ساتھ ناانصافی کرنا ہوگا۔ ایک ایسے جسد کو جو روح کے خواص سے تقریباً محروم ہوگیا ہو، مصنوعی طور پر زندہ رکھنے کی کوشش کرنا آئین قدرت کی خلاف ورزی ہے اور نعوذ باللہ خالق کی شان میں گستاخی اور اس کے حضور ایک چیلنج ہے کہ "تو کہتا ہے کہ زندگی اور موت تیرے اختیار میں ہے، دیکھ کہ ہم کس طرح زندگی کو طول دیتے ہیں"۔ لیکن یہ چیلنج کتنا کھوکھلا ہے۔ یہ بات جب ہی واضح ہو جاتی ہے جب اس انسان کی حیثیت کذائی کو دیکھا جائے جس کی بیچارگی کی فضیحت کی جارہی ہے اور جس کے درد کو طوالت میں ڈالا جارہا ہے۔ ایسا انسان زندہ اس لئے نہیں رہا کہ اب اس میں سانس اور خون کی گردش کے علاوہ کچھ باقی نہ رہا۔ وہ مردہ سے اس لئے بدتر ہے کہ

ں سکون سے محروم ہے جو موت لے کر آتی ہے۔ اسے حیات صادق نہ کہو، یہ مرگ کاذب ہے کہ موت ہونے کے
ود زندگی کا اعلان کر رہی ہے۔

یہاں اکابر و مشاہیر کی موت کا وہ عبرتناک پہلو سامنے آتا ہے کہ مر چکے ہیں۔ زندگی کا نام و نشان باقی نہ
یک نعش ہے کہ کوچہ بازار میں کھینچی جا رہی ہے، ایک تماشا بن گئی ہے۔ لوگ آخری دیدار کے لئے آ رہے ہیں۔ ہزاروں
لاریں لگی ہوئی ہیں، آخری رسوم انجام دینے میں جتنی تاخیر ہو سکتی ہے، کی جا رہی ہے، تاکہ دنیا مرنے والے کی بے بسی کا
دیکھے۔ روح کبھی کی نکل چکی۔ خاک کے ڈھیر میں کیا رکھا ہے جسے اس طرح رسوا کرتے ہو۔ کیا صرف اس لئے کہ جو تاثر مرنے والے
یت کا تھا، زائل ہو جائے اور ایک پھولی ہوئی نعش ایک ورم کیے ہوئے بے جان اور بے نور چہرے کی یاد ساری
ش یادوں کو مٹا دے۔ خیر تمہاری مرضی۔ یہ آخری "تاوان" ہے جو شہرت پانے والے کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ تاوان
ل کرنے والوں کو کیا خبر کہ وہ اس جگہ جا رہا ہے، جہاں یہ شہرت اور سر بازار یہ رسوائی ہرگز کام نہ آئے گی۔ جہاں
اصلاح کا دروازہ بند ہو چکا ہو، وہاں شہرت اور نام نہاد عزت کو بار کہاں۔

قلم بہکنے کا عادی ہو گیا ہے۔ موقلم نے دو تصویریں آپ کے سامنے کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ ایک تو ایسے مریض کی
زندہ رکھنا زندگی کی تضحیک ہے، لیکن اسے ایسی حالت میں رکھنے کے جتن کیے جاتے ہیں۔ دوسرے ایک مردہ کی جسکی
کو مرجع خلائق بنایا جا رہا ہے اور کوچہ و بازار اور شہر و دیار میں کھینچا جا رہا ہے۔ دونوں حرکتیں ناروا اور مذموم
دونوں حرکتیں مضحکہ خیز اور معیوب ہیں۔ قدرت کا مذاق اڑاؤ گے تو منہ کی کھاؤ گے۔ دونوں تصویروں کی
ہیت ظاہر ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ دیرینہ عادت ہے کہ مذہب کے نام پر جان دینے کے لئے تیار رہیں گے، لیکن
سب کچھ۔ اس کے برعکس جو مذہب نے بتایا ہے اخوت اور مساوات کے چرچے زبانوں پر ہیں لیکن اپنے بھائیوں کے
جال جاہ کو جتا کون ہے، مساوات کون برتتا ہے؟ دراصل جتنا فاصلہ خوشحال اور غریب مسلمانوں میں ہے
وسرے فرقوں میں نظر نہیں آتا۔ شراب کی ممانعت ہے لیکن نہ معلوم کتنے مسلمان ہیں جو شراب کو شیر مادر کی
پیتے ہیں۔ جسد خاکی کو اسلام کوئی اہمیت نہیں دیتا کہ اس کا کاروبار صرف روح سے ہے۔ لیکن ہم نہ صرف
ہیں بلکہ لاشے کے لئے پختہ قبریں بنواتے ہیں، جو مذہباً سخت ناروا ہے۔ چاہے پکی قبریں بنواؤ، چاہے مرنے والے کی
یں تاخیر کر کے کوچہ و بازار میں رسوا کرو۔ چاہے مرنے والے کو جبکہ ہوش و حواس، عقل و شعور، حوصلہ اور ولولہ،
و اور حرکت ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں، مصنوعی طور پر زندہ رکھنے کی کوشش کرو۔ یہ سارے عمل

یکساں ہیں۔ المناک اور عبرتناک اور حسرتناک ہیں۔ آخر اوّل الذکر کیا بات کلیسا کا فیصلہ صحیح ہے۔ مگر وہ
سے اس فیصلہ پر پہنچا۔ وسائل کی بات ایک غیر روحانی اور سراسر انسانی امر ہے۔ اسے معرض بحث میں لانا
کے ضعف کی دلیل ہے۔ دراصل کلیسا کے اس "فتویٰ" کی تعبیر و تفسیر ورثا اور تیماردار اپنے شعور، ذوق اور
کے مطابق کریں گے اور یہیں خطرے کی گھنٹی بجتی ہے۔ بعض ورثا اطباء کو اپنے مفاد کے مطابق سبق پڑھائیں گے۔
کی پیچیدگی اور غیر معمولی اور غیر مناسب وسائل علاج میں پڑنا ہی نہ چاہیئے کہ یہ ایک پُرخطر وادی ہے۔ ہماری
ناقص میں سوال صرف یہ ہونا چاہیئے کہ آیا علاج سے مریض کے ہوش و حواس اور شعور بحال اور بیدار ہو سکیں
خواہ تھوڑی سی مدت کے لئے سہی۔ اگر اس کا امکان ہے کہ ہو سکیں گے، تو علاج خواہ اس پر کتنا ہی صرف کیا
روا اور برحق۔ اور اگر امکان نہیں ہے، تو علاج درد افزا اور طوالت خیز علاج ناروا اور باطل۔ اسے علاج کہ
کہئے، کہ اس کا مقصود شفا ہے ہی نہیں۔ بلکہ جدید طبی سائنس کی دسترس کی نمائش اور نئی دواؤں کی بیرحم
ہے۔ بہرحال یہ تو ایک عام بلکہ عامی آدمی کی رائے ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر مفتیان شرع متین اس مسئلہ کی طرف

# شئے لطیف

بچپن میں سُنا تھا" فلاں صاحب میں شئے لطیف کی کمی ہے۔" ذہن میں یہ تاثر تھا کہ یہ جملہ
ایسے شخص کے لیے کہا جاتا ہے، جس میں بھونڈا پن پایا جائے۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ 'شئے لطیف' سے
نہ فکر کی لطافت مراد ہے، نہ اطوار کی نفاست۔ شئے لطیف دراصل تناسب کے احساس کا دوسرا نام ہے۔
کوئی بات کہاں کہنی چاہیے، کس طور پر کہنی چاہیے' اس کا صحیح فیصلہ انسان 'شئے لطیف' کی رہنمائی کے بغیر
نہیں کر سکتا۔

آپ کی نظر سے ایسے لوگ گزرے ہوں گے جنھیں اپنی قسمت سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ وہ سدا
سچی اور کھری بات کہتے ہیں، پھر بھی کوئی ان کی بات نہیں سنتا۔ لوگ اُلٹے ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ جہاں
انھوں نے یہ بات شروع کی لوگوں نے تیوری چڑھائی کہ دیکھیے اب کیا آتا ہے۔ بجائے اُن کی سچائی کی تعریف
و پذیرائی کرنے کے، لوگ ان کی باتوں سے مکدر ہونے لگتے ہیں اور بعض تو دشمنی پر اُتر آتے ہیں۔ یہ بے محل
بولنے والے یہ سمجھتے بھی نہیں کہ بات موقع دیکھ کر کرنی چاہیے۔ بے موقع بات جراحت کا سامان بہم پہنچاتی ہے
استہزا کا۔ جو لوگ سچ بات کہہ کر، بغیر ارادہ اصلاح کے، دوسروں کا دل دُکھاتے ہیں، وہ سچائی کو بدنام کرتے
ہیں اور بہتوں کو سچائی سے بدگمان کر دیتے ہیں۔ بات شروع کرتے وقت یہ تو سوچ ہی لینا چاہیے کہ اس بات
کا اثر کیا ہوگا۔ اگر بات کا اثر بُرا ہونے کا ڈر ہے تو بات کی ہی کیوں جائے۔ کیا صرف اس وجہ سے
کہ وہ زبان پر آگئی ہے، یا اس بنا پر کہ حقیقت بے نقاب ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ کسی شخص نے کوئی
غلط قدم اٹھایا اور آپ نے اسے برملا بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا تو کیا نتیجہ ہوگا۔ وہ ضد پکڑ جائیگا اور اپنے
دل میں آپ کے لیے کدورت یا عداوت کو جگہ دیدے گا۔ آپ چلے تھے اصلاح کرنے، اس کے بجائے
اپنے مخاطب کو اس کی غلطی کو اس کی غلطی میں راسخ کر دیا اور اسے اپنا دشمن بھی بنا لیا۔

آپ کسی سے ملنے گئے۔ اس کے اختیار میں ہے کہ آپ کا کام بن جائے۔ لیکن آپ سوال
کے بجائے چھوٹتے ہی مطالبہ کرنے لگے، حکم دینے لگے، جھگڑنے لگے تو اس کا اختیار تمیزی جو آپ کے

مسئلے کو حل کرنے میں صرف ہوتا، اسے اُلجھانے میں لگا دیا جائے گا۔ بات کرنے کا ڈھنگ زندگی
اہم ترین چیزوں اور کامیابی کے اہم ترین وسائل میں سے ہے۔ اگر ڈھنگ مناسب ہے تو بات
بن جائے گی، نامناسب ہے تو بات بگڑ کر رہے گی۔

کس وقت بات کرنی چاہیئے اور کس وقت دم سادھ لینا چاہیئے، اس کا فیصلہ ہمیں روز کرنا
پڑتا ہے۔ صحیح فیصلہ احساسِ تناسب کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ کو اپنے افسر سے شکایت ہے، آپ اس کا
جا بجا کرتے پھرتے ہیں، گویا شکایات کے دو چند ہو جانے کا بنفسِ نفیس انتظام کر رہے ہیں۔ یاد رکھئے
کہ کلمات موصوف تک پہنچ جائیں گے، "مناسب" یعنی نامناسب اضافوں کے ساتھ۔
بہتر ہوتا کہ آپ موصوف سے خود بات کر لیتے اور بات کرتے ہوئے اس احساس کا اظہار کر دیتے کہ
آپ کی خوشحالی اور آپ کے مستقبل میں دلچسپی ہے اور اس امید کو زبان دیتے کہ آپ کو ان کی ہمدردی
پر اعتماد ہے۔ یاد رکھئے کہ ہر انسان ان توقعات کو جو دوسروں کو اس کے متعلق ہیں، پورا کرنے کی
کچھ نہ کچھ کوشش ضرور کرتا ہے۔ جس مسئلے میں آپ نے کسی دوسرے کو ابتدا ہی سے شریک کر لیا وہ مسئلہ
اس کا خود اس کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ بات یہاں بھی نہیں رکتی۔ ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ ہر فرد ان توقعات
کو بھی جو خود اسے اپنی ذات سے ہیں، پورا کرتا ہے؛ یا اس سمت میں آگے بڑھتا ہے۔ جبھی تو کہتے ہیں
اپنے پیشے کو شکستوں کی یاد یا ہار کے تصور سے گرد آلود نہ کرو۔ ناکامیوں اور ناکامیوں کو بھول جاؤ اور
کامیابیوں اور کارگزاریوں کو یاد رکھو۔ اس طرح تم اپنے پیشے میں آب و رنگ بھر دو گے، جو تمہارے
اندر اعتماد اور افتخار پیدا کر کے تم سے بڑے بڑے کام کرائے گی۔ جیسے جیسے نئی کامیابیاں تمہیں حاصل
ہوں گی، پرانی ناکامیوں کی یاد خزاں کے پتوں کی طرح جھڑتی چلی جائے گی اور نئی کامیابیاں بہار
کی کونپلوں کی طرح حافظے میں پھوٹ کر نکلیں گی۔ تمہارا تصور، تمہارے متعلق جو پیکر بنائے گا، اس میں
اعتماد، قوتِ تسخیر جلوہ گر ہوگی۔ ناکامیوں اور شکستوں کے اسباب کا جلد ہی تجزیہ کر کے ان کی
حوصلہ شکن یاد کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دو۔

جو لوگ شیخی کے عادی ہیں یا خود ستائی سے باز نہیں آتے وہ بھی انھیں محرومیوں میں سے ہیں
شئے لطیف، جس سے کترا کر نکل گئی۔ مان لیجیے کہ آپ افلاطون ہیں مگر اس شخص کو جس سے آپ بات کر رہے
ہیں، آپ کے افلاطون ہونے سے کیا سروکار۔ اس کے پاس اس یاوہ گوئی کو سننے کے لیے وقت کہاں

آپ ڈینگ لیں گے، تو شروع میں وہ آپ کی سادگی پر مسکرائے گا، لیکن جلد ہی اکتا جائیگا اور آپکی صحبت سے گریز کرنے لگے گا۔ آپ اگر واقعی افلاطون ہیں، تو آپ کو خود اس کا اعلان کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ کی دانشمندی سورج کی کرنوں کی طرح دنیا میں پھیل جائے گی۔

ایک گروہ ان اشخاص کا ہے جو اپنی تعریف تو نہیں کرتے، لیکن اپنا اور اپنے گھر والوں کا ذکر کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ یہ خیال ان کے دماغ پر اپنا سایہ نہیں ڈال پاتا کہ آپکے گھرانے کے متعلق دوسروں کو دلچسپی کیوں ہونے لگی اور ان لوگوں کی تو کسی سماج میں کمی نہیں جو آپکے پاس آکر گھنٹوں بیٹھ جائیں گے اور باتیں کیے جائیں گے۔ یا خاموش بیٹھے رہینگے۔ دونوں صورتوں میں انھوں نے آپکا وقت خراب کیا، آپ کے سکونِ خاطر کو برہم کیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنی صحبت کا شرف بخش کر وہ آپ پر احسان کر رہے ہیں؛ حالانکہ دراصل انھوں نے آپ کو عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کو انگریزی میں "بور" کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ "شئے لطیف" کا انتساب ناممکن ہے۔

اور ایسے لوگ بھی ہمیں اپنے اردگرد مل جائیں گے جو شیخی مارنے کے بجائے اس کے برعکس عمل کرتے ہیں۔ یعنی اپنی کم مائگی اور نا اہلی کا، وقت ناوقت اعلان کرتے ہیں۔ انھیں کھرچ کر دیکھیے تو پتہ چلے گا کہ اپنی ذات گرامی کے متعلق انھیں دل ہی دل میں ہزاروں خوش فہمیاں ہیں اور یہ خوش فہمیوں کی طغیانی ہے جو انکسار کا بہروپ بھر کر زبان پر آتی ہے۔ گویا اپنے افتخار ذاتی کو اس عنوان برہنہ ہونے سے بچایا جا رہا ہے۔ بعض بعض اس انکسار میں دعوتِ ستائش کو کروٹ لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ موصوف کے پاس صرف ایک صورت ستائش حاصل کرنے کی ہے، یعنی اپنے آپ کو برا بھلا کہنا، ہیچ دکھانا، ذرۂ ناچیز بتانا، مخاطب کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ موصوف جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی تردید کرے اور ان کی تعریف کے پل باندھے تاکہ محترم کی تفریط اور اس کی افراط سے ایک اوسط نکل آئے، جو حقیقت کے قریب تر ہو، یا کم از کم مخاطب پر یہ الزام نہ آئے کہ محترم اپنی جو ہجو کر رہے ہیں، وہ اس میں برابر کا شریک ہے۔ بہرحال یہ انکسار جھوٹا انکسار ہے، پُر فریب انکسار ہے اور اس کا شمار خصائلِ حمیدہ میں کرنا فریب کھانے والوں کے لئے بھی دشوار ہے۔ جھوٹے انکسار سے پُر خلوص ڈینگ بہتر ہے۔ "شئے لطیف" کا پہرہ جہاں ہٹا، اس طرح کے نفسیاتی آسیب دل و دماغ میں داخل ہو جاتے ہیں، اور زبان کے میدان میں آکر دادِ شجاعت دینے ہیں۔

یوں تو "شئے لطیف" کی کی اپنے اظہار کے لئے زبان کی محتاج بھی نہیں۔ اس کے ان گنت کرشمے بھی

کوئی کم نہیں۔ بے محل اور بے موقع کام بھی لوگ ناحق کر گزرتے ہیں۔ جو بات کسی موقع پر نہ کہنی چاہیے، جو کام کسی موقع پر نہیں کرنا چاہیے وہی کرتے ہیں اور سب کو خفت، پشیمانی اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرتے ہیں۔

زندگی کا تجربہ جتنا وسیع ہوتا ہے اور انسانوں کے باہمی تعلقات اور ان کے ردِ عمل کے تجربہ کا موقع جس قدر ملتا ہے اسی قدر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ انسان کے لئے تناسب کا احساس بیحد ضروری وصف ہے اگر یہ نہ ہوگا تو وہ ہر قدم پر ٹھوکریں کھائے گا اور زندگی کے صحرا میں بھٹکتا رہ جائے گا۔ یہ دنیا اتنی وسیع، یہ زندگی اتنی پیچیدہ، یہ تجربات اتنے گوناگوں اور حالات کی صورتیں باہم دگر اس قدر مختلف اور باہمی روابط اتنے نازک اور افراد کی انا اس قدر استیلا طلب اور مختارات اتنے وافر، راہیں اتنی کثیر اور کسی ایک لمحہ میں کچھ کہنے یا کرنے کے امکانات اس قدر متنوع ہوتے ہیں کہ تناسب کا احساس اگر رہنمائی اور یاوری نہ کرے تو فرد ٹکرا ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے بھٹکتا رہے اور جیوں جیوں آگے بڑھے منزل سے دور ہوتا چلا جائے۔ اس قدر دور کہ مرکز کی طرف واپس آنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ مرکز سے دور ہونے کا انجام کیا ہے، پارہ پارہ ہو جانا، بکھر جانا۔ یہی انجام اس شخصیت کا ہوتا ہے احساس تناسب جس کی شیرازہ بندی نہیں کرتا وہ شخصیت منقسم (SPLIT PERSONALITY) شخصیت کی صورت پر منڈلانے لگتی ہے۔

یہ احساس تناسب ہی ہے جو بات کی تہ تک پہنچاتا ہے۔ ورنہ انسان کے حواس خمسہ دماغ کی طرف ہزاروں لاکھوں تأثرات اور پیغامات بھیجتے رہتے ہیں۔ غریب دماغ ان کے ہجوم سے گھبرا جائے اور اس طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگے جیسے ڈوبتا ہوا انسان موجوں کی یورش میں دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ یہ احساس تناسب ہے جو ان ہزارہا پیغامات میں سے جو حواس دماغ کو بھیجتے ہیں چند کی طرف دھیان دیتا ہے اور باقی کو تحت الشعور کے گودام میں بھر دیتا ہے۔ اہم اور غیر اہم کا امتیاز، ضروری اور غیر ضروری کی تفریق، بلکہ نیک و بد اور حسن و قبح کی تمیز تک بھی احساس تناسب یا شئے لطیف کی قلمرو میں آجاتی ہے، اسی وصف کا تیسرا نام قوتِ انتخاب ہے۔

طالب علموں کے لئے احساس تناسب کو آزمانے اور اس پر نشان لگنے کا ایک موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ امتحان میں ایک طویل عبارت دے دی گئی اور کہا گیا کہ اس کا خلاصہ (PRECIS/SYNOPSIS) لکھو، اس کا لب لباب نکالو۔ جواب سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ امتحان دینے والے میں تناسب کا احساس کس

حذتک ہے، کس پایہ کا ہے۔

زندگی میں ہر قدم پر فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ یعنی کئی راہوں کئی مختارات میں سے ایک کو چُننا پڑتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فیصلہ کرنے کے لئے ایک ثانیہ سے زیادہ سمے نہیں ملتا۔ زندگی کے امتحان میں جو پرچہ آپ کو آئے دن بلکہ متواتر کرنا پڑتا ہے، وہ سینکڑوں کثیر المختارات (OBJECTIVE QUESTIONS OF MULTIPLE CHOICE TYPE) معروضی سوالات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر آپ کو قدرت نے "شئے لطیف" سے نوازا ہے، اگر آپکو احساس تناسب کی دولت ملی ہے تو آپ زندگی کے اس امتحان میں پورے اُتریں گے، ورنہ اس بحرِ ذخار میں بے سمت وارادہ غوطے کھاتے رہیں گے۔ 'شئے لطیف' بالکل نہ ہو تو مرض لاعلاج ہے۔ ہاں تھوڑی بہت ہو تو اس کو بڑھایا اور سنوارا جا سکتا ہے۔ جس طرح طالب علم مشق کے بعد لب لباب یا خلاصہ بہتر لکھنے لگتا ہے۔ اسی طرح انسان محنت اور ممارست کے ذریعہ اپنے احساس تناسب کی گیرائی اور گہرائی کو فروغ دے سکتا ہے۔ شئے لطیف کی کمی جہاں دوسروں کے لئے حظ کا سامان فراہم کرتی ہے وہاں محرومین کے لئے ناکامیوں کی ضمانت لے لیتی ہے۔

شئے لطیف کی کمی ہو تو انسان پر غلط بات کرنے اور صحیح بات غلط وقت پر یا غلط ڈھنگ سے کرنے اور غلط فیصلہ کرنے اور غلط قدم اٹھانے کا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

"شئے لطیف" احساس تناسب، صلاحیت انتخاب، قوتِ فیصلہ، قوتِ ممیزہ، ایک ہی وصف کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں سے ایک کو مانجھئے تو باقی سب پر جلا آتی ہے۔ ایک کو غذا دیجیے تو باقی سب کو توانائی ملتی ہے۔ ایک کی مشق کیجیے تو یہ ہم رشتہ قوتیں بھی چمک جاتی ہیں۔ "شئے لطیف" کو نازک نہ سمجھئے۔ اس میں بہت جان ہے۔ اسے چھوٹی سی نہر جانئے، یہ اسی سرچشمے سے نکلی ہے، جہاں سے بڑی بڑی ندیاں پھوٹی ہیں، جو انسان کو سیراب کرتی ہیں، اسے تناور درخت بناتی ہیں۔ اس کی شخصیت کو پروان چڑھاتی ہیں اور اکتسابات کے فروغ کے لئے امکانات کے دروازے کھول دیتی ہیں۔ باقاعدگی، ترتیب، انضباط، یہ سب اسی بنیادی وصف کی دین ہیں۔ بظاہر چھوٹی سی یہ صفت کتاب زندگی کی شیرازہ بند ہے۔ "شئے لطیف" اعتدال کے راستے پر چلاتی ہے۔ جو لوگ اعتدال سے عادتاً تجاوز کرتے ہیں، انھیں "شئے لطیف" سے کوئی سروکار نہیں۔ شئے لطیف سلیقہ کا سبق دیتی ہے، قرینہ سکھاتی ہے، سلامت روی کی چال چلواتی ہے۔ زندگی کے بحری سفر میں اس کی حیثیت "قطب نما" کی ہے۔

●●

# اخلاقی غور وخوض

دہلی یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں تھوڑی دیر وقت گزارنے کے لئے پہنچ گیا تھا۔ شیلف پر سے ایک کتاب اُٹھائی "اخلاقی غور وخوض"۔ کتاب آکسفوڈ کے کلیرنڈن پریس میں دو سال ہوئے چھپی مصنّف کا نام آر۔ ام ہیئر (R.M.HARE) ہے۔

کچھ ورق اُلٹے، جن مسائل کا ذکر تھا، ان سے ہمارا روز سامنا ہوتا ہے۔ ہر چند اس کتاب سے ہم سرسری گزرلے تاہم "تہذیب الاخلاق" کے قارئین کو اس کے بنیادی نکات سے روشناس کرانا بے محل نہ ہوگا۔ یہ کتاب گو نقطۂ آغاز ہے ان مسائل پر نئے سرے سے سلسلۂ فکر کا۔

اخلاقیات کا ذکر چھڑ جائے تو ضمیر، مذہب، سماج اور عقل چاروں اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ انسانی فطر بعض باتوں کو بُرا سمجھتا ہے اور بعض کو اچھا۔ یہ فیصلہ کرنے میں اسے عقل کی مدد درکار نہیں ہوتی۔ وہ اس فیصلہ پر بغیر غو کے پہنچتا ہے جس طرح دن کو دن کہنے سے پہلے اسے سوچنا نہیں پڑتا، نہ رات کو رات کہنے سے پہلے۔ یہ شعور اس کی رگوں میں خون کی طرح رواں دواں ہے۔ اسے فطرت، جبلّت، ضمیر اور اسی قبیل کے بہت سے نام دیئے گئے ہیں، جو ہم معنی نہیں ا کا مطلب ایک ہے۔ ان کے کہنے سے یہ مفہوم ظاہر ہو جاتا ہے کہ انسان کے پاس نیک و بد میں امتیاز کرنے کے ذرائع ا ڈھنگ، عقل، جائزہ، منطق اور تنقید کے علاوہ بھی ہیں۔ زیر نظر کتاب کا بنیادی خیال یہ ہے کہ تجزیہ کرنے والی عقل، فطری شعور، نیک و بد کی کمک کے لئے طلب کی جا سکتی ہے، خصوصاً ان مقامات پر جہاں حل مشکل اور فیصلہ دشوار نظر آتا ہو۔ جہاں انسان کو دو ایسی راہوں میں سے ایک کو چُننا پڑتا ہو جس میں سے دونوں راہیں الگ الگ اخلاقی طور پر ناگزیر نظر آتی ہوں۔ ایک راہ کو چُنا جائے تو جس راہ کو چھوڑا گیا وہ حسرت اور پشیمانی اور پچھ کی چٹکیاں دل میں لیتی رہتی ہے کہ حیف صد حیف ہم نے اپنے اخلاقی فرض سے روگردانی کی۔ اور اگر خود اس راہ کو اختی کرلیا جائے جسے چھوڑا تھا، تو دوسری راہ کو چھوڑنا خلش اور انفعال کا سبب بن جائے۔

اس حاشیہ آرائی کے بعد ہم کتاب کی طرف پھر لوٹتے ہیں۔ اس میں دو مثالیں دی گئی ہیں جن کا ذ وضاحت کے لئے ضروری ہے۔ مان لیجئے کہ آپ نے ایک عرصہ سے اپنے بچوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ فلاں اتوا

ہم سب ایک ساتھ سیر اور پکنک اور خوش وقتی کے لئے نکلیں گے۔ آپ کی بے اندازہ مصروفیت کی وجہ سے بچے کبھی چھٹیاں منا ہی نہیں پاتے۔ ایک مدت کے بعد انھیں دن بھر بے فکری کے ساتھ باہر گزارنے کا موقع مل رہا ہے۔ عین اس وقت جب ماں باپ اور بچے گھر سے نکلنے والے ہیں، ایرپورٹ سے فون آتا ہے، ایک دوست کا جو آسٹریلیا سے آیا ہے، ... سال کے بعد آپ سے ملے گا۔ ایک اتوار کا دن ہی اس کے پاس ہے۔ اس کی فرمائش ہے کہ آپ اس کو اور اس کی بیوی کو یہاں کی موزیم اور تعلیمی ادارے دکھا دیں۔ اگر آپ اپنے مدت سے بچھڑے ہوئے دوست کی بات مانتے ہیں، تو بچوں پر کیا اثر ہوگا۔ ان کے شاداب شگفتہ چہرے کمھلا جائیں گے۔ وہ منھ لٹکا کر، منھ بسور کر رہ جائیں گے۔ ان کے دل ٹوٹ جائیں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ ان کے ماں باپ کو اپنے وعدہ کا پاس نہیں۔ ان کی دلشکنی کے علاوہ جو بات آپ کو کھٹکے گی وہ یہ کہ آپ کی وعدہ خلافی ان کی تربیت پر کیا اثر انداز ہوگی۔ آپ انھیں سکھاتے رہے ہیں کہ جو شخص اپنی بات کا پاس نہیں کرتا، اپنے وعدہ کو پورا نہیں کرتا، اس کی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ نہ اس کے قول میں کوئی وزن ہوتا ہے۔ سماج میں اس کی کوئی ساکھ باقی نہیں رہتی۔ اور آپ خود وعدہ خلافی کر رہے ہیں۔ بچے آپ سے اور آپ کی دوسری نصیحتوں سے بدگمان ہو جائیں گے۔ دوسری طرف آپ اگر اپنے دوست کو نظر انداز کرتے ہیں۔ جو آپ کے بھروسے پر آپ کے شہر میں اپنی بیوی کو لے کر آیا ہے اس امید کے ساتھ کہ آپ ان کی راہ میں آنکھیں بچھائیں گے اور چند گھنٹے ہمدم دیرینہ اور اس کی شریک حیات کے ساتھ گزارنے سے آپ کو بے اندازہ خوشی ہوگی۔ آپ کس منھ سے اس سے کہیں گے عزیز دوست! آج کا دن تو ہمیں بچوں کے ساتھ گزارنا ہے۔ ان سے وعدہ ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ تمہارا ملنا ہمارے لئے ملاقات مسیحا و خضر سے کم نہیں ہوتا۔

اس طرح کے چھوٹے موٹے مراحل ہمیں اکثر در پیش ہوتے ہیں۔ دو اخلاقی فریضوں میں سے ایک کو چننا پڑتا ہے۔ بسا اوقات متبادل فیصلوں کے نتائج اور مضمرات پر غور کرنے کو کچھ وقت بھی مل جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات زیادہ اہم فیصلے چشم زدن میں کرنا پڑتے ہیں: سمندری لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ دشمن کی آبدوز نے آپ کے بیڑے کے ایک جہاز کو مسمار کر دیا ہے۔ اس کے بچے ہوئے افراد جان بچانے کے لئے اوپر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آبدوز کا رخ اب آپ کے بیڑے کے دوسرے جہازوں کی طرف ہوگا۔ ایک پل میں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ گولے بارود کے پورے چارج سے آبدوز پر تہ آب حملہ کر دیں اور اُسے فی النار و السقر کر دیں۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو آپ کے فلیٹ کا ایک اور جہاز سارے افراد کے ساتھ موت کے منھ کا نوالہ بن جائے گا اور اگر ایسا کیا تو آبدوز کے ساتھ آپ کے شکستہ جہاز کے ساتھی جو اوپر آنے اور جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں لقمہ اجل ہو جائیں گے۔

ہے نہ فیصلہ دشوار! دونوں میں سے جو فیصلہ کیجیے یکسوئی اور اطمینان حاصل نہ ہوگا۔ ہاتھ آئے گی صرف خلش
اب دو مثالیں آپ کے سامنے رکھتے ہیں:

ایک بچہ علم کی جستجو میں گھر سے نکلتا ہے۔ اس کی ماں نے ایک عمر کی کمائی اس کے حوالے کر دی ہے۔ کرتے کے
اندر اسے اچھی طرح سی دیا ہے کہ نہ کسی کو اس کی موجودگی کا گمان ہو، نہ اس کے گرنے کا امکان باقی ہے۔ بیچاری ماں
نے اپنے لختِ جگر کو وداع کرتے وقت اسے صرف یہی دولت نہیں دی، ایک اور دولت کو بھی زادِ راہ کے طور پر اس کے
سپرد کیا۔ یعنی "بیٹا کبھی جھوٹ نہ بولنا، جب بولنا سچ بولنا" قافلہ نے ابھی آدھی مسافت ہی طے کی ہوگی کہ ڈاکوؤں
نے اس پر حملہ کیا۔ زر و مال سب لوٹ لیا۔ بچے کی باری آئی۔ اوپر سے ٹٹولا کچھ نہ ملا۔ بچے کے پاس ہوتا بھی کیا
ضمناً پوچھ لیا کہ "تیرے پاس کچھ ہے" بچے کو فیصلہ کرنا ہے۔ ایک طرف علم کی پیاس اور ماں کی محنت کا پاس۔ اس
غریب نے عمر بھر کی کمائی بیٹے کے تحصیلِ علم کے شوق کی نذر کر دی تھی۔ اب اگر بتاتا ہے کہ میرے پاس اس قدر دینار ہیں
تو ڈاکو سب چھین لیں گے۔ ماں نے جو کچھ سالہا سال میں پس انداز کیا ہے، ایک پل میں برباد ہو جائے گا اور تحصیلِ علم کا
ارمان بھی دل میں گھٹ کر رہ جائے گا۔ اگر نہیں بتاتا ہے تو اشرفیاں تو بچ جائیں گی۔ لیکن ماں کے حکم کی خلاف ورزی
ہوگی کہ بیٹا ہمیشہ سچ بولنا۔ اس بچے کو زیادہ تأمل نہیں کرنا پڑا۔ اس نے پلک جھپکتے یہ فیصلہ کر لیا کہ جن اشرفیوں
تک ڈاکوؤں کی نگاہ اور ہاتھ نہیں پہنچ سکے، میں ان کی موجودگی کا اعتراف اور اعلان کروں گا۔ جب اس نے کہا
کہ "ہاں میرے پاس اتنی اشرفیاں ہیں" تو ڈاکو سمجھے کہ یہ کنگال لڑکا ہم سے مذاق کر رہا ہے۔ اسے پکڑ کر اپنے سردار کے
پاس لے گئے۔ قارئین واقف ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا، یہ بچہ کون تھا اور کس طرح اس کی راست گوئی سے متاثر
ہو کر ڈاکو ایمان لے آئے اور انھوں نے توبہ کی۔

غور کیجیے: پنّا کی اس عورت کے دل پر کیا گزری ہوگی جس نے آقا کے بچے کے بستر پر جسے وہ پال
رہی تھی اور جسے رات میں طاقتور دشمن قتل کرنے آ رہے تھے، اپنے بچے کو لٹا دیا اور آقا کے بچے کو دوسری جگہ
چھپا دیا۔ مامتا کہتی تھی کہ ماں جایا ہی کائنات ہے۔ اس کو نو مہینے پیٹ میں رکھا۔ خونِ جگر سے اس کو غذا فراہم
کی۔ اتنے ارمانوں اور تکلیفوں کے بعد وہ پیدا ہوا۔ کن امنگوں سے اسے پالا، بیدرد بن کر دشمن کے خنجر کے سپرد
کر دیا جائے؟ ماں کی مامتا کو کیا ہو گیا؟ ایسی ماں دھرتی کے ماتھے پر کلنک ہے، ظالم ہے، قاتل ہے، ڈائن
ہے۔ وہ عورت اپنے ضمیر سے یہ سب لعن طعن سنتی رہی۔ اس کا جگر چھلنی ہو گیا۔ پھر یہ سوچا کہ جس بچے کو وہ
پال رہی ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ لیکن وفاداری چلاتی ہوئی آگے بڑھی کہ اے بے وفا! تو نے

جس مالک کا نمک کھایا ہے، جس کے بچے کو اپنے بچے کی طرح محبت سے پالا، اُس پر وقت آپڑا ہے تو دُور کھڑی ہو کر تماشا دیکھے گی۔ پھر راج کمار مارا گیا تو راج کا کیا ہوگا۔ فتنہ و فساد سر اٹھائیں گے اور خدا کی مخلوق اور راجہ کی رعایا مصیبت میں پھنس جائے گی۔ قارئین جانتے ہیں کہ اس عورت نے وفا کو مامتا پر قربان کر دیا۔ فیصلہ کتنا دشوار تھا۔ مگر اس وفا شعار نے چھاتی پر پتھر رکھ کر بغیر آنکھ جھپکائے وہ دلیرانہ فیصلہ کر لیا۔

فارسی کی مثل ہے کہ وہ جھوٹ جس میں مصلحت شامل ہو، اس سچائی سے بہتر ہے جو فتنہ اور فساد برپا کرے۔ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ خود غرضی اور ہوس پیشہ عقل حصول مقصد کے لئے مصلحت کے دائرہ کو بہت پھیلا بھی دیتی ہے۔ ضمیر کی آواز کو دبانے کے لئے مصلحت کی مدد اکثر حاصل کی گئی ہے۔ یہ پہچاننا کبھی کبھی دشوار ہو جاتا ہے کہ مصلحت منفعت کے حدود میں کہاں سے قدم رکھ رہی ہے۔

چلتے چلتے ضمیر کی بات بھی ہو جائے جو اخلاقیات کی اس برات کا نوشاہ ہے۔ جہاں تک نیک و بد میں امتیاز اور اخلاقی فیصلے کرنے کا سوال ہے، ضمیر کی راہ نمائی کے بغیر بات آگے نہیں بڑھتی۔ اگر اسے زندہ رکھا جائے تو ضمیر کا وہ ذریعہ ہے جو ہمیں اخلاقی خطرات سے دُور رکھتا ہے اور جو برے وقت میں جب قدم ڈگمگانے لگیں ہمارے کام آتا ہے۔ عقل جب ہوس کی آلۂ کار بن جاتی ہے اور گمراہ کرنے کے لئے طرح طرح کی تاویلیں کرتی ہے، جب انسانوں کی ہر طرف پھیلی ہوئی گمراہی، بھلے آدمیوں کو نکمّا بنا دیتی ہے، ضمیر اس وقت ہمیں بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ لیکن ضمیر کی بات نہ سُنی جائے، اسے استعمال نہ کیا جائے، تو وہ روٹھ کر الگ ہو جاتا ہے اور انسان اس کی رہبری سے خود کو محروم کر لیتا ہے۔ ضمیر کی آواز بعض اوقات بہت دھیمی ہوتی ہے۔ اس وقت یہ طے کرنا بھی دشوار ہوتا ہے کہ یہ ضمیر کی آواز ہے یا کوئی واہمہ۔ نوائے سروش ہے یا صدائے ابلیس۔ عقل کی ہوس پیشگی اور ضمیر کے ابہام ضعف اور آلودگی کے رحم و کرم پر انسان کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اس لئے ہدایت کا انتظام کیا گیا ہے۔ کتاب و سنت میں یہی اہتمام ہے۔

دروغ مصلحت آمیز کی بات ہو رہی تھی۔ آپ نے دروغ شناس آلہ (lie detector) کا شنا ہوگا۔ اس کی گرفت بھی ناآموزدہ تک ہے اس کے شکنجے میں وہی لوگ آپاتے ہیں جو بالعموم سچ بولتے ہیں۔ اگر وہ کبھی جھوٹ بولیں تو چہرے کی رنگت بدل جاتی ہے۔ شفق کی لہریں اعلان کرتی ہیں کہ روز روشن سے ہٹ کر شب تاریک میں قدم رکھا جا رہا ہے اور اگر چہرے کی رنگت پر قابو پا لیا، تو جلد کی کہربائی خصوصیات کی تبدیلی آلکی مدد اور قابل کی پردہ دری کے لئے آجاتی ہے۔ ستم ہے کہ نہیں، عادی دروغ گو جو جھوٹ

ہوتے ہیں اور جن کا ضمیر مرجھا چکا ہوتا ہے، دروغ شناس آلہ کو دھوکا دے کر صاف نکل جاتے ہیں اور
کے خوگر نہیں اور جنھیں مصلحت یا وقتی کمزوری نے تھوڑی دیر کے لئے بہکا دیا تھا، وہ گرفت میں آجاتے ہیں

داخلی بصیرت اور ضمیر زندگی کے بعض پیچیدہ امور میں تن تنہا واضح رہبری نہیں کر پاتے۔ انھیں عقل
مدد کے لئے بلانا پڑتا ہے۔ جہاں بصیرت دو متبادل راہوں میں سے کسی کے حق میں فیصلہ نہ کر سکے وہاں
عقل کی کمک درکار ہوتی ہے۔ عقل کے پاس تجزیہ کرنے اور منطقی ڈھنگ سے استدلال کرنے اور بالآخر ترجیح
کے جو طریقے ہیں، اخلاقی دوراہوں پر ان سے مدد مل جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر عقل ضمیر یا داخلی بصیرت کے تابع
رہتی ہے۔ بصیرت اور فراست کے اشتراک عمل سے بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

ضمیر کو اگر کریدا جائے تو دو پرتوں پر نگاہ پڑے گی۔ ایک تو وہ داخلی وصف جو برائی کی آہٹ
ہی الارم دیتا ہے، خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ جو بھلائی کی طرف کھینچتا ہے۔ اس وصف سے کچھ نہ کچھ حصہ
کو ملتا ہے۔ بعض انسان برے ماحول کے تحت بداعمالیوں اور بے غیرتی اور بے حسی سے اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔
گناہوں اور ڈھٹائی کے بوجھ سے اس طرح دبا دیتے ہیں کہ کروٹ لینا، یا کسمسانا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔
خواہش سے جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ اس کی ناوقت حرکت ان کے لئے سوہان روح بن جاتی ہے۔ اس کی آواز سے
ہوتی ہے۔ اسے اکھاڑ کر پھینک نہیں سکتے۔ اسے گاڑ دیتے ہیں، دفنا دیتے ہیں، لیکن یہ بظاہر نحیف و نزار
بہت سخت جان ہے۔ وہ گناہ اور خود غرضی اور بداعمالی کے نیچے یوں مدتوں اسی طرح دبا رہے گا جیسے
اور بیج، گیاہ اور سبزہ برف کے نیچے دب جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بہار کبھی نہیں آئے گی اور زمین، سبزہ، گیاہ سے ہمیشہ
لئے محروم ہو گئی۔ لیکن اپریل کا مہینہ آنے دیجئے، بظاہر مردہ سبزہ برف کی تہ کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ ضمیر بھی مدتوں
اسی طرح سر اٹھائے گا۔ اس وقت پچھتانا کچھ کام نہ آئے گا۔ اس کا ڈنک گناہ گاروں کے آخری ایام کو تلخ کر دیتا ہے۔

ہاں تو ضمیر کی بنیادی پرت انسان کے خمیر کا جزو ہوتی ہے اور دوسری پرت اسے تربیت، ماحول، مذہب اور سماج
اس طرح انسان بھلائی کا اس قدر عادی ہو جاتا ہے اور برائی سے اس قدر نفور کہ برائی کے خلاف ضمیر کا ردعمل فوری اور
اس کی آواز اونچی ہو جاتی ہے جسے کوئی نقارہ ڈبو نہیں سکتا۔ اگر بچپن میں دین کے نقوش تعلیم و تربیت سے گہرے بٹھا دیے
اور ماحول اور سماج ایسا ملا جو اخلاقی قدروں کا قدردان نکلا تو ضمیر کا دائرہ عمل وسیع، فیصلہ کرنے کی طاقت زیادہ توانا اور
و باطل کے مابین تمیز کرنے کی شمشیر زیادہ دھاردار ہو جاتی ہے۔ اس طرح گویا پہلی پرت وہبی اور دوسری اکتسابی ہوتی ہے

# مسز اندرا گاندھی

## چند بکھرے ہوئے تاثرات

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے یونیورسیٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کے مشاہرے، اور شرائط خدمت کی چھان بین کرنے اور اس کے بعد کمیشن کو اپنی سفارشات پیش کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ اس کمیٹی نے مسئلہ پر غور و فکر کیا اور اساتذۂ جامعات اور ماہرین تعلیم سے مشورہ کرنے کے لئے اپنے اراکین کو مامور کیا۔ میرے سپرد وہ سب کمیٹی کی گئی جو جنوبی ریاستوں کا دورہ کرے گی۔ کرناٹک کے دورے کے بعد ہم لوگ کیرالا آئے۔ ماہرین تعلیم کے ساتھ ترِی وانڈرم میں ہمارے مذاکرات کا آج دوسرا دن تھا۔ کیرالا یونیورسٹی میں اس ریاست کے تعلیمی مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی کہ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے آکر میرے کان میں یہ روح فرسا خبر پھونکی کہ مسز گاندھی پر آج صبح ان کے مکان میں قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے اور وہ نازک حالت میں انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں لے جائی گئی ہیں۔

پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ مسز گاندھی باوجود ان نکتہ چینیوں کے جو وقتاً فوقتاً ان پر کی جاتی رہی ہیں اس وقت ہندوستان کی سب سے قدآور اور اہم ترین شخصیت تھیں۔ ہندوستان کے پھوٹ ڈالنے والے اور فتنہ برپا کرنے والے عناصر اور رجحانات کو قابو میں رکھنا، ان ہی کا کام تھا۔ انھیں خدا نے وہ قامت اور بصیرت عطا کی تھی، جو اتنے بڑے اور پر پیچ ملک کی رہنمائی کے لئے ضروری ہے۔ اُنھوں نے بڑی حد تک بہ حیثیت وزیر اعظم اس اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا، جس کی بنیاد ان کے عہد آفریں باپ نے ڈالی تھی۔ ذاتی دیانت اور اعلیٰ ظرفی اور بلندی معیار کی بدولت وہ سارے ہندوستان کے لئے موجب احترام تھیں۔ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی ترجمانی، اس ملی جلی تہذیب کی ترجمانی جس میں ہندوستان کی رواداری اور اس کا وسیع ظرف شامل تھے اور جو جدید مغربی تہذیب کی شائستگیوں، رعنائیوں اور علم طرازیوں سے بھی مستفیض تھی، جس قرینہ اور جمال کے ساتھ مسز گاندھی نے کی، وہ آپ اپنی مثال ہے۔ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے ماضی اس کے عبوری حال اور تابناک مستقبل کے لئے اس کے منصوبوں اور عزائم کی پیکر تھیں۔

نہرو خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ سونے کے نوالے اور سنہری شہرت کے ساتھ پیدا ہوئیں۔ ہر چند کہ بچپن میں ہی سانس انھوں نے سیاست کے ماحول میں ہی لی، لیکن منظرِ عام پر وہ کانگریس کے صدر ۱۹۵۹ء کی حیثیت سے آئیں۔ بہ حیثیت صدر کے ان کی کارگزاری نے جمنا کی لہروں کو شعلہ بار نہیں کیا۔ اور بہ حیثیت وزیرِ اطلاعات (۱۹۶۴ء) بھی انھوں نے کارگزاری اور کارسازی کے کوئی ہوش ربا نقوش محکمے کے اوراق پر ثبت نہیں کیے۔ بظاہر ایک نازک سی، کم دِرسی، کم گو، کم آمیز، کم آواز، حسین خاتون سے زیادہ توقعات کی بھی نہیں کی جا سکتی تھیں۔ جب یہ سُنا گیا کہ وہ جواہر لال نہرو کی جانشین ہوں گی، تو خیر خواہوں کے دلوں میں بھی شکوک پیدا ہوئے۔

لال بہادر شاستری جی کے تاشقند میں اچانک انتقال کے بعد جب اندرا گاندھی کو وزارتِ عظمیٰ کے لیے چُنا گیا، تو دلوں میں طرح طرح کے اندیشوں نے سر اٹھایا "اس برصغیر کی مہار ایک نازک سی خاتون کے ہاتھ میں دیدینا کہاں کی دانشمندی ہے، حد ہوگئی خاندان پرستی کی" بعض نکتہ چینیوں نے کہا۔ اور شروع شروع میں ایوان میں نئی وزیرِ اعظم کی کارگزاری اور گفتگو میں عدمِ اعتماد، ہچکچاہٹ اور لکنت کے انداز ہمدردوں کی حوصلہ شکنی اور عام ہندوستانیوں کی تشویش کے لیے کافی تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اعتماد پیدا ہوتا گیا، نقشہ بدلتا گیا اور دنیا نے دیکھا کہ بظاہر نحیف و نازک خاتون، خوش پوش، خوش اطوار، خوشرو، نفاست پسند خاتون، دل بھی رکھتی تھی اور دماغ بھی اور آہنی گرفت بھی، وہ دل جس میں جرأت تھی اور وہ دماغ جو روشن تھا اور جس میں فیصلہ کی صلاحیت تھی اور وہ ہاتھ جن کی پکڑ کبھی ڈھیلی نہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس کا سکہ بیٹھتا گیا۔ اس کی آواز اور انداز میں اعتماد اور گفتگو میں روانی آتی گئی۔ اور پھر سیاست کی ڈوریاں سمٹ کر اس کے ہاتھوں میں آگئیں اور ان کے سروں پر جو رہنما اور وزراء اور با اثر اور مقتدر انسان تھے، ان کی حیثیت دیکھتے ہی دیکھتے کٹھ پتلیوں کی سی ہو گئی اس نے سیاست کے گُر سیکھ لیے اور کہنہ مشق شاطروں کو پے در پے مات دی۔

اور وہ دن بھی آگیا جب اس کا قد اس پارٹی سے بھی اونچا ہوگیا جس نے اسے اعلیٰ وزارت کے لیے چُنا تھا۔ وہ پارٹی اس کی ذات سے کسبِ اقتدار و اعتبار کرنے لگی۔ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۲ء میں اس کے شانوں پر کانگریس پارٹی نے عام چناؤ جیتا۔ ۱۹۷۲ء سے تین سال پہلے اس نے بینکوں کو سرمایہ داروں کے شکنجے سے نکال کر قوم کے تصرف میں دے دیا، تاکہ وہ خلق کی خدمت بھی کر سکیں۔ کانگریس کے فرسودہ اصنام کو توڑ کر اس نے نئی کانگریس کی بنا ڈالی۔ اس کے نکل آنے سے پرانی کانگریس میں جان ہی نہ رہی اور بڑے بڑے بُت سر کے بل گر پڑے اور ایسا ایک بار سے زیادہ ہوا۔

باوجود زبان کی نرمی اور لہجہ کی شیرینی کے اس نے سب سے مناسب فاصلہ رکھا۔ جہاں کسی نے قریب آنے کی کوشش کی یا یہ ظاہر کیا کہ وہ وزیرِ اعظم کے مزاج میں دخیل ہے، وہیں اس کو اس کی جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ کسی کی مجال تھی کہ اس کی نگاہ میں اپنی اہمیت کے پل باندھ سکے۔ کانگریس کے بڑے بڑے رہنما اور ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اس کے دست نگر اور اس کی نگاہِ کرم کے طالب ہو گئے، جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا۔ کیا مجال کہ دوسرے اُف بھی کر سکیں۔

ایک انگریزی میگزین نے اسے ہندوستان کی ملکہ (ایمپریس آف انڈیا) کہا تھا۔ اس کے بظاہر نازک ہاتھوں میں غیر معمولی طاقت تھی۔ کہا جاتا تھا کہ کابینہ میں صرف ایک مرد ہے۔ اندرا گاندھی (اور وہ بھی مرد آہن)۔

مسز گاندھی کے شانے اتنے فراخ نہ تھے، جتنے ان کے عظیم باپ کے، اور نہ دل اتنا وسیع، نہ دماغ اتنا باخبر، لیکن انتظامی امور میں وہ ان سے زیادہ مؤثر تھیں۔ فیصلہ اور کام کی راہ میں وہ تکلف، مروت اور مراعات کو حائل نہ ہونے دیتی تھیں۔ فیصلہ کا نفاذ بے دریغ کراتیں اور چالاکی اور سینہ زوری اور سازش کرنے والوں یا وزارتِ عظمیٰ کے خواب دیکھنے والوں کی سرکوبی انتہائی شائستہ چابکدستی کے ساتھ کرتیں۔ زبان پر کوئی سخت لفظ نہ آتا۔ ملنے کی نوبت بھی نہ آتی اور سرکش اور سازشی کو پتہ چل جاتا کہ وہ آسمان سے زمین پر پٹک دیا گیا ہے۔ باریابی کے دعویدار کو اچانک پتہ چلتا کہ دروازہ اس پر بند کر دیا گیا ہے۔ سر ٹکرائے گا تو بھی نہ کھلے گا جو معتوب یا مشتبہ ہوا، وہ خواہ کسی ریاست کا وزیرِ اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو، ہفتوں انتظار کرے تب بھی حاضری سے محروم رہے گا۔ اپنا سا منہ لے کر واپس چلا جائے گا۔ اس طرح لوگوں میں احساسِ تناسب بنا رہا اور مرکزی شخصیت کے وزن و وقار کی بالاتری پر آنچ نہ آئی۔

خفگی یا اختلاج کا اظہار براہِ راست شاذ ہی ہوتا۔ آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کم ہی کی جاتی۔ آپ باتیں کر رہے ہیں، کوئی بات اہم یا التفات کی مستحق سمجھی گئی، تو سر اٹھا کر دیکھ لیا۔ یہ آپ کی فراست پر منحصر ہوتا کہ اس کی اٹھتی ہوئی نگاہ سے کیا نتائج اخذ کرتے ہیں اور ردِ عمل کی بابت کس قیاس کو راہ دیتے ہیں۔

اس نازک اور خوش اندام و خوش وضع عورت کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ دنیا میں کسی حکمراں کو رات دن اتنے بڑے بڑے گوناگوں حوصلہ شکن، سکون آشوب مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جتنے کہ ہندوستان کے وزیرِ اعظم کے حصہ میں آتے ہیں۔ لیکن اندرا گاندھی ان مسائل و مصائب سے ہمیشہ تازہ دم نکلیں۔ ایسے مسائل کے بوجھ کے نیچے مضبوط سے مضبوط کمر ٹوٹ جاتی۔ لیکن یہاں جبیں پر شکن تک نہ آئی۔ وہی تازہ دمی، وہی تبسم نما سکون، وہی نفاست، وہی شادابی، وہی شگفتگی۔ گویا ایک نازوں کی پلی ہوئی خوشحال خاتون ہے، جس کے

چمن کو باد سموم اور جس کے دامن دل کو فکروں نے چھوا تک نہ ہو، جس کا منتہائے آرزو، خوش باشی اور خوش پوشی ہو جس نے ڈرائنگ روم سے باہر قدم نہ رکھا ہو۔ جو شخص بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ کون ہے، ان سے مل لے گمان بھی نہ ہو کہ اس خاتون نے زمانہ کے سنگین سے سنگین، پر آشوب سے پر آشوب، جگر دوز سے جگر دوز مسائل سے لوہا لیا ہے۔ اور کسی ایسے ہی مسئلہ سے نبرد آزمائی کر کے ابھی ابھی آرہی ہے۔ ریشم کی ڈوری مضبوط ہوتی ہے، سُن رکھا تھا۔ لیکن نہ اتنی مضبوط کہ فولاد شرمائے، نہ اتنی قاطع کہ سیوف کو رشک آئے۔

اس پاکیزہ چہرے کی پاکیزہ کشش کو ہزاروں دلوں نے محسوس کیا ہے، نہ معلوم کتنے دل اس انتہائی دلآویز مسکراہٹ سے کھل اٹھے ہیں۔ وہ مسکراہٹ جو مونالیزا کے تبسم کی طرح پُراسرار نہیں۔ لیکن اس سے زیادہ دلکش ہے اور اسے سادہ نہ سمجھیے۔ پُر کار بھی ہے اور رمز آلود بھی۔ کبھی اس میں بے پایاں گفتگو کی آہٹ ملتی ہے۔ کبھی یہ دانستہ کوشش کہ جانے والا بے التفاتی کا گلہ کرتا ہوا نہ جائے۔ کبھی بے محل بات کو ٹالنے کی تدبیر، کبھی دل موہ لینے کا حربہ، کبھی یہ فہمائش کہ ان چند لمحات سے زیادہ مقسوم نہیں ہیں، تشریف لے جائیے۔

ایمرجنسی کے دوران اہل نفاذ نے زیادتیاں کیں، جس کا خمیازہ مسز گاندھی کو بھگتنا پڑا۔ لیکن وہ بے اعتماد نہیں ہوئیں۔ اس وقت سب یہ سمجھے تھے ان کا سیاسی اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، اس وقت بھی ان کے حوصلے پر آنچ نہیں آئی، نہ سکون نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ ان کی شخصیت کا یہ جادو تھا کہ ویرانہ میں رہتے ہوئے بے منصب و جاہ بھی اگر وہ کسی سفارتی جلسے میں چلی جاتیں تو سب لوگ ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ برسر اقتدار وزیر خارجہ کو چھوڑ کر۔

مصیبت اور معزولی کے ان ایام میں کچھ لوگوں نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا، ان کی خدمت میں برابر جاتے رہے۔ ایک روز بڑے امتنان کے ساتھ ایسے لوگوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شبنم کی بوندیں آنکھوں میں تیر رہی ہیں۔

راقم نے پہلی بار قریب سے انھیں اس وقت دیکھا جب وہ طیارہ سے جس میں وہ سفر کر رہا تھا، بمبئی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد کئی ایک بار ان مجلسوں میں شریک ہوا جن کی وہ صدر تھیں۔ ان میں سے ایک مجلس قومی یکجہتی کونسل کی تھی۔ ذکر مسلم اقلیت کے اعتماد اور خوش حالی کو بحال کرنے کا تھا۔ اس مجلس میں غفور صاحب (اس وقت بہار کے وزیر اعلیٰ) نے مذاکرہ میں شرکت کرتے ہوئے کہا تھا کہ محترمہ آپ کسی مسلمان کو صدر یا چیف جسٹس بنائیں یا نہ بنائیں مسلمانوں کو تھانوں میں مامور ضرور کر دیجیے کیونکہ اس کا بڑا اثر مسلمانوں کے احساس سلامتی و احساس اعتماد پر پڑے گا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری جب میں نے قبول کی تو وزیر اعظم سے ملنے گیا۔ رخصت کے وقت

ئیں کہ آپ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں۔ حوصلہ بڑھانے کا یہ ایک طریقہ تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی یت رکھتی ہیں۔

آسان روی اور طوائف الملوکی کے بعد نظم و ضبط اور قواعد و ضوابط کا نفاذ شرپسند عناصر کو گراں را۔ ہنگامہ برپا کیا کہ شیخ جامعہ کے پیر اکھڑ جائیں یا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ طلبہ کے گمراہ سربراہوں نے کسی لے پر خاک و خون کی تیاریاں کیں۔ خود قلعہ نشیں ہو گئے اور معصوم لڑکوں کو آگ میں جھونک دیا۔ پولیس دفاع میں گولی چلانا پڑی اور ایک معصوم عزیز کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ وہی ہو گیا جس کو بچانے کے لئے پے در پے جتن کرتا اور خطرے اٹھاتا چلا آیا تھا۔ میں نے شدتِ غم میں استعفیٰ دینے کی ٹھان لی۔ بات دلی پہنچی اور وہاں سے چشم زدن میں 'دُبئی'، جہاں وزیر اعظم دورے پر گئی ہوئی تھیں۔ ابھی دلی ے بات ہوئے آدھا گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور وزیر اعظم کا پیغام پہنچا کہ استعفیٰ دینے سوال نہیں ہوتا، ثابت قدم رہیے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے دور اہم امور میں گھرے ہونے کے باوجود ز گاندھی نے میری ڈھارس بندھانے اور سبکدوشی سے باز رکھنے کا یہ اہتمام کیا۔ یہی نہیں، دوسرے روز صبح اس وقت کے وزیر داخلہ (حالیہ صدر جمہوریہ) وائس چانسلر کے مکان پر تشریف لائے، بظاہر بچشم خود حالات دیکھنے کے لئے، بباطن اسی پیغام کو دہرانے کے لئے۔ چند ماہ بعد مسز گاندھی سے ملاقات ہوئی، تو میں نے کریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی اس خصوصی توجہ نے اس نازک وقت میں میرے دل کے تاروں کو چھو دیا تھا۔ س سانحہ کے بعد طالع آزماؤں نے یونیورسٹی کو اپنے ذاتی یا سیاسی مقاصد کے لئے تسخیر کرنا چاہا۔ میں سدِ راہ بنا تھا۔ چنانچہ تین سال تک لگاتار ایک گروہ میرے خلاف وزیر اعظم کے کان بھرتا رہا۔ لیکن مسز گاندھی نے نہ ان ل نہ رخ۔ میں نے البتہ ان سے معذرت کی کہ میری وجہ سے ان کو الجھن میں ڈالا جاتا ہے۔ راقم سطور کے متعلق ن کی جو کچھ رائے رہی ہو اس سے قطع نظر ان کے انتظامی شعور نے اس کی اجازت نہیں دی کہ احتجاج کے زد میں ی وائس چانسلر کو سبکدوشی پر مجبور کر دیا جائے۔

اس دردناک سانحے کے بعد یونیورسٹی کو بند کرنا پڑا تھا۔ جب کھولنے کا ارادہ کیا تو انتظامیہ نے حامی بھری۔ ریاستی حکومت کو یقین دلایا گیا تھا کہ اگر یونیورسٹی کھلی تو بہت بڑا تصادم ہوگا، کشتوں کے پشتے جائیں گے۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسا کرتے ہوئے احتجاج کر رہا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن کون سنتا تھا۔ جن حضرات نے یونیورسٹی بند کرانے کے ڈول ڈالے تھے ان کی انتھک کوشش تھی کہ یونیورسٹی کھلنے نہ پائے۔

لڑکوں کا ایک سال تو ضائع ہو ہی جائے پھر دیکھیں وائس چانسلر کیسے رُکتا ہے۔ یہ گتھی بھی مسز گاندھی کی خاموش اشارے نے سلجھائی۔ وزارتِ داخلہ میں مجلسیں ہوئیں اور یونیورسٹی کھلی، اور سکون اور امن کے ساتھ پڑھائی ہوئی اور ضائع ہوتا ہوا سال، موت کے جبڑے سے نکال لیا گیا۔

یونیورسٹی کی اقامت گاہوں میں بڑا ہجوم تھا۔ ضرورت تھی ان میں اضافہ کی۔ ایک عرصہ دراز سے کوئی ہال نہیں بنا تھا۔ کمیشن اور وزارت میں کون سنتا۔ یہاں بھی وزیرِ اعظم کی ذاتی دلچسپی نے دروازے وا کر دیے اور زرِ خطیر سے جو منظور ہوا تھا ایک نئے ہال کی خوب صورت عمارت کھڑی کر دی گئی جو علامہ اقبال کے نام سے موسوم ہے اور جس میں سات سو طالب علموں کے لئے جگہ ہے۔

یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بازیابی کے لئے ۱۹۶۶ء سے ہندوستان کے مسلمانوں نے جدوجہد شروع کی، قربانیاں دیں، یہاں کی تعلیمی فضا مکدّر ہو گئی۔ احتجاج کر کر کے لوگ تھک کر بیٹھ گئے۔ مراد آباد میں فسادات ہوئے، پھر علی گڑھ شہر میں، اور بازیابیِ کردار کی مانگ دب گئی۔ اس وقت جب یہ مطالبہ ایک عرصہ سے فضا میں تھا اچانک یہ منظور کر لیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا، یہ بات ابھی تک صیغۂ راز میں ہے اور رہے گی۔ لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد بہت دیر تک یونیورسٹی میں ہنگامہ آرائی کا حوصلہ کسی کو نہ ہو سکا۔ حالات کا یہ بھی ایک طنز ہے کہ ۱۹۸۱ کے ترمیمی ایکٹ نے جس کے ذریعہ مسلمانوں کا مطالبہ منظور ہوا اور روایتی کردار بحال کیا گیا بالآخر ہدف اسی کو بنایا جس کے لئے یہ ساری جد و جہد کی گئی تھی، نکتہ چیں خندہ زن ہیں کہ اقلیتی کردار کیا اسی کو کہتے ہیں:

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد ٭ وائے گر در پسِ امروز بود فردائی

پھر ایک وقت آیا کہ ساری مرکزی یونیورسٹیوں کے لئے ایک مشترک ایکٹ کی تجویز کی گئی۔ یونیورسٹیوں کی خود مختاری معرضِ خطرے میں پڑ گئی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے احاطہ میں تو کہرام مچ گیا کہ ایک ہاتھ سے روایتی کردار دیا گیا اور دوسرے ہاتھ سے اسے واپس لیا جا رہا ہے۔ ایک بڑی ریلی ہوئی۔ راقم نے اس ریلی کی صدارت کی اور اس کا رخ اُمنگی مانگ کی طرف موڑا اور کہا کہ ایک نمائندہ گروہ وزیرِ اعظم سے ملے۔ میں اس کی سیادت کو تیار ہوں۔ دوسری یونیورسٹیوں کی نگاہ بھی ہم پر تھی۔ چنانچہ بھان متی کے کنبہ کو لے کر راقم سطور مسز گاندھی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں تو یہ عالم تھا کہ "تار باجا اور راگ بوجھا"۔ میں نے اس اقدام کے مضرات کا ذکر چھیڑا ہی تھا کہ انھوں نے انتہائی شگفتگی کے ساتھ بات کی تہ تک پہنچنے کی خبر دے دی۔ حامی تو نہ بھری لیکن ہم مطمئن واپس آئے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ اس مشترک بل کا سراغ بھی کسی کو نہ ملا۔ مسز گاندھی کے کام کرنے کا یہی انداز تھا۔ انھیں بات کی

تک پہنچنے اور فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگتی تھی۔ لیکن اس کا اعلان دورانِ گفتگو کرنا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ اس میں دو مصلحتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ جب تک ان کا دفتر جس میں انھوں نے لائق ترین افسروں کو جمع کر رکھا تھا، تجویز کو چھان پھٹک کر دیکھ نہ لے، کوئی حتمی وعدہ کرنا بعد میں دشواریاں پیدا کر سکتا تھا۔ دوسرے اس طرح وہ ملنے والوں کو ان کی جگہ پر رکھ سکتی تھیں تاکہ ضروری فاصلہ درمیان میں رہے۔ اور گفتگو سوال و جواب یا برابری کی سطح پر بات چیت کی شکل، اختیار نہ کرے۔ ان کا طور ڈالفن کا سا تھا جس کی پشت بقول شیکسپیر پانی میں رہنے کے باوجود تر نہیں ہوتی۔ اس بات پر اب اتفاق ہے کہ مسز گاندھی مشورہ بہتوں سے کرتی تھیں لیکن فیصلہ ان کا اپنا ہوتا تھا۔ ابتدا میں لوگ سوچتے تھے کہ ان کے مشیران کے لئے فیصلہ کرتے ہیں لیکن بعد میں یہ بات واضح ہو گئی کہ ہیں، فیصلہ کیا ہوا اور کب ہوا، یہ سب کچھ وہ خود طے کرتی تھیں۔ فیصلوں کی ضمن میں ایک عالم ان کے انتخاب ساعت کا قائل تھا۔ صحیح وقت پر فیصلہ کرنے کے لئے ان کے پاس گویا ایک چھٹی حس تھی۔ بینکوں کو قومی تصرف میں لانے کا فیصلہ اتنا برمحل اور بروقت نکلا کہ اس نے ہندوستان کی سیاست کا نقشہ ہی بدل دیا اور اس وقت سے ان کی سیادت کا سکہ چلنے لگا۔ بہت سی مثالوں میں سے یہ صرف ایک مثال ہے۔

ہر وہ شخص جو آگے بڑھنے اور لے چلنے کے لئے بیتاب ہو، وہ جمہوریت اور اہل کاروں کی آہستہ خرامی سے گھبرا جاتا ہے۔ کام اگر کرنا ہے تو ان تکلفات اور ضوابط اور لایعنی اور پُرتاخیر موشگافیوں کو بالائے طاق رکھنا ہوگا۔ اندرا گاندھی نے بھی یہی کیا۔

لیکن سارا اختیار جب ہاتھ میں آجاتا ہے، تو وہ اپنے خطرات بھی ساتھ لاتا ہے۔ پھر انسان دوسروں کی رائے کو لائق اعتنا نہیں سمجھتا اور رائے دینے والے بھی اپنی رائے کو صاحب اختیار کی رائے یا رجحان اور افتاد کے مطابق ڈھالنے لگتے ہیں۔ گویا صاحب اختیار آزاد اور پُرخلوص رائے سے خود کو محروم کر لیتا ہے، اسے جو مشورہ ملتا ہے وہ خود اس کے رجحان کی پھیکی سی نقل ہوتا ہے۔ اپنی ہی آواز کی گونج اس کے کانوں میں آتی ہے اور وہی بھلی لگتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک خطرہ اور پیش آتا ہے، صاحب اختیار جو دراصل عوام سے طاقت اخذ کرتا ہے ان سے کٹنے لگتا ہے، دور ہو جاتا ہے، محصور ہو جاتا ہے۔ ہر چند کہ اندرا گاندھی کا ہاتھ عوام کی نبض پر تھا پھر بھی ان سے ان کا رابطہ وہ زندہ اور پیوستہ رابطہ نہیں رہا تھا جس کی بنا گاندھی اور نہرو نے ڈالی تھی۔ ان کو سلامتی اور تحفظ کے لئے ایک حد تک دامن کش اور روپوش رہنا پڑا۔

شروع میں کانگریس کے جن مکھیاؤں نے اندرا گاندھی کو وزیر اعظم کی گدی پر اس امید کے ساتھ بٹھایا تھا

کہ حکومت اندرا گاندھی کی ہوگی اور راج وہ کریں گے، انھیں مایوس ہونے میں دیر نہیں لگی۔ یہ "اتالیق" اسی
ساتھ ہٹا دیے گئے جس سے نوخیز اکبر نے بیرم خاں کو اختیار اور راستے سے ہٹا دیا تھا۔ اول تو وہ کام کرنے
دوسرے نہرو کی بیٹی، دوسروں کی تابع فرمان کب ہونے والی تھی ؛ تیسرے وہ اصلاحات جو غریبوں اور کم
حق میں تھیں کہنہ دماغوں کو راس کیونکر آتیں۔

اشوک مترا نے جو ایک سبکدوش سول سرونیٹ ہیں اور جنھیں شعبۂ اطلاعات میں اندرا گاندھی کے
کام کرنے کا اور ان کی مجلسوں اور مشوروں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے، اسٹیٹمین میں اپنے مضمون میں
کے بیکراں اختیارات کے مضر اثرات کا ذکر اس طور کیا ہے :

"۱۹۶۹ء میں کانگریس پارٹی کے جس وقت ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اس سے سول سرونیٹ کے اس حق
رائے دینے سے عبارت تھا، بندشیں لگنا شروع ہو گئیں۔ کلّی اتفاق یا کمٹ منٹ کی اصطلاح نے معاملہ کو اور سنگین
.... اندرا گاندھی یہ سمجھنے لگیں کہ حکومت کرنا ان ہی کا فرض اور حق تھا اور اسی اعتماد کے مطابق ہندوستان
وفاقی نظام کے ڈھانچے کو توڑ امروڑ اگیا۔ مسز گاندھی کا کارنامہ زبردست اور ہیبت آفریں ہے۔

اندرا گاندھی نے بہ حیثیت وزیراعظم ۱۶ سال کے عرصے میں کارہائے نمایاں انجام دیے، انھوں
کے اتحاد پر جراحت نہ آنے دی۔ غریبوں اور کمزوروں کے لیے ان کا دل ہمیشہ پگھلتا رہا کہ ان کا نصب العین
پسماندوں، مظلوموں کو علم اور خوش حالی سے روشناس کرانے کا تھا۔ انھیں اپنے عظیم باپ کی طرح جو گرم جوشی
ملی، ان کی شخصیت میں جو کہربائی طاقت تھی، اس کا راز نہ صرف اس روحانی عقیدت میں تھا جو ہندوستانیوں
نہرو خاندان سے تھی، وہ خاندان جو اپنے رنگ، روپ، قامت، جمال اور خد و خال کے لیے مشہور تھا، بلکہ اس احساس
میں بھی کہ اتنے خوش حال اور آسائش خوا افراد نے وطن کی آزادی کے لیے ساری آسائشیں اپنے اوپر حرام کرلیں اور
تکالیف کو گوارا بنالیا ؛ اندرا گاندھی کی پرستش اس لیے بھی کی گئی کہ وہ عورت تھیں، وہ عورتوں کے شعور اور امکا
کی علامت بھی تھیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ جس چیز نے جواہر لال اور اندرا گاندھی کی شخصیتوں میں وہ کہربائی سحر
جسے کیرزما کہتے ہیں، وہ اہل ہند کے دلوں میں یہ احساس تھا کہ وہ ایک روشن مستقبل کا تصور رکھتے ہیں اور
رائے ہیں۔ وہ دیانت، ذہانت، لیاقت اور بصیرت سے لیس ہیں۔ وہ ریاستی، لسانی، مذہبی اختلافات
تنگ نظریوں سے بالاتر ہیں۔ وہ ملک کو عہد حاضر کے شانہ بشانہ چلانے کے خواب دیکھتے ہیں اور خواب کو تعبیر
بدلنے پر قادر ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کو وسائل اور سائنسی اور ٹکنیکل انفرا اسٹرکچر سے مضبوط کیا۔ وہ

زبان بولتے ہیں جو ہندوستان میں ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ اتنے خوشحال اور نفاست پسند ہونے کے باوجود عوام پر جان دیتے ہیں۔ اندرا گاندھی نے ناوابستہ ممالک کی سربراہی اعتماد اور قابلیت اور قرینہ کے ساتھ کی۔ اشوک مہتا نے ۱۹۶۰ء میں اندرا گاندھی سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر اس ڈھنگ سے کیا ہے "وہ شرمیلی اور لجائی ہوئی سی تھیں۔ حیا نے ان کے چہرے پر سرخی کی لہریں دوڑا دی تھیں اور بولنے میں انھیں تامل تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی زندگی تنہائی اور حفاظت میں گزری ہو۔"

میں نے ملاقاتوں کے دوران ان سے بات چیت کا آغاز بالعموم انگریزی میں کیا۔ اس خیال سے کہ فاصلہ رکھنے اور ضابطہ کو نباہنے کے لئے بیرونی زبان کارآمد ہے اور مادری زبان میں قرب اور بے تکلفی کا پہلو آجاتا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ مجھے اُردو کی طرف لے آئیں۔ شاید وہ ایک یوپی والے کی غیر مخلوط اردو سننا چاہتی تھیں، جو شائستگی کے آداب اور معنویت کی پرتیں اور لطافت کی تہیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ انھوں نے گزشتہ ساڑھے چار سال کے دوران یونیورسٹی میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ لیکن اس کے وائس چانسلر کی مدد اور پشت پناہی میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ اگر کوئی صلاح دینی ہوئی بھی تو براہ راست کبھی کچھ نہیں کہا:

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

اندرا گاندھی کی عظمت کو ان کی زندگی میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ موت نے اس میں اضافہ کر دیا۔

ان میں کام کی لگن اور ریاضت کی صلاحیت لامحدود تھی۔ ٹیلی ویژن پر ان کے معالج (معالج نہیں طبیب کہ ان کو علاج کی نوبت ہی نہ آتی تھی) نے بتایا کہ وہ روز سولہ سترہ گھنٹے کام کرتی تھیں۔ مشکلات کا وہ خیر مقدم کرتیں، چیلنج کو وہ دوڑ کر قبول کرتیں۔ میری اندرا گاندھی سے آخری ملاقات ۲۶ اکتوبر ۸۴ء کو ہوئی تھی، ذاکر حسین کالج ٹرسٹ کی میٹنگ میں۔ بات بات سے شائستہ اور دلنواز شگفتگی اور خندہ جبینی مترشح ہو رہی تھی۔ وہ نومبر کے دوسرے ہفتے میں علی گڑھ آرہی تھیں۔ شاید اس روز جبکہ یہ سطور لکھی جارہی ہیں وہ یہاں ہوتیں لیکن ایسا ہونے کو نہ تھا۔ موت کے ظالم ہاتھوں نے انھیں ہم سے چھین لیا۔

بہ حیثیت وزیر اعظم کے انھوں نے یونیورسٹی میں قدم نہیں رکھا۔ وزیر اعظموں میں وہی ایسی تھیں جنھیں یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ میں نے کئی بار انھیں علی گڑھ آنے کی دعوت بھی دی۔ انھوں نے متبسم ہو کر حامی بھر بھی لی۔ لیکن ہر بار تامل کیا گیا کہ ایک گروہ کی خواہش تھی کہ وہ علی گڑھ نہ آئیں۔ وہ یہاں آتیں تو انھیں زبردست خیر مقدم سے نوازا جاتا۔ ان کی راہ میں آنکھیں بچھائی جاتیں علی گڑھ کی روایتی مہمان نوازی

کو ان کی صنف اور دلپذیر شخصیت اور ان کے حسن و جمال سے اپیل کرتی۔ اور وہ آتیں تو یونیورسٹی کو کچھ دیر جاتیں۔ میں نے آخر میں انھیں لکھ دیا تھا کہ میں نے طے کر لیا ہے جب تک وزیر اعظم نہیں آتیں میں تقسیم اسناد کا جلسہ (کونووکیشن) نہیں کروں گا۔ انھوں نے سوچا کہ جانا چاہیے مگر نہ آسکیں اور یوں امید جو تھی وہ مایوسی میں بدل گئی۔

اندرا گاندھی اپنے باپ کی طرح نڈر تھیں۔ ذاتی خطرہ کا انھیں احساس تک نہ تھا اور محنت سے دامن بچانا ان کے تصور میں بھی نہ آتا تھا۔ چیلنج کو بنا آنکھ جھپکائے قبول کرتیں۔ خطرہ میں کود پڑنا ان کی ادا تھی۔ میگی ویڈن پری جا مسز سبھدرا جوشی نے بتایا کہ تقسیم کے ایام میں گھرے ہوئے اور ستائے ہوئے مسلمانوں کی خدمت کے لیے ان کے ساتھ نکلتیں اور بے دھڑک ان مجمعوں میں چلی جاتیں جہاں ہر لمحہ ان کی جان کا جوکھوں تھا۔ ڈاکٹر ماتھر نے یہ بھی بتایا کہ ان کی نگاہ جزئیات پر تھی اور وہ ان لوگوں کا جو ان کے ساتھ مامور تھے، خاص خیال رکھتی تھیں۔ ایک بار دورے پر ڈاکٹر ماتھر کی سال گرہ پڑی۔ اندرا گاندھی نے ایک خوبصورت سی نظم اس موقع کے لیے لکھی اور تبریک کے ہدیہ اور دلدہی کے وسیلہ کے طور پر انھیں بھیج دی۔

نہرو خاندان کی روایت کے مطابق انھیں اقلیتوں اور ہریجنوں اور ادی باسیوں اور پچھڑے ہوئے طبقوں کی فلاح سے گہری دلچسپی تھی۔ لیکن باوجود ان کی کوششوں کے یہ لوگ تیر ستم کا نشانہ بنتے رہے۔ مسلمانوں نے اکثر ان کا ساتھ دیا لیکن کہا جاتا ہے کہ آندھرا پردیش اور کرناٹکا کے انتخابات کے بعد انھوں نے مسلمانوں کی طرف سے کچھ بے نیازی برتنا شروع کردی۔ فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کو گم سم کر دیا تھا، تاہم بحیثیت مجموعی انھیں مسلمانوں کی زبان، تمدن اور اطوار سے دلچسپی تھی جس کا تقاضہ ان کے بچپن کا ماحول اور ان کا سیکولر اور جمہوری مزاج کرتا تھا۔

مسز گاندھی کے قتل کی خبر پاکر خلقت سکھوں پر ٹوٹ پڑی، یہ جنون نہیں تو اور کیا ہے، جو لوگ مارے گئے یا لوٹے گئے ان کا گناہ کیا تھا، دوسروں کے قصور کی سزا انھیں کیوں ملی۔ کیا انصاف اسی کا نام ہے

اندرا گاندھی کے ہمیشہ تازہ دم رہنے کے دو راز ہیں۔ کام میں انہماک اور کام کرنے کا حوصلہ اور اپنے اوپر غیر معمولی قابو اور ایک مرتب نظام زندگی۔ ہر چیز سانچے میں ڈھلی ہوئی، ہر چیز ناپی اور تلی ہوئی، مشکل کام قاعدے سے کیا جائے تو سہل ہو جاتا ہے، آسان کام بے قاعدگی سے کیا جائے تو زندگی خلش اور خلفشار میں گزرتی ہے۔ ان کی زندگی بہت مرتب اور منضبط تھی اسی وجہ سے وہ مصروف رہتیں لیکن تھکی نظر نہ آتیں۔

۲ نومبر کی شب میں تین مورتی اندرا گاندھی کے آخری دیدار کے لیے گیا۔ سارا جسم پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ خوبصورت چہرا موت کے سایہ میں بھی خوبصورت نظر آرہا تھا۔ اور وہ ترشے ہوئے خد و خال اپنے لازوال زاویوں کو لیے ہوئے اس اپنی قوت ارادی کا اعلان کر رہے تھے جس نے ۱۶ سال تک ہندوستان کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دیا اور جس نے اقوام عالم کی انجمن میں ہندوستان کو مقام امتیاز عطا کیا۔ ذہن ۲۰ سال پہلے کی طرف گیا۔ جب ہم اسی طرح جواہر لال نہرو کو آخری خراج عقیدت ادا کرنے کے لیے تین مورتی میں آئے تھے۔

●●

ہر کمال کو زوال ہے، لازوال صرف خدا کی ذات ہے۔

# ستاروں کی زندگی اور موت

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (ترجمہ : بیشک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کے کام کی چیزیں لے کر چلتی ہیں اور پانی میں، جسے اللہ نے آسمان سے اُتارا اور اس پانی سے اس زمین کو جو مرچکی تھی، زندہ کیا اور اس میں سب طرح کے جانور پھیلائے۔ ہوا اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان اس کے حکم کے تابع ہیں۔ بیشک ان سب چیزوں میں اُن لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں، نشانیاں ہیں)۔

مشاہدۂ تفکر، اور مطالعۂ قدرت اور تدبر، زندگی اور موت کا تسلسل، قرآن کریم میں یہ ذکر بار بار آتا ہے اور قدرت سے رابطہ رکھنے اور قدرت کے مظاہر پر غور کرنے اور ان سے نتائج نکالنے کی تلقین جابجا کی گئی ہے۔ اگر اُن آیات کا شمار کیا جائے جو اس موضوع پر ہیں، تو یہ بات کھل جائے گی کہ ان کی تعداد ان آیات سے کہیں زیادہ ہے جو قرآن میں کسی دوسرے موضوع پر آئی ہیں۔ مقصد ظاہر ہے : انسان کائنات کا جزو ہے، وہ اگر خود کو قدرت سے الگ رکھنے کی کوشش کرے گا، تو مرجھا جائے گا۔ کیونکہ اس کی جڑیں زمین کے اندر نہیں رہیں گی۔ اس کے علاوہ کائنات کی وسعت کا احساس اسے گھمنڈ سے بچاتا ہے اور بار بار یاد دلاتا ہے کہ زمان کے طول اور مکان کی عرض کے سامنے اس کا وجود بے حقیقت ہے۔ کائنات کا پُراسرار اور حیرت انگیز نظام اسے کائنات کے پیدا کرنے والے اور قائم رکھنے والے کی طرف لے جائے گا۔ وہ خود سے بار بار سوال کرے گا کہ یہ سارا نظام آپ ہی آپ وجود میں کیونکر آسکتا ہے اور یہ باطل اور فضول اور بے کار کیسے ہو سکتا ہے؟

ایک چھوٹے سے پتّا پر ہی نظر ڈال لیجئے۔ اس کی نشوونما کا بھید کیا ہے؟ وہ پیڑ سے کیا لیتا ہے اور اس کے عوض پیڑ کو کیا دیتا ہے؟۔ اس کی ننھی سی جان کو زندہ اور سرسبز رکھنے کے لئے کیا کیا عوامل کام کرتے ہیں

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ∴ ہر ورقی دفتریست معرفتِ کردگار

وہ لوگ تو کم نصیب ہیں جو قدرت کے اوراق کا مطالعہ سرے سے کرتے ہی نہیں وہ ان مناظر سے سرسری گزر جاتے ہیں، اور جو لوگ ان کا مطالعہ کرتے ہیں وہ ذوق اور شعور کے بقدر بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ ان اوراق کی مثال کسی بڑے شاعر کے آثار کی سی ہے۔ قارئین اپنے علم اور ذوق کے مطابق اشعار سے حظ اندوز ہوتے ہیں۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ جن قوموں نے فطرت سے اپنا ناتا توڑ لیا، جنھوں نے اپنے ذہن اور اپنی فکر کو انسان کے بنائے ہوئے زنداں میں اسیر کر لیا، جنھوں نے مشاہدہ اور غور و فکر کو ترک کر دیا، وہ قومیں جہالت، پستی، تباہی اور فنا کی طرف گامزن ہوگئیں۔

قدرت کے اوراق میں ایک بہت ہی دلکش اور معنی خیز ورق آسمان ہے، جو انسان آسمان پر نظر رکھتے ہیں، وہ اپنے مسائل اور مصائب کو بہ آسانی برداشت کر لیتے ہیں۔ کم از کم وہ اپنے مسائل کو بڑھاتے چڑھاتے نہیں، نہ ان کے ہجوم سے گھبراتے ہیں۔ آسمان کے سامنے انسان اور اس کے مسائل سمٹ کر حقیر اور غیر اہم رہ جاتے ہیں۔ رات میں آسمان پر نظر ڈالیے اس کی دلائی میں بے شمار ستارے ٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۶۲ سال ہوئے ہمارا ایک عالم طبیعات سی وی رمن پانی کے جہاز میں یورپ جا رہا تھا۔ اس نے آسمان پر نظر ڈالی اور سوچنے لگا کہ آسمان نیلا کیوں ہے۔ قدرت کے اس دلنواز مظہر پر وہ غور کرتا رہا اور بالآخر ۹ سال بعد اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا اور جواب کے ساتھ طبیعات میں نوبل انعام جو دنیا کا اہم ترین اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ شعاعوں کے اثرات کے متعلق سی وی رمن کے اس انکشاف کو سائنس کی کتابوں میں ان کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے اور وہ "رمن ایفیکٹ" کہلاتا ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ جس سال سی وی رمن کو یہ اعزاز ملا، اسی سال ان کا بھتیجا سبرامنیم چندر شیکھر ان ہی کی طرح پانی کے جہاز میں کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے انگلستان جا رہا تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۱ سال کی تھی۔ جہاز کے ڈیک سے آسمان کے ورق کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی نگاہیں ستاروں پر جم گئیں۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ وجود میں کیونکر آئے، ان کے ارتقا کے منازل کیا ہیں اور بالآخر ان کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ تین سال کی تحقیق اور غور و خوض کے بعد اس نے ستاروں کی پیدائش اور موت کے متعلق ایک جامع نظریہ

تیار کر لیا۔ سبرامنیم چندر شیکھر نے ۱۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو ۲۴ سال کی عمر میں رائل ایسٹرو فزیکل سوسائٹی کی میٹنگ میں اپنا نظریہ پیش کیا۔

اس نظریہ کا لب لباب یہ ہے کہ مرنے والے ستاروں میں سے جن ستاروں کا ماس (MASS) سورج کے ماس ۱.۴ گنے سے کم ہوتا ہے، وہ ستارے اپنا جوہری ایندھن ختم کرنے کے بعد ٹھنڈے ہو کر ایک گنجان مادے میں گر جاتے ہیں جسے "وھائٹ ڈوارف یا "سفید بونا" کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ ستارے جن کا وزن کری ٹیکل ماس (سورج کے ماس کے ۱.۴) سے زیادہ ہوتا ہے وہ "وھائٹ ڈوارف" کی منزل کے بعد بھی سکڑتے چلے جاتے ہیں اور زیادہ گھنے، اور زیادہ گھنے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کو بلیک ہول کہا جاتا ہے۔ سائنس کی کتابوں میں کری ٹکل ماس کو "چندر شیکھر کی حد" کا نام دیا گیا ہے۔

چندر شیکھر ستاروں کی ساخت کا مطالعہ چند سال کرنے کے بعد اس حیرت انگیز انکشاف تک پہنچ گیا۔ مدراس میں اسے ایڈنگٹن کی کتاب جو اس وقت کا سب سے بڑا اختر شناس تھا، انعام میں ملی تھی یہیں سے ستاروں میں اس کی دلچسپی کا آغاز ہوا اور بالآخر اس نے ان کی داستانِ حیات کی ساری منازل چھان ڈالیں اور وہ اس جگہ پہنچ گیا، جہاں تک اس سے پہلے کسی ہیئت داں کی نگاہ نہیں گئی تھی۔ چندر شیکھر نے کیمبرج پہنچکر اپنے ہیرو ایڈنگٹن سے رجوع کیا اور ۲۴ سالہ شاگرد اور ۵۲ سالہ استاد کی یہ دلچسپ جوڑی فلکیات کی سیر کے لئے باہم نکلا کرتی۔ لیکن آج اس اہم میٹنگ میں ایڈنگٹن نے چندر شیکھر کی بات کاٹ دی اور اس کے نظریہ کا مذاق اڑایا۔ اس ہونہار سائنس داں کی امنگوں پر اوس پڑ گئی۔

لیکن سبرامنیم چندر شیکھر ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ وہ سادہ مزاج اور وسیع الذہن انسان پھر اپنے کام میں لگ گیا اور پھر کیمبرج یونیورسٹی چھوڑ کر شکاگو چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر چندر شیکھر نے اپنے نظریہ کو ایک کتاب میں قلمبند کیا اور کتاب طاق پر رکھ دی اور دوسری تحقیقات میں مصروف ہو گیا۔ چندر شیکھر کا دن ۶ بجے شروع ہوتا ہے اور آدھی رات کو ختم ہوتا ہے۔ اس معمول میں کبھی تبدیلی نہیں آئی۔

۵۰ سال پہلے چندر شیکھر کے نظریہ کو دنیا نے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ آج اسی نظریہ پر اُسے نوبل انعام ملا ہے، ایسٹرو فزکس (ASTRO PHYSICS) پر سب سے پہلا نوبل انعام چندر شیکھر کی دریافت کی اہمیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اس کی EQUATIONS کو ہم خلا کی تحقیق (اسپیس ریسرچ) اور دور یابی REMOTE SENSING اور جدید علم ہیئت میں استعمال کرتے ہیں۔ دراصل اب کوئی بھی

میدان ایسا نہیں ہے جس میں اس کے گوناگوں انکشافات کو استعمال نہ کیا جاتا ہو۔

اور یہ سائنس داں جس نے انسان کے علم اور اس کے ذہنی افق میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ انتہائی سادگی اور انکسار کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، شہرت سے بے نیاز ہو کر اسے اپنے کام سے کام ہے، وہ اس ہندوستانی روایت کا مرقع ہے کہ سادگی سے رہو اور بلندی کی طرف نظر رکھو۔ "میرا مقصد ایک مسئلہ کو حل کرنا نہیں ہے، بلکہ ایک پورے رقبہ کا احاطہ کرنا ہے۔"

چندر شیکھر نے امریکن قومیت اختیار کرلی ہے، ہر چند کہ ہم نے ایک وقت میں اسے نادانی اور جانبداری کی بنا پر ڈیمانسٹریٹر کے چھوٹے سے منصب کے لئے رد کر دیا تھا۔ آج ہمارا سر فخر سے اونچا ہے کہ ہمارے وطن کی خاک سے فی زمانہ ایک ایسا انسان پیدا ہوا جس نے انسانی علم کو آگے بڑھایا۔ چند سال پہلے ہرگووند کھرانا نے بھی ہمیں اسی طرح فخر کا موقع دیا تھا۔ لیکن چندر شیکھر کی سادگی، قناعت، استقامت، سلامت روی اور نہ بجھنے والی علم کی پیاس اُسے اور بھی ممتاز کرتی ہے اور اسے ابنائے وطن سے بے مہری کی شکایت بھی نہیں۔ وہ نہ صرف بڑا سائنس داں ہے بلکہ بڑا آدمی بھی ہے۔ جس کی لگن کے ناخن نے ستاروں کی دنیا کے بہت سے رازہائے سربستہ کھول ڈالے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ملک نے سائنس کے فروغ میں حصہ لیا ہے اور اس کے بعض فرزندوں نے عالمگیر امتیاز حاصل کیا ہے۔ اس دن کا ہمیں ہنوز انتظار ہے، جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سائنس کی دنیا میں سرسید کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرے گی۔

●●

# ہماری ذہانت کا معیار

مشہور طنز نگار سوئفٹ نے ایک ایسے ملک کا ذکر کیا تھا جہاں یہ بحث کہ انڈے کو گول سرے یا نوکیلے سرے سے توڑا جائے، شدید، طویل اور تباہ کن اختلاف کا سبب بن گئی تھی۔ اور کیوں نہ ہو؟ اس خاکدان میں اختلاف ہی سے تو ساری چہل پہل ہے۔ اس کے بغیر دنیا سونی نہ ہو جائے؟ اور پھر اس سے زیادہ اہم موضوع ہو بھی کیا سکتا ہے۔ انڈے کی غذائیت سے کون سلیم الطبع انسان انکار کر سکتا ہے۔ اس میں غذا کے اتنے ذخیرے بھرے ہوئے ہیں کہ ایک زندگی وجود میں آتی ہے اور نشوونما پاتی ہے۔ انڈے کو بجائے اس کے کہ بچے کو وجود میں لائے اور اسے غذا فراہم کرے، اشرف المخلوقات انسان اپنے کام و دہن کی لذت اور اپنی نشوونما کے لئے بے محابا اُسے تصرف میں لے آیا ہے۔ اس کے بعد لازمی سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس "کنٹینر" (کن ٹے نر) اس سربمہر گلاس تک رسائی کس دروازہ سے ہونا چاہیے۔ "گول" کا روئے سخن وسعت اور کرۂ ارض کی طرف ہے "نوکیلے سرے" کا انداز تیر بہدف ہونے کا ہے۔ اس میں سمت کا تعین ہے اور گولائی میں ابہام کا چور چھپا ہوا ہے۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ اس نے گول جواب دیا۔ یا کسی بات کو ٹالنے کا ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں گول کرو۔ لیکن ہاکی اور فٹ بال کے میدان میں اُتر جایئے تو گول کی بے مقصدی اور بے سمتی افعال کے تعین اور مقصد کے حصول میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بہرحال گول سرے اور نوکیلے سرے والوں کی نوک جھونک ختم نہ ہونا تھی، نہ ہوئی۔

جہاں تک اقوام کا تعلق ہے، اس قسم کی معنی خیز اور مابعد الطبیعاتی بحثوں کو پناہ اور فروغ دینے میں گزشتہ صدیوں سے مسلمان پیش پیش رہے ہیں۔ انھوں نے سارے غیر اہم کاموں اور بے مصرف بکھیڑوں، مثلاً قدرت کے مشاہدہ، کتابوں کے مطالعہ، جستجو، ریاضت، مہم جوئی، طالع آزمائی، تحصیل علم اور تحقیق کو خیرباد کہہ دیا ہے تاکہ یکسوئی کے ساتھ ایسے اہم مسائل کو بیٹھے ہوئے گلے اور چڑھی ہوئی آستینوں اور کف بھرے ہوئے دہن اور گردن کی اُبھری ہوئی رگوں کا خراج دے سکیں، جیسے نماز میں "آمین" کو دبی ہوئی زبان سے ادا کیا جائے یا بلند آواز سے؛ رکوع میں جاتے وقت ہاتھوں کو کانوں تک اٹھائے جائیں یا نہیں۔ شہیدانِ کربلا کی یاد میں سُنّی اور شیعہ ایک دوسرے

کا خون ہر سال کتنے دنوں تک بہائیں، اور کتنے افراد کو اس لذیذ موقع سے استفادہ کا موقع دیں۔ پیر کے حضور سجدہ کرنے کے باوجود موحد ہونے کا دعویٰ کریں یا نہ کریں، اسلام جیسے ابتدائی سیدھے سادے، بے صیقل، صاف اور واضح مذہب کو جو طفلِ مکتب کی سمجھ میں آجائے اور جس پر عمل کرنے میں ذرہ برابر دشواری نہ ہو، سادگی اور بے رنگی کی تہمت سے کیوں نہ بچائیں۔ اصول اصول کی جو لوگ رٹ لگاتے ہیں، وہ آئینِ قدرت سے ناواقف ہیں۔ اصل کے سبھی جڑ کے ہیں۔ اور فروع بھی شاخ کے۔ پیڑوں پر نظر ڈالنے والے جڑوں کو کب دیکھ پاتے ہیں، تنا، ڈالیاں، ٹہنیاں، پھل پھول، پتے، کونپلیں ہی نظر آتی ہیں اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہیں۔ برگد کو بھول جایئے تو جڑوں کو صرف زیرِ زمیں پایئے گا۔ انھیں کھودنے سے کیا حاصل، جڑیں کھل جائیں گی، مٹی ہٹ جائیگی، تو ٹہنیاں سوکھنے لگیں گی، پتیاں مرجھا جائیں گی۔ اسی لئے تو اب ایک عرصہ سے مسلمانوں کے رہنماؤں نے انھیں اصول کی پرخطر وادی میں قدم رکھنے سے روک دیا ہے۔ انھیں فروعات کے برگ و بار سے آگے بڑھنے نہ دیا کہ ان سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے اور ذہن پر صیقل ہوتی ہے۔ اصول کی راہ میں ایک قباحت اور ہے۔ یہ راہ سیدھی ہے۔ کولھو کے بیل کی طرح ایک پٹے ہوئے راستہ پر آنکھ بند کر کے زندگی بھر چلتے رہیئے۔ ذہانت کو اس راہ میں جوہر دکھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ طبع زاد باتوں کے لئے دروازہ بند ہے۔ اس راہ سے انحراف، اجتہاد، ایجاد، اُپج، پرواز اور خوشخرامی کی راہیں پھوٹ ہی نہیں پاتیں۔ اصولوں کی بے کیف یک رنگی سے دل کیوں نہ گھبرائے۔ زندگی کیوں نہ اجیرن ہو جائے۔ اصولوں میں رکھا ہی کیا ہے سوائے پابندیوں کے۔ انسان ویسے ہی کیا کم مجبور ہے کہ ایک مجبوری اصولوں کے نام پر اور بڑھالی جائے۔ انسانی فطرت بندشیں قبول نہیں کرتی اور اسلام دینِ فطرت ہے[1]

●●

# مسلم اقلیت کی مشکلات کا مؤثر حل

**آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس** کے تذکرہ سے بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ملک میں مسلمانوں کی تعلیم سے اس کانفرنس کا گہرا تعلق تھا۔ اس کے خطبات مسلمانوں کے تعلیمی سفر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تاریخی خطبات سے صاف طور پر اندازہ ہوتا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک مرکز ہے جس سے پھوٹنے والی شعاعوں میں ایک شعاع یہ کانفرنس ہے۔ جس کے واسطے سے ملک کے ہر خطے میں بسنے والے مسلمانوں کو روشنی ملتی ہے۔

عام مسلم ادارے ہر جگہ خستہ حالی کا شکار ہیں۔ مجھے مراد آباد، بلند شہر اور گورکھپور کے اسکولوں کا حال قریب سے معلوم ہے جبکہ انھیں مقامات پر دوسرے ادارے برابر ترقی پذیر ہیں۔ یہ صورت حال ہمارے لئے تازیانۂ عبرت ہے۔ شمالی ہند میں یہ الم انگیز منظر زیادہ نظر آتا ہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں ہماری بے توجہی پوری طرح عیاں ہے۔ ہمیں یہ شکایت ہے کہ زمانہ ہمارے خلاف ہے لیکن کبھی ہم نے سوچا کہ کیا خود ہم اپنے خلاف نہیں؟

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ❊ کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

یقین کیجیے کہ اگر ہم اسی حالت پر باقی رہے، تو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیے جائیں گے۔

جنوبی ہند میں مسلمانوں کا تعلیمی معیار شمالی ہند کے مسلمانوں سے اچھا ہے۔ لیکن اگر وہاں کے غیر مسلموں سے ان کا موازنہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمان وہاں بھی دوسروں سے پیچھے ہیں۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمیں اپنے فرض کا احساس نہیں۔ ہم اولاد کی تعلیم کے سلسلے میں صرف مالی تعاون کو کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن صحیح تربیت کے لئے یہ تصور مضر ہے۔ مجھے انڈو یوکیشن کے ذریعہ معلوم ہوا کہ پسماندہ اقوام کے لڑکے مقابلے کے امتحان میں مسلم لڑکوں سے تعداد میں بھی زیادہ ہوتے ہیں اور قامت اور صلاحیت میں بھی اچھے ہوتے ہیں۔ اس بیان کا یہ مدعا نہیں کہ ہمتوں کو پست کیا جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس صورت حال کو ہم اپنے لئے پیغامِ عمل سمجھ کر اپنی جد و جہد تیز کردیں اور اپنی ترقی کے لئے خود کوشش کریں۔ ہمیں کسی ایسی ملک گیر قیادت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے جو

ہماری مشکلات کو حل کرے۔ ایسی قیادت کا موجودہ حالت میں وجود مشکل ہے۔ "مردے از غیب برون آید کارے بکند" والی بات کسی اور موقع کے لئے ہے۔ اس وقت ہر شخص کو اپنے دائرہ عمل و رسوخ میں کوشش کرنا چاہیئے۔ دو سو سال میں صرف ایک سر سید مرحوم کی شخصیت ایسی نظر آتی ہے جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح و ترقی کے لئے مثبت قدم اٹھایا؛ ان کے علاوہ ہر میدان میں بہت سی نمایاں شخصیتیں موجود تھیں لیکن الٰہ کے حصہ میں یہ دولت نہ آئی۔ ہمیں اصلاح کے لئے اپنے گھر، اپنے محلہ اور اپنے شہر سے ابتدا کرنی چاہیئے۔ ہمیں بقا میں دشواریوں کا ضرور سامنا ہے۔ لیکن اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے کمر کسنے کی ضرورت ہے۔ سہل انگاری اور اور خوش خرامی سے مسئلہ کا حل نہ ہوگا۔ علم کا سرمایہ دس سال میں دوگنا ہو جاتا ہے۔ ہم اگر جفاکشی و جہد مسلسل سے کام نہ لیں گے تو اس رفتار کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔

اقلیت کی بقا و خوش حالی کے لئے تین باتیں ضروری ہیں:

(۱) اوّل یہ کہ اقلیت اپنے دین و مذہب کی سختی سے پابندی کرے، اور ہمیشہ اس کے ذریعہ اپنے شیرازہ کو منظم رکھے۔

(۲) دوم یہ کہ محنت و ریاضت سے کام لے۔ اپنی قوت بازو کے ذریعہ آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ جانفشانی و تندہی سے کام لے کر اکثریت کا مقابلہ کرے اور ملک کی تعمیر میں دوسروں سے پیچھے نہ رہے۔

(۳) سوم یہ کہ ملک کی اکثریت کے ساتھ خوشگوار اور شگفتہ تعلقات رکھے۔

ہم کو ترقی کرنے کے لئے اپنے اندر احساس تناسب پیدا کرنا چاہیئے۔ آج ہم جزوی مسائل پر لڑتے ہیں لیکن اہم مسائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پہلے یہ مرض جنوب کے مسلمانوں میں نہ تھا۔ لیکن اب وہاں بھی یہ فتنہ پہنچ گیا۔ چنانچہ حیدرآباد وغیرہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ جس ملت کی بنیاد توحید پر تھی اور جس میں اتحاد و اتفاق پر غیر معمولی زور دیا گیا تھا، آج اسی کا اتحاد پارہ پارہ ہے۔ ہمارے اتحاد و اتفاق کی واضح بنیاد خود ہمارے دین میں موجود ہے لیکن ہم نے اسے بھی نظر انداز کر دیا۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

علامہ اقبال نے جو سوال کیا تھا، وہی سوال حالی اور دوسرے مصلحین بھی کرتے ہیں۔ ہمارے اداروں میں جو اختلافات ہیں، اُن سے کیا کوئی فائدہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ ضرورت ہو تو انسان اختلاف کر سکتا ہے، بحث کر سکتا ہے، لیکن بلا وجہ اختلاف کا کیا فائدہ۔ ہم پُرانے مسائل کو کیوں اُٹھاتے ہیں۔ ہمیں مستقبل سے متعلق سوچنا چاہیے، ماضی سے نہیں۔ ماضی سے ہم سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اختلافات کے لئے مواد فراہم کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی اصلاح کے لئے خود قدم اٹھانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کا حال جانتا ہے۔ وہی قیامت کے دن ہمارے مابین فیصلہ فرمائے گا، ہم کیوں فیصلہ کرتے ہیں؟ ایک شخص اگر اسلام کا اقرار کرتا ہے اور اس کی طرف سے مسلمانوں کی مخالفت یا تحریک کا کوئی عمل ظاہر نہیں ہوتا، تو ہمیں اس پر بھروسا کرنا چاہیے۔ یقین کیجیے تحریک کے لئے اختلاف اور تعمیری کاموں سے گریز تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

اُردو زبان و ادب کے انحطاط کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُردو پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی زبان کا ادب اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب اس کے ادیب کو عزتِ نفس کے ساتھ اپنا تخلیقی سلسلہ جاری رکھنے کا موقع ملے۔ آج اُردو کی کتابیں فروخت نہیں ہوتیں۔ اہلِ قلم کو اکادمیوں اور ریڈیو کے پروگراموں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس صورتِ حال کے اندر کسی اعلیٰ ادب کی تخلیق کی توقع عبث ہے۔ آج مدراس اور کرناٹک میں اردو کے تحفظ کے لئے کوشش ہو رہی ہے، حالانکہ اُردو ان کی مادری زبان نہیں۔ ہمیں اس سے سبق لینا چاہیے۔ ہم اتنی بڑی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی اپنی زبان کا تحفظ نہیں کر سکتے۔ حالانکہ یہودیوں نے ہم سے کم ہوتے ہوئے بھی اور سخت ترین حالات کا سامنا کرتے ہوئے بھی، اپنی مذہبی زبان عبرانی کو آج تک محفوظ رکھا ہے، بلکہ اس کو برابر ترقی دے رہے ہیں۔ اردو کو بچانے کے لئے ہمیں اس کو اپنے گھروں پر رائج کرنا اور اس کی تعلیم دینا چاہیے۔ ہماری روایت رہی ہے کہ گھروں میں بڑی بوڑھی عورتیں اُردو وغیرہ کی تعلیم دیا کرتی تھیں، اسی سلسلہ کو فروغ دینا چاہیے۔ اس لئے بھی اُردو کا تحفظ ضروری ہے کہ اس زبان میں ہمارا عظیم دینی و علمی و تمدنی سرمایہ موجود ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہوں کہ ریڈیو اور فلموں کے ذریعہ اردو محفوظ رہ جائے گی، تو یہ ہماری سادہ لوحی ہے۔ ہمیں سطح کو نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ اسے کرید کر گہرائی میں پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

آج ضرورت ہے کہ ہم باعزت زندگی کے لئے اور مشکلات میں اپنی بقا کے لئے کوشش کریں اور ملک کی ترقی میں حصہ لیں۔ ہم تعلیم میں بہت زیادہ پسماندہ ہیں لیکن اس بات کا احساس بہت تھوڑے لوگوں کو ہے، ان کا تناسب ٥ یا ١٠ فیصد سے زیادہ نہیں۔ ہمیں اپنی مدد آپ کرنے کے لئے تیار ہونے کی ضرورت ہے۔ حالی

اور اقبال کے پیغام کو مشعل راہ بنا کر چلنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں دنیا کے حالات کے مطالعہ سے اور اپنے تجربات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔ دل میں ملت کا درد پیدا کرنا چاہیے۔ ہماری نئی نسل اپنے ماضی سے واقف نہیں، اسے اپنے مصلحین کی نصیحتوں کا علم نہیں۔ اقبال کا کلام اور حالی کی مسدس ان کو پڑھانا چاہیے۔ مسدس کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ جاننا چاہیے کہ سرسید کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پوچھے گا کہ اپنی نجات کے لئے کیا کام کیا ہے، تو میں جواب دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوایا ہے۔

آپ جن منصوبوں کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، ان کو نافذ کیجیے، اور مستقبل سے متعلق اندیشہ کو راہ نہ دیجئے۔ اسکول کو ترقی دیجئے۔ لڑکیوں کا کالج قائم کیجئے اور ہمت سے کام لیجئے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ٭ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عقل کی لب بامی نے قوی کو شل کیا ہے۔ ابرہہ جب کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے آیا، تو عبدالمطلب اپنے اونٹ واپس لینے کے لئے اس کے پاس گئے۔ اس نے پوچھا اونٹ مانگنے آئے ہو، لیکن کعبہ کے متعلق کچھ نہیں کہتے؟ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ میں اونٹ کا مالک ہوں، اس لئے اس کی واپسی کا سوال کر رہا ہوں، رہا کعبہ تو اس کا مالک اس کی حفاظت کرے گا۔

اسی طرح آپ کوشش کیجیے۔ اگر آپ کا کام اللہ کی راہ میں ہوگا، تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور باقی رکھے گا۔ آپ دوسرے اداروں کے ذمہ داروں سے ملئے، ان اداروں میں اپنے طلبہ کے داخلے کے لئے کوشش کیجئے، ضرور آپ کی آواز سنی جائے گی۔ اور تعلیم کے سلسلہ میں یہ یاد رکھئے کہ نقشِ اول دینی تعلیم کو بنائیے اور گھروں میں بچوں کو دینی تعلیم دیجئے۔"

(مسلم ہائر سکنڈری اسکول الہ پورہ کی طرف سے دیئے جانے والے عصرانے میں تقریر)

● ●

# کاروانِ زندگی

اِسلام کے متعلق کبھی کبھی یہ خیال دل میں گزرتا ہے کہ : "خوش درخشید ولی شعلۂ مستعجل بود" یعنی خوب چمکا، لیکن جلد بجھ گیا۔

آٹھویں اور نویں عیسوی کے درمیان، تقریباً سَو سال کے اندر اس مذہب کے نام لیوا، اپنی علمی، اخلاقی اور عسکری فتوحات کی بدولت تقریباً (اس وقت کی) ساری دنیا پر چھا گئے۔ چار سَو سال تک وہ علم کے کاروان سالار رہے۔ اخلاق و کردار کی پاکیزگی کی ایسی مثالیں انسانیت کے سامنے لے آئے جن کی نظیر پیش کرنے سے دنیا ہر دور میں قاصر رہی ہے۔ لیکن جلد ہی مسلم معاشرے میں فساد راہ پا گیا۔ جس دین کے بازوؤں پر انھوں نے علوم کی تسخیر کی تخلیق کی تھی، اس دین کی روح کو انھوں نے اپنی گرفت سے نکل جانے دیا۔ جستجو، حرکت، ولولہ، تازہ دمی، انبساط، اتحاد، اور تقویٰ کی جگہ بےحسی، کاہلی، تن آسانی، تقلید، جمود، اور عیش پرستی اور سر اندازی نے لے لی۔ اپنے دین کی نسبت مسلمانوں کا وہی حال ہوا جو آئینے کے سامنے لائی ہوئی عبارت کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے دین کا عکس معکوس بن گئے۔ چنانچہ اغیار کے لئے اسلام کو سمجھنے کا آسان، مگر عبرت ناک طریقہ یہ رہ گیا ہے کہ مسلمانوں کے دین کو ان کے اطوار و احوال کے برعکس قیاس کریں، مگر وہ ایسا کیوں کرنے لگے۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ جتنے بُرے مسلمان ہیں ان کا مذہب بھی اُتنا ہی بُرا ہوگا۔ انھیں ایسا سمجھنے، حتیٰ کہ ایسا کہنے سے، کوئی روک نہیں سکتا۔ کس کو ایسی جستجو ہوتی ہے کہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرے اور پھر ان کی بابت رائے قائم کرے؟ لوگ مذہب کے متعلق رائے اس مذہب کو ماننے والوں کو برتنے اور اُن کے اطوار و اخلاق کو دیکھنے کے بعد قائم کرتے ہیں۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر اسلام خدا کا آخری پیغام ہے، اگر اسلام سے ہدایت خداوندی کا زرّیں سلسلہ پایان کو پہنچتا ہے، تو پھر کیا وجہ کہ اسلام کو بظاہر اس قدر جلد جراحت پہنچ گئی، اس کی ساکھ اتنے کم عرصے میں گر گئی؟ اس کے ماننے والوں کا شیرازہ اتنی جلد درہم برہم ہو گیا اور ان کے اخلاق اتنی تیزی کے ساتھ بگڑ گئے؟

یہاں ہمیں اسلام اور مسلمانوں کے درمیان فرق کرنا پڑے گا۔ خود کو بدر کے میدان میں لے جائیے۔ کل کفارِ مکہ کے لشکرِ جرار سے مٹھی بھر مسلمانوں کا مقابلہ بدر کے میدان میں ہوگا۔ دونوں فوجیں صف آرا ہیں۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے دن، لشکر کو ترتیب دینے، خندق کھودنے، اور کھدوانے اور صفِ جنگ کی ترتیب کو آخری شکل دینے میں صرف کیا۔ رات کو جب سب ساتھی سو گئے تو آپؐ نے پروردگار سے رجوع کیا۔ گڑگڑاتے رہے اور فتح و نصرت کی دعا مانگتے رہے کہ یا رب کل کی جنگ میں مسلمان ہار گئے تو پھر دنیا میں تیری عبادت کرنے والا، تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی دعائیں سن لیں، دین مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ اسلام قیامت تک کے لئے محفوظ ہو گیا۔ محفوظ نہ صرف اس طرح کہ ترتیب و حفظ قرآن کا محکم انتظام ہو گیا، بلکہ اس طرح بھی کہ اسلام کی مکمل تشریح احادیث کی روشنی میں، مکمل ترجمانی سیرتِ رسولؐ کے ذریعہ؛ اور اس کی وضاحت صحابہ کرامؓ کے اطوار و کردار کی شکل میں اور اسلام کی سچائی کا اثبات اس کی اخلاقی اور ذہنی تسخیرات کے ذریعہ کر دیا گیا۔

لہٰذا اس خلش انگیز خیال کا جواب جس کا ذکر آغازِ داستان میں آیا تھا، کچھ اس طرح بن پڑتا ہے کہ اس پیغامِ ہدایت میں تحریف و ترمیم کی گنجائش نہیں رہی۔ مسلمان کتنے ہی زبوں حال، گمراہ اور بدکردار کیوں نہ ہو جائیں ان کے دین کی سالمیت پاکیزگی اور ابدیت پر اس کا اثر کچھ بھی نہیں پڑتا۔ جو دین خلقِ خدا کے لئے رحمت بن کر آیا تھا، وہ اب بھی رحمت بنا ہوا ہے اور رحمت بن کر رہے گا۔ ابد تک۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام اپنے نام لیواؤں تک محدود نہیں رہا، ساری انسانیت اس سے متاثر ہوئی۔ کوئی مذہب اب ایسا نہیں ہے جس کے ماننے والوں پر اسلام کی انقلاب آفریں تعلیمات کا اثر نہ پڑا ہو۔ خورشید جب کرنوں کے بھالے تانے ہوئے اپنے خیمے سے نکل آتا ہے، تو لوگ رات کے گھور اندھیرے کو بھول جاتے ہیں۔ خورشید کی کرنیں، اس کی بصارت افروز روشنی، اس کی حیات انگیز حرارت، ساری دنیا اور اس پر رہنے والی ساری مخلوق کے لئے ہے۔ کوئی ایک طبقہ یا گروہ اس کو سمیٹ نہیں سکتا، محدود نہیں کر سکتا۔ نہ اوٹ بن کر دوسروں کو محروم کر سکتا ہے۔ اسلام کیا آیا، سارے مذاہب کے ماننے والوں نے ایک خدا کو کسی نہ کسی عنوان سے تسلیم کر لیا۔ خدا کا تصور جو بعض ادیان میں دب گیا تھا، قرنوں کی گرد اپنے دامن سے جھاڑ کر پھر ابھر آیا۔ توحید، غیر مخلوط توحید کو ساری انسانیت نے بطرزِ مستقیم یا بالواسطہ تسلیم کر لیا۔ ایک خالق کو ماننے کے بعد عقاید اور اعمال کی صفائی اور پاکی کے لئے بہت سی راہیں نکل آئیں۔ خود ہندوؤں نے اسلام کے زیرِ اثر ویدک دور کی خدا شناسی کو دوبارہ حاصل کر لیا اور چمکا دیا۔

توحید ہی نے اخوت کو جنم دیا۔ اخوت، بے آمیزش اخوت، کا اعلان جیسا اسلام نے کیا ہے، پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اب جبکہ اخوت کا اصول انسانیت کے لئے جزوِ ذہن بن چکا ہے، یہ اندازہ لگانا مشکل ہے

کہ ایک زمانہ میں یہ تصوّر کتنا غریب اور بعید تھا اور اس کو ذہنوں میں داخل اور زمانے میں رائج کرنا کتنا بڑا انقلاب تھا۔

اس سے بھی زیادہ اہم کردار اسلام نے مساوات کے تصوّر کو دلنشین اور مساوات کے تقاضوں اور مضمرات کو منوا کر ادا کیا۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی عالم اسلام میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو وسائل کی کمی کی بنا پر تحقیر سے نہیں دیکھ سکتا۔ ہندوستان میں کیفیت البتہ مختلف ہے کہ یہاں جاتی واد کا زور رہا ہے۔

اس عالمگیر انقلاب کے اجزائے ثلاثہ کا جو اسلام نے بپا کیا، تیسرا جزو حریت ہے۔ اسلام نے غلامی کو بند نہیں کیا، لیکن پہلے قدم کے طور پر اس کو گوارا، بلکہ خوشگوار اور تحقیر، ظلم وستم اور ناانصافی سے محفوظ کر دیا۔ مساوات نے شہ دی اور حریت نے جرأتِ حق گوئی کو اسلامی خصائل کی صف میں بٹھا دیا۔

انسان کو مندرجہ بالا اصولوں کے تحت اسلام نے انسان کو عزتِ نفس دی اسے اس کے افعال و اعمال کے لئے ذمّہ دار ٹھہرایا۔ اسلام نے انسان کو عذر، معذرت، وسیلہ، سفارش، حیلہ، بہانہ، ابہام و اشکال کے دلدل سے نکال کر مسئولیت کی مضبوط دھرتی پر کھڑا کر دیا۔ اب فرد کو یہ اختیار نہیں رہا کہ اپنی غلطیوں اور تباہ حالیوں کے لئے دوسرے انسانوں یا اپنے مقدر کو موردِ الزام ٹھہرائے۔ یا معذوری اور مجبوری کا عذر کر کے اپنی ذمّہ داریوں سے گریز کرے۔

ان جاں بخش اصولوں کی روشنی نے توہمات، ضعیف الاعتقادی، دارہ بانی، گریز اور غیر ذمّہ داری کے اندھیرے کو دُور کر دیا۔ اسلام نے ٹونے اور ٹوٹکے کے سادہ اصول پر اخلاق کی بنیاد رکھی۔

ان بڑے بڑے عیبوں کے خلاف جنہوں نے ابتدائے آفرینش سے انسان کو خوار و زبوں رکھا ہے اور جنہوں نے بےشمار دوسری برائیوں کو رواج دیا ہے، جنہوں نے اُم الخبائث بن کر لاکھوں گھر برباد کیے ہیں، ان کے خلاف سب سے مؤثر جہاد اسلام نے کیا، یعنی شراب نوشی، جوا، اور زنا۔ اسلام نے پہلی بار عورت کو تحقیر، ظلم، استحصال اور ناانصافی کا ہدف بننے سے بچایا اور اس کے انسانی مرتبے اور حقوق کو تسلیم کیا۔

اسلام کے ان اوصاف کو دُنیا نے عام طور پر تسلیم کیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور وصف ہے جس کی طرف نظر کم گئی ہے۔ وہ ہے ہر دَور، ہر خطّے اور ہر گوشے میں ایسے انسانوں کا پیدا کرنا جو انسانیت کے معیار پر پُورے اُترتے ہوں، جو پانی میں رہتے ہوئے اپنا دامن تر نہ ہونے دیں، جن کے دل میں خوفِ خدا ہو اور جو دنیا کی کسی طاقت سے نہ ڈرتے ہوں، جنہیں کوئی طاقت کلمۂ حق کہنے سے نہ روک سکے۔ برائی کے باوجود جن کے دل کا دامن برائی کے احساس سے آلودہ نہ ہو، جنہیں سیدھے راستے سے نہ کوئی ڈر ہٹا سکے، نہ کوئی لالچ، تواضع جن کا مزاج ہو، انصاف جن کا شیوہ، فروتنی جن کی خُو ہو، انسان دوستی اور ہمدردی جن کا مسلک، اور بے لوث خدمتِ خلق جن کا

مقصدِ زندگی۔ یہ لوگ نرم خو اور آہستہ رَو اور سراپا سکون ہوتے ہیں۔ لیکن حق کی حمایت میں چٹان کی طرح سخت اور باطل کے مقابلے میں شمشیر کی طرح قاطع۔ یہ لوگ بُرائیوں سے بچنے کے لئے دنیا سے گریز نہیں کرتے، دوسروں کو بُرائیوں سے بچانے کے لئے دنیا میں لپٹتے ہیں۔ اس وقت جبکہ ہوا، اور فضا، مٹی اور پانی سب آلودہ نظر آتے ہوں، یہی ان کی آنکھوں میں ہوتی ہے، دامن پر نہ آلودگی ہوتی ہے، نہ نمی۔ مزدور جب ٹھیکے پر کھدائی کرتے ہیں تو قطعۂ زمین کے ایک چھوٹے سے حصے کو تیشہ کی ضرب سے بچا کر چھوڑ دیتے ہیں، تاکہ جب پیمائش کا وقت آئے کہ کتنی مٹی کھودی گئی تو جو حصہ تیشہ سے مَس نہیں ہوا، اس کی نشان دہی کرے کہ کس سطح سے کھدائی شروع ہوئی تھی۔ مذکورہ نفوس اسی بچے ہوئے تودے کی طرح ہیں، جس سے موازنہ کرکے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ہم کس حد تک نیچے گئے ہیں۔ یہ لوگ اس لائٹ ہاؤس یا منارۂ نور کی مانند ہیں جو اپنی جگہ سے نہیں ہلتا، لیکن دور دور تک جہازوں کو پُرخطر چٹانوں سے دور رکھتا ہے جن سے اگر وہ ٹکرا گئے، تو پاش پاش ہو جائیں گے۔

پس ہماری دانست میں اسلام کا بڑا کارنامہ نہ صرف یہ ہے کہ اس نے ایک قلیل عرصے میں ایک زبردست انقلاب، اسلام کی اخلاقی اور ذہنی کائنات میں برپا کر دیا، نہ صرف یہ کہ اس نے اپنے فیوض کو ان لوگوں تک محدود نہیں رکھا جو اس پر ایمان لے آئے اور اپنی قدروں اور لازوال اصولوں سے ساری انسانیت کو متاثر کیا، بلکہ یہ بھی کہ اس نے قیامت تک ایسی کامل اور پاکیزہ شخصیتوں کو متواتر وجود میں لانے کا اہتمام کیا، جو دنیا کی ترغیبات و ترہیبات اور خبائث و مکروہات سے سرِ مو اثر پذیر نہیں ہوتیں۔ یہ لوگ ان زمانوں میں بھی جبکہ بدی عادی نظر آتی ہے اور موج در موج بڑھتی چلی جاتی ہے اس طرح پاکیزہ اور پُرسکون زندگی گزارتے ہیں جیسے کہ ماحول اور موسم ان پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتا۔ جس طرح ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ سورج پورب سے نکلے گا، اسی طرح ہم ان کے متعلق پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہ ہوگی اور کوئی دنیاوی طاقت انھیں حق طرازی، حق پیمائی اور حق گوئی سے باز نہیں رکھ سکے گی۔ یہ بظاہر سیدھے سادے کمزور اور نرم گو انسان بڑے سے بڑے طوفان کے مقابلے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان ہی کے لئے کہا گیا ہے:

مردانِ خدا، خدا نہ باشند ✤ لیکن ز خدا، جدا نہ باشند

[خدا رسیدہ لوگ خدا نہیں ہیں، لیکن خدا سے جُدا بھی نہیں ہیں]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قادرِ مطلق نے جب دین کے اتمام و تکمیل کا فیصلہ کیا اور انبیاء کرام کے نزول سلسلہ پر خاتمہ کی مُہر لگا دی تو یہ بھی مقدر ہوا کہ دین کی ترجمانی کے لئے خُدا کے نیک بندوں کا ایک سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا جن پر موسم اور لیل و نہار کے تغیرات کا کوئی اثر نہ ہوگا، اور جو بگڑی ہوئی قدروں کی پرچھائیں بھی دامنِ دل پر نہ پڑنے دیں گے جن کی ذاتِ گرامی تاریکی، بیدینی اور بدعملی کے بحرِ ذخار میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھے گی۔ ان ہی لوگوں کی برکت ہے کہ دنیا باوجود گناہوں اور بداعمالیوں کے ابھی تک تباہ نہیں ہوئی۔ خدا کا فضل ہے کہ یہ لوگ کتاب و سنت کے حامل اور پابند ہیں ہر ایک دَور میں ایک دو نہیں سیکڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ آپ اپنے جوار میں دور تک دیکھئے۔ ایک آدھ بزرگ ایسے ضرور نظر آئیں گے جن کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، مرنا جینا صرف خدا کے لئے ہوگا۔ انسانیت کو اگر جسم تصور کیا جائے، تو یہ لوگ اس میں آنکھوں کا مقام رکھتے ہیں۔ طمع اور خوف کے علاوہ یہ ... سے بھی بالاتر ہوتے ہیں۔ واقعی یہ اسلام کا کرشمہ ہے کہ ایسے نفوس کا سلسلہ اسی کثرت کے ساتھ جاری ہے۔

# زادِ راہ اور راہنما

سرسید نے اخلاص کو زادِ راہ اور عقل کو راہنما بنایا تھا۔ عقل راہنما نہ ہو تو بات بنتی نہیں۔ عقل انسان کا امتیازی وصف ہے۔ لہٰذا جو لوگ انسان کہلاتے ہیں اور انسان کی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتے ہیں وہ عقل کی رہنمائی کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل، بے حس اور بے مہر عقل، کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکتی۔ اسے جذبہ کی رفاقت، تائید اور متابعت درکار ہوتی ہے۔ بغیر جذبہ کے عقل بے جان رہ جاتی ہے اور بغیر عقل کے جذبہ بے مہار اور خودسر ہو جاتا ہے۔ عقل کا کام ہے جذبہ کو قابو میں رکھنا اور اس سے کام لینا عقل کا کام ہے۔ بھلے اور بُرے میں امتیاز کرنا اور افعال کے نتائج سے آگاہ کرنا۔ جذبات منہ زور گھوڑوں کی طرح ہیں، جن کی روک تھام صرف عقل کر سکتی ہے۔ اور کبھی کبھی ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب عقل بھی نہیں کر سکتی۔

سرسید نے جن کی نظر اجتماعی نفسیات پر گہری تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کا جائزہ لیا تو یہ بات ان پر واضح ہوگئی کہ انھوں نے جذبات کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے، جذبات جس راہ پر انھیں چلاتے ہیں اس پر وہ چلتے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جذبات کی رَو میں بہنے اور نفع و نقصان سے آنکھیں بند کر لینے کا انجام خودکشی ہے۔ لہٰذا انھوں نے عقل کی بالادستی اور علم کی رفاقت پر زور دیا تاکہ انفرادی جذبات اجتماعی شعور کے تابع فرمان ہو جائیں۔ قارئین کرام واقف ہیں کہ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کی پیش رفت کے لئے تگ و دو سے وہ تحریک شروع کی جسے ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ تحریک علم و عقل کی تحریک تھی۔ ہم نے یوم سرسید پر ایک تقریر "مقام نیم تعبیر" کے عنوان سے کی تھی۔ ماحصل اس کا یہ تھا کہ سرسید کا خواب شرمندہ نیم تعبیر ہوا۔ یہ تحریک ۵۰ سال چل کر مضمحل ہوگئی اور اب روبہ زوال ہے۔

گزشتہ سال یوم سرسید پر ہم نے "تہذیب الاخلاق" میں ایک مضمون "کنگ لیر" کے عنوان سے شائع کیا تھا جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ایک احسان فراموش بلکہ محسن کش اور تیرہ باطن قوم نے اس عظیم رہنما کی نیت پر رکیک حملے کیے اور اس کے دل کو طنز کے تیروں سے چھید ڈالا۔

آج کی صحبت میں ہمیں یہ دکھانا ہے کہ ہرچند کہ یہ انسانی ڈائینمو' اس بطلِ جلیل کی غیر معمولی اصلاحی طاقت کے تحت ایک ملت جہالت سے ناتہ توڑنے اور علم سے رشتہ جوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ تاہم اُس نے سر سید کے پیغام کو جو روشنی، عقل، سلامت روی، ہوش و گوش، اعتدال، توازن، ثبات، صبر اور استقلال کا پیغام تھا، قبول نہیں کیا، اُس نے ارزاں جذباتیت، کم کوشی اور تن آسانی سے اپنا تعلق بنائے رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بسنے والی قوموں میں مسلمان سب سے زیادہ سادہ لوح، جذباتی، عاقبت نا شناس، زود مشتعل، اور فریب خوردہ ہیں۔ یہ عام کیفیت ہندوستانی مسلمانوں کی ہے جو اپنی انتہائی شدت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یوں بھی یونیورسٹی کا مزاج تحقیق، تفتیش اور تجزیہ کا ہوتا ہے۔ جس پر سر سید کی ساری تحریک مبنی تھی، استدلال، تمحیص، اور تفحص پر۔ تاریخ کا بہت بڑا طنز ہے کہ اس یونیورسٹی میں جو سر سید کی تحریک کا مرکز ہے، مزاج کی تشکیل ان گھڑ، بھونڈے، بے صیقل اور نا تراشیدہ جذبات سے پُر ہوتی ہے۔ یہاں سے عقل اور ہوش و گوش اور عاقبت اندیشی اور خود و خوض کو دیس نکالا مل گیا ہے۔

جس قدر تکلیف زندگی میں سر سید کو تنگ نظر اور خصومت پیشہ معترضین کے پُر عناد اعتراضات سے ہوئی ہوگی، اس سے کہیں زیادہ ایذا انھیں پہنچے گی، اگر وہ دوبارہ زندہ ہو کر یونیورسٹی کے اندازِ مزاج اور طرزِ نگاہ کو دیکھیں۔ انھیں یہ دیکھ کر کس قدر کرب ہوگا کہ جس روش پر وہ نوجوانوں کے مزاج کو ڈھالنا چاہتے تھے اس کے برعکس اُسے پا رہے ہیں۔ بڑے میاں سر پیٹ لیں گے کہ الٰہی یہ کیا۔ وہ دیکھیں گے کہ تحقیق کی جگہ افواہ، تفتیش کی جگہ اختراع، صداقت کی جگہ دروغ، کاوش اور جانفشانی کی جگہ تن آسانی اور چرب زبانی، نظم و ضبط کی جگہ ہنگامہ خیزی، اور دریدہ دہنی نے لے لی ہے، تو اس برصغیر میں انقلاب برپا کر دینے کے باوجود وہ محسوس کریں گے کہ ان کی ساری مساعی رائگاں اور تمام کوششیں اکارت ہو گئیں۔ ان کا مقصد علم کا لبادہ پہنانا نہ تھا، بلکہ زاویۂ نگاہ کو درست کرنا تھا۔ اس میں درستی کے بجائے کجی دیکھیں گے تو ان پر کیا گزرے گی!

# ۲

مختصر یہ کہ سرسید کی بات کو مسلمانوں نے یہاں تک سُنا کہ دنیا سے کنارہ کشی کی مذموم رسم کو ترک کر دیا اور یاس کے لبادہ کو تار تار کر کے پھینک دیا اور حکومت وقت سے بے تعلقی اور اس کے خلاف سلگنے کی بے مصرف روش سے باز آ گئے اور انگریزی تعلیم کو بادلِ نخواستہ قبول کر لیا۔ لیکن جدید تعلیم کی اشاعت اس تیزی کے ساتھ نہ ہو پائی، حالات جس کا تقاضا کر رہے تھے۔ سرسید کی رحلت کے ۵۰ سال بعد جدید تعلیم کی تحریک کا زور ٹوٹنے لگا۔ ۱۸۵۷ء کے ۹۰ سال بعد مسلمانانِ ہند کو ایک دوسرے پُر آشوب دَور کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ملک کی تقسیم اور اس سے متعلق ہنگاموں نے ان مسلمانوں کے حوصلے کو جو ہندوستان میں رہ گئے تھے توڑ دیا اور وہ غصہ، مایوسی اور بے بسی کے عالم میں ایک بار پھر خول کے اندر سرک گئے، گرد و پیش سے بے تعلق اور بے حس اور ملک کی ترقی اور خوشحالی سے بے نیاز اور بے بہرہ ہو کر۔ تعلیمی پسماندگی نے ہر قدم پر ان کا راستہ روکا۔ کچلے ہوئے جذبات کو انھوں نے حرزِ جاں بنایا۔ کڑھتے رہے، سلگتے رہے۔ ان کا ردِّ عمل سر بسر جذبات پر مبنی تھا۔ انھوں نے اس زبوں حالی میں بھی عقل کی رہبری قبول نہ کی۔ جذبات کی رَو میں بہتے رہے۔ عقل کو منھ نہ لگایا۔ اس لیے پے در پے مات کھائی۔ علیگڑھ ہندوستانی مسلمانوں کا دل اور ان کے طرزِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی نے، بجائے اس کے کہ وہ ان مسائل پر، جو مسلمانوں کو آزادی اور تقسیم کے بعد لاحق ہوئے تھے، غور و فکر کرتی، ۱۹۶۵ء کے سانحے کے بعد ساری توجہ اقلیتی کردار کی بازیابی پر مامور کر دی۔ ہمیں اس کردار کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اعتراض ہے اس ابہام اور ناعاقبت اندیشی اور سادہ لوحی پر جس نے سارے حقائق کا بدل ایک نعرہ کو سمجھ لیا۔ ذرا دیر کے لئے بھی ہم نے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا۔ اگر پہلوؤں اور مضمرات کو فکر کے احاطے میں لے آیا گیا ہوتا تو وہ درد انگیز انکشافات نہ ہوتے جو ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ کو برتنے پر ہوئے۔ اقلیتی کردار کے مبہم مطالبہ اور یونیورسٹی کی تعریف اور کورٹ کی تشکیل پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانے کے بجائے ٹھوس بنیادی امور کو ایکٹ کی گرفت میں لائے ہوتے۔ جذبات ساری تحریک پر چھا گئے اور عقل کو نفع و نقصان کے پرکھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ یہ مسئلہ سرسید کی زندگی میں اٹھا ہوتا، تو وہ اس کے حل کے لئے کسی تحریک کی ضرورت سرے سے سمجھتے ہی نہیں۔ حکومت کو استدلال سے قائل کرتے۔ ان کا ہدف مبہم اقلیتی کردار

نہ ہوتا، بلکہ وہ چند ایسی ٹھوس باتیں منوا لیتے، جن کے نتائج خاطر خواہ ہمہ گیر، نفاذ پذیر اور دُور رس ہوتے۔ اگران کے دلائل اور مطالبے کو حکومت رَد کرتی، تب کہیں تحریک کی نوبت آتی جس کی بنیاد ابہام پر نہیں تفریحات پر ہوتی۔ وہ دانا بینا انسان کبھی سراب کے تعاقب پر راضی نہ ہوتا۔ اسکی حکمتِ عملی موانع اور مخالفت سے عہدہ برآ ہوتی۔

سیّد والا گہر کی رحلت کو چوتھائی صدی بھی نہ گزری تھی کہ علیگڑھ اور مسلمانانِ ہند نے ہوش و گوش اور سوجھ بوجھ اور عقل و دانش کے اس سبق کو بھلا دیا جو انھوں نے دیا تھا۔ چنانچہ ان کے شاگرد علی برادران خلافت کی تحریک کو لیکر اُٹھے۔ مسلمانانِ ہند نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور قریب تھا کہ ان کے سب سے قیمتی سرمایہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھی اس تحریک پر قربان کر دیا جائے۔ ہر طرف جذبات کا بول بولا تھا۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ہندوستان کے مسلمان خلافت کے جسدِ بے جان میں روح کیونکر پھونک سکتے ہیں۔ اور اگر بفرضِ محال پھونک بھی دی تو خود ان کو اس سے کیا حاصل ہوگا اور دنیائے اسلام کو کرم خوردہ خلافت سے کیا ملے گا۔

یہاں تک ذکر تھا رہنما عقل کا جسے ہم نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ عقل سے ہم نے سرسید کے جاتے ہی ناتہ توڑ لیا۔ اب تذکرہ ہوگا زادِ راہ یعنی اخلاص کا۔ سرسید نے فکر اور نظر میں ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ ایسا کرنے کے لئے انھیں کون سے جتن تھے جو نہ کرنے پڑے۔ کون سی قربانی تھی جو نہ دینی پڑی۔ ساری صعوبتیں، خصومتیں اور تکلیفیں انھوں نے اخلاص کے سہارے برداشت کیں۔ ان کے اخلاص کا نتیجہ ہے کہ علیگڑھ تحریک ہندوستان بھر میں تعلیم و روشنی کے برگ و بار لائی۔ علیگڑھ کے طلبا ایک لڑی میں پرو دیئے گئے۔ بانی کے حسنِ نیت کی بدولت علیگڑھ مسلم یونیورسٹی پُر آشوب ادوار سے جانبر ہوئی اور آج بھی پھل پھول رہی ہے۔

ماتم اس بات کا ہے کہ اخلاص کی روایت بھی یونیورسٹی سے فنا ہو گئی۔ اب جسے دیکھیے نفسی نفسی میں گرفتار ہے۔ کم ہیں ایسے لوگ جو اپنے چھوٹے سے فائدے کے لئے یونیورسٹی کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اخلاص نام کی کوئی شے یہاں دور دور نظر نہیں آتی۔ خود غرضی کا دَور دَورہ ہے۔ آرزو صرف یہ ہے کہ یونیورسٹی سے جو کچھ مل سکے لے لیا جائے اور اس کے عوض اسے کچھ نہ دیا جائے۔ عمارت کے لئے اخلاص مسالے کا کام کرتا ہے۔ اس کے بغیر اینٹیں الگ رہتی ہیں۔ جُڑ نہیں پاتیں۔ ہوا ذرا سی تیز ہوئی اور دیوار اڑا اڑا دھم، زمین پر آگئی۔ خود غرضی جب رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو افراد پنپ جائیں تو پنپ جائیں۔ جماعت کا شیرازہ بکھرا رہتا ہے۔ یہی حال اس وقت یونیورسٹی کا اور ہندوستانی مسلمانوں کا ہے۔ ان کے لئے ترقی کا سفر اور پیش رفت کے منازل طے کرنا محال ہو گیا ہے۔ سفر کریں تو کیسے؛ زادِ راہ ہی نہیں۔ نہ زادِ راہ، نہ راہنما، نہ اخلاص، نہ عقل۔

••

# خطا کس کی ہے؟

۱۵ اگست کے گارجین نے ایران و عراق کی لڑائی کا اعتراف اداریہ سے کیا ہے۔

"یہ لڑائی شروع ہوئی اور ختم ہونے میں نہیں آرہی ہے صرف اس وجہ سے کہ دو ضدی آدمی آیت اللہ خمینی اور صدام ایک دوسرے کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ لیکن لڑائی سے اتنا زبردست نقصان ہرگز نہ ہوتا، اگر دوسرے ممالک نے ہتھیار نہ بھیجے ہوتے۔ لہٰذا اس بڑے نقصان کی ذمہ داری خلیج تک محدود نہیں ہے۔ امریکہ اور روس نے اپنی حکمتِ خارجہ کا ایک اہم اوزار اسلحہ کی فروخت کو بنا رکھا ہے۔۔۔۔ "سپری" THE STOCKHOLM INTERNATIONAL PEACE RESEARCH INSTITUTE کے جمع کیے ہوئے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ان دونوں ممالک کے ہتھیاروں کی فروخت کا زیادہ حصہ تیسری دنیا کی قسمت میں لکھا ہے۔ روس دنیا بھر میں بکنے والے کل اسلحہ کا ۷۰ فی صد اور امریکہ ۵۶ فی صد ترقی یافتہ ممالک کو بیچتا ہے۔ امریکہ کے اسلحہ کے گاہکوں کی تعداد روس کے گاہکوں سے تین گنی زیادہ ہے اور سوویت روس اسلحہ بیچنے والے ممالک میں اول ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روس کے گاہک، جن میں عراق بھی شامل ہے، بہت بڑی مقدار میں اسلحہ خرید لیتے ہیں! اسلحہ برآمد کرنے والوں میں تیسرا نمبر فرانس کا ہے، اور چوتھا نمبر برطانیہ کا ہے۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء تک سب سے زیادہ اسلحہ خریدنے والے ممالک میں سے ۱۷ مشرقِ وسطیٰ میں تھے۔ عرب ممالک میں واقعات کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔ پہلا اسلحہ خریدو پھر ان کے استعمال کی صورت نکالو۔ فرانس عراق کو میزائل بیچنے والا ہے۔ ان کے ہدف خلیج میں پٹرول کے ٹینکر ہوں گے۔

یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ تیسری دنیا میں جہاں کہیں لوگوں پر بپتا پڑتی ہے، وہ مغربی ممالک کے اسلحہ کی فروخت کی وجہ سے۔ لیکن لڑائی کا پیمانہ اور اس کی مدت اور اس کے لائے ہوئے عذاب کا سرا براہ راست ان ترقی یافتہ ہتھیاروں سے جوڑا جا سکتا ہے، جو انھیں فراہم کیے گئے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک اسلحہ کی فروخت سے خود اپنے اسلحہ اندوزی کے پروگرام کو کمک پہنچا رہے ہیں۔ ایٹمی لڑائی دائرہ امکان تک محدود ہے لیکن روایتی انداز کی لڑائیاں دنیا میں جا بجا ہو رہی ہیں۔۔۔۔ بے شمار انسان لڑائی کا چارہ بن رہے ہیں اور دنیا مطمئن نظر آرہی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات میں مسلمانوں کے عبرت کا سرمایہ ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام کامل ترین دستورِ حیات ہے۔ یہ اخوت اور مساوات، رافت اور رحمت، اتحاد اور خیر کا پیام لے کر آیا۔ اپنے گریبان میں منھ ڈالیے اور بتایئے کہ ان میں سے کوئی وصف بھی اب ہمارے اندر نظر آتا ہے۔ ہم آپس میں لڑتے مرتے ہیں۔ ہم نے خود کو خباثت میں گلے گلے مبتلا کر رکھا ہے۔ تعیش ہمارا شیوہ ہے۔ جہالت اور بداخلاقی ہمارا وطیرہ۔ عراق اور ایران آپس میں دست و گریبان ہیں، اس پر مصر ہیں کہ ایک دوسرے کو تباہ کر دیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے بعض شہروں میں سُنّی اور شیعہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو سرمایۂ آخرت سمجھ رہے ہیں۔ دنیا کے باشندے کیا نتیجہ نکالیں گے اور اہلِ ہند مسلمانوں کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ کاش مسلمان یہ سمجھیں کہ اس وقت بظاہر ان میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ وہ دنیا میں باقی رہیں گے یا عزت کے ساتھ دیکھے جائیں گے۔

گارجین نے تسلیم کیا ہے کہ آگ پر تیل ترقی یافتہ ممالک چھڑک رہے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کی ذمہ داری کم نہیں ہوتی۔ اغیار تو تیل چھڑکیں گے ہی۔ ہم انھیں ایسا کرنے کا موقع کیوں دے رہے ہیں۔ کیا یہ ملت عقل و شعور، غیرت اور حمیت، اتفاق، اور اتحاد، اخلاق اور کردار کے لحاظ سے بالکل دیوالیہ ہو گئی ہے۔

یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ دنیا میں دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی تو برائیوں میں مبتلا ہیں، ان کے یہاں بھی جہالت اور نااتفاقی ہے۔ لیکن اس شدت سے کہاں ہے اور ان کے یہاں تاویل کی گنجائش کتنی ہے۔ اسلام کا مذہب اس قدر واضح ہے کہ اعمال میں انحراف کی ساری راہیں اس کے ماننے والوں کے لئے بند ہو گئی ہیں اور کڑے احتساب کی ساری راہیں کھل گئی ہیں۔ مسلمان اگر سب کچھ بھول کر صرف جہالت اور نفاق کی گرد اپنے دامن سے جھاڑ دیں تو وہی نہیں، ساری دنیا بدل جائے۔ کیونکہ سر دست انھوں نے اپنی غفلت اور بداعمالی کی نقاب اسلام کے روئے زیبا پر ڈال رکھی ہے۔ جو کوئی دیکھتا ہے اسلام کے متعلق حقارت انگیز رائے قائم کرتا ہے۔

••

# غرور اور فخر

غرور اور تکبر بے شمار برائیوں کی جڑ ہے۔ سبھی نظامِ اخلاق میں اس کی گنتی کبیرہ گناہوں میں ہوتی ہے۔ اسلام کو غرور ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ دنیا کا کوئی مذہب کوئی ضابطۂ اخلاق غرور کو روا نہیں رکھتا۔ ابلیس کی خطا صرف یہی تھی کہ اس نے گھمنڈ کے نشے میں اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے سرتابی کی کہ آدمؑ کو سجدہ کیا جائے۔ گھمنڈ اخلاق کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ وہ حقیر ذرّہ جسے آدمی کا نام دیا گیا ہے، جس کے وجود کا انحصار سانس کے ڈورے، خون کی گردش اور دل کی دھڑکن پر ہے اور جسے ایک لمحہ ثبات نہیں، اُسے تکبّر کیوں کر روا ہو سکتا ہے؟ وہ اِتراتا کس بات پر ہے۔ اسے زعم کاہے کا ہے؟ تکبر کرنے والا خدا کی نہیں صرف اپنی پرستش کرتا ہے۔ وہ اشیا، حالات اور افراد اور مسائل کے متعلق صحیح رائے قائم ہی نہیں کر سکتا کہ ان سب پر خود اس کی شخصیت اور نخوت کا سایہ پڑنے لگتا ہے۔ اس کے سوچنے کے انداز میں کجی آجاتی ہے۔ وہ فیصلہ اپنی خوشی، آسایش، غرض اور رجحان کو سامنے رکھ کر کرتا ہے شئے کی اچھائی اور برائی سے بے نیاز ہو کر انسان جیسے کمزور وجود کا اکڑ کر چلنا کتنا مضحکہ خیز ہے۔

گھمنڈ، اِتراہٹ، غرور، اکڑ، نخوت، انانیت، خود پرستی یہ سب تکبّر کی ہی شکلیں ہیں۔ ان کا نقصان حامل کو اس طرح پہنچتا ہے کہ وہ ہوش و گوش اور تناظر و تناسب اور بصیرت و شعور اور شئے لطیف سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کا افق سمٹ جاتا ہے۔ جو رائے ساری کائنات کے پس منظر میں قائم کرنا چاہیے تھی، متکبّر اور گھمنڈی انسان اسے اپنی شخصیت کے سکڑے ہوئے اور حقیر پس منظر میں قائم کرتا ہے۔ ایسی صورت میں رائے کے صائب اور فیصلے کے درست ہونے کا امکان بھی نہیں رہتا۔ چونکہ اس کی ذات بیچ میں آجاتی ہے، لہٰذا عقل پر جذبات کا کُہرا چھا جاتا ہے اور عقل کی آنکھوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ عقل کو جو صلاحیت پرکھنے کی دی گئی ہے وہ مفلوج ہو جاتی ہے۔

انسان تنہا رہ کر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا کام آگے جب ہی بڑھتا ہے، جب دوسرے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ شرکت اور تعاون کے لئے باہمی ہمدردی اور انسیت درکار ہوتی ہے۔ گھمنڈی انسان سے لوگ کترانے لگتے ہیں۔ گھمنڈ کی قبا میں دوسروں کی تحقیر کا استر لگا ہوتا ہے۔ گھمنڈی کو ہر شخص ناپسند کرتا ہے اور

جب تک سخت غرض نہ پڑے۔ اس سے دور رہتا ہے۔ مغرور آدمی نادانستہ دلوں کو توڑتا ہوا چلتا ہے۔

کبر اور غرور میں فرق ہے اور اس سے کہیں زیادہ فرق غرور اور فخر کے درمیان ملے گا۔ فخر اور ناز بھوٹتے ہیں اعتماد اور ولولے سے۔ فخر کا شمار اچھے خصائل میں ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں اترانے کا پہلو اور دوسروں کی تحقیر پنہاں نہ ہو اور اپنی کم مائگی کا احساس مضمر ہو۔ کوئی فرد، کوئی طبقہ، کوئی قوم اور کوئی ادارہ صحت مند فخر سے محروم ہو کر پنپ ہی نہیں سکتا۔ فخر راست روی کے لئے محافظ، سخت کوشی کے لئے مہمیز، ذہن کے لیے اُفق اور بلند پروازی کے لیے پر و بال فراہم کرتا ہے۔ شاید ہی کوئی انسان اتنا بد قسمت، ایسا تیرہ روز ہو گا جو کسی بات پر فخر نہ کر سکتا ہو۔ ایسے آدمی کے لئے دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ زندگی میں اسے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ کوئی ولولہ اور کوئی امنگ اسے متحرک نہیں کر سکتی۔ اس میں اور مٹی کے ڈھیر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ وہ کڑھتا اور سلگتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں گنجائش نہیں رہتی، وسعت اور شگفتگی اس کے پاس نہیں پھٹکتی۔

صحت مند فخر اور عزت نفس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فخر کو گھمنڈ سے دور رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان یہ محسوس کرے کہ جن اوصاف پر وہ ناز کر رہا ہے وہ اس کے پیدا کرنے والے کی دین ہیں۔ وہ فخر جس میں شکر کا عنصر پنہاں نہ ہو، کھوکھلا اور کم وزن ہوتا ہے۔ اگر نگہداری نہ کی گئی تو وہ تکبر میں بدل جائے گا۔ فخر کرنیوالے شکر کرنیوالے ہوتے ہیں۔ فخر محسوس ہوتا ہے، ملفوظ نہیں ہوتا۔ بلکہ آداب، اطوار، چال ڈھال اور بشرہ سے بھی زیادہ نہیں چھلکتا۔ تراوش ہوتی ہے تو صرف اعتماد، تشکر، عزتِ نفس اور مدبانیت کے سرمائے میں۔ اللہ کے دیے ہوئے شمائل و خصائل پر فخر محسوس نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ فخر محسوس کرنے کی چیز ہے، اعلان کرنے کی نہیں۔ فخر وہ خوشنما جھاگ ہے جو زندگی کے سمندر میں شکر کی لہروں کی بدولت ابھر کر سامنے آتا ہے۔ فخر اور گھمنڈ میں اتنا ہی فرق ہے جتنا موتی اور خزف میں۔

●●

# مسلمانانِ ہند کے تعلیمی، سماجی، اور تہذیبی مسائل

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی اور سماجی صورتِ حالات تمام ملک میں یکساں نہیں، مختلف علاقوں میں مختلف ہے۔ شہر اور دیہات، شمال اور جنوب، مغرب اور مشرق میں بڑا فرق نظر آئے گا۔ ابھی تک ہم ان مسائل کو شہر کے آئینے میں دیکھتے چلے آئے ہیں۔ حالانکہ تقریباً ۹۰ فی صد ہندوستانی مسلمان گاؤں میں بستے ہیں اور مسلمانوں کی حالت کا کوئی جائزہ اور ان کی ترقی کا کوئی منصوبہ اس اکثریت کا احاطہ کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ آبادی کا یہ جزو غالب یقیناً درخورِ اعتنا ہے۔ علاوہ بریں ہم نے اکثر مسلمانوں کے مسائل کو یو۔پی کے مسلمانوں کے مسائل کے مساوی سمجھا ہے۔ وہ دور عرصہ ہوا، ختم ہو گیا جب ہندوستان سے مراد تھی شمالی ہندوستان۔ اب ملک کے دوسرے حصے اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے اگر ان کے کسی طبقے میں مسائلِ حاضرہ سے عہدہ برآ ہونے کی تھوڑی بہت صلاحیت نظر آتی ہے تو وہ جنوب کے مسلمان ہیں یا شمال کے ہرگز نہیں۔ مسلمانانِ ہند کی قیادت جنوب کو منتقل ہو جانی چاہیے۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جو ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پیشرفت کی ذمہ دار اور ایک مدت تک سیاسی اتحاد و اقتدار کی بانی تھی، ایک عرصہ ہوا دم توڑ چکی۔ اس کے برعکس کیرالا میں جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی ہے، وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑھتے ہوئے تعلیمی نظام کا مرکز اور منبع بن گئی۔ اس کے علاوہ کیرالا کی مسلم سروس سوسائٹی نے بھی تعلیمی کام بڑے پیمانے پر شروع کر دیا ہے۔ یہی حال کرناٹکا کی "الامین" سوسائٹی، تامل ناڈو کی ایس۔آئی۔ای۔ٹی[1] اور سیتا کتی ٹرسٹ اور آندھرا پردیش کی متعدد انجمنوں کا ہے۔ کلام کا حاصل یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں میں جذبۂ ایثار اور تعلیمی و ثقافتی پیشرفت کا تعلق ہے، مرکزِ ثقل اب شمال سے ہٹ کر جنوب پہنچ گیا۔ یہ کہنے سے مدعا، تاہم یہ نہیں کہ وہاں جو کام ہو رہا ہے وہ کسی اعتبار سے بھی کافی ہے۔ یا دوسرے فرقوں کے کارناموں کے آگے ذرا دیر ٹھہر سکتا ہے۔

ایک بات اعتذار کے طور پر اس گفتگو کے دوران میں مسائل کا ذکر کرتے کرتے نقطۂ نگاہ اور

۱۔ ساؤتھ انڈیا ایجوکیشنل ٹرسٹ (جنوبی ہند کا تعلیمی ٹرسٹ)

نفسیاتی کیفیت، اور صلاحیتوں اور میلانات کی بات کرنے لگوں گا۔ یہ طریقہ نہ مربوط ہے، نہ عمود، لیکن میں جو کچھ کہنا
چاہتا ہوں اس کے لئے شاید غیر موزوں نہیں۔ مسائل کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ان کے حل کی طرف بھی اشارہ کروں گا۔

یہاں یہ دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ مسلمان ایک صدی کے اندر معلوم دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے
تک پھیل گئے تھے۔ وہ جہاں گئے علم کا چراغ لے کر گئے۔ چار سو سال تک نوعِ انسانی کے علمی اور تہذیبی کارناموں کی
داستان ان کے ذہنِ رسا اور دلِ زندہ کے ساتھ جُڑی رہی۔ علم اور سائنس کے سارے اکتسابات اور انکشافات
ان ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک مذہب نے عبادات سے زیادہ زور مشاہدے، غور و فکر اور
تحصیلِ علم پر دیا۔ نتائج نے ایک عالم کی نگاہ کو خیرہ کر دیا۔ چار صدیاں گزرنے کے بعد (۸۰۰ لغایت ۱۱۰۰ عیسوی)
انحطاط کا سلسلہ شروع ہو گیا جس پر مُہر پندرھویں صدی کے اواخر میں لگی۔ اختراع کی جگہ اقتدا، ایجاد کی جگہ تقلید
نے لے لی اور یہ سلسلہ زور پکڑتا چلا گیا۔ چنانچہ جو لوگ علم و تہذیب کے قافلہ سالار تھے، جہالت اور قدامت کے اجارہ دار
بن بیٹھے۔ اقتدار اور اقبال کے دور میں یہ عنوان ڈھکا چھپا رہا۔ لیکن جب حکومت اور اختیار ہاتھوں سے نکل گئے
تو زوال طشت از بام ہو گیا اور اس کی رفتار تیز تر ہوتی چلی گئی۔ ہندوستان مسلمانوں کا زوال اٹھارھویں صدی کی
ابتدا سے شروع ہوا۔ اُنیسویں صدی کے اوسط میں انگریزوں کے تسلط کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔
زندگی سے عہدہ برآ، اور مصائب و مراحل سے نبرد آزما ہونے کا ولولہ باقی نہ رہا۔ ایک چراغ تھا جو گُل ہو گیا، ایک
آگ تھی جو سرد ہو گئی۔ انیسویں صدی کے آخر ربع میں سر سید احمد خاں نے علی گڑھ کے ذریعے مسلمانوں کو جہالت اور
مایوسی کے شکنجے سے چھڑایا اور ان میں جینے کی لگن پیدا کی۔ انھیں زمانے سے ہم آہنگ اور ہم قدم ہونے کے آداب
سکھائے۔ تحقیر کے عادیوں کو تسخیر کا سبق دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سہرا، جو بد قسمتی سے ادھوری
رہ گئی، سید احمد خاں اور اُن کی تحریک کے سر ہے۔ لیکن قدامت پرستی اور جہالت اور جمود نے اس تحریک کو زیادہ
آگے بڑھنے نہ دیا اور ۱۸۵۷ء کے زبردست جھٹکے پر ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ملک کی تقسیم
اور آزادی کے بعد ایک اور جھٹکا لگا۔ ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد پاکستان
کے حصے میں آئی یا وہاں چلی گئی، جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے، انھیں ایک عرصے تک شبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔
بہت دنوں تک مسلمان بٹوارے کے زخم چاٹتے رہے۔ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک مدت تک ہراس
چھائی رہی۔ وہ ایک بار پھر اپنے خول میں چلے گئے۔ انھیں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ وہ آزاد ہوتے ہی اسیر ہو گئے ہیں۔ پہلے
بدیسیوں کے محکوم ہوئے تھے، اب اپنوں کے۔ یہ احساس رفتہ رفتہ زائل ہوا۔ لیکن وہ اعتماد جو مجروح ہو گیا تھا ابھی تک

پوری طرح بحال نہ ہو پایا۔ فرقہ وارانہ فسادات اس کی بازیابی میں سدِّ راہ ہوتے رہے۔ افسوس ہے کہ ان کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ مسلمانوں میں یہ احساس عام طور پر پایا جاتا ہے کہ جہاں وہ پنپے اور یکسو ہوئے سراسیمگی اور انتشار کے سامان فراہم کر دیئے گئے۔ یہ احساس بالکل حق بجانب نہ سہی حقیقت سے قطعاً بے تعلق بھی نہیں ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے متعلق جو کمیشن حکومت کی جانب سے بٹھائے گئے ان میں کئی ایک نے ان فسادات کے پیچھے سازش کا ہاتھ دیکھا ہے۔ یہ احساس بھی نہ محدود ہے نہ بے بنیاد کہ کبھی کبھی ان میں پولیس اور پی۔اے۔سی کا رخ مسلمانوں کے خلاف معاندانہ ہو جاتا ہے۔ فرقہ وارانہ بلووں نے ہندوستانی مسلمانوں کو نہ صرف دلجمعی سے محروم کیا ہے، بلکہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب میں شیر و شکر ہونے سے بھی روکا ہے۔ وہ ہندوستان پر اپنا اتنا حق نہیں سمجھتے جتنا کہ وہ دراصل ہے اور جتنا کسی طبقہ کے بلوغ، ترقی اور فروغ کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستان کے منصوبہ بند وکاس میں وہ شریک نہیں ہو پاتے، نہ اس سے کماحقہٗ بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ تعلیم و تمنا اور ترقی کی گرمیں ان کے پہلو کو مستنیر نہیں کر پاتیں۔ بددل ہو کر وہ علم سے جی چرانے، محنت سے دامن بچانے لگے ہیں۔ طبیعت کی گلہ مندی، محرومی کا احساس، مظلومی کا فشار، یہ سب نقطۂ نگاہ کی صحت اور ارادہ کی صلابت کے ضامن نہیں ہو سکتے۔ ایسی صورت میں افتادِ طبع مریضانہ ہو جاتی ہے۔ اختیار، عقل کے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔ عنان جذبات کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ بھلے برے کا پرکھنا دشوار ہو جاتا ہے اور اپنے مسائل اور مشکلات کو کھلے دل سے سامنے رکھنا دشوار تر۔ اپنے گوشے میں بیٹھ کر سلگتے رہیئے، دھواں حصے میں آجائے گا، لیکن نہ حرارت ہاتھ آئے گی، نہ روشنی۔ محرومی کے فشار کو 'پدرم سلطان بود' کے خیال دامنگیر نے اور بڑھا دیا ہے۔ اسی تباہ کن خیال نے ہمیں گھمنڈ اور اسراف کے گرداب میں ڈال دیا اور محنت اور پامردی اور اقدامیت سے محروم کر دیا۔

علیحدگی اور بےچینی اور بےاطمینانی کی آنچ کو بیروزگاری نے ہوا دی ہے۔ شمالی ہندوستان کے شہری مسلمانوں کے ایک معتد بہ حصے نے یا زمینداری پر تکیہ کیا تھا یا نوکری کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔ زمینداری ختم ہو گئی، نوکری ملتی نہیں، اب کریں تو کیا کریں؟ چونکہ بازار گرم رہا تھا، اس لئے کساد بازاری اور کھلتی ہے۔ پہلے ملازمت میں رعایت برتی جاتی تھی۔ اب کئی سطحوں پر مراعات کے برعکس کچھ اور ہوتا ہے۔ پھر مقابلہ مشکل۔ اکثریت نے جدید تعلیم کا آغاز مسلمانوں سے پہلے کیا تھا، وہ اس دوڑ میں ان سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ خوش حالی اس کی ہم رکاب ہے۔ اس کے بچے علمی ماحول میں پروان چڑھتے ہیں اور پڑھے لکھے والدین کے زیر سایہ اور زیر ہدایت جلا یافتہ ذہن اور پرحوصلہ دل کے ساتھ تعلیم کے مراحل طے کرتے ہیں۔ وہ تعداد میں بھی کئی گنے ہیں۔

لہٰذا ان کے مقابلے میں ہمت شکستہ، افلاس زدہ اور بیزار مسلمان شاذ و نادر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایک ناکامی مزید ناکامیوں کو جنم دیتی ہے۔ مسلمان جب مسلمانوں کو سرکاری دفاتر اور محکموں میں نہیں پاتے تو ان کا دل اور کھٹا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کی حکومت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ محرومی کا احساس اور علیحدگی کا رجحان اس طرح اور بڑھ جاتا ہے۔ بڑی صنعت اور بڑی تجارت میں بھی ان کا کوئی معقول حصہ نہیں۔ جب تک حکومت کے محکموں میں حکومت کی پالیسی کے باوجود ان کی شرکت برائے نام ہے، تو پبلک سیکٹر یا منظم پرائیوٹ سیکٹر میں انھیں کون نوکری دے گا۔ وہاں اکثر عزیزوں یا ہم ذاتوں یا ہم مذہبوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہندوستانی روزی کمانے کے محدود مواقع کے لئے اکثریت سے مقابلہ نہیں کر سکتے تو کیا انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا ملک کے اور خود ان کے حق میں اچھا ہوگا۔ ہندوستان خود بحیثیت ایک ترقی پذیر ملک کے ترقی یافتہ ممالک سے مطالبہ کرتا رہا ہے کہ وہ ترقی کی راہ میں اس کی اور دیگر ترقی پذیر ملکوں کی مدد کریں۔ کیا خود ہندوستان کی اتنی بڑی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی حکومت سے اور اپنے ملک کی اکثریت سے یہ مطالبہ کرے کہ اس کو سہارا دے کر آگے بڑھائے، بعض سطحوں پر اس کے لئے ملازمتوں کا تحفظ کرے اور اسے ملک کی ہمہ جہت ترقی میں شریک ہونے کا موقع دے۔ ایک سیکولر، جمہوری اور ارتقا پرداختہ ملک کو خود اس کا انتظام کرنا چاہیے کہ اس کا ایک بڑا طبقہ پس ماندہ اور غیر مطمئن نہ رہے۔ کیونکہ اگر وہ پسماندہ رہا، تو ملک کی ترقی میں اس کا عنان گیر ہوگا۔ ترقی اور خوشحالی دونوں ناقابلِ تقسیم ہیں۔

یہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا ذکر تاریخی اور وطنی پس منظر میں کیا گیا تھا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی زبوں حالی کی ذمہ داری دوسروں پر ہے۔ شکوہ دراصل خود سے کرنا چاہیے:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ٭ کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف مسلمان والدین بالعموم توجہ نہیں دیتے۔ تعلیم کی فیس داخل کر دی اور مطمئن ہو بیٹھے۔ یہ ذکر ان کا ہے جو استطاعت رکھتے ہیں۔ کثیر تعداد ایسی ہے، جس کی مالی حیثیت انھیں اس کی اجازت نہیں دیتی کہ بچوں کو اسکول بھیج کر ان کی قبل از وقت کمائی سے گھر کو محروم کر دیں۔ یہاں پیٹ کاٹنا ہوگا، ورنہ اس بچے کا مستقبل اسی کی نشو و نما کیا، جو مزدوری میں لگا دیا گیا۔ تعلیم اگر گھر گھر نہ پہنچی تو فلاح کے دروازے ہمیشہ بند رہیں گے۔ ہمارا اولین فرض ہے کہ پیامِ تعلیم کو عام کر دیں۔ جہالت میں نہ دنیا کی فلاح ہے، نہ دین کی۔ جو لوگ پڑھ لکھ گئے ہیں اگر انھوں نے علم دوسروں تک پہنچایا، تو وہ بیک وقت بے حسی اور کفرانِ نعمت کا ارتکاب کریں گے۔ ہمارا پیدائشی

اور اہم ترین مسئلہ ہے تعلیم کی اشاعت۔ اسی سے دوسرے امراض کا مداوا ہوگا اور ترقی کی نئی نئی راہیں کھلیں گی۔ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دیکھتے ہیں تو دل میں یہ ہوک اٹھتی ہے کہ یاالٰہی مسلمانوں میں کوئی دوسرا دوسرا سیّد احمد خاں کے قدوقامت اور بصیرت کا کیوں پیدا نہ ہوا۔ سیاسی رہنماؤں کی ہمارے یہاں کثرت رہی ہے لیکن سماجی رہنما اور رضاکار ناپید ہیں۔ تعلیم کی اشاعت بڑی خشک چیز ہے، اس میں نہ اقتدار نہ شہرت، نہ زبان کا چٹخارہ۔ اس میں ریاضت درکار ہے، پتّہ مارنا پڑتا ہے اور اس کے ہم عادی نہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ اسلاف کی مہم جوئی اور خطر طلبی، ریاضت اور ذوقِ علم کے ردِّعمل کے طور پر ہم نے تن آسانی اور عشرت کوشی، کاہلی اور جہالت کے اندھیرے میں بسیرا لیا ہے۔ ہم میں اس کی صلاحیت نہیں رہی کہ کسی بڑے اور دیر طلب کام کو منصوبہ بنا کر انجام دے سکیں۔ دل لگا کر یکسوئی کے ساتھ کوئی کام کر سکیں۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ سوتے سوتے بیدار ہوئے۔ تھوڑی دُور دوڑے، پھر سو گئے۔ دیر تک دوڑنے کا ہم میں دَم نہیں۔ جم کر محنت کرنے، لگاتار ریاضت کرنے کا ہمیں یارا نہیں۔

غزل ہمارے مزاج کی آئینہ دار ہے۔ بلکہ اس کی تشکیل میں بھی اس کا حصّہ ہے۔ خاکہ، منصوبہ، نقشہ یا پلاٹ ہم تیار نہیں کر سکتے۔ تسلسل ہم دیر تک قائم نہیں رکھ سکتے۔ نصاب میں سائنس اور ریاضی سے ہمارے بچے ایک عرصے تک دامن بچاتے رہے کہ ان میں یکسوئی اور لگاتار محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اس میں رجحان میں کمی آ رہی ہے۔

مسلمانوں نے مختلف شہروں میں اسکول قائم کیے۔ لیکن کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر، اور اس مستثنیات میں اب اضافہ ہو رہا ہے، ان کا معیار اب اچھا نہیں۔ ان اسکولوں کی اصلاح کے علاوہ ضرورت اس بات کی ہے مسلمان بچے بڑی تعداد میں اچھے عام اسکولوں میں داخل ہوں، جو آزادی اور آلاتی وسائل ان اسکولوں اور کالجوں کو حاصل ہیں، ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ممتاز اور بااثر شہریوں کو اس کام میں ہاتھ ڈالنا چاہیے۔ وہ عام اداروں کے سربراہوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، ان سے اپیل کر سکتے ہیں۔

تعلیم ہی نہیں، ترقی کی دوسری مدوں میں پلان کے تحت جو سرمایہ کاری ہوتی ہے، مسلمانوں نے کچھ تو لاعلمی، کچھ جھجک اور کچھ کاہلی کی بدولت اس سے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ آبادی میں تناسب کے بقدر فائدہ اٹھایا ہوتا، تو کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوتے۔ عام اسکولوں کے نصاب میں بعض ایسے سبق داخل کر لیے گئے تھے جن سے مسلمانوں کی تصویر بگڑ کر سامنے آتی تھی۔ ایسا نفاق انگیز مواد نصاب کی کتابوں سے نکالا گیا ہے اور نکالا جا رہا

یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک طرف سے نکالا گیا، دوسری طرف سے پھر داخل ہو گیا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ہمارے خلاف غلط باتیں پھیلائی جائیں اور ہم خاموش رہیں یا یہ کہہ کر کہ "ہماری بلا سے" دم سادھ لیں۔ ضرورت چوکسی اور چوکنا رہنے کی ہے، ورنہ وہ دن دُور نہیں جب اہل وطن کے علاوہ خود ہمارے بچے ہمیں حقارت سے دیکھنے لگیں گے۔ کاش کہ مرحوم ظفر احمد صدیقی صاحب کی طرح ہر ریاست میں ایک جری، حق پسند اور بیدار انسان پیدا ہو جائے جو اس فتنے کا سدِ باب کر سکے۔ صریح الزام تراشی اور دشنام طرازی سے بھی زیادہ خطرناک زاویۂ نگاہ اور افتادِ طبع ہے جو سطروں کے درمیان چھپی رہتی ہے جس پر کوئی انگلی رکھ ہی نہیں سکتا۔ اس طرح کی اسلام دشمن کتابوں نے بھی مسلمان بچوں کو بعض اوقات عام تعلیمی اداروں سے دُور رکھا ہے۔ مگر ان اداروں سے دُور رہنا نہ مسلمانوں کے لئے اچھا ہے نہ ملک کے لئے۔ گھر کے علاوہ اسکول میں ہی بچے، اپنے گردوپیش، اپنے ہمسایوں اور اپنے ہم وطنوں کے متعلق رائیں قائم کرتے ہیں۔ بڑی بدقسمتی ہوگی اگر کتابیں نقطۂ نظر کی صحت میں حائل ہو جائیں، یا ان کی وجہ سے محبت اور صلح و آشتی کے بجائے کدورت اور عداوت دلوں میں راہ پائے۔ جن لوگوں نے نفاق انگیز مواد نصاب میں داخل کیا وہ ملک کے دشمن ہیں۔ انھوں نے عداوت اور نفرت کا بیج بویا ہے۔ اعلیٰ تعلیم میں امتیاز کے لئے عام تعلیم کی چوڑی اساس درکار ہے۔ زیادہ تعداد میں اگر بچے تعلیم کے حلقے میں داخل ہو جائیں، تو ان میں ممتاز لائق اور جدت آفریں لوگ بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر اساس تنگ ہے تو معیار بلند نہ ہو پائے گا اور نہ وہ باخبر رائے عامہ پنپ پائے گی جو ایک صالح اور ترقی پذیر سماج کو جنم دیتی ہے اور جو ظلم اور ناانصافی کا راستہ روک سکتی ہے۔ ہم کچھ تو جہالت اور کچھ نفاق کی وجہ سے رائے عامہ کے فیوض سے محروم ہیں، جب ہی تو برائیاں سینہ تانے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں اور اچھائیاں منہ چھپائے ہوئے ہیں۔ نہ ہم اپنوں کی اصلاح کر سکتے ہیں، نہ دوسروں کو اصلاح پر مجبور کر سکتے ہیں۔ رائے عامہ تعلیم کی توسیع سے بنتی ہے۔

تعلیم کی ناہمواری نے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ انھیں دو گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ پہلا طبقہ تو وہ ہے جس نے مدارس میں دینی تعلیم حاصل کی ہے۔ دوسرے طبقے نے عام اسکولوں میں جدید علوم حاصل کیے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل ہے۔ ایک نے دین کا دامن پکڑ لیا۔ دوسرے نے دنیا سے ناتا جوڑ لیا۔ ایک دوسرے سے بیگانہ، بے نیاز، بے خبر۔ نتیجے میں ملت دو نیم ہو گئی۔ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جماعت کے لئے دو نیم ہونا اتنا ہی مہلک ہے جتنا فرد کے لئے۔ شخصیت کی سالمیت اس طرح تباہ ہو جاتی ہے۔ شخصیت پراگندہ ہو تو نہ افعال میں توازن ہوگا، نہ حرکات میں ٹھہراؤ، نہ نیک و بد کا شعور، نہ گردوپیش کا

اور ایک، نہ متحد ہو کر قدم اٹھانے کی صلاحیت۔ ہمارا اس وقت یہی حال ہے

دین کو ہم نہیں چھوڑ سکتے، کہ اگر دین نہیں تو ہم کہاں؟ ہماری انفرادیت ختم! دنیاوی تعلیم سے ہم منھ نہیں موڑ سکتے کہ ترقی اور خوش حالی اور انسانی ذہن کی تسخیرات سے بہرہ یابی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ چارۂ کار صرف یہ ہے کہ ان دونوں تعلیمی دھاروں کو باہم قریب تر لایا جائے۔ دینی مدارس کا ڈھانچہ کچھ اس طرح ہو کہ ایک تو اس میں جدید تعلیم کو کچھ نہ کچھ شامل کیا جا سکے، دوسرے دینی تعلیم پائے ہوئے طلبا کے لئے جدید تعلیمی اداروں میں داخل ہونے کی راہیں کھلی رہیں۔ اسی طرح عام یا جدید اسکولوں کے طلبا کے لئے دین اور اردو زبان کی جز وقتی تعلیم کا انتظام محلہ محلہ، مسجد مسجد کیا جائے۔ کام بہت بڑا ہے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے پیمانے پر شہر شہر، بستی بستی کیا جا سکتا ہے۔ مذہبی مدارس کے درسی نظام میں تبدیلی کی طرف توجہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ مشیر الحق نے اپنی کتاب Islam in secular India میں دکھایا ہے کہ درس نظامی میں دیوبند نے جو تبدیلی کی وہ اس لحاظ سے زمانے کے تقاضوں کے برعکس تھی کہ نصاب کا دنیاوی اور علمی اور کاروباری عنصر نکال دیا گیا اور نصاب کو صرف مبلغین اور علما کی ضروریات کے مطابق ڈھال دیا گیا۔

سائنس اور ٹکنالوجی میں ہندوستانی مسلمانوں کے پچھڑے پن کو دور کرنے کے لئے ادارے کھولنے چاہئیں۔ جنوبی ریاستوں نے اس بارے میں پہل کی ہے، شمالی ریاستوں کے مسلمان سبق لیں۔ دراصل ادارے کھولنے سے بھی زیادہ اہم ان کا ڈھنگ سے چلانا ہے۔

تعلیم کا اصل مقصد تہذیب نفس ہے۔ تعلیم سے انسان میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اخلاق و اطوار کی صفائی ہوتی ہے۔ وہ ماحول اور گرد و پیش سے باخبر ہوتا ہے۔ علاوہ بریں تعلیم کا رشتہ روزگار سے جڑا ہوا ہے۔ جو طالب علم ڈھنگ سے محنت کرتے ہیں ان پر کسب معاش کی راہ کھل جاتی ہے۔ سرکاری اور بہت سی غیر سرکاری ملازمتوں میں داخلے کے لئے مقابلے کے امتحانات اور انٹرویو ہوتے ہیں۔ اس کام کے لئے مرکز اور ریاستوں، ریلوے اور بنکوں وغیرہ نے کمیشن قائم کر رکھے ہیں۔ مسلمان جو تعلیم میں یوں ہی پیچھے ہیں اور سرکاری محکموں میں جن کی نمائندگی بہت کم ہے، ان کے لئے یہ بات اہم ہے کہ وہ ملک میں ہونے والے بے شمار مقابلوں کے امتحانوں کے لئے رہبری کے تحت اَن تھک محنت کے ساتھ تیاری کریں۔ اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پہلا قدم اٹھایا تھا۔ جنوبی ریاستوں میں کہیں کہیں یہ کام شروع ہو گیا ہے، لیکن یہ ساری کوششیں ضرورت کو دیکھتے ہوئے ابھی تک بہت کم ہیں، بلکہ نہ ہونے کے برابر۔

روزگار کا ذکر آگیا ہے تو اہلِ حرفہ کا تذکرہ بھی ہو جائے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ مسلمان اہلِ حرفہ ہنرمند ہیں۔ لیکن ان کے دستِ دولت آفریں کو تخلیقِ جمال کے لئے مزدوری اس طرح ملتی ہے جیسے اہلِ ثروت غریبوں کو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ انھیں وسائل، تعلیم اور سامان اور ان کے ہنر کو صیقل درکار ہے۔ ان کی شیرازہ بندی کرنا، انھیں مہاجن کے چنگل سے اور تقلید کے شکنجے سے نکالنا، ان کے لئے نئے ڈیزائن اور اچھا خام مواد اور بازار کے امکانات فراہم کرنا، ایک ٹھوس قدم اصلاح اور پیشرفت کا ہوگا۔

جہالت بہت سی سماجی برائیوں کو جنم دیتی ہے اور معاشرتی اصلاح میں سدِّ راہ ہوتی ہے۔ جہالت اور انحطاط کے زیرِ اثر خوبیاں برائیوں میں بدل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی رسائی براہِ راست اور بلاواسطہ اپنے خالق تک ہے۔ زوال کے دور میں انسان کی خود اعتمادی اور عزتِ نفس نخوت اور انانیت میں تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ ہم لوگ انا و لا غیری کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ہماری انا کو ذرا سی ٹھیس پہنچ جائے تو ہم بڑے سے بڑے مقصد، اہم سے اہم ادارے، قریب سے قریب دوست کو تباہ و برباد کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ یہی انا ہے جو ہمیں کسرِ نفسی سے روکتی ہے۔ جو ہمیں ادارے چلانے اور مل کر کام کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے۔ ہم ساری اہمیت اپنی ذات کو دینے لگے ہیں۔ سماج کی بھلائی کی ہمیں مطلق پرواہ نہیں رہتی۔ اسی کارن ہمارا معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا، نہ برائیوں سے دامن چھڑا سکتا ہے۔

حسد کی جاں سوز کونپل بھی انانیت کی ٹہنی سے ہی پھوٹتی ہے۔ حاسد کسی دوسرے کو پنپتے نہیں دیکھ سکتا۔ پھلنے پھولنے والا اگر حاسد سے رشتہ یا ہمسائیگی کی قرابت رکھتا ہے، تو حسد کی لَو اور زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ حاسد دوسروں کے درپئے آزار رہتا ہے اور خود کو بھی جلاتا ہے۔ حسد اتحاد کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں یہ بیماری بہ نسبت دوسری ہندوستانی قوموں کے زیادہ پائی جاتی ہے۔ ہمارے سماج کو یہ روگ گھن کی طرح لگ گیا ہے۔ ہم ملک کی دوسری قوموں کو دیکھتے ہیں کس طرح وہ اپنے عزیزوں، اپنے محلے یا ذات برادری والوں یا اپنے ہم مذہبوں کو تعلیم و تربیت اور روزگار تک دلا دیتے ہیں۔ اور مسلمان: وہ اقتدار پاتے ہی، اختیار کو پہنچتے ہی آدم کے آنے کی طرح اینٹھنے لگے ہیں۔ ان کے خاندان کا مفہوم اتنا ہی محدود اور حقیر ہوتا ہے، جیسا اہلِ مغرب کا یعنی میاں بیوی اور بچے۔ یہ سب انفرادیت کا تاریک پہلو، حسد کا ثمرہ اور نااتفاقی اور غیر ذمہ داری کا نتیجہ ہے۔

ایمان کی شکل بگڑی تو وہ غور و فکر کے لئے سمِ قاتل بن گیا۔ نتیجہ ذرا دیر غور کرنا معیوب ٹھہرا،

متروک ہوا۔ حکومت ہاتھوں سے گئی، تو شکایت زبان پر آگئی۔ لیل و نہار اور ابنائے روزگار کا شکوہ عادت بن گیا۔ بزم آزمائی اور جہانگیری کا یارا نہ رہا تو خانہ جنگی اختیار کر لی۔ قناعت و توکل سے حوصلہ کی یاوری ہوتی تھی، استقامت کو پشتہ ملتا تھا اور ارادے میں بے خوفی آتی تھی۔ اب ان ہی نے قویٰ کو مفلوج اور عزم کو معطل کر دیا۔ بزرگانِ دین کے احترام نے قبروں کی پرستش کا روپ دھارا، صحت مند اور بیدار مغز اطاعت شعاری اندھی تقلید بن کر رہ گئی۔ سچ ہے بُرے دن آتے ہیں تو اچھائیاں برائیوں میں بدل جاتی ہیں۔ اس نقلِ ہیئت[۱۵] کا باعث رداوت کا عمل ہوتا ہے۔

اسلام صحرانشینوں کے عزائم کے جلو میں دنیا میں پھیلا تھا، وہ صحرانشیں جو سادہ مزاج، پُر حوصلہ، تازہ دم اور رو ئیں تن تھے۔ انھوں نے اسلام کو سادہ، پاکیزہ، بے میل، انقلاب آفریں پایا۔ اس دستورِ حیات، اس منشورِ عمل کو سینہ سے لگایا اور اُسے ساتھ لے کر چار دانگ عالم میں کلمۂ حق بلند کیا۔ ایران کے راستے سے جب مسلمان ہندوستان میں آئے، تو وہ تکلفات، توہمات، آسائش طلبی، خانہ نشینی، عیش کوشی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہ رنگ یہاں گہرا ہوتا چلا گیا، جسے مطلق العنان حکومت اور جاگیردارانہ نظام نے اور چمکایا۔ اخوت اور مساوات کے رشتے کمزور ہو گئے، اور حریت نے غلامی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ قوموں میں داد و ستد کے طریقے بھی نرالے ہوتے ہیں۔ وہ باتیں بلا تامل اختیار کر لی جاتی ہیں جن میں آسائش یا کشش ہو۔ مسلمانوں نے یہاں کے دیرینہ باشندوں سے وہی باتیں سیکھیں جو طبیعتوں کو لُبھاتی تھیں، دیدہ زیب تھیں یا آسائش آفریں لیکن ہندوؤں کی سادگی اور محنت اور فکر کی پرواز کی طرف توجہ نہ کی۔ گرم خون کو ٹھنڈا ہوتے ہوتے اپنی عزم کو کمزور ہوتے ہوتے وقت لگا اور جب ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا، تو اخلاقی انحطاط اور عیش کوشی کے دروازے کھل گئے۔ مسلم معاشرے کو گھن لگنا شروع ہو گیا۔ یہ سماج تن آسانی اور کاہلی، نکتہ چینی، حسد اور بدگوئی، تغافل، خود غرضی اور بے عملی کی رسیوں میں جکڑ گیا۔ مذہبی اصلاح کی تحریکوں نے گراوٹ کو روکا اور اعلیٰ انسانی اقدار کی اشاعت کی، مگر اس کا اثر دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا سماج ہنوز روبہ زوال ہے۔ عام ہندوستانی سماج کو بھی روگ لگا ہوا ہے، لیکن مسلمانوں کا معاشرہ زیادہ سرعت کے ساتھ زوال کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ بے ایمانی دونوں جگہ مشترک ہے۔ لیکن انفرادی خود غرضی اور ریاضت فراموشی میں مسلمان ہندوستان کی دوسری قوموں سے کہیں آگے ہیں۔ سماجی خدمت اور اجتماعی کوشش کی روایت مسلمانوں کے یہاں بہت ضعیف ہو چکی ہے۔ نفسی نفسی کا عالم ہے، "یہاں وصل کی فکر کسی کو نہیں، لوگ فصل کے نغمہ سرا ہیں"۔

تن آسانی اور عیش کوشی کے زیر سایہ ذہنوں کو زنگ لگ گیا ہے اور ان ہی کے زیر سایہ زندگی سے متعلق ایک سرسری طرز نگاہ مسلمانوں کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ وہ محنت اور سادگی اور صفائی اور صبر وضبط کو تلانجلی دے چکے ہیں۔ صبح کو دن چڑھے اٹھنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان کے گھر عام طور پر گندے رہتے ہیں۔ ان میں بہت سے گفتگو میں مبالغہ اور غلو سے کام لیتے ہیں۔ وفا کرنے کے ارادے کے بغیر وعدے کرتے ہیں۔ فضول خرچی پر فخر کرتے ہیں۔ جہالت پر نادم نہیں ہوتے۔ باہم کج بحثی پر اصرار کرتے ہیں۔ چھوٹے سے اختلاف پر آستین چڑھا لیتے ہیں۔ جھگڑنے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں۔ اوقات کی تقسیم میں ان کی کوئی نظیر نہیں۔ مذہب کو ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ باتوں کو کہیے تو رات دن کیے جائیں، کام کو کہیے تو دامن بچا جائیں۔ نام خدا کا لیتے ہیں، پوجا کشتی کی کرتے ہیں۔ زر کی جھلک دیکھی اور فرائض منصبی کو چھوڑ چھاڑ اس کے تعاقب میں رواں ہو گئے۔ وعدہ اور وقت دونوں کی پابندی سے بے نیاز ہیں۔ سنجیدگی اور ذمہ داری سے روگرداں ہیں۔ نفس مارنے کے بجائے ڈینگ مارتے ہیں۔ بیگانے ترقی کریں تو یہ مسرور و مطمئن، لیکن اپنے آگے نہ بڑھنے پائیں۔ ان کی ٹانگ کھینچ کر گرا دیں گے۔ ان کی خدمت کے لئے کوئی سرپھرا نکل پڑے، تو طعن وتشنیع اور زبان درازی سے اس کے کلیجے کو چھلنی کر دیں گے۔

ان کے یہاں ایسے لوگوں کی بہت کمی ہے جو پڑھے لکھے اور باخبر اور باشعور ہوں، ان پر مزید بدقسمتی کہ ایسے لوگ عوام سے اولین فرصت میں ناتہ توڑ لیتے ہیں۔ یہ انوکھا BRAIN DRAIN (برین ڈرین)[1] ہے جس سے ہندوستانی مسلمان دوچار ہیں۔ یہ لوگ ملک سے باہر نہیں جاتے، بلکہ ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسری اقلیم میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کو اپنے بھائیوں کی خبر بھی نہیں آتی۔ یہ بے غیرت اور حمیت باختہ لوگ اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کا نقطۂ نگاہ عام مسلمانوں سے بالاتر ہے۔ مسلمان عوام کو یہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ گویا اگر ان کی طرف ملتفت ہوئے تو ان کے حب وطن، ان کی قوم پرستی پر حرف آئے گا۔ یہ ان نو دولتوں کی طرح ہیں جو غریب باپ کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی اصلاح کے لئے بیسویں صدی عیسوی میں اگر کسی نے قدم اٹھایا ہے تو وہ مذہبی جماعتیں ہیں۔ سیاسی جماعتوں سے اس کی امید عبث ہے۔ بہر حال ہندوستانی مسلمانوں کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ ان کے زوال کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے۔ چونکہ اہل حرفہ اور مزارعین پہلے کی بہ نسبت

---

۱۔ ارباب ذہن وشعور کی ہجرت یا کنارہ کشی

خوش حال ہیں اور زیرِ نفقت سے بھی کشائش ہوگئی ہے، اس لئے ہندوستانی مسلمان سمجھنے لگے ہیں کہ ان کا حال اچھا ہے، حالانکہ حالت دگرگوں ہے۔ ہندوستان کی زندگی کے ہر شعبے میں اُن کا حصّہ کم ہوتا جارہا ہے۔ کسی علمی جلسے کے لئے کوئی مقرر تلاش کیجیے، تو نتیجہ ہمت شکن۔ حکومت کے شعبوں اور دفاتر میں مسلمانوں کو ڈھونڈھیے تو مشکل سے کوئی نام نظر آئے گا۔ وکلا، اطبا، صنعت کاروں اور فن کاروں میں بھی ان میں سے کم ایسے ہیں جو شانِ امتیاز تک پہنچے ہوں۔ مفکروں اور صحافیوں اور دانشوروں اور محققوں کی صفِ اوّل میں مسلمانوں میں سے آپ کسے بٹھایئے گا۔ یہ قحط یہ فقدان حکومت کی بے اعتنائی یا اغیار کی مخالفت کی وجہ سے نہیں بلکہ خود ہماری غفلت، کوتاہی اور شامتِ اعمال کی بنا پر ہے۔ ایک جمہوری اور سیکولر ملک میں ہم حکومت سے اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں، ہمیں کرنا چاہیے۔ جستہ جستہ قلم برداشتہ اور دہن کشادہ نہیں، بلکہ متحد ہوکر، پیوستہ، متواتر، مسلسل۔ لیکن اپنی بربادی کا الزام ہم حکومت کو نہیں دے سکتے۔ یہ ہمارے اپنے کرتوت ہیں جو صورتِ انحطاط بن کر سامنے آئے ہیں۔ ہماری قیادت پارہ پارہ ہے۔ اس میں ملک گیر قیادت کا ذکر کیا اب سوائے ایک استثنا کے کوئی ایسا بھی نہیں جو ریاستی سطح کی قیادت پر پورا اُترتا ہو۔ ہماری نمائندگی کا جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں، وہ اپنی یا آقایان ولی نعمت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اقلیت کی صورتِ حالات میں یہ دشواری بھی ہوئی ہے کہ اس کی قیادت کو اُبھرنے کے لئے حالات مساعد نہیں ملتے۔ اگر صاف صاف جرأت کے ساتھ ترجمانی کرے تو حکومت کی نظر میں مشتبہ ہو جائے۔ اگر عقل سے مسائل کو پرکھے اور جذبات سے اپیل نہ کرے، انتہاپسندی کے عوض میانہ روی، جوش کی جگہ ہوش سے کام لے، تو ملت اس کو شمار میں نہ لائے، اور اُسے سوءِظن کا ہدف بنائے اور قیادت نہ اُبھرے تو اصلاح اور ترقی کے منصوبے کون بنائے۔ ان کو قوت سے فعل تک کون پہنچائے۔ یہاں باخبر اور صحت مند رائے عامہ کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانوں میں صحتمند قیادت کے اُبھرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی قیادت جو متوازن اور معتدل ہو۔ نہ کاسہ لیس، نہ انتہاپسند۔ مسلمانوں میں تعلیم کو عام کیے بغیر گاڑی آگے نہیں بڑھے گی۔ تعلیم کے دونوں مکاتب کو ایک دوسرے سے قریب لانا ہوگا۔ ایک سے دوسرے کو استفادہ کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کے امدادِ باہمی اور سماجی خدمت کی روایات کو عدم سے وجود میں لانا چاہیے۔ حکومت پر لازم آتا ہے کہ مسلمانوں کو فرقہ وارانہ غارت گری اور خوں ریزی سے نجات دلائے۔ اس کے لئے ضروری ہے انتظامیہ کی مضبوطی اور وہ قدم (جس کا حکومت کئی بار اعلان کرچکی ہے) یعنی پولیس اور پی اے سی میں مسلمانوں کو معتدبہ تعداد میں داخل کرنا۔ آئین یہاں سدِّراہ نہ ہوگا۔ کیونکہ ایسا کرنا

ملک میں امن وامان قائم رکھنے اور ایک بڑی اقلیت کو اندیشہ اور بے اطمینانی اور خطرے سے بچانے کے لئے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ملازمتوں کی کئی سطحوں میں مسلمانوں کے لئے تحفظ اور اعلیٰ ملازمتوں میں مقابلے کے انتظامات بھی حکومت پر واجب ہیں۔ اگر یہ دو قدم اٹھائے گئے تو مسلمانوں کے حوصلے اور اعتماد اور وطن عزیز سے ان کی وابستگی اور اس کی ترقی کے لئے ان کی مساعی میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

تہذیبی مسائل کا ذکر جستہ جستہ آچکا ہے۔ اس ضمن میں زبان اور ادب کی اہمیت کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اردو کے متعلق بھی ایک قسم کا جھوٹا سکون اہل زبان کے شامل حال ہے۔ اردو بظاہر نوازی جارہی ہے۔ اس کے بولنے اور اس کی قدر کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کے لکھنے اور پڑھنے والوں اور اس کے نکتہ سنجوں کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے اور بظاہر وہ دن دور نہیں جب اردو زبان کے منصب سے ہٹ کر ایک بولی رہ جائے گی۔ اردو کے سلسلے میں بعض ریاستوں نے کچھ اعلانات اور اقدامات کئے ہیں۔ ہمیں ان کی پذیرائی کرنی چاہیے، لیکن اردو کا مسئلہ تب تک حل نہیں ہوگا، جب تک اس کا ناتہ روزگار سے نہیں جڑتا اور جب تک کچھ ریاستوں میں اسے لازمی زبان کا درجہ نہیں ملتا۔ لیکن حکومت کے گوشۂ خاطر سے کہیں زیادہ اہم خود اردو والوں کی کوششیں ہونگی۔ اگر گھر گھر، محلے محلے اردو کو بیرون وقت پڑھانے کا انتظام نہ کیا گیا تو یہ غیر معمولی زبان اپنے متمول اور پُر وزن ادب کو آغوش میں لے کر دب جائے گی۔ یہ زبان ہندوستان کی بے مثال مشترکہ تہذیب کی سب سے دلکش علامت ہے۔ اگر یہ ختم ہوگئی تو ہندوستانی تہذیب کے تمول اور وقار کو سخت جراحت پہنچے گی اور مسلمان تو اپنے آپ کو اور زیادہ تہی دامن محسوس کریں گے کہ یہ ان کے مذہب، تہذیب اور تمدن کی ترجمان بھی ہے۔

زبان سے قطع نظر، ہندوستانی تہذیب کو مسلمانوں نے مالامال کیا ہے۔ ہندوستانی تہذیب ہی ہے، جو ایک طرف مقامی اور دوسری طرف ایک عالمگیر تہذیب کے ارتباط کا نتیجہ ہے۔ ہندوستانی تہذیب کو ان دونوں ہی کا اعتراف کرنا اور ان سے طاقت اخذ کرنا چاہیے۔ حب وطن برحق، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخلاقی اقدار آب و گل کے اسیر ہو جائیں۔ ایک مقامی تہذیب کا ایک عالمگیر تہذیب کے ساتھ ارتباط۔ فنون لطیفہ، بلکہ فکر و فلسفہ کے اشجار میں برگ و بار لاتا ہے۔ ہمیں انسان دوستی کا مسلک اختیار کرنا ہے۔ وطن سے والہانہ محبت، نوع انسان سے محبت کا راستہ نہیں روک سکتی۔

پرانی تہذیبیں اور اخلاقی قدریں، سائنس اور ٹکنالوجی کے انقلابات اور خود غرضی و ہوس کے

سیلاب کی زد میں ہیں۔ ان کو بچانے کے لئے ہمیں اپنی ملی جلی تہذیب کو توہمات اور الحاقات اور تعصبات سے پاک کرنا ہے، تاکہ دونوں تہذیبوں کا جوہر یعنی ان کی خدا پرستی اور انسان دوستی آلائشوں سے منزّہ ہو کر نکھر کر سامنے آجائے۔ اخلاقی قدروں اور انسانیت کے تحفظ کی شکل صرف یہی ہے۔ اگر ہم باہم کدورت لے کر بیٹھے رہے تو ہمارا آئینہ زمانے کے تقاضوں کے انعکاس میں ناکامیاب رہے گا۔

الغرض ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا طرزِ فکر اور زاویہ نگاہ بدلنا ہوگا۔ انھیں کسبِ فخر کے لئے ماضی کے بجائے حال پر تکیہ کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے وطنِ عزیز اور اہلِ وطن کے ساتھ اپنے تعلقات کو استوار کرنا ہوگا۔ ہمیں ہندوستان کے سیکولر آئین، اس کی ترقی پسند، مساوات پیکر اور ترقی آمادہ جمہوریت کے لئے ہموطنوں میں امتیاز حاصل کرنا ہے۔ انسان دوستی، اسلام دوستی اور حبِ وطن میں باہم کوئی مغائرت نہیں۔ ہمارے مسلک کے اجزائے ترکیبی یہ تینوں ہونے چاہئیں۔ رواداری، حلم اور دور اندیشی کو ہمیں اختیار کرنا ہوگا۔ تعصب زود برہمی اور لمحاتی ردِ عمل اور خامکارانہ جوش و خروش سے پرہیز، ہم پر بالخصوص واجب ہے۔ تعلیم سے غفلت کا خمیازہ ہم ابھی تک اٹھا رہے ہیں۔ ہمیں اس گناہِ کبیرہ کو ترک، اور اس کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ اقتصادی زبوں حالی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جو ذہین طلبہ کو پہچان سکے اور ان کے تعلیمی مصارف کی کفالت کر سکے۔ علاوہ بریں ٹکنیکل اور ووکیشنل (تکنیکی، منفعت بخش اور ہنر آموز) تعلیم کی طرف توجہ کو موڑنا ہوگا۔ سماجی معائب میں اسراف، حسد اور نفاق، توہمات، گھمنڈ اور عیش کوشی سے حذر کرنا ہوگا۔ جاگیر دارانہ نظام کی باقیاتِ صالحات سے ہمیں اپنے دامنِ دل کو چھڑانا پڑے گا۔ جمہوریت سے ہمارا رشتہ نازو نیاز اور داد و ستد کا رشتہ ہونا چاہیے۔

میں نے اس مقالے میں ہندوستانی مسلمانوں پر بے دریغ تنقید کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صاف گوئی کا، کھری کھری سنانے کا وقت آگیا ہے۔ یہ سارے اعتراضات ہم سب پر عائد ہوتے ہیں۔ میں خود کو ان سے مستثنیٰ کرنے کا گمان بھی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کے دوسرے فرقوں میں بھی کمزوریاں ہیں، جن میں سے کئی ایک مسلمانوں کی کمزوریوں سے بالکل مختلف ہیں۔ لیکن میرا روئے سخن ان کی طرف نہیں ہے۔ میں اگر انھیں کچھ کہوں گا، تو چھوٹتے ہی بدگمانی کا شکار ہو جاؤں گا اور پھر مجھے اپنوں سے کہاں فرصت کہ بیگانوں کے قدم لوں۔ میری نیت پر شبہ کیا جائے گا، شکایت عداوت پر محمول ہوں گی، نکتہ چینی کو دشمنی تصور کیا جائے گا۔ میں نے مسلمانوں کی خوبیاں بھی نہیں گنائیں کہ میرا مقصد برائیوں اور کمزوریوں کی طرف دھیان اور ان ——— سے

چھٹکارا دلانا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ پوری ملت ان برائیوں میں شریک ہو، یا برابر کی شریک ہو۔ ہم میں ایسے بھی لوگ ہیں جو ان برائیوں سے بری ہیں۔ لیکن بڑی تعداد میں گہرا رنگ ان ہی کا ہے جن کا نقشہ کھینچنے کی کوشش میں نے ابھی ابھی کی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب عورتوں کی زبوں حالی ہے۔ ہماری عورتیں بالکل گھٹی ہوئی رہتی ہیں۔ اس پردے نے جسے مذہب سے کوئی سروکار نہیں، ان کی صحت کو گھائل کر دیا ہے، جسمانی اور ذہنی صحت کو۔ اسیرانہ کم ہمتی ان کی عناں گیر ہو گئی ہے۔ نہ وہ صحت اعتماد اور وسعت نظر کے ساتھ زندگی بسر کر سکتی ہیں اور نہ نئی نسل کو سلیقے سے پروان چڑھا سکتی ہیں۔ جو خود کھو گیا ہو، دوسروں کی رہبری کیونکر کرے گا۔ ہم نے اپنی آدھی آبادی کو مفلوج کر رکھا ہے اور اس کے باوجود فلاح اور ترقی کے خواہاں ہیں۔

مسلمانوں نے سائنس اور ٹکنالوجی سے تعلق قائم نہیں کیا اور نہ ہی ان سے مفاہمت گوارا کی۔ ان کا نقطۂ نظر ہنوز رومانی اور غیر سائنسی ہے، جذبات پر مبنی، عقل سے نفور۔

اقلیتوں کی صورت حال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تین شرطوں کو پورا کیے بغیر کوئی اقلیت پنپ نہیں سکتی۔

(۱) وہ اپنے مسلک، مذہب اور روایات پر سختی سے قائم رہے،

(۲) ان تھک ریاضت کی بدولت خود کو اکثریت سے زیادہ لائق، کارگزار اور بہتر ثابت کرے،

(۳) اکثریت کے ساتھ اپنے تعلقات شگفتہ رکھے۔

ان میں سے ایک شرط بھی اگر پوری نہ ہوئی تو خوش حالی اور ترقی حاصل کرنا محال ہوگا، بلکہ جینے کے لالے پڑ جائیں گے۔ ہمیں اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھنا ہوگا کہ ہم کس شرط کو پورا کر پائے ہیں۔

شرم کی بات ہے کہ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی لڑکیاں والدین پر بوجھ بننے لگی ہیں۔ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات نہ سہی، توقعات ہونے لگی ہیں اور جنوبی ہندوستان میں تو کتخدائی کی قیمت لڑکی والوں سے مانگنے لگے ہیں۔ ہندوؤں میں بہت سی دلہنیں جن کے والدین سسرال والوں کے لالچ کو پورا نہیں کر سکے، خود کو آگ میں جلا کر خاکستر ہو گئی ہیں۔ مسلمان ابھی یہاں تک تو نہیں پہنچے لیکن اس راہ میں ان کے قدم پڑنے لگے ہیں۔ شمالی ہند کے مسلمان کھل کر روپیہ ہنوز نہیں مانگتے لیکن زیر لب تو دست سوال دراز کرتے ہی ہیں۔ ہونے والے سمدھیانے کی عقلمندی کی تشفی اشارہ سے کرتے ہیں۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں کو تو یہ لعنت پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ ایک عنوان سے لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ مسلمانوں کے یہاں زیادہ سنگین ہے۔ کیونکہ ان میں تعلیم یافتہ اور برسر روزگار

لڑکوں کی تعداد تعلیم یافتہ لڑکیوں کے تناسب سے دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ کسی شہر یا قصبے پر نظر ڈالیے، بہت سے مسلمان گھروں میں ایسی لڑکیاں ملیں گی جو بن بیاہی بیٹھی ہوئی ہیں۔ ایسے بر جو ان کے لئے موزوں ہوں، نہیں ملتے۔ معاشرہ عبوری دور میں ہے۔ بچوں کی شادیاں ابھی تک ماں باپ کرتے ہیں۔ لڑکیاں سنجیدگی اور محنت کے ساتھ پڑھتی ہیں اور کامیاب ہوتی ہیں۔ ہمارے لڑکے اتنی محنت نہیں کر پاتے، اگرچہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ نہ کریں۔ علاوہ بریں وہ محنت بھی کرلیں تو کیا، گھر کا اور محلے کا ماحول تعلیمی پیش رفت میں سدِ راہ ہوتا ہے۔ تعلیم پوری کرتے ہیں، تو روزگار کے بیشتر دروازوں کو بند پاتے ہیں۔ وہ لڑکیاں جنھوں نے ماں باپ کے گھر اخلاق اور تہذیب کے لحاظ سے خاصی معیاری زندگی گزاری ہے، کس طرح نکھٹو اور نکمے اور ناقص العمل لڑکوں کے گلے باندھ دی جائیں۔ ہمارے نوجوانوں میں اگر وہ شے "حمیت نام ہے جس کا" ذرا بھی باقی ہے، تو انھیں مسلمان لڑکیوں اور ان کے ماں باپ کو اس تشویش اور پریشانی سے بچانا چاہیے جو اچھے لڑکوں کے قحط نے پیدا کر دی ہے۔ اس کا طریقہ صرف ایک ہے، باقاعدہ محنت۔ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں ملازمتیں ہیں، خواہ سرکاری، خواہ غیر سرکاری، اگر ہمارے نوجوانوں کی طرف سے یوں مطمئن ہو جائیں کہ وہ زیادہ دیانت دار اور محنتی کارگزار ہیں، تو وہ انھیں لینے پر بالآخر مجبور ہو جائیں گے۔

مذکورہ صورت حال نے دو انوکھی مشکلات ہمارے لئے پیدا کر دی ہیں۔ چونکہ ہمارے لڑکوں کو دفاتر میں ملازمتیں بہت کم ملتی ہیں اور پڑھ لکھ کر وہ اکثر مدتوں بیروزگار رہتے ہیں، اس لئے مسلمان والدین اپنے بچوں کو جدید تعلیم ذوق و شوق کے ساتھ نہیں دے پاتے۔ بنابریں تعلیم کی توسیع کی رفتار ہمارے یہاں اطمینان بخش نہیں ہے اور وہ طبقہ جس کے ہاتھ میں ہنر ہے یا جو محنت کش ہے، وہ یہ دیکھتے ہوئے کہ پڑھ لکھ کر لڑکے کسی کام کے نہیں رہتے، اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینے سے گریز کرتا ہے کیا یہ بہتر نہیں کہ بچے اوائل عمر سے کمانے لگیں اور بڑھ جائیں تو پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ کمائیں؟ جتنی بار وہ طبقہ یہ سوال خود سے کرتا ہے جواب اثبات میں پاتا ہے۔ اس جواب کے آگے تعلیم کے فوائد پر تقریر سننے کے لئے کون تیار ہوگا۔ تعلیم کے بعد روزگار صرف اس لئے اہم نہیں کہ وہ نہ ملا تو کھائیں گے کیا؟ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اگر ہمارے بچے تعلیم پاکر بڑی تعداد میں ملازمتوں سے محروم رہے، تو پھر انھیں پڑھوانے کا شوق ان کے والدین میں کیونکر پیدا ہوگا۔ لاکھ جتن کیجیے، اس چکر سے کیسے نکلیے گا؟ تعلیم کا رواج گھر گھر نہ ہوگا، تو دوسرے طبقوں سے ملازمتوں اور کاروبار کے لئے مقابلہ کیسے کیجیے گا؟ اور جب تک ملازمتیں نہیں ملتیں، والدین کو اس بات کے لئے کیسے

راضی کیجیے گا کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر بے مصرف اور بیروزگار بنا دیں۔

بیسویں صدی کے دوسرے رُبع سے مسلمان والدین نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم کی طرف قدرے توجہ کی۔ مستثنیات کو چھوڑ کر یہ توجہ اس بنا پر تھی کہ لڑکے چاہنے لگے تھے کہ بیوی پڑھی لکھی آئے۔ اب یہ عالم ہوگیا ہے کہ زیادہ پڑھی لکھی لڑکیوں کو اچھے برسرِ روزگار لڑکے نہیں ملتے۔ اگر حالت یہ رہی تو لڑکیوں کی پڑھائی پر پھر دھکا پہنچے۔ پہلے تعلیم کی کمی لڑکیوں کی شادی میں سدِّ راہ تھی اور اب ایک حد تک تعلیم کی زیادتی۔ کیونکہ مسلمان لڑکیاں کیریئر کی طرف بہت کم جاتی ہیں۔ غریب ماں باپ کا روپیہ صرف کرا کر پڑھ لکھ گئیں اور پڑھا لکھا برسرِ روزگار بر بھی نہیں ملا، تو کیا حاصل ہوا؟ روایت انھیں نوکری کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ورنہ ملازمت کے دروازے پر دستک دیتیں تو اس سے کہ دروازہ کھلتا بھی ہے کہ نہیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے حالات سے مجبور ہو کر خود کو گرہوں میں باندھ لیا ہے، اور ابنائے وطن بے نیازی سے انھیں دیکھ رہے ہیں کہ انھیں اپنی آگ میں جلنے دو۔ مسلمانوں کو بے حسی اور بے عملی زیب دیتی ہے اور نہ ابنائے وطن کو بے نیازی اور بے تعلقی۔ مسلمانوں کے مسائل جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کچھ تو دوسرے اہلِ وطن کے ساتھ مشترک ہیں۔ کچھ ان کے مخصوص مسائل ہیں۔ لیکن ان کے مسائل چاہے مخصوص ہوں چاہے مشترک ہوں سارے ہندوستان کے مسائل ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے ہندوستان کے سارے باشندوں کو مل کر جتن کرنے چاہئیں کہ سب کی عافیت اور فلاح اسی میں ہے۔ ہندوستان کے جسم میں مسلمانوں کی حیثیت ہاتھ یا ٹانگ کی سی نہیں کہ ٹوٹ جائے یا کٹ جائے، پھر بھی جسم اپنا کام کرتا رہے گا۔ ان کی حیثیت اعضائے رئیسہ میں ایک عضو کی ہے کہ اس کے خلل پذیر ہو جانے کے بعد جسم صحت مند نہیں رہ سکتا۔ مسلمانوں کی پس ماندگی کی بیشتر ذمّہ داری خود مسلمانوں پر ہے۔ لیکن باقی اہلِ وطن خصوصاً ہمارے ہندو بھائی اس ذمّہ داری سے بالاتر نہیں۔ جمہوریت جو ذمّہ داریاں عاید کرتی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ سب شہریوں کی خوش حالی اور پیش رفت کے لئے کوشش کی جائے۔ کیونکہ اگر کوئی ایک فرقہ یا طبقہ پس ماندہ رہتا ہے، تو جمہوریت کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔ اکثریت کے لئے تو یہ لازم ہے کہ اقلیتوں کو ترقی اور خوش حالی کی دوڑ میں اپنے ساتھ لے کر چلے۔ حکومت سے مطالبہ کرنے کا جہاں تک تعلق ہے یہ ہر فرد اور ہر طبقے کا حق ہے۔ اقلیت کے مطالبات پر حکومت کو کان دھرنا چاہیے کہ جمہوری طرزِ حکومت کی آزمائش یہیں ہوتی ہے۔ لیکن حکومت کی توجہ سے کہیں زیادہ اہم اکثریت کا التفات اور اس کی ہمدردی ہے۔ بغیر اس کے حکومت کے فرامین اور احکام زیبِ قرطاس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اکثریت کو چاہیے کہ اپنے افراد میں ایک فضا، ایک رجحان، ایک نقطۂ نظر اقلیت کے ساتھ کشادہ دلی

ہمدردی اور اعانت پیدا کرے۔ یہ فرض اکثریت کا ہے اور اسی کو اسے نبھانا ہے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اکثریت کے ساتھ خیر سگالی، خوش دلی اور شگفتگی کے روابط استوار کریں۔ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ مسلمان جذباتی ہیں، جوش کی رو میں بہ جاتے ہیں اور جوش میں ان کے اکثر رہنما ان کے دیرپا مفاد کو بھول جاتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں ایسا موڑ آگیا ہے، جہاں انھیں صورت حالات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا اور بدلے ہوئے حالات سے خود کو ہم آہنگ کرنا چاہیے۔ نئی دنیا اور اس دنیا میں اپنی نئی حیثیت کے مضمرات اور عواقب کو سمجھنا اور اپنے رویے اور زاویۂ نگاہ اور اندازِ مزاج کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا بہت ضروری ہے۔ ماضی کے طواف، تن آسانی، خوش خرامی، انتہا پسندی، جذباتیت پرستی اور انا کو چھوڑ کر مستقبل کی تشکیل، جفاکشی، میانہ روی، عقلیت پسندی، کو شعار بنانا چاہیے۔ جہالت کی جگہ علم، طغیانی کی جگہ حلم، انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کو دینی ہوگی۔ مل کر کام کرنے، ایک دوسرے پر اعتبار کرنے، ڈھنگ سے ادارے چلانے اور انسانیت کی خدمت پر خود کو آمادہ کرنے میں ہی بھلا ہے۔ یہ دور سخت مقابلے اور اجتماعی کوشش کا دور ہے۔ جو قومیں قدم ملا کر اور سر جوڑ کر چلتی ہیں، وہی آگے بڑھتی ہیں۔ ترقی کے لئے کوئی چھوٹا راستہ آج تک نہیں نکلا۔ عیش کوشی کو انحطاط سے کوئی جدا نہ کر سکا۔ نفاق سے زوال کا ناتا نہ ٹوٹا ہے، نہ ٹوٹے گا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اگر عزت کے ساتھ رہنا ہے تو تحصیل علم، اتحاد اور انتھک کوشش کے بغیر کام نہ چلے گا۔

(ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل لکچر)

# دینا نہ دینا

ایک مالدار آدمی نے پوچھا: "دینا کسے کہتے ہیں؟" جواب ملا: "جب تم اپنی دولت میں سے دیتے ہو تو برائے نام دیتے ہو، مگر جب تم اپنے میں سے دیتے ہو، تو کچھ دیتے ہو۔"

وہ لوگ بھی ہیں جن کے پاس بہت کچھ ہے اور وہ اس میں سے تھوڑا سا دیدیتے ہیں۔ وہ دیتے اس لئے ہیں کہ لوگ جانیں۔ ان کے من میں چھپی ہوئی یہ خواہش ان کے دینے کو اکارت کر دیتی ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس بہت کم ہے اور وہ سب کچھ دے ڈالتے ہیں۔ یہ گروہ زندگی اور اس کی دیالی میں اعتقاد رکھتا ہے، اس کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔

وہ لوگ بھی ہیں جو خوشی خوشی دیتے ہیں یہی خوشی ان کا انعام ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو تکلیف کے ساتھ دیتے ہیں۔ یہ تکلیف ان کا بپتسمہ ہے جو ان کو اخلاص کے حلقہ میں لے آتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دیتے ہیں اور دیتے ہوئے نقصان یا تکلیف محسوس نہیں کرتے وہ خوشی کی تلاش بھی نہیں کرتے؛ دیتے ہوئے انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی کام ثواب کا کر رہے ہیں۔ وہ اس طرح دیتے ہیں جیسے سامنے کی وادی میں وہ لہلہاتا ہوا پھولدار پیڑ ہوا میں اپنی خوشبو بکھیر رہا ہے۔ ایسے دینے والے کے ہاتھوں سے پروردگار کی مشیت ظاہر ہوتی ہے اور ان ہی کی آنکھوں کی اوٹ سے وہ دنیا پر مسکراتا ہے۔

مانگنے پر دینا اچھا ہے، پر بنا مانگے دینا اس سے بڑھ کر ہے۔

تمہارے پاس جو کچھ ہے ایک نہ ایک دن وہ سب کچھ دے دیا جائے گا۔ اس لئے ابھی دے ڈالو جبکہ دینے کا موسم تمہارے ہاتھ میں ہے، تمہارے وارثوں کے نہیں۔

تم کہتے ہو: "ہم دیں گے ضرور، لیکن صرف ان کو جو دراصل مستحق ہیں۔"

تمہارے باغ کے پیڑ تو یہ نہیں کہتے، اور نہ ہی تمہاری چراگاہ میں بھیڑوں کے گلے یہ کہتے ہیں۔ وہ تو اس لئے دیتے ہیں کہ وہ زندہ رہیں، دینا زندگی ہے؛ مٹھی بند کر لینا، نہ دینا موت ہے۔

اور تم ہوتے کون ہو کہ لوگ تمہارے سامنے اپنے جگر کو چاک کر کے دکھاتے پھریں اور اپنے وقار کا جامہ تمہارے سامنے اتار پھینکیں، تاکہ تم ان کی اہلیت کو برہنہ اور ان کے افتخار کو بے حجاب دیکھ سکو۔

پہلے اپنی خبر لو۔ بننا ہے تو دینے والے بنو، یا دینے کا ایک وسیلہ بن جاؤ۔ تم کیا دو گے؟ یہ صرف زندگی ہے جو زندگی کو دیتی ہے، یا دے سکتی ہے۔ تم ناحق سمجھتے ہو کہ تم دے رہے ہو۔ تمہارے حصہ میں تو صرف دیکھنا آیا ہے۔ دینا کوئی اور ہے۔

# اجتماعی خودکشی کے طریقے

اجتماعی خودکشی کے طریقے کیا کیا ہیں؟

لیجیے سنیے: پہلا طریقہ جسے ترہبدف سمجھیے پیچھے کی طرف دیکھنا ہے۔ نہ دنیا ساکت ہے نہ زندگی ٹھہری ہوئی۔ لہٰذا انسان کے لئے حرکت میں رہنا ضروری ہے۔ جو پیچھے کی طرف رخ کرے گا وہ پیچھے جائے گا، جس کا رخ آگے کی طرف ہوگا وہ آگے بڑھے گا، جو پیچھے جائے گا وہ بالآخر عدم تک پہنچ جائے گا جس سے وہ کبھی وجود میں آیا تھا۔ عدم کا لامتناہی سکون حاصل کرنا ہے، تو ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھیے۔ حال اور مستقبل سے کنارہ کش ہو جائیے۔ ماضی میں زندگی بسر کیجیے اور بالآخر عدم تک کا سفر طے کر لیجیے۔ جہاں سے آئے تھے وہیں پہنچ جائیے۔ جن قوموں کو آگے بڑھنے کا ولولہ نہیں رہتا، جو زمین کے سینے پر بوجھ بن جاتی ہیں وہ ہمیشہ ماضی کی بات کہا کرتی ہیں اور اس ماضی کی طرح جو ختم ہو گیا ہے خود بھی ختم ہو جاتی ہیں اور جو پیچھے کی طرف رخ کرکے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا وہ لڑکھڑا کر گر جائے گا۔ زندگی نام ہے حرکت کا، جستجو کا اور پیش رفت کا۔ ان تینوں مصیبتوں کا علاج صرف ایک جگہ ملے گا، موت کی آغوش میں۔

اجتماعی خودکشی کے لئے ایک سبیل اور نکلی ہے۔ یعنی وقت ناوقت فریاد کرنا، آہ بھرنا، حرف شکایت زبان پر لانا، اور اپنے حال زار پر پیہم ترس کھانا۔ جو لوگ فریاد کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ بے داد کرتے ہیں۔ شکوہ و شکایت کرنے والا پہلے غیرت سے ہاتھ دھوتا ہے۔ خود پر ترس کھانے والا ایک گھن لگا دینے والے اخلاقی مرض میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جو قوم گلہ مندی کی خوگر ہو جاتی ہے حوصلے کی راہیں اس پر بند ہو جاتی ہیں۔ ولولہ اس سے کترا کر نکل جاتا ہے۔ اس کے یہاں عمل کی طاقت شل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی تکلیف حقیقی یا خیالی کو بڑھا چڑھا کر اپنے وجود پر حاوی کر دیتی ہے۔ اپنی خام خیالی اور مبالغہ آرائی سے خود کو بے بس بنا دیتی ہے اس میں جینے کی لگن باقی نہیں رہتی اور وہ سسک سسک کر مر جاتی ہے۔ شکایت کو جس جماعت نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، اس نے فنا کو گلے لگایا۔ شکایت کرنے والے کام نہیں کر سکتے۔

ایک شکایت ہی کیا، گفتار کی کثرت بھی اکثر اجتماعی زندگی کی مشکلات کو آسان کر دیتی ہے!

گفتار کے غازیوں کا کردار کھوکھلا ہو جاتا ہے اور اس بوڑھے پیڑ کی طرح جو کھوکھلا ہو چکا ہے، ہوا کا ایک جھونکا اُسے وجود سے عدم کی طرف لے جاتا ہے۔ جو قوم زبان کے چٹخارے پر جان دینے لگی وہ دراصل جان گنوا بیٹھتی ہے۔ زبان کا چلنا زندگی کی ایک علامت ہے مگر زندگی سے عبارت نہیں۔ جو لوگ باتیں بنانے کے عادی ہو جاتے ہیں، کام کرنے کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہتی۔ باتیں بنانے سے کام بگڑتے ہیں۔ زیادہ باتیں کرنے والے لوگ بہت سی باتیں غلط کہہ جاتے ہیں، اپنی بات کا پاس نہیں رکھتے، اپنے عہد کو پورا نہیں کرتے۔ اس عادت میں جب وہ راسخ ہو جاتے ہیں تو قول کو فعل کا بدل سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے، جوانمردی کا ان میں شائبہ باقی نہیں رہتا۔ عزتِ نفس کا احساس ان کی گرفت سے نکل جاتا ہے۔ یہ لوگ حقیقت کے بجائے داستانوں کی دنیا میں رہتے ہیں اور داستان کہتے کہتے سو جاتے ہیں، اس طرح سے کہ ان کی داستان تک بھی داستانوں میں باقی نہیں رہتی۔ یہ لوگ خیالی پون چکیوں پر وار کرتے رہتے ہیں اور بالآخر خود اس وار کے ہدف بن جاتے ہیں جو دستِ قضا سے سرزد ہوتا ہے۔

قومیں خود کو معدوم کرنے کے لئے ایک اور طریقہ بھی اختیار کرتی ہیں: وہ علم سے اپنا ناتا توڑ لیتی ہیں اور جہالت کے حصار میں جا بیٹھتی ہیں۔ اس شبستاں میں انھیں بڑا سکون ملتا ہے، وہاں علم کی شعاعیں آنکھوں کو ستاتی نہیں۔ گہری نیند سے جگاتی نہیں۔ ہر سمت اندھیرا، ہر طرف سکون۔ نہ آگہی کی روشنی، نہ جستجو کی تڑپ، نہ پیش رفت کا ولولہ! انسان نے دنیا میں جو کچھ ترقی کی ہے علم کی بدولت کی ہے۔ علاوہ بریں دنیا کے وسائل محدود ہیں۔ ان وسائل کو حاصل اور استعمال کرنے کے لئے دنیا کی اقوام میں سخت مقابلہ ہو رہا ہے۔ جن قوموں کے پاس علم ہے، عالم کی زمام ان کے ہاتھ میں ہے۔ علم طاقت ہے، زندگی ہے۔ جہالت کمزوری ہے، فنا ہے۔ فنا ہونے کا آسان طریقہ ہے جہالت کی قبر میں اُتر جانا، زندہ درگور ہو جانا اور پھر ابدی نیند سو جانا۔ انسان کی تسخیرات اور قدرت پر اس کی بالادستی علم اور عقل کی بدولت ہے۔ علم ہی عقل پر سان رکھتا ہے۔

آپ تو اتنا جانتے ہی ہوں گے کہ قوم افراد سے بنتی ہے۔ افراد متحد ہوتے ہیں تو جماعت مضبوط ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنے مفاد کا اسیر ہو جائے تو جماعت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ اینٹوں کو مسالے سے نہ جوڑیئے، یوں ہی اُوپر تلے رکھ دیجیے، تو مکان بن چکا۔ افراد کو ربط باہم اور خلوص و ایثار سے جوڑا جاتا ہے۔ مشترک مقاصد اور مشترک عزائم و عقائد ہی جماعت کو توانا بناتے ہیں۔ اگر خلوص، ربط باہم اور اشتراکِ مقاصد کی جگہ خود غرضی نے لی تو یوں سمجھیے کہ قوم فنا کے راستے کی بہت سی مشکلات سے نجات پا گئی۔ جو قومیں پکے ہوئے پھل کی طرح ٹپکنے کے لئے تیار ہیں، ٹٹولیے تو وہ افراد کی خود غرضی کی مرہونِ احسان ہیں، اسی کی بدولت اس حالت کو پہنچی ہیں۔ کسی قوم کے

متعلق اگر یہ فیصلہ کرنا ہو کہ گروہ باقی رہے گی یا فنا ہو جائے گی، تو یہ دیکھیے کہ اس کے افراد اپنے ذاتی مقاصد کو ترجیح دیتے ہیں یا اجتماعی مقاصد کو؟ اجتماعی موت کو حاصل کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ افراد کے کانوں میں خود غرضی کا سبق پھونک دیا جائے۔ افراد مختلف سمتوں میں جائیں گے، تو جماعت منزل مقصود تک پہنچ چکی۔ ہندوستان میں کونسی قوم ایسی ہے جس کے افراد اپنے چھوٹے سے چھوٹے فائدے کے لئے قوم کا بڑا سے بڑا نقصان کو تیار نہیں؟

خود غرضی کے جلو میں تکبر، انا اور نخوت آتے ہیں۔ ان سب کی پرچھائیں، عقل و شعور پر پڑتی ہے۔ نخوت کے نشے میں انسان اجتماعی فلاح کو فراموش کر دیتا ہے۔ نخوت جدھر جاتی ہے، عداوت اور نفاق کے بیج بکھیرتی ہوئی جاتی ہے۔ نخوت، جہالت کی بہن ہے اور اس کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے۔ کسی قوم میں نفاق اور انتشار برپا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے کانوں میں تکبر کا منتر پھونک دو۔ پھر ایسی پھوٹ پڑے گی جس کا مٹنا قسم ہے۔ انا گزیدہ لوگ پھنکارتے اور ڈستے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ان کے کاٹے کا علاج نہیں، ان کا کاٹا سوتا ہے۔

حسد ہماری قوم کا طرۂ امتیاز ہے، اس کی وجہ سے شیرازہ سب سے زیادہ بکھرتا ہے۔ بظاہر حسد خود غرضی کے برعکس ہے، جو زیادہ قریب ہوتا ہے وہی اس کا ہدف زیادہ بنتا ہے جن سے کوئی تعلق نہیں، وہ پھلیں پھولیں، ترقی کریں کسی پر گراں نہیں گزرتا۔ اپنے عزیز، ہمسائے اور احباب اگر کامیاب ہوتے ہیں، ترقی کرتے ہیں تو لوگ آگ بگولہ ہو جاتے ہیں۔ اغیار اگر پنپتے ہیں، ترقی کرتے ہیں تو کوئی اثر نہیں پڑتا۔ گویا قدرت کی طرف سے ایک مضبوط انتظام اس بات کا ہو گیا کہ یہ قوم کبھی مل کر نہ رہ سکے۔ ہمیشہ جوتی میں دال بٹتی رہے۔ لہٰذا حسد کو راہ نما بنا لیا جائے تو قوم کے فنا ہونے کی منزل آسان ہو جاتی ہے۔ حسد اچھائی کو پنپنے نہ دے گا، برائی کو شہ دے گا۔ اچھائی بقا کی ضامن ہوتی ہے، برائی موت کا باعث۔ حسد محبت کی قبا کو پارہ پارہ کر دیتا ہے، اتحاد کی دیوار میں دراڑ ڈال دیتا ہے۔

کسی جماعت کا شیرازہ بکھرنے لگے، تو امید بندھتی ہے کہ جلد ہی زندگی کے مصائب سے نجات مل جائے گی۔ موت اسے اپنی آغوش میں لے لیگی۔ دہریہ نفسی نفسی کے کلمہ گو موت کی راہ سے حشر کے میدان تک پہنچ جائیں گے۔ "وہاں جو ہوگا دیکھا جائے گا" لیکن یہاں کے نت نئے بکھیڑوں سے تو رستگاری ملے گی۔ ساتھ ہی کبھی کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے، جیسا کہ اقوام و ملل کی تاریخ میں بارہا ہوا ہے، کہ

اُن ہی میں سے کوئی فرد ایسا اٹھے جو زوال آمادہ قوم کو سنبھال نے اس کی رگِ غیرت کو جوش میں لے آئے اس کی قیادت اور شیرازہ بندی اس عنوان کرے کہ بقا فنا کی جگہ لے لے، پیشرفت پسپائی کی۔ لہٰذا اس قوم یا جماعت پر جس نے دنیا سے منھ موڑ لیا ہے اور فنا ہوجانے کی ٹھان لی ہے، لازم آتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے کسی فرد میں خلوص اور رہبری کو اکٹھا نہ ہونے دے اور اگر وہ جمع ہوجائیں تو ایسے راہ نما کی وہ تھکا فضیحتی کرے، اس کی تذلیل اور تحقیر کے اتنے اسباب فراہم کردے کہ خود اس کی جان پر بن جائے۔ یا تو اصلاح کا سودا اس کے سر سے نکل جائے، یا جان تن سے۔ اس کی نیت پر شبہ کرے اور الزاموں کی بوچھار سے اس کی طمانیت کو برہم، اس کے عزائم کو متزلزل، اس کے جذبۂ اصلاح کو مجروح کرے۔ جو قوم صالح قیادت کو پنپنے نہیں دیتی اس کے لیے موت بغایت آسان ہوجاتی ہے۔

اجتماعی خودکشی سے بچنے کا ایک راز اور ہے، چلیے اسے بھی بند کرتے چلیں۔ وہ ہے اداروں کو چلانے کی صلاحیت۔ جب تک کوئی قوم اداروں کو ڈھنگ سے چلا سکتی ہے، وہ مر نہیں سکتی۔ ادارے انفرادی برائیوں کی روک تھام کرتے ہیں اور اجتماعی ترقی کا انصرام۔ خدا جس قوم کو فنا کرنا چاہتا ہے اس سے صحت مند قیادت کے علاوہ اداروں کو چلانے کی صلاحیت بھی چھین لیتا ہے؛ خدا کے بندے بھی ایسا کر سکتے ہیں۔

لیکن ایک اور مشکل راہ میں حائل ہے، وہ ہے انسان کی عقل، اس کے سوچنے کی طاقت۔ عقل سوچنے اور غور کرنے سے باز نہیں آتی۔ غور کرے گی تو بھلے بُرے کو سمجھنے لگے گی اور کبھی نہ کبھی راہ پر پڑ جائے گی۔

مانا کہ عقل کو طاق پر نہیں بٹھا سکتے، اسے معطل نہیں کر سکتے لیکن اسے غیر ضروری باتوں میں اُلجھا تو سکتے ہو۔ اسے اصول سے ہٹا کر فروعات کے دلدل میں ڈال دیجیے؛ لاکھ جتن کرے اس میں سے نکل نہ پائے گی، پھنستی چلی جائے گی۔ فضولیات، توہمات اور خرافات کی گرفت میں ایک بار عقل آگئی تو ادراک اور بصیرت سے محروم ہوجائے گی۔ اسے اس کا یارا ہی نہ رہے گا کہ قوم کو فنا سے بچائے۔ مثلاً جب دو انسان ملتے ہیں تو جوش اور خوشی کے ساتھ ایک دوسرے کی پذیرائی کرتے ہیں۔ کوئی آداب عرض کرتا ہے، کوئی سلام علیکم کہہ کر خیر مقدم اور خیر سگالی کرتا ہے۔ سلام کا مقصد ہے دلوں کو ملانا، افراد کو جوڑنا۔ اس کا رخ موڑ دیجیے تو یہ دلوں میں بیر ڈال دیگا، افراد کو ایک دوسرے سے توڑ دیگا۔ افراد کو اس بحث میں اُلجھا دیجیے کہ سلام ہاتھ اٹھا کر کیا جائے، کہ ہاتھ چھوڑ کر؛ یا یہ کہ سلام بآواز بلند کیا جائے، یا ہاتھ کے اشارے سے۔ اس بحث کو تیز و تند کر دیجیے ——— اس قدر تیز کہ عقل بیچاری کو فرار ہوتے ہی بنے اور افراد کشت و خون پر تُل جائیں اور صدیوں تک اپنا وقت اور صلاحیتیں اس مباحثے کی نذر کرتے رہیں، اور جتنی باتیں زندگی، ترقی، بقا اور پیشرفت کے لیے ضروری ہیں انھیں

بھول جائیں۔ دیکھا آپ نے سلام کا مقصد فوت ہو گیا، بلکہ اُلٹ گیا۔ کسی قوم کو اصول سے ہٹا کر فروع میں اُلجھا دیجئے وہ ہمیشہ اپنے لئے مشکلات پیدا کرتی رہے گی جن سے نجات موت کے ہی ہاتھوں ملے تو ملے۔ ایسے لوگ۔ پیڑ گنتے ہیں اور جنگل ان کی نگاہوں کی گرفت میں آتا ہی نہیں۔ یہ جزو کو کل پر اور نقطے کو حروف پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ فروع آشنا اصول سے منحرف رہتے ہیں، تناسب اور تناظر سے محروم ہو جاتے ہیں، نیک و بد کا انھیں شعور نہیں رہتا؛

قوم کی مجموعی حالت کچھ بھی ہو، خواہ کتنی ہی مفلس، جاہل، جھگڑالو، سطحی اور بے وقار کیوں نہ ہو، اس میں سے اُبھر کے کچھ لوگ ایسے ضرور نکلتے رہیں جو خوش حال پڑھے لکھے سنجیدہ، سمجھدار اور با اثر ہوتے ہیں۔ مگر قوم پسماندہ ہے تو یہ ترقی یافتہ طبقہ اس کی اصلاح کے بجائے اس کے استحصال پر کمربستہ ہو جائے گا۔ اس کی نعش پر کھڑا ہو کر اپنے قد کو اونچا کرے گا۔ اس کا نمائندہ بن کر اسے دھوکے دے گا اور حکومتِ وقت کا قرب حاصل کرے گا؛ حکومت کو اطمینان دلائے گا کہ جس جماعت سے اس کا تعلق ہے وہ خوش حال اور شادماں ہے اور حکومت کے اقبال اور انصاف کے گُن گا رہی ہے۔ یہ طبقہ گورکن کا وصف رکھتا ہے۔ قوم کی بالاقساط تدفین کرنا اس کا مشغلہ اور پیشہ ہے۔ یہ قوم کی جڑ کاٹنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ ہے۔ یہ وہ جنس گراں ہے جو مصر کے بازار میں بکنے کے لئے سدا تیار ہے اور اس کی قیمت بھی کوئی ایسی زیادہ نہیں، چند ٹکڑے چاندی کے یا روٹی کے۔ یہ طبقہ بڑے کام کا ہے۔ اسی کی امداد شریکِ حال رہی تو قوم کل کی مرتی، آج مر جائے گی۔

اس سلسلے کی ایک کڑی اب بھی رہ گئی ہے۔ جس قوم کو ابدی نیند سلانا ہے، اس کو آہستہ آہستہ حرکت اور محنت سے دُور لے جانا ہوگا۔ حرکت میں برکت ہے۔ محنت بارور ہو کر رہتی ہے۔ جفاکشی میں توانائی چھپی ہوئی ہے۔ جو قومیں منزلِ فنا کے لئے رختِ سفر باندھ لیتی ہیں وہ محنت، حرکت، جد و جہد سے جی چُراتی ہیں۔ کاہلی تن آسانی اور عیش و عشرت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتی ہیں۔ بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ جس قوم نے اپنے عروج کے زمانے میں ایک عالم کو تہ و بالا کر ڈالا، جس نے چشم زدن میں دنیا کو تسخیر کر لیا، علم و عمل دونوں سے، وہی زوال کے زمانے میں خانہ نشین ہو گئی؛ اپاہج ہو کر گھر میں بیٹھ رہی، اس طرح منجمد ہو کر گویا کا ٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ جسے خود حرکت سے گریز ہو اس کا لہو کب تک گردش میں رہے گا۔ ایسی قوم کے افراد سلامتی اور آرام کا کلمہ پڑھتے ہیں، جستجو ان کے دامنِ دل کو چھوتی نہیں، مہم جوئی سے انھیں گریز ہوتا ہے۔ ملکِ خدا ان کے لئے تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ معذور ہو کر گھر میں بیٹھ جاتے ہیں اور اسی طرح ایک دن قبر میں اتر جاتے ہیں۔ تن آسانی، خانہ نشینی، عیش طلبی کا بھلا ہو، جانکنی کی مدت مختصر ہو جاتی ہے۔

ایک شاعر نے جسے مدتوں زعم رہا کہ وہ زوال کے سیلاب کو بند باندھ کر روک سکتا ہے، کہا تھا:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم ٭ جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

سچ ہے جو قوم یقین کی دولت کھو بیٹھتی ہے، وہ اپنی شخصیت کو محفوظ نہیں رکھ پاتی! فنا ہو جاتی ہے۔ یقین سے ہی عمل کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ گمان کے صحرا میں قدم رکھا تو بھٹکنے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ کسی قوم کے یقین کو مجروح کر دو، اس میں نہ ولولہ باقی رہتا ہے نہ زندگی۔ نہ عمل کا جذبہ نہ آگے بڑھنے کی تمنا۔ شاعر نے بہت شور مچایا، زوال آمادہ، فنا بستہ قوم کسمسائی، پھر سو گئی۔ بڑی رعایت کی تو اس کے اشعار گنگنانے لگی۔ اس سے بڑا طنز کیا ہوگا کہ جن اشعار میں عمل کی تلقین کی گئی ان اشعار کو ہی عمل کا بدل بنا لیا گیا، دھرے رہ گئے شاعر کے سارے عزائم۔ انقلاب برپا ضرور ہوا۔ لیکن زبانوں تک رہ گیا، حلق کے نیچے نہیں اترا۔ جس یقین کو بیابان کی شب تاریک میں قندیلِ رہبانی بننا تھا، اس کی لو دھیمی ہوتی چلی گئی وہ بجھ گیا۔ حرکت اور جد و جہد کا جو صور شاعر نے امنگ اور آرزو اور اعتماد کے ساتھ پھونکا تھا اسے سن کر قوم نے کروٹ لی پھر اس طرح سو گئی کہ جاگنا حشر تک قسم ہے۔

میرے ہاتھ میں نہ قلم ہے، نہ موقلم۔ ایک آئینہ ہے جسے میں نے بظاہر ایک جیتی جاگتی قوم کے سامنے رکھ دیا ہے۔ جو کچھ تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے، جو کچھ میں قلمبند کروں گا، وہ عکس ہے ایک ایسی قوم کا جو مٹنے پر تلی ہوئی ہے۔ وہ ہر ڈھنگ اختیار کر رہی ہے جو اسے فنا کی منزل تک پہنچا دے۔ دنیا کی تاریخ میں کب کسی قوم نے مرنے کے لئے اتنے سامان فراہم کیے ہوں گے۔ رہتی دنیا تک خودکشی کرنے والی اقوام خودکشی کے ان طریقوں پر کوئی اضافہ نہ کر سکیں گی۔ خدا گواہ ہے میں نے اس فنا آمادہ قوم کے سامنے آئینہ اس لئے رکھا کہ اس کی تصویر بلاکم و کاست سامنے آ جائے۔ نکتہ چینوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں نے آئینہ چہرے کے سامنے یہ دیکھنے کے لئے رکھا کہ سانس آ رہی ہے یا مریض دم توڑ چکا!

● ●

# مسلم یونیورسٹی میں تعلیمی اور اقتصادی سیمنار

گزشتہ ماہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ہمدرد فاونڈیشن کے بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو کے اشتراکِ عمل سے علی گڑھ میں مسلمانانِ ہند کی تعلیمی اور روزگاری حالت پر غور وخوض کرنے کے لئے ایک دو روزہ سیمنار منعقد ہوا۔ یہ اس اہم سلسلے کی دوسری کڑی تھی۔ پہلا سیمنار گزشتہ سال دہلی میں کیا گیا تھا۔

مسلمانانِ ہند کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اصول کو چھوڑ کر فروع سے الجھ جاتے ہیں۔ ان کا ذہن تعمیری کے بجائے تنقیدی اور اکثر تخریبی ہو جاتا ہے۔ ان میں اداروں کو چلانے اور منصوبہ بنانے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت بہت کم رہ گئی ہے۔ ان کا ردعمل عقل سے زیادہ جذبہ پر منحصر ہوتا ہے۔ ان کا زاویۂ نگاہ اجتماعی سے زیادہ انفرادی ہوتا ہے۔ یہ دونوں خصوصیات انکی پیش رفت میں سدِ راہ ہیں۔

تازہ ترین ثبوت علی گڑھ سیمنار کی بابت ردعمل میں ملے گا۔ محض اس بنا پر کہ اس سیمنار میں اقلیتی کمیشن کے صدر جسٹس عبداللہ بیگ نے شرکت کی تھی اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ کسی نے رُک کر یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ سیمنار نے کن مباحث پر غور کیا اور ان کے متعلق وہ کس نتیجہ پر پہنچا اور آئندہ کے لئے غور و فکر، سروے اور تحقیق کی کیا کیا راہیں نکلیں۔ بہتر ہے اس کا فیصلہ ہو جائے کہ اقلیتی کمیشن پر بھی اثر انداز ہونا چاہیئے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ یا اسے ایسی مجلسوں اور محفلوں سے دور رکھنا چاہیئے۔ دور رکھنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ کمیشن جو بالعموم اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کے مسائل پر غور اور تحقیق کرنے کے لئے ترتیب دیا گیا ہے مسلمانوں کی صورتِ حالات اور ان کے مسئلوں سے بے بہرہ رہ جائے گا اور ان کے حق میں کوئی مؤثر سفارش نہ کر سکے گا۔ اس گنہگار انسان کو جس کے ہاتھ میں اس وقت قلم ہے یقینِ کامل ہے کہ اگر مسلمانوں نے اوائلِ اسلام میں یہی رخ اختیار کیا ہوتا جو وہ گزشتہ چند صدیوں سے کر رہے ہیں تو اسلام مکہ معظمہ میں اور وہ بھی چند بزرگانِ دین تک محدود رہ جاتا۔ حیرت ہے کہ جو لوگ صرف خدا سے ڈرنے پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنوں اور بیگانوں کی نکتہ چینی سے کیونکر خوف کھانے لگے! جو دین کہ دنیا کی رہبری کے لئے تھا اس کے ساتھ یہ کیسا انوکھا برتاؤ ہے کہ اسے دنیا کی نگاہوں سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ماننے والے کھُل کر بات کرنے کا یارا بھی نہیں رکھتے۔ جس دین نے

مشاہدہ، فکر و غور، تدبر و تفکر، جستجو، اور حرکت پر زور دیا تھا۔ اس کے نام نہاد ماننے والوں کا واسطہ اب صرف جمود سے رہ گیا ہے۔ طریق کار دراصل یہ ہونا چاہیے کہ اپنوں اور بیگانوں میں سے اگر کوئی شخص ایسی بات کہے جو مسلمانوں کے مسلک یا عمومی مفاد کے خلاف ہو تو ہمارے اہل فکر اس کا معقول اور مسکت جواب دیں۔ ہم زندہ ہیں اور اس دنیا کا اور انسانیت کا ایک حصہ ہیں۔ اس لئے لوگ ہماری حالت، ہمارے مسلک، ہمارے نقطۂ نظر کے متعلق گفتگو ضرور کریں گے اور ان کا منھ کوئی بند نہیں کر سکتا۔ اگر ہم خدانخواستہ مردہ ہوتے اور آثار قدیمہ میں گنے جاتے تو ہم پر مؤرخانہ اور ترحمانہ نظر ہی ڈالی جا سکتی تھی، اور وہ بھی کبھی کبھی ہمیں زندہ ہونے کا حق اور زندہ ان اداکرنا ہے ہم پر تبصرہ ہوگا، نکتہ چینی ہوگی، ہمارا موازنہ دوسروں کے ساتھ کیا جائے گا، ہمیں تبصرہ کی توضیح کرنا ہوگی، نکتہ چینی کا جواب دینا پڑے گا۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم دوسروں کے بالمقابل تولے جا رہے ہیں تو وہ شخص جو ترازو لے کر بیٹھا ہے ڈنڈی تو نہیں مار رہا ہے، جو ڈنڈی مارنے پر تلا ہوا ہے وہ جب تولے گا تو ڈنڈی مارے گا۔ ڈنڈی پر نگاہ رکھنا اور اُسے سیدھا رکھنا ہمارا کام ہے۔ لڑ جھگڑ کر نہیں، سمجھا کر، مناظرہ اور مباحثہ سے نہیں۔ استدلال، توجیہ، توضیح، افہام و تفہیم سے کہ یہی طریقہ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں اختیار کیا ہے اور اسی راہ پر چل کر اسلام کی اشاعت کی گئی تھی۔

جہاں تک اجتماعی کے بجائے انفرادی زاویۂ نگاہ کو اختیار کرنے کا تعلق ہے۔ اس کی مثال بھی مذکورہ سیمنار سے مل جائے گی۔ ایک محترم صحافی کو اپنے قیام کے متعلق کچھ شکایات ہیں (جو ایک حد تک بجا تھیں) ان کی آزردگی نے سیمنار کی تحقیر کی شکل اختیار کر لی۔ بہر کیف جس طرح گلدار اپنے نقوش نہیں بدل سکتا ہندستانی مسلمان بھی اپنی بے مصرف نکتہ چینی اور اپنی انفرادی انانیت کو چھوڑنے کی طرف ہرگز مائل نہیں ہے۔ بیکار نکتہ چینی سے ایک طرف نکتہ چینی کی قوت عمل بالکل ضائع ہو جاتی ہے، تو دوسری طرف جس پر نکتہ چینی کی گئی اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ اور اگر اس کا اخلاص جنون کی حد تک نہیں ہے تو وہ یہ کہہ کر کنارہ کش ہو جائے گا کہ بھاڑ میں جائے وہ لوگ جو نکموں، کاہلوں، باتونیوں، ناکاروں، لفاظوں، ریاکاروں کو گوارا کر لیتے ہیں، اگر گوارا نہیں کرتے تو صرف اس شخص کو جو ان کی حالت سدھارنا چاہتا ہے، انھیں آگے بڑھانا چاہتا ہے، وہی تو ایک ان کا دشمن ہے۔ جذبات کے ابال کو بہ طیب خاطر قبول کرتے ہیں لیکن حقیقت پسندانہ تجزیہ اور کسوٹی پر پرکھنے کے ڈھنگ پر چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں۔

فی الحال ہم ان بیشمار اور گرانقدر مقالوں کا ذکر کریں گے، جو مختلف اجلاسوں میں ماہرین تعلیم

و ماہرین اقتصادیات نے پیش کئے۔ ہم خطبۂ صدارت اور مسٹر سکسینہ جوائنٹ سکریٹری اقلیتی کمیشن کی تقریر سے اقتباسات پر اکتفا کریں گے۔

"یہ تصور کیا جاتا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو ہندوستان کے مسلمانوں کو جدید دور سے عہدہ برآ کرنے کی تحریک کا مرکز تھی، مسلمانوں کے مسائل پر غور اور تحقیق کرے گی۔ یہ خواب ہنوز تشنۂ تعبیر ہے۔ یہ بات دراصل ایک نیک فال ہے کہ یونیورسٹی اب اس بات کے لئے تیار ہو چکی ہے کہ مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی حالت کے متعلق تحقیق و تفتیش اور معنی خیز غور و خوض کرے گی۔۔۔۔"

مرکزی اقلیتی کمیشن، اقلیتی پینل اور ریاستوں کے اقلیتی کمیشن اپنی سعی و کوشش کر رہے ہیں لیکن مسلمانوں کے مسائل ہنوز ان کی گرفت میں نہیں آسکے ہیں۔ ان کے متعلق اعداد و شمار صفر کے برابر ہیں۔ مسلمان اپنی صورت حالات کے متعلق رائے صرف تاثرات کی بنا پر کرتے ہیں۔ اگر اعداد و شمار فراہم ہو جائیں اور ان کا تجزیہ اور اشاعت کی جائے تو مندرجہ ذیل نتائج نکلیں گے۔

(۱) ملک اور قوم کے اجتماعی ضمیر کو دھکا لگے گا جس کے نتیجہ میں دوسرے فرقے اور خود حکومت کا زاویۂ نگاہ مسلمانوں کے متعلق بدل جائے۔

(۲) اور وہ بے حسی اور بے تعلقی جو مسلمانوں کو اپنی حالت کی نسبت ہے، ٹوٹ جائے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے زوال کے اسباب حسب ذیل ہیں:

۱۔ تعلیم سے غفلت، جسے افلاس نے اور بڑھا دیا۔

۲۔ تبدیلی کی مدافعت اور جدید زمانہ سے عہدہ برآ ہونے سے گریز۔

۳۔ ملت دو دنیاؤں میں بٹ گئی ہے، جنھیں ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک دنیا جدید تعلیم یافتہ اور خوش حال مسلمانوں کی، دوسری دنیا دینی تعلیم حاصل کرنے والوں اور ان کے ساتھ ساتھ عام غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی۔ اس خلیج کو جس نے ملت کو دو نیم کر دیا ہے، پاٹنا ہوگا۔

۴۔ ہمارے اندر مل کر کام کرنے کی صلاحیت مفلوج ہو چکی ہے۔ اس صلاحیت کے بغیر ترقی کی ہی نہیں جا سکتی۔

۵۔ ایک ایسی ملت میں جہاں زیادہ تعداد ان پڑھ اور غریب عوام کی ہے، تعلیم یافتہ، با اثر اور صاحب منصب لوگ نادانستہ ان کا استحصال کرنے لگتے ہیں، اس سے ایک نقصان یہ بھی ہے کہ

عوام صحت مند قیادت سے محروم ہو جاتے ہیں اور آگے بڑھنے کا دلولہ باقی نہیں رہتا۔

۶- خوف اور غیر محفوظ ہونے کا احساس جو مسلمانوں کے ذہن میں جاگزیں ہو گیا ہے اس کے سایہ تلے ریاضت، جوش، اور امنگ سب مرجھا جاتے ہیں۔ ہر وقت یہ خطرہ دامنگیر رہتا ہے کہ ہمارے ساتھ جب ہوگی زیادتی ہوگی، انصاف کبھی بھی نہ ہوگا۔ یہ ذہنیت کیوں پیدا ہوئی اس کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں، اور اس کے متعلق دو رائے ہو سکتی ہیں لیکن اس بارے میں سب کو اتفاق ہوگا کہ یہ ذہنیت نامحمود اور مضر ہے۔ آئین کی غیر جانب داری کے باوجود مسلمانوں کی ایوان اقتدار میں نمائندگی برائے نام ہے، وہ شرکت کے حوصلہ انگیز احساس سے محروم رہتے ہیں اور اس دلولہ سے بھی جو ملک کے ارتقا اور تعمیر نو کے جلو میں آتا ہے۔

۷- کچھ تو تعلیم کی کمی کی وجہ سے، کچھ خشگیں علاحدگی اور کچھ بڑھی ہوئی انانیت کی وجہ سے بہت سے مسلمان تناسب کے احساس سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ چنانچہ وہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتوں پر جھگڑتے رہتے ہیں اور اہم مسائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ معاشرہ کی خدمت کا ان کے یہاں صیغہ ہی نہیں اور سوشل سروس کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ اگر افراد معاشرہ کی فلاح اور ترقی کے لئے کام کرنے کو تیار نہ ہوں گے، تو معاشرہ ترقی کر ہی نہیں سکتا۔

۸- بہت سی سطحوں پر مسلمانوں کے خلاف امتیازی برتاؤ روا رکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ دوسروں کی عداوت اس قدر نہیں، جتنی ذات برادری اور اقربا پروری کی روایت۔

کسی اقلیت کے جانبر اور سرخرو ہونے کے لئے مندرجہ ذیل تینوں شرطوں کا پورا ہونا ضروری ہے:

۱- وہ اپنے مذہب، ثقافت اور روایت پر سختی سے پابند رہے۔

۲- ریاضت اور جانفشانی کے ذریعہ وہ اپنے آپکو اکثریت سے بہتر ثابت کرے۔

۳- وہ اکثریت کے ساتھ اپنے تعلقات شگفتہ رکھے۔

یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی تعلیمی پسماندگی سے جلد از جلد نجات حاصل کریں۔ اب دوسرا قدم جو اٹھانا ہے، وہ یہ ہے کہ تحقیق، ریسرچ، سروے، جائزے اور اعداد و شمار کی فراہمی کا کام انتہائی سنجیدگی، سلیقہ اور ثابت قدمی کے ساتھ کیا جائے۔

اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ مسلمانوں کے مسائل کو سارے ملک کے مسائل کے پس منظر میں دیکھا جائے۔

مسلمانوں کو چاہیئے کہ مشترک مسائل کو حل کرنے کے لئے وہ برادرانِ وطن کے ساتھ سر جوڑ کر اور قدم ملا کر آگے بڑھیں۔

مسٹر سکسینہ نے اپنی تقریر میں عبرتناک اعداد و شمار دیئے اور دو باتیں ایسی کہیں جو مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی ہیں۔ انھوں نے ہمدردانہ تجزیہ کے بعد اس رائے کا اظہار کیا کہ ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کی آبادی دوسرے طبقوں کے ساتھ مخلوط ہے، ہر جگہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے پسماندہ نظر آئیں گے۔

دوسری بات جو سکسینہ صاحب نے کہی اس کا تخاطب صرف ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ اقلیت کی صورتِ حالات کی منطق یہ ہے کہ وہ اکثریت سے بہت زیادہ محنت کرے اور اس پر فضیلت حاصل کرے اس منطق پر ممالک و اقوام کی تاریخ نے مہر لگا دی ہے۔ ایک ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں اقلیت نے نہ محنت کی، نہ دوسرے فرقوں سے مقابلہ کا دم بھرا۔

●●

# طلبا سے خطاب

عزیزانِ گرامی!

علی گڑھ تحریک علم اور عقل، روشنی اور تازہ ہوا، امید اور ولولہ، درد اور خلوص کی تحریک تھی۔ اس نے ہزیمت خوردہ اور مظلوم مسلمانوں کو مایوسی اور غصہ سے چھٹکارا دلایا۔ اس نے ان کے مرجھائے ہوئے دلوں کو زندگی اور ولولہ دیا۔ اس نے انھیں یہ بھی سمجھا دیا کہ خود غرضی اور نفسی نفسی سے ہرگز کام نہ چلے گا، کوئی طبقہ، کوئی قوم، کوئی ملت اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے افراد انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دیتے رہیں گے۔ اور جب تک ان میں تعمیری اداروں کو ڈھنگ سے کام چلانے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی۔ اس نے یہ اعلان کیا کہ جہالت انسان کے لیے سب سے بڑی لعنت ہے اور کوئی قوم جہالت دور کیے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ اس تحریک نے علم کی اشاعت سے بھی زیادہ جس کام کو سمجھا وہ نقطۂ نگاہ کی تبدیلی کا تھا۔ یعنی ہمارا ردِ عمل، ہمارے فیصلے، جذبات پر نہیں عقل پر مبنی ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں میں علم اور عقل کی بالادستی کو رواج دینے کی کوشش کی۔ اس نے انھیں یہ بھی سکھایا کہ الگ تھلگ رہ کر کڑھنے اور سگنے یا ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمیں سب کے ساتھ مل کر چلنا ہے اور تہذیب حاضر اور وطن عزیز کی برکتوں اور نعمتوں سے دوسروں کے ساتھ بہرہ اندوز ہونا ہے۔ اس تحریک نے جہالت کے ازالہ اور اخلاق و اطوار کی تہذیب و اصلاح کا کام بیک وقت انجام دیا۔

اس تحریک کے بانی سید احمد خاں علیہ الرحمہ نے، جن کی قدوقامت کے سامنے گزشتہ دو سو سال کے بیشتر قد آور مسلم رہنما پستہ قد نظر آتے ہیں؛ اپنی تحریک کو نہ صرف خلوص اور ولولہ، بلکہ دانش مندی، حکمت عملی اور بصیرت کے ساتھ چلایا، جو کچھ فی الوقت ممکن تھا اس کو انجام دینے کی کوشش کی۔ موقع اور محل کا خیال رکھا۔ اور کسی وقت اصلاح کے تدریجی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ مثلاً انھوں نے لڑکیوں کی جدید تعلیم کو اس وقت چنداں اہمیت نہ دی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ ٹیکنیکی تربیت سے جو

انھوں نے صرفِ نظر کیا، وہ بھی اسی وجہ سے۔ سید احمد خاں نے لپنے ذمّہ کوئی ایسا کام نہ لیا جو ہرچند کہ اچھا تھا مگر اس وقت درخورِ عمل نہ تھا۔ انھوں نے اپنی تحریک کو چند گنے چنے مقاصد پر مبنی رکھا اور اسے اور اپنے خواب کو مقاصد کی ریل پیل اور تعبیروں کی کثرت سے بکھرنے نہیں دیا۔ انھوں نے اصولوں پر کوئی مفاہمت روا نہ رکھی، لیکن فروعات اور معاملات میں اس لچک اور داد و ستد کو آلۂ کار بنایا جس کے بغیر پیشرفت ناممکن تھی۔ سید احمد خاں نے حکومتِ وقت سے تعلقات کو خوشگوار بنایا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر مسلمان اسی طرح برہمی، علیحدگی اور غم و غصّہ کا شکار بنے رہے تو علم، روزگار اور اصلاح کی دوڑ میں وہ اس قدر پیچھے رہ جائیں گے کہ شبہ ہونے لگے گا کہ وہ کبھی دوڑے بھی تھے؟ انھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنا ہندو مسلم اتحاد پر ڈالی۔ ایسے اتحاد پر جس میں اقلیت کی عزتِ نفس اور اس کی روایات اور مفادات محفوظ رہیں۔

علیگڑھ تحریک بمشکل ۷۰ سال چلی۔ آغاز میں انتہائی زور و شور کے ساتھ، برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک وہ علم اور تازہ ہوا اور روشنی بکھرتی چلی گئی۔ لیکن ۶۰ سال کے بعد ہی انحطاط شروع ہو گیا، اور گزشتہ ۳۵، ۴۰ سال میں اس انحطاط نے شدّت پکڑ لی۔

وہ خلوص، وہ دردمندی جس سے اس تحریک اور اس کی علامت علیگڑھ یونیورسٹی نے توانائی حاصل کی تھی مفقود ہو گئی اور ان کی جگہ خود غرضی نے لے لی۔ علیگڑھ یونیورسٹی اور علیگڑھ تحریک کے ساتھ وفاداری، ہمدردی اور ہمنوائی کا اعلان ہر کوچہ و بازار سے ہوتا ہے، لیکن یہ اعلان کرنے والے کیا یونیورسٹی کا حق ادا کرنے کے لئے کبھی تیار ہوئے۔ کیا انھوں نے حقوق و مطالبات کے نقارخانہ میں فرائض اور خدمت کی آواز پر بھی کبھی کان دھرا۔ یہ سچ ہے کہ یونیورسٹی کے آڑے وقت میں اس کے بیرونی ہمدرد قربانی دینے کے لیے بے محابا آگے بڑھے۔ لیکن خود گھر والوں نے کیا کیا اور کب تک۔ علیگڑھ میں نفسی نفسی کا یہ کاروبار جب تک جاری رہے گا، کوئی غیر المعقول اصلاح تو در کنار، خاطر خواہ اصلاح بھی اس ادارہ کی نہ ہو سکے گی۔ آئیے ہم سب اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں کہ آیا ہم اپنی ذات پر ادارہ کو ایک لمحہ بھی ترجیح دینے کے لیے تیار ہیں۔

تعلیم کی توسیع کی رفتار بھی رُک گئی اور اب ہندوستانی مسلمانوں کا شمار تعلیمی اعتبار سے ملک کے لپماندہ طبقات میں ہے۔

اور ایک بات جس میں علیگڑھ تحریک کبھی بھی دراڑ نہ ڈال سکی، ہماری جذباتیت ہے۔ عقل کی بالادستی کو ہم نے دراصل کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ہمارا اوڑھنا بچھونا جذبات بنے رہے اور اب بھی ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے

بھلے بُرے میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ امکانات، عواقب اور نتائج کو عقل کی روشنی میں پرکھ نہیں پاتے۔ لہٰذا ہم دھوکا اور ٹھوکر پہم کھاتے رہتے ہیں، نعروں پر دھیان دیتے ہیں اور عقل اور عافیت اور پیشرفت کی راہ سے منھ موڑ لیتے ہیں۔

علیگڑھ تحریک کا اہم دوسرا جزو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تھی۔ اس نے بھی ایک عرصے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

ضرورت ہے علیگڑھ تحریک کو نئی زندگی دینے کی —— کیا خلوص، علم اور عقل کی بازیابی میں ہم کامیاب ہو سکیں گے؟ ہماری بقا اس امکان پر منحصر ہے کیا ہم علیگڑھ یونیورسٹی کو مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کا ذریعۂ اُولیٰ بنا سکیں گے؟ ہمیں خود سے پوچھنا ہے۔

کیا ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی رگوں میں خون زندگی دوڑا سکیں گے، تاکہ ملک میں بکھرے ہوئے مسلم تعلیمی اداروں کی شیرازہ بندی، توسیع اصلاح اور نگرانی ہو سکے۔ کیا ہم سائینٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کو جس کا حال ہی میں احیا ہوا ہے، وہی مقصدیت اور افادیت دے سکیں گے جو اس کے عظیم الشان بانی کا مطمع نظر تھا۔ کیا ہم یونیورسٹی کو مقدار کی جگہ معیار، فرش کی جگہ بامعنی سکون، تقلید کی جگہ تنوع اور ایجاد گفتار کی جگہ کردار، تن آسانی کی جگہ محنت اور پس ماندگی کی جگہ فضیلت اور کسب کمال سے ہمکنار ہو سکیں گے۔ اگر ہم نے ایسا کر لیا تو ہم سب کی جیت ہے اور اگر ہم نے ایسا نہ کیا، تو علیگڑھ تحریک کا احیاء درکنار خود یونیورسٹی کی خیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بے حسی، بے دردی، بے علمی، بے عقلی اور بے عملی سے بچائے۔

۳۰ جنوری ۱۹۸۳ء
(طلبا یونین کے ایک سمینار کے موقع پر)

●●

# بہیمیت یا تہذیب

"خواتین کو جنسی انداز سے ستانا، دلی کے مردوں کا معروف اور محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔" حوا سے چھیڑ چھاڑ" (EVE TEASING) کی اصطلاح گویا اس رسم کو بہ طیب خاطر تسلیم کرتی ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم تو عام طور پر یہ لیا جاتا ہے کہ عورتوں کو دیکھ کر "ہوس ناک" سیٹیاں بجائی جائیں اور آوازے کسے جائیں لیکن راہ چلتی عورتوں پر جو بپتا پڑتی ہے اس میں تذلیل بھی ہوتی ہے اور مردوں کا ان پر ظلم کر کے حظ اندوز ہونے کا پہلو بھی۔"

" اندر پرستھ کالج کے سامنے چند لڑکیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ موٹر سائیکل پر سوار دو نوجوان ان کے پاس آتے ہیں۔ انھیں بیباکی اور ہوس کے ساتھ گھورتے ہیں۔ ان پر دست درازی کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکیاں اعتراض کرتی ہیں، تو ان میں سے ایک لڑکا ایک لڑکی کے تھپڑ رسید کرتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کے موٹر سائیکل چلا دیتا ہے اور کئی گز تک چیختی چلاتی ہوئی لڑکی کو گھسیٹتا لے جاتا ہے۔"

" رام کرشنا پورم کی سرکاری کالونی میں دو لڑکیاں سڑک پر جارہی ہیں۔ ایک نوجوان سائیکل پر آرہا ہے۔ جب وہ ان کے برابر سے نکلتا ہے، تو ان میں سے ایک لڑکی کی گردن پر تھوک دیتا ہے۔ غریب چلاتی ہے تو ہنس کر اس کے زخم پر نمک چھڑکتا ہوا نکل جاتا ہے۔"

"بسوں میں، سینماؤں میں، کالجوں میں، بازاروں میں، غرضیکہ ہر جگہ عورتوں کو ستا کر لذت اندوز ہونے کا سین دیکھنے میں آتا ہے۔ عورتوں کو چھیڑنے والوں میں سے بعض ہوا میں پیار کا اشارہ کر کے، یا سوقیانہ فقرے کس کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ عادت اتنی عام ہو گئی ہے کہ عورتیں اب اسے سڑک کے دوسرے خطرات کی طرح، جیسے تیز رفتار سواریاں اور گڑھے، بغیر احتجاج کے قبول کرنے لگی ہیں۔ لیکن ان بدمعاشوں میں سے بعض کے حوصلے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ لڑکیوں کو نوچتے ہیں۔ پیروں سے ان کے پیر دباتے ہیں، ان پر دست درازی کرتے ہیں۔ اپنے بدن کو ان کے جسم سے رگڑتے ہیں۔"

"یہ غنڈہ پن ہولی کے زمانہ میں اپنے شباب کو پہنچ جاتا ہے۔ عورتیں اب ہولی کے تصور سے کانپنے

لگی ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے نوجوانوں کی ٹولیاں سڑکوں پر شکار کی تلاش میں گھومتی ہیں اور عورتوں پر رنگ سے اور غبارنگ کے یورش کرتی ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں ہولی کے زمانہ میں دو سو نوجوانوں نے جو چھڑیوں اور لوہے کی سلاخوں سے لیس تھے، ہندو کالج اور سینٹ اسٹیفن کالج کے احاطوں پر چھاپہ مارا۔ لڑکیوں کو کلاس روم سے کھینچ کر باہر نکالا اور ان کے ساتھ بے محابا دست درازی کی اور ارباب اختیار دیکھتے رہ گئے۔ بعض لڑکیوں کی تو ایسی گت بنی کہ انھیں گھر لوٹنے سے پہلے کپڑے بدلنے پڑے۔ سب سے افسوسناک پہلو اس داستان کا یہ ہے کہ انتظامیہ اور طلبہ نے طالبات کو بچانے کی کوئی فکر نہیں کی۔ طالب علموں نے تو خود کو غنڈوں کے خوف سے کمروں میں مقفل کر لیا اور پرنسپل اور اساتذہ کھڑکیوں سے ٹک ٹک دیکھتے رہے۔"

"بے حسی اور بزدلی کے اس قسم کے مظاہرے شہر بھر میں ہوتے رہتے ہیں۔ شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص عورتوں کی مدد کو آگے بڑھے۔ تختۂ مشق بنی ہوئی عورت جب مدد کے لئے چلاتی ہے تو بھی کسی کے کان میں جوں نہیں رینگتی۔"

"چند ماہ ہوئے کالج کی ایک لڑکی کے ساتھ ۱۷ جوانوں نے ایک ہی بس میں چھیڑ خانی کی۔ ان میں سے ہر ایک باری باری لڑکی کے پاس گیا، اس کو پیار کیا اور بس سے اتر گیا اور مسافر دیکھتے رہے۔"

"ایک اور لڑکی کے ساتھ بس میں ایک نوجوان نے دراز دستی دکھائی۔ وہ چلائی تو نوجوان نے اسے تھپڑ مارا، دھینگا مشتی میں وہ بس سے گر گئی۔ کسی نے نوجوان کو روکنے یا پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ عام طور پر ڈرائیور اور کنڈکٹر بھی مزاحم نہیں ہوتے۔ بلکہ کبھی کبھی وہ دست درازی کے خود مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں پولس نے عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی کے الزام میں ۲۶۲۶ گرفتاریاں کیں۔"

"پولس نے بہت سے اقدامات اس بری عادت کو روکنے کے لئے کیے ہیں۔ لیکن بات ابھی تک بنی نہیں۔ لڑکیوں کا کہنا ہے کہ پولس کے جو خصوصی اسکواڈ کالجوں کے سامنے تعینات کیے گئے ہیں ان کا وقت اکثر گپ مارنے میں اور لڑکیوں کو گھورنے میں صرف ہوتا ہے۔"

"عورتوں کی تنظیموں نے بھی اس آوارگی کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ کہتی ہیں کہ ان کے پاس افراد، وسائل اور وقت کی کمی ہے۔ اس لئے وہ جہیز سے متعلق مظالم اور مجرمانہ حملوں کے دفعیہ سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔"

"اس موضوع سے متعلق سیمینار میں یہ تجویز بھی رکھی گئی کہ عورتیں آل پنیں اور پسی ہوئی مرچ (آلات دفاع کے طور پر) اپنے ساتھ رکھا کریں۔ لیکن یہ کوئی حل نہیں ہے۔ لفنگے شکار کھیلنے ٹولیوں میں نکلتے ہیں۔ اور اگر اکیلے بھی ہوں، تو ان کی طاقت کا پلہ عورتوں کے مقابلہ میں بھاری رہتا ہے۔ بلکہ جو عورت مقابلہ کرتی ہے اس کو اور

زیادہ ذلت کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔"

اقتباس یہاں ختم ہوتا ہے۔ آج دلی کا نقشہ کھینچا گیا، کل مدراس کی باری ہے۔ اسی طرح سارے بڑے شہروں میں عورتوں پر مردوں کی شرمناک دست درازی کے حالات انڈین ایکسپریس میں چھاپے جائیں گے۔ گویا یہ گھناؤنی بیماری ملک گیر ہے۔ کیا یہی وہ قدیم تہذیب اور روایتی شائستگی اور پاک دامنی ہے جس پر ہمیں فخر ہے؟ کیا ہماری بعض خواتین کا یہی مقدر ہے کہ شادی سے پہلے سر بازار لفنگے ان پر زبان درازیاں اور دست درازی کریں اور شادی کے بعد سسرال والے اور بے غیرت شوہر مال و زر کے مطالبات سے ان غریبوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں اور ان میں سے بہت سی سسرال والوں کی ایذا رسانی سے تنگ آکر خود کو جیتے جاگتے آگ کے حوالے کر دیں اور جو خود نہ جلیں ان کو سسرال والے جلا ڈالیں؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، اس کی سرشت میں اچھائیاں ہی اچھائیاں بھر دیں اور جب انسان کو گرایا تو تحت الثریٰ میں پہنچا دیا۔ یہ انسان نہیں جانور ہیں جو عورتوں کو ہوس اور بد زبانی اور دراز دستی، اور طمع اور ظلم کا تختۂ مشق بناتے ہیں، بلکہ یہ جانوروں سے بدتر ہیں۔ ان میں نہ شرم ہے نہ حیا، نہ محبت ہے نہ وفا۔ انسانیت انھیں چھو کر نہیں گئی۔ انھیں اندازہ نہیں کہ تہذیب اور انسانیت دونوں کا تقاضا ہے کہ صنف نازک کی عزت کی جائے۔

ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ ۱۱ جولائی کے شمارہ پر نظر پڑی۔ آج ذکر مدراس کا ہے۔ وہاں بھی زن آزاری زندگی کا جزو بن گئی ہے۔ اگرچہ دلی کا، مدراس مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ بات پھر دہرائی جا سکتی ہے کہ نی زمانہ جنوب شمال سے اطوار و اخلاق اور نظم و ضبط کے لحاظ سے کہیں بہتر ہے۔ چلتے چلتے ایک بات اور کہہ دی جائے۔ دنیا کو امریکہ نے بہت کچھ دیا۔ اہل امریکہ میں بہت سی خوبیاں ہیں، ولولہ ہے، جستجو ہے، علم کی طلب ہے، ٹیکنولوجی پر گرفت ہے، جمہوری طرز فکر ہے۔ اپنے قدرتی اور افرادی وسائل کے بازوؤں پر امریکہ نے تسخیر کائنات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اس نے آدمی کو چاند پر اُتار دیا اور چاند سے بہت دُور ان جہانوں تک اپنے بےجان لیکن زود نویس، عکس کار اور خبر رساں قاصد بھیج دیئے جو ستاروں سے کہیں آگے ہیں۔ تجربہ، تجزیہ، تنظیم نے اسے سائنس ٹکنالوجی اور صنعت و تجارت اور بندوبست (مینجمنٹ) کا قافلہ سالار بنا دیا۔ طالع آزمائی اور مہم جوئی میں بھی اس نے باقی دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ کھیلوں کی اقلیم میں بھی اس کا سکہ چلنے لگا۔ لیکن امریکہ نے نودولتیوں کی طرح روایات، اقدار اور آداب کے بندھنوں سے بھی خود کو آزاد کرا لیا۔ انجام ظاہر ہے آوارگی، اوباشی، زر پسندی، مشین پرستی، اخلاق باختگی، اقدار سوزی۔ اچھا ہوتا اگر بات یہیں تک رہتی

اور ہم یہ کہکر خاموش ہو جاتے کہ نئی دنیا کو اس کا طرزِ زندگی مبارک۔ لیکن ٹکنالوجی کے انقلاب نے عالم کی طنابیں کھینچ کر رکھ دیں اور نئی دنیا اور پرانی دنیا میں وقت اور دسترس کو دیکھتے ہوئے اتنا فاصلہ بھی نہیں رہا، جتنا پہلے ایک ریاست کے دو شہروں کے درمیان ہوتا تھا۔ امریکہ کی خوشحالی، اقبال مندی اور کاروبار سالاری سے مرعوب ہو کر ساری دنیا اخلاق و اطوار، وضع و لباس، طرزِ ادا، لب و لہجہ غرضیکہ سارے اسالیبِ زندگی میں اس توازنِ گم کردہ خطۂ زمین کی پیروی کرنے لگی۔ نظام جسمانی میں فساد ہو تو جلد پر پھوڑے، پھنسی، خارش اور ناسور کی شکل میں جھلک آتا ہے۔ ہپیّوں پر نظر ڈالئے جو اپنے جھبڑوں اور تہذیب کی قدروں کو پھونکتے ہوئے ایک عرصہ تک چار دانگ عالم میں گھومتے رہے۔ ان مخصوص کلیساؤں کو دیکھئے، جہاں ہمجنسوں کی شادی کا سوانگ رچایا جاتا ہے۔ "واٹر گیٹ" اور "لاک ہیڈ" کی داستانیں دہرائیے جو نئی دنیا کی سیاست اور تجارت کی بے ضمیری کا اعلان کر رہی ہیں۔ جرائم کے اعداد و شمار پر نگاہ دوڑائیے جن میں ۱۸ سال سے کم عمر والے غالب ہیں۔ اسکولوں کی خورد سال طالبات میں بن بیاہی ماؤں کی تعداد پر غور کیجئے۔ امریکہ کے جسم پر یہ سارے پھوڑے پھنسیاں اور اس کے روئے زیبا پر یہ بدنما مہاسے صحت مند نگاہوں کو کراہت آمیز پسپائی پر مجبور کرتے ہیں اور خود امریکی انھیں ہنوز اپنے رخِ روشن پر خال اور قد آور فربہی مائل جسم پر جوانی کے نقوش سمجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔ لیکن ستم یہ ہے کہ نئی دنیا جو کچھ آج کرتی ہے، پرانی دنیا اسے کل اختیار کر لیتی ہے۔ مشرقی دنیا نے باستثنائے مشرقِ بعید نئی دنیا کا حوصلہ، ولولۂ محنت، اور جستجو اور تجزیاتی اسالیب تو اختیار نہیں کئے لیکن بے راہ روی، بے ضمیری، لباس، اطوار، اقدار سوزی، روایات کشی، مشین پرستی اور چمک دمک اور پرستشِ زر کو بلا تکلف اپنا لیا۔ انسانیت اور راہ روی اور اخلاق و کردار کو روئے زمین پر امریکہ کے اثرات نے بڑی طرح مسمار کیا ہے۔

خود ہمارے ملک میں اس کی مثال موجود ہے۔ پنجاب کا صوبہ زندہ دلی، محنت، آگے بڑھنے کی لگن، سنگلاخ زمینوں کو گلزار بنانے، پہاڑ کاٹ کے جوئے شیر لانے، ساری دنیا کو زیرِ قدم سمجھنے، زراعت اور صنعت کو اپنے نقطۂ عروج پر پہنچانے، مہم جوئی، طالع آزمائی کے لحاظ سے ہندوستان کی ریاستوں میں سرِ فہرست ہے۔ لیکن امریکہ کی طرح اس نے بھی محنت کوشی اور جانفشانی کے ساتھ ساتھ عیش کوشی اور کامرانی کو بھی شعار بنا لیا۔ اس نے اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ قبول نہیں کی، خواہ وہ سفر کی دشواریاں ہوں، یا راہروؤں کی مخالفت یا اقدار اور اصول۔ اس نے شمالی ہندوستان کی تہذیبی روایات کو چشم زدن میں پامال کر دیا۔

جہاں جہاں پنجابی گئے انھوں نے ریاضت اور حوصلہ مندی، بے اصولی، زرپرستی اور بے حیائی کی مثالیں قائم کردیں۔ دِلّی جو ان کے زیرِ اثر ہے اُس نے اپنے اطوار اور بناؤ بہ نگاہ اہلِ پنجاب کی روش پر ڈھالا ہے۔ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں، صنفِ نازک کے ساتھ جو برتاؤ ملک کی راجدھانی میں کیا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اہلِ پنجاب کے اثرات کا رہینِ منت ہے۔ کیا عجب کہ دُلھنوں سے جو مطالبات کیے جاتے ہیں اور جن کا انجام اکثر جنازہ پر ہوتا ہے، وہ بھی اس زرپرستی، ہوس اور طمع کا نتیجہ ہوں جسے اہلِ پنجاب کی اقبال مندی اور خوش حالی نے سکۂ رائج الوقت بنادیا ہے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے ساتھ جو کچھ امریکہ نے کیا، ہندوستان کے ساتھ وہی پنجاب کر رہا ہے۔

اب ہم اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ زن آزاری کے اعداد و شمار میں سال بسال اضافہ کی دہلی پولیس کے ترجمان نے یہ توجیہ کی ہے کہ پولیس کے تعینات کیے جانے کے بعد وہ عورتیں جنھیں چھیڑا جاتا ہے، ہمت کرکے آگے آنے اور رپورٹ درج کرانے لگی ہیں۔ واللہ اعلم۔ گزشتہ ماہ کچھ نوجوانوں نے جن کے خلاف عورتوں کو چھیڑنے کی رپورٹ کی گئی تھی، رپورٹ کرنے والے کے مکان پر دھاوا بولا اور اسے وہاں نہ پاکر اس کے لڑکے کو مار ڈالا۔

عام طور پر مردوں نے جس میں پولیس اور پولیس کی باوردی خواتین شامل ہیں، اس رائے کا اظہار کیا کہ چھیڑ خانی کے بہت سے واقعات کی ذمہ دار ایک حد تک خود عورتیں، بالخصوص کالج کی لڑکیاں ہیں۔

ایک پولیس افسر نے کہا کہ گزشتہ ماہ انھوں نے شکایت موصول ہونے پر ۱۵ نوجوانوں کو حراست میں لیا تھا انھوں نے اپنی صفائی میں کہا کہ لڑکیوں نے اپنے ہوس انگیز لباس اور اپنی اداؤں سے ان کی ہمت افزائی کی تھی۔

ریڈی میڈ کپڑوں کی فیکٹریوں میں سپروائزر، کام کرنے والی عورتوں کے خلاف گندی زبان استعمال کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی مجال نہیں کہ مردوں کو اس طرح خطاب کریں۔

گندی بستیوں میں رہنے والی نیچے طبقوں کی عورتوں کو مقامی غنڈے اکثر ستاتے رہتے ہیں۔ ان کو اندھیری سڑکوں اور کھیتوں کے گھر میں فراغت کا انتظام نہ ہونے سے خبثِ نفس کا اظہار کرنے میں مدد ملتی ہے۔

تعلیمی اداروں میں بعض اوقات استانیوں کے ساتھ خانگی نوکروں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹروں کو سینیئر ڈاکٹر چھیڑتے اور ستاتے ہیں۔

درمیانی طبقہ میں عورتوں کو بعض اوقات دیوروں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ اور جنسی آزار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ تھا مذاکرہ کی روداد کا خلاصہ جو انڈین ایکسپریس میں شائع ہوا۔ عورتوں کے خلاف بے حیائی، بدتمیزی

اور ظلم کی رفتار تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ دوسرے امور کے علاوہ ان ہولناک درازدستیوں کی ایک وجہ مردوں اور عورتوں کا آزادانہ ملنا ہے۔ عورتیں گھر کی چہار دیواری میں رہیں، گھر چلائیں، بچوں کی پرورش کریں یا باہر نکل کر مردوں کے دوش بدوش کام کریں؟ اس سوال کا جواب موجودہ زمانہ نے اپنے حالات اور شعور کے مطابق دیدیا ہے۔ کیا یہ جواب اطمینان بخش ہے! کیا عورتیں جب گھر سے نکل کر دفاتر وغیرہ میں کام کرتی ہیں، تو ان کے بچے غفلت اور بے ترتیبی کا شکار نہیں ہوجاتے؟ کیا نئی نسل میں ٹھہراؤ، ثبات، سکون اور خوشی کی جو کمی ہے، وہ بچپن میں ماں کی نگرانی اور شفقت سے محروم رہ جانے کی وجہ سے تو نہیں ہے طفولیت کا ڈر اور بے اطمینانی، جوانی میں بے حسی، بیدردی، بے مہاری کی شکل تو اختیار نہیں کرلیتی؟

مغربی ممالک اور مشرقی ممالک کے حالات الگ، ان کے مزاج مختلف! یہاں آبادی کی اتنی کثرت کہ بیروزگاری کم روزگاری اور غریبی ترقی اور خوشی میں سدِ راہ ہیں۔ مغرب میں آبادی کی اتنی قلت کہ صنعت اور تجارت اور خدمت کی اقالیم میں مشینوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جارہا ہے اور موٹے موٹے زیادہ محنت کے کاموں کے لئے مزدور غریب ممالک سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ ان کی معاشیات کا انحصار مشین اور سرمایہ پر، یہاں کی معاشیات کا انحصار افرادی طاقت پر۔ مشرقی ممالک نے آزادی کے بعد منصوبہ بند ترقی کا آغاز کیا، تو اس فرق کو بھول گئے۔ انھوں نے بڑی بڑی مشینیں درآمد کرلیں۔ چنانچہ بڑی صنعتوں میں اضافہ کے ساتھ روزگار کے مواقع گھٹتے چلے گئے۔

اسی قسم کی غلطی ان ممالک نے مغرب کی وضع پر عورتوں کو ملازمتوں اور ان کاموں میں ڈال کر کی جو مرد ابھی تک کر رہے تھے۔ جہاں لاکھوں مرد بے روزگار اور کروڑوں تنگ روزگار تھے، وہاں عورتوں کی مداخلت نے بے روزگاری اور کم روزگاری کی شدت اور بڑھا دی۔ لیکن اس مسئلہ پر اتنی آسانی سے محاکمہ نہیں کیا جاسکتا اگر ملازمت نہ کریں تو وہ عورتیں کیا کریں جن کی شادی نہ ہوئی ہو۔ لیکن زمانہ کی رفتار کے مطابق دولت کی طرح روزگار بھی ان ہزارہا خاندانوں نے سمیٹ لیا ہے، جن میں میاں بیوی دونوں کام کرتے ہیں اور لاکھوں گھرانے ایسے ہیں جہاں نہ میاں کے پاس کوئی معقول دھندا ہے، نہ بیوی کے پاس۔

(۲)

۱۷ جولائی کے انڈین اکسپریس (دہلی ایڈیشن) سے اقتباس ذیل میں درج ہے۔ یہ حیدرآباد کے نامہ نگار کا قلم سے ہے: "ایک اسٹیج آرٹسٹ کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا، کیونکہ راتوں میں ریہرسلوں کے دوران وہ حکام بالا کی

فرمائش پوری نہ کر سکی ۔

" ایک عورت حیدرآباد کے قریب ایک تھانہ میں لائی گئی، خطاً چھوٹی سی چوری بمزا، پولیس اسٹیشن میں مجرمانہ حملہ"

کئی انجمنیں عورتوں کو ستانے کے خلاف جہاد کر رہی ہیں، لیکن بے نتیجہ۔

" استری شکتی سنگٹھن " یا " تنظیم طاقت نسواں " کی سکریٹری نے کہا کہ حیدرآباد بھی، جسے اپنی شائستگی اور روایات پر ناز تھا، اب دہلی کی پیروی کر رہا ہے۔ کسی عورت کے لئے تنہا نکلنا بہت بڑی سزا ہے۔ مرد اس کا پیچھا کرتے ہیں، اس پر فقرے کستے ہیں اور ستاتا ہو تو اس پر حملہ کرنے میں بھی انھیں باک نہیں ہوتی۔

عورتوں کا ستانا کلکتہ میں بھی شروع ہو گیا ہے۔ درمیانی طبقہ کے بنگالی، دہلی اور ملک کے بعض دوسرے حصوں کے مقابلے میں عورتوں کی زیادہ عزت کرتے ہیں۔ رپورٹ کیے ہوئے واقعات کی تعداد ۱۹۸۱ء میں چھ تھی، ۱۹۸۲ء میں ایک، لیکن اعداد و شمار پر اعتبار کون کرے، خصوصاً ایسے معاملہ میں جہاں افشا کے بجائے اخفا کو مصلحتاً پسند کیا جاتا ہو۔

گزشتہ دس پندرہ سال میں کلکتہ کا اخلاقی معیار بہت گر گیا ہے۔ عورتوں کی اتنی عزت اب نہیں ہوتی جتنی کہ ہوا کرتی تھی۔ اس کی وجہ ہے ذہنیت کا تجارتی قالب میں ڈھل جانا۔

اخبارات اور رسالے ایسے اشتہارات چھاپتے ہیں جن میں عورتوں کو بطور جنس کے دکھایا گیا ہے۔ فلموں کے اشتہارات بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ عورتوں پر مجرمانہ حملہ اور زہرہ گداز سزائیں۔ عورت فلموں کا تانا بانا ہے، اسے خرید سکتے ہیں، بیچ سکتے ہیں اور لذت اندوز ہونے کے بعد اسے نکال باہر کر سکتے ہیں۔ عورتوں کے خلاف جسارت کرنے والوں کی مثالیں یہاں اب بھی کبھی کبھی سامنے آجاتی ہیں۔

۲۲ جولائی : مدھیہ پردیش کے باوردی بھیڑیے زنا بالجبر کے علاوہ پولیس والے بے سہارا عورتوں پر ہوس آمیز فقرے کستے ہیں اور ان کی طرف لذت طلب ڈھنگ سے بڑھتے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی، زنا بالجبر کی ایک ہلکی شکل ہی تو ہے۔ اس علاقہ میں عورتوں کو خریدنا اتنا ہی آسان ہے، جتنا بھینسوں کا خریدنا۔

جاگیردارانہ سماج میں کھیتوں میں مزدوری کرنے والی عورتیں، مالداروں کی عزت کا سامان ہیں۔ زمیندار سمجھتے ہیں کہ ان کا پیدائشی حق ہے کہ ہر بجن عورتوں کو اپنے بستر میں جگہ دیں۔" شری چندر شیکھر نے اپنی پد یاترا کے

دوران اس علاقے سے گزرتے ہوئے بتایا" ادیواسی عورتوں کے متعلق یہ تصور عام ہے کہ انھیں ذرا سی ترغیب دو، تو وہ تمھارے بستر کے اندر نظر آئیں گی۔" جھبوا کے ادیواسی ضلع میں ہزاروں نوجوان اندوز دھر اور دوسرے قصبات سے بھگوریا کے میلہ کا رُخ اس لئے کرتے ہیں کہ آدیواسی عورتوں کے گداز بدن کی چٹکیاں لیں، ایتر ولی کے اشارے کریں، انھیں چھیڑیں اور اپنے جسم کو ان کے بدن سے ٹکرائیں۔

ایک لڑکی نے کہا کہ بسوں میں زیادہ تر مرد اپنی نگاہوں سے ہمیں برہنہ کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔

قارئین کی نظر سے گزرا کہ دلی، مدراس، حیدرآباد اور مدھیہ پردیش میں عورتوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ روا رکھا جاتا ہے۔ ہم پھر دہرائیں گے کہ کسی قوم کے مہذب ہونے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس میں عورتوں کا احترام کیا جاتا ہو۔ اس سلسلہ میں قول فیصل انگریزی مضمون نگار (غالباً چارلس لیمب) کا ہے۔ جس نے کہا تھا کہ تعلیم یافتہ، خوشحال، بااثر اور خوش پوش خواتین کی عزت کون نہیں کرتا۔ مہذب ہونے کی کسوٹی یہ ہے کہ عورت کی بہ حیثیت عورت کے عزت کی جائے۔ خواہ وہ دھوبن، گھوسن، یا مہترانی یا کنیز ہو۔ کچھ عرصہ پہلے کلکتہ میں یہی حال تھا۔ وہاں کسی کی مجال نہ تھی کہ کسی غریب یا خستہ حال عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھ سکے۔ اسی بنا پر راقم یہ سمجھتا ہے کہ باوجود جذباتی اور ہنگامہ آرا ہونے کے اہل کلکتہ دراصل مہذب تھے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس مرض کا علاج کس طرح کیا جائے جو وبا کی طرح پھیل رہا ہے اور جسے زن آزادی، چھیڑ خانی، لذت کوشی اور اظہار ہوس کے نام دیئے گئے ہیں۔ دراصل مذہب ہی ایسا ضابطہ اخلاق ہے جس کے بدولت نقوش بداطواری، بے شرمی، بدچلنی اور ہوس گفتاری کی راہ میں زندگی بھر حائل ہوتے ہیں۔ اگر یہ نقوش بچپن میں گہرے پڑ گئے، تو گمراہی کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں اور اگر انسان بھٹکا بھی تو ایک باخبر تربیت یافتہ اور بیدار ضمیر اسے سرزنش کرنا شروع کر دیتا ہے اور جس راہ سے وہ بھٹک کر گیا تھا، اس راہ پر واپس لے آتا ہے۔ مذہب کے علاوہ معاشرہ بھی اگر صالح اور صحیح ہو تو افراد شرمناک برائیوں سے بچ جاتے ہیں۔ مذہب کے ساتھ ساتھ معاشرہ کا صحتمند رجحان بھی فرد کے ضمیر کو بیدار اور ہر دم انتباہ رکھتا ہے۔

بہرکیف ہم ہندوستانیوں کے لئے جو ایک قدیم تہذیب سے بہرہ اندوز ہیں اور جنھیں مغرب کی مادیت کے مقابلہ میں اپنی روحانیت پر ناز ہے، یہ طور طریقے جن میں مرد بے حجاب اور ہوس ریشہ اور درندوں سے بدتر ہو جاتا ہے، انتہائی شرمناک ہیں۔ پرائی بہو، بیٹیوں کو نہ صرف تاکنا، جھانکنا، بلکہ ان پر ہوس آمیز نگاہیں ڈالنا، ان کے متعلق گندے تصورات کو دل و دماغ میں راہ دینا اور موقع ملنے پر انھیں چھیڑنا، ستانا، بے عزت کرنا اور مختلف طریقوں سے اور مختلف طریقوں میں ہوس کا تختہ مشق بنانا، اس سے زیادہ رذالت اور دنائت تصور میں نہیں آتی۔

●●

# ایک تقریر

حاضرینِ کرام: سب سے پہلے اس جلسے کے منتظمین کا شکریہ ادا کردوں۔ شکریہ اس کا نہیں کہ آپنے اتنی محبت سے پذیرائی کی، ایسے اعلیٰ پیمانے پر جلسے کا اہتمام کیا، ایسی فیاضی اور دریادلی کا ثبوت دیا۔ شکریہ تو یقیناً اس کا بھی واجب ہے۔ لیکن میں کسی استقبال کی امید، کسی اعزاز کی تلاش میں نہیں نکلا ہوں۔ مجھے تلاش ہے ایسے مواقع کی کہ میں اپنے بھائیوں سے، دُور دراز کے علاقوں میں بسنے والے دوستوں سے، گفتگو کرسکوں، اپنے دل کی بات ان تک پہنچا سکوں۔ تو اصل شکریہ اس کا کہ آپنے ایسا موقع فراہم کیا۔

حضرات! میں آپ سے جو گفتگو کرنے والا ہوں۔ اس میں آپ کو زبان کا چٹخارہ نہیں ملے گا، جو تصویریں آپ کے سامنے پیش کرنے والا ہوں وہ کوئی دلکش و دل آویز تصویریں نہیں، جو کچھ میں عرض کرنے والا ہوں اس سے آپ کو سرور و انبساط کے بجائے ذہنی کرب حاصل ہوگا۔ آپ کے دل کو بےچینی محسوس ہوگی۔ مگر میں کیا کروں، مجھے احساس ہوا کہ قوم کو ایک سخت مرحلہ درپیش ہے اور یہ گھڑی امتحان کی گھڑی ہے۔ اس احساس نے مجھے مجبور کردیا کہ میں علی گڑھ سے قدم نکالوں اور دیوانہ وار سارے ملک کا دورہ کروں، اپنے درد میں آپ کو شریک کروں، ممکن ہے اس سے قوم کی بہتری کی کوئی سبیل نکل آئے اور اس دشوار مرحلے سے گزر جانے کا کوئی راستہ نکلے۔

دوستو! اس وقت صورت یہ ہے کہ ہم مسلمان ہر جگہ اور ہر معاملے میں دوسروں سے بہت پیچھے ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ بہتوں کو تو اس پسماندگی کا احساس تک نہیں اور جنھیں احساس ہے بھی، ان پر ایسی بےحسی طاری ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ اقلیتی کمیشن کے جائنٹ سکریٹری مسٹر سکسینہ نے دو ایسی باتیں کہی ہیں جو ساری قوم کو بےچین کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انڈونیشیا سے لے کر مصر تک جن ملکوں میں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ آباد ہیں، وہاں وہ تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی میں اپنے ہم وطنوں سے بہت پیچھے ہیں۔ دوسری بات اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اقلیت کو زندہ رہنے کے لئے اکثریت سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور دنیا میں ہمیشہ یہی ہوا ہے۔ لیکن تاریخ

میں پہلی بار اس کے برعکس ہو رہا ہے: ہندوستانی مسلمان اکثریت سے زیادہ تو کیا، اس کے برابر محنت کرنے کو بھی آمادہ نہیں ہیں۔

اس بے حسی اور بے عملی کا اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان جدید تعلیم سے محروم ہیں اور ملال اس کا ہے کہ یہ قوم ہے جس کے دین میں علم حاصل کرنے کو بیحد اہمیت دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ پیدائش سے موت تک برابر علم حاصل کرو۔ اے ایمان لانے والو مردو اور عورتو! علم حاصل کرو۔ جن اصحاب نے اس نظر سے قرآن حکیم کا مطالعہ کیا ہے ان کا بیان ہے کہ جن آیتوں میں کائنات کا مشاہدہ کرنے اور اُس پر غور و فکر کرنے کے بعد نتائج تک پہنچنے اور علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اُن آیتوں سے گنتی میں کہیں زیادہ ہیں جو عبادات سے متعلق ہیں۔ یہ بات بھی توجہ کی طالب ہے کہ آج عربی میں سائنس کا ترجمہ علم ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی سے بارھویں صدی عیسوی تک یعنی چار سو سال مسلمان خدا اور اس کے رسولؐ کے اس حکم پر کاربند رہے۔ سائنس کے مؤرخین تسلیم کرتے ہیں کہ اس زمانے میں دنیا کا کوئی علم ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کا شرمندۂ احسان نہ ہو۔ علوم میں کوئی اضافہ ایسا نہیں ہوا جس کا سہرا اس دور کے مسلمانوں یا عربوں کے سر نہ رہا ہو۔ اس کے بعد چار سو سال ایسے گزرے جنھیں ڈھلان کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد مکمل تاریکی ہے۔ جہالت، زوال، بے حسی کی تاریکی۔ آج کا مسلمان علم سائنس اور ٹکنالوجی سے کوسوں دور ہے اور ان تینوں چیزوں پر غیر مسلموں کی حکمرانی ہے۔

یہ صورت حال تشویشناک ہے۔ ہم سب کو مل کر اس طرف توجہ کرنی چاہیے اور علم کی دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہم میں جو لوگ تجارت کر رہے ہیں، یا جنھوں نے کوئی صنعت قائم کر لی ہے، یا کسی دستکاری میں مہارت حاصل کر لی ہے، وہ اپنی ظاہری آسودہ حالی سے مطمئن ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلانا وقت اور پیسے دونوں کا زیاں سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تعلیم حاصل کر کے وہ ان کے کام کے نہ رہیں گے اور اتنا نہ کما سکیں گے، جتنا بغیر تعلیم کے کما سکتے ہیں۔ وہ اس قدر صبر اور اتنا انتظار نہیں کر سکتے کہ ان کے لڑکے تعلیم مکمل کر لیں۔ ان ننھے ہاتھوں اور ناپختہ ذہنوں کو اپنی آمدنی میں اضافے اور اپنی آسائش کے لئے استعمال کرتے ہیں اور خدا سے نہیں ڈرتے۔ وہ اپنی ذرا سی آسائش اور آمدنی میں معمولی سے اضافے کی خاطر بچوں کو اپنے ساتھ لگا لیتے ہیں اور انھیں تعلیم سے محروم کر دیتے ہیں۔

یہ بڑی نادانی ہے، بڑی خام خیالی ہے۔ یہ بچے تعلیم یافتہ ہوں گے، تو کل آپ کے کاروبار کو بہت آگے بڑھا سکیں گے۔ سوچیے کیا بات ہے کہ مال ہم اپنے کارخانوں میں تیار کرتے ہیں، اسے ملک سے باہر بھیج کر لاکھوں روپے دوسرے کماتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ تعلیم یافتہ ہیں۔ درآمد، برآمد کا فن بڑا پیچیدہ ہے۔ وہ لوگ اس فن سے واقف ہیں۔ درآمد برآمد کی بات بھی جانے دیجیے، سائنس اور ٹکنالوجی بہت تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ آج کل دنیا کا مجموعی علم ہر دس سال میں دوگنا ہو جاتا ہے، زمانہ کی تیز رفتاری کا اندازہ اس سے لگائیے۔ آنے والا زمانہ، ہمارے بچوں کا زمانہ اور بھی تیز رفتار ہوگا۔ صنعت میں، دستکاری میں عجیب عجیب تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی ایجادات ہوں گی۔ کتابوں، رسالوں، اور اخباروں کے ذریعے ان کا علم عام ہوگا۔ بے علم لوگوں کی رسائی ان سب چیزوں تک کیسے ہوگی؟ تو جناب یقین کر لیجیے کہ علم حاصل کیے بغیر ہمارے بچے ہمارے کام کو، ہمارے کاروبار کو، ہرگز فروغ نہیں دے سکیں گے۔ نہ ان کی شخصیت کی تعمیر ہو سکے گی، نہ ان کا کاروبار بڑھ پائے گا۔

اگر آپ میری اس رائے سے اتفاق نہ بھی کرتے ہوں تو ایک اور بات قابل غور ہے۔ کما کر پیٹ بھر لینے میں کوئی کمال نہیں۔ یہ کام تو چرند، پرند سب ہی کر لیتے ہیں۔ لیکن جو چیز انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے علم اور عقل۔ ان دونوں کا آپس میں گہرا رشتہ ہے کہ علم کے بغیر عقل کو جلا نہیں ہوتی۔ اس میں چمک نہیں آتی۔ کیا ہم یہ پسند کریں گے کہ ہمارے بچے کما کر پیٹ تو بھر لیں، لیکن علم سے محروم رہیں؛ ان میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہ ہو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ انسان کا نشانِ امتیاز یہ ہے کہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر کسے، علم کی روشنی میں پرکھے۔

آخری بات یہ کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے ہمیں علم حاصل کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اور خدا نے ان بچوں کو ہماری تحویل میں دیا ہے، ہمیں ان کا سرپرست مقرر فرمایا ہے۔ بہتر سے بہتر انداز میں ان کی پرورش کرنا ہمارا فرض ہے۔ خدا کے بتائے ہوئے راستے پر ان کا چلانا ہماری ذمہ داری ہے۔ بچپن سے انھیں کاروبار میں لگا کے اور انھیں علم سے محروم کر کے ہم خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ ہمارے صنعت کار، تاجر اور اہل حرفہ بیشتر دین دار لوگ ہیں۔ لیکن خدا کا ایک اہم حکم ماننے سے وہ انکار کر دیں، تو ان کی دین داری کس کام کی۔ میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ حشر کے دن جب سوال ہوگا کہ ان معصوموں کو تمھاری تحویل میں دیا گیا تھا، تم نے اپنی ذرا سی آسائش کی خاطر انھیں ایک اہم حکم کی تعمیل سے روک دیا، اگر

شخصیت کے سنورنے اور توانا ہونے کے امکانات کو ختم کردیا، انھیں علم حاصل نہیں کرنے دیا، تو دوستو! بتاؤ تمھارے پاس کیا جواب ہوگا؟

خدا تعالیٰ تمھارے کاروبار میں ترقی دے۔ تمھاری دولت میں برکت ہو۔ اللہ تمھیں اور نعمتوں سے نوازے۔ مگر خدارا تم ان بچوں کو اللہ کی ایک اہم نعمت سے محروم تو نہ کرو۔

ہمارے کچھ بھائی ایسے بھی ہیں، جنھوں نے ماشاء اللہ تعلیم حاصل کرلی اور کسی بلند منصب پر فائز ہوگئے۔ اب وہ خوش اور مطمئن ہیں کہ انھیں دولتِ دنیا حاصل ہوگئی۔ ان کے بچے بھی ملک کے بہترین اسکولوں میں تعلیم پارہے ہیں۔ ان بچوں کا مستقبل محفوظ ہے اور ان کے لئے ترقی کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن انھیں قوم کے باقی افراد کا خیال نہیں آتا۔ ان بھائیوں کا خیال نہیں آتا، جو زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں پر ان بھائیوں کا بڑا حق ہے۔ علم کی دولت پس انداز کرنے کے لئے نہیں، بانٹنے کے لئے ہے۔ یہ لوگ جو پسماندہ ہیں یہ بھی تو قوم کا ایک حصّہ، بلکہ بڑا حصّہ ہیں۔ یہ سمجھ لینا کہ ہم ان سے علیحدہ ہیں، دانشمندی نہیں۔ ہم سب ایک شجر کی شاخیں ہیں۔ ٹہنی اُس وقت تک ہری بھری اور سرسبز و شاداب رہتی ہے جب تک وہ شجر سے جڑی رہے، علیحدہ ہوجانے کے بعد وہ مرجھا جاتی ہے، کُھلا جاتی ہے۔ پتّے منتشر ہوکر پامال ہوجاتے ہیں اور ٹہنی سوکھ کر آگ کی خوراک بنتی ہے اور آخرکار راکھ ہوجاتی ہے۔ ہمارے شاعر نے کہا تھا:

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ ؛ ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

یہی تعلق فرد و ملّت کا ہے۔ فرد ملّت سے کٹ کے اپنی حیثیت کھو بیٹھتا ہے:

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں ؛ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

قوم سے ہمارا تعلق استوار رہنا چاہیے کہ اسی میں ہماری بقا ہے۔

ساری خرابی دراصل یہ ہے کہ: کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا۔ جو لوگ احساس کی دولت سے محروم ہیں، جنھیں زیاں کا کوئی احساس نہیں، انھیں کچھ کہنا فضول ہے۔ یہ لوگ اس معنی میں خوش نصیب ہیں کہ نہ کچھ سوچنے کی زحمت کرتے ہیں، نہ انھیں قوم کی بدحالی کا خیال آتا ہے۔ اس لئے وہ ہر طرح کے ذہنی کرب سے محفوظ رہتے ہیں۔ مگر ایک جماعت وہ بھی ہے، جسے اس زیاں کا احساس ہے۔ اس نقصان کا غم ہے، قوم کی زبوں حالی کا صدمہ ہے۔ وہ دکھ جس کا اظہار نہ ہو، آخرکار کینسر بن جاتا ہے اور جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو حرفِ شکایت زبان پر لاتے نہیں تھکتے۔ حکومت کی شکایت، ناسازگار حالات

کی شکایت۔ یہ عادت فضول بھی ہے اور مضر بھی۔ شکایت کر کے انسان سُبک ہوتا ہے۔ اور اپنا وزن اور وقار کھو بیٹھتا ہے۔ کچھ کو فلک ناہنجار سے گلہ رہتا ہے۔ کیونکہ ہر مصیبت اُوپر ہی سے تو نازل ہوتی ہے! قوم کے کھوئے ہوئے اقبال کا یہ بے مصرف ماتم اور بھی مہلک ہے۔ اس سے قوتِ عمل مجروح ہوتی ہے۔ کام کرنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ دل سے ولولہ اور اُمنگ رخصت ہو جاتے ہیں۔ شکوہ و ماتم سے بچنا اور سرگرم عمل ہو جانا وقت کا تقاضا ہے۔ نالۂ و فریاد کرنے والے عمل کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک لمحہ برباد کئے بغیر اُٹھ کھڑے ہوں اور کچھ کر گزریں۔ اگر ہم اس خام خیالی میں ہیں کہ آسمان سے کوئی مسیحا اُتر کے ہمارے درد کا درماں کرے گا، کسی "مردے از غیب" کا ظہور ہوگا جو ہمارے بگڑے کام بنا دے گا، تو یہ خود فریبی ہوگی۔ یہ اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ اپنا کام آپ کئے سے ہوتا ہے۔ جو لوگ ہم خیال اور ہمدرد ہیں، جنھیں مسلمانوں کی زبوں حالی بےچین کئے ہوئے ہے، وہ ملک کے گوشہ گوشہ میں ملیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے جوار، اپنے حلقہ میں سب سرگرم عمل ہو جائیں۔ ان کے عمل کی مجموعی طاقت نتیجہ خیز۔ اور بار آور ثابت ہوگی۔ کوئی ہمسایہ مدد کو نہیں آتا۔ ہمیں خود اٹھنا ہوگا، اپنی تقدیر آپ بنانی ہوگی۔

ہمارے ہموطن ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے۔ ہم اب تک چونکے بھی نہیں۔ کل تک ہم کارواں سالار تھے، آج گردِ کارواں ہیں اور گردِ کارواں ہی رہے تو کل پیروں تلے روندے جائیں گے۔ یاد رکھیے زمانہ بڑا بےرحم ہے۔ جو اپنا خیال آپ نہ کرے، زمانہ اس کا خیال نہیں کرتا۔ پیچھے رہ جانے والوں کو وہ مُڑ کر دیکھتا تک نہیں۔ زندگی کا کارواں بڑا تیز رفتار ہے۔ ہمیں سبک خرامی اور سست روی کو ترک کرنا ہوگا۔ اپنی قوتوں کو مجتمع کرکے دوسروں سے تیز دوڑنا ہوگا کہ آگے نکل جانے والوں کو پکڑ سکیں۔ اس دوڑ میں کمزور مارے جاتے ہیں اور مٹ جانا ان کی قسمت ہے۔ ہمارے شاعر نے کہا تھا:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ❊ ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

قدرت کا یہ قانون اٹل ہے کہ کمزور کو اس دنیا میں جینے کا حق نہیں۔ یہاں ضعیفی سے جسمانی کمزوری مراد نہیں، مراد ہے علمی، اقتصادی اور تکنیکی پسماندگی۔ جب ہی تو آپ نے دیکھا کہ تندرست و توانا عربوں کو یہودیوں نے جب اور جس طرح چاہا، مات دی۔ یوں کہ یہ قوم بیدار ہے، منظم ہے، تعلیم یافتہ ہے، سائنس اور

ٹکنالوجی پر مکمل گرفت رکھتی ہے۔ ہمیں اس پسماندگی سے نجات پانی ہوگی، جرم ضعیفی کے ارتکاب سے بچنا ہوگا۔ ورنہ وہ دن دور نہیں، اور میں اس دن کے تصور سے کانپتا ہوں جب ہم صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گے۔

ہم اگر پسماندہ رہے تو جس ملک میں رہیں اس کی دھرتی پر بوجھ بنیں گے اور بے آبرو ہوں گے۔ اگر ہم اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکے اور ملک کی ترقی میں کوئی رول ادا کر سکے، تو آنکھوں پر بٹھائے جائیں گے۔ آپ حضرات جو اس جلسہ میں جمع ہیں اور جنھیں خدا نے علم کی دولت اور مادی وسائل سے نوازا ہے اور جو میری اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں ان کا فرض ہے کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کریں، ان میں تعلیمی بیداری پیدا کریں اور کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ جا بجا تعلیمی ادارے قائم کریں اور کسی مسلمان بچے کو ان پڑھ نہ رہنے دیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس ضمن میں میرے فرائض آپ سے زیادہ ہیں۔ میری ذمہ داریاں آپ سے بڑھ کر ہیں اس لئے کہ میں اس ادارے سے منسلک ہوں، جو ہمارے آپ کے بہت بڑے محسن سر سید علیہ الرحمۃ کے تعلیمی اور اصلاحی مشن کا ایک حصہ ہے۔ سر سید ہمارے کارواں کے وہ سالار تھے، جن کا ہاتھ قوم کی نبض پر اور نظر مستقبل پر تھی۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے اعتماد کی بازیابی کی۔ ان کی یاس کو آس میں بدلا۔ ان کو اپنی روایات پر قائم رہنے کی ترغیب دی۔ ہمارے رہنما جذبات سے کھیلتے آئے ہیں۔ ان کی اپیل جذبات سے ہوتی رہی ہے۔ ایک سر سید ہی ایسے تھے جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو عقل سے کام لینے کی تلقین کی۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کا واحد ذریعہ تعلیم تھی۔ اس لئے انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کا ایک وسیع منصوبہ تیار کیا، علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اتنے بڑے ملک میں صرف ایک کالج مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا۔ انھوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی، جس کا مقصد سارے ملک میں جگہ جگہ تعلیمی ادارے قائم کرنا تھا۔ انھوں نے مختلف مقامات پر اس کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقد کیے اور جدید تعلیم کا ذوق عام کرنے کی کوشش کی۔ انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن ان کی چلائی ہوئی تعلیمی تحریک [illegible] سال تک کامیابی کے ساتھ چلنے کے بعد مضمحل سی ہو گئی۔ آج اس تحریک کو پھر منظم طور پر زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سر سید کو احساس تھا کہ کانفرنس کا اجلاس تو سال میں ایک بار ہوتا ہے۔ یاد دہانی نہ کرائی جائے تو لوگ اس کی تجویزوں اور سفارشوں کو بہت جلد بھلا دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے، ان کی سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لئے انھوں نے "تہذیب الاخلاق" نکالا۔ انھوں نے اس رسالے سے یہ کام بھی لیا کہ کبھی مہینے میں ایک بار، کبھی دو بار، گھر گھر پہنچ کر لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلایا کرے۔ یہ ان کے اصلاحی اور تعلیمی مشن کا

ترجمان تھا اور مسلمان قوم کو بیدار کرنے میں اس کا جو حصہ ہے اس سے آپ سب واقف ہیں۔ محسوس ہوا کہ اسے ازسرِ نو جاری کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ فروری ۱۹۸۲ء سے اسے دوبارہ جاری کر دیا گیا، جب محمد ہدایت اللہ صاحب نائب صدر جمہوریہ نے اس کا اجرا کیا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت روز افزوں ہے اور یہ ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ رہا ہے۔ یہ رسالہ سراسر تعلیمی اور اصلاحی ہے۔

اس ملک میں ہم اقلیت میں ہیں اور اقلیت کو جانبر ہونے اور باعزت زندگی گزارنے کے لئے میرے خیال میں تین شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے۔ پہلی بات لازمی ہے کہ وہ اپنے دینی مسلک اور اپنی صالح تمدنی روایات پر ثابت قدم رہے، جو اپنے عقاید سے وفاداری نہیں برتتے، ان کے بارے میں یہ خیال ہوتا ہے اور درست ہوتا ہے کہ جو اپنے مذہب کے وفادار نہیں، تو ملک کے کیسے ہو سکتے ہیں۔ اور جس میں یہ صفت نہ ہو، وہ عزت کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اقلیت کو اکثریت سے زیادہ محنت وجاں فشانی کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ تیسری اور آخری بات یہ کہ پہلی شرط کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اکثریت سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے چاہئیں۔ اس لئے کہ تعلقات خوشگوار اور شگفتہ رکھنے میں دونوں کا بھلا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ ہمارے آئین اور حکومتوں نے مختلف فرقوں کے درمیان جس برابری اور عدم امتیاز کا اعلان کیا ہے، ان کا نفاذ اکثریت کے ان افراد کے ہاتھ میں ہے جو مختلف شعبوں اور اداروں میں برسرِ اختیار ہیں۔

میں جہاں کہیں جاتا ہوں مجھ سے مسلم یونیورسٹی کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔ آپ بھی یقیناً اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اس ادارے سے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک جذباتی لگاؤ ہے۔ شکاگو میں علیگڑھ کے ایک پرستار سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گھنٹوں یہاں کے چپے چپے کا اس تفصیل سے ذکر کیا، جیسے برسوں یہاں رہے ہوں۔ بعد میں یہ معلوم ہو کر حیرت ہوئی کہ انھوں نے کبھی علیگڑھ کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا۔

طلبا میں بدنظمی ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی علیگڑھ میں ضبط و نظم کی بہتر فضا ہے۔ ریڈنگ روم صبح آٹھ بجے سے رات کے دو دو بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ اور پڑھنے والوں کی وہ کثرت ہے کہ بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ اساتذہ کی مستعدی اور طلبا کی محنت سے ہم نے اپنے نقصان کی تلافی کر لی ہے۔ ایک سال برباد ہو جانے کا جو اندیشہ لاحق ہو گیا تھا وہ الحمدللہ دور ہو گیا۔ داخلے صلاحیت کی بنا پر کیے جا رہے ہیں۔ سال بہ سال داخلوں کی شرائط کو سخت اور معیار کو بلند کیا جا رہا ہے۔ داخلے اور امتحانات پروگرام کے مطابق ہو رہے

ہیں۔ اقامتی زندگی کو چیرہ دستیوں تخریب کاروں اور استحصال آزماؤں سے پاک کیا گیا ہے۔

یونیورسٹی میں بہت سے نئے شعبے قائم ہوئے کیمیکل انجینیرنگ کی شروعات پہلے ہو چکی تھی۔ اب اس میں باقاعدہ تعلیم ہو رہی ہے۔ نرسنگ کا کورس شروع کیا گیا ہے۔ ہوٹل مینجمنٹ کی دنیا میں بہت مانگ ہے، یہ کار آمد کورس بھی ہمارے یہاں اگلے سال سے شروع ہو رہا ہے، فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے۔

یونیورسٹی میں عمارات کی کمی تھی، اُسے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میڈیکل کالج میں ایک سو چالیس بستروں کا ایک نیا وارڈ زیر تعمیر ہے۔ ایک بہت بڑے سہ منزلہ ہوسٹل کی تعمیر مکمل ہونے والی ہے۔ اس میں پانچسو طلبا رہ سکیں گے۔ ایک اور اقامت گاہ نیو ہال میں کمروں کا اضافہ ہوا ہے۔ انتظامیہ عملہ کی عمارت تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کی عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ یونیورسٹی پالی ٹیکنک میں نصاب اور داخلوں میں غیر معمولی اضافہ آئندہ سال سے کیا جائے گا۔ لڑکیوں کے کالج میں ۲۰۰ لڑکیوں کے لئے ایک ہوسٹل کی منظوری حاصل کر لی گئی ہے۔ الغرض یونیورسٹی میں سنجیدہ تعلیمی اور تحقیقی فضا کو بحال کر دیا گیا ہے۔ اب نصابوں کی تجدید کی باری ہے، جس کے لئے یہ لمحہ موزوں ہے، کیونکہ یونیورسٹی نے ۱۰ + ۲ + ۳ وضع تعلیم کو قبول کر لیا ہے۔ اڑان کے لئے ضروری ساز و سامان فراہم ہے۔ اساتذہ سے طلبہ کی توقعات بڑھ رہی ہیں۔ بیحد ضروری ہے کہ یہ توقعات پوری کی جائیں اور ہمارا قافلہ ولولے اور عزم کے ساتھ مقابلہ کی رزم گاہ اور معیار کی منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔

سامعین کے اس مجمع میں اہل علم ہیں، دانش ور ہیں، فضلا ہیں، صنعت کار اور اہل حرفہ ہیں، نوجوان اور طالب علم بھی ہیں۔ ان سب نے میری اس طویل تقریر کو انہماک اور تحمل سے سنا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں عرض کی گئیں انھیں وہ قابل توجہ خیال کرتے ہیں اور یہ بیداری کے آثار ہیں۔ دکن کے مسلمان ہم سے پہلے جاگ چکے ہیں اور تعمیری کاموں میں مصروف ہیں۔ ہمیں ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ اور خود انھیں بھی کام کی رفتار کو تیز کرنا ہوگا کہ وہ بھی دوسری قوموں سے ابھی پیچھے ہیں۔ ہمیں اپنے پرانے اداروں کو مستحکم کرنا چاہیے۔ نئے ادارے قائم کرنے چاہئیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر آپ سب نے توجہ کی تو جلد شمالی ہند میں بھی ہمارے اداروں کا جال پھیل جائے گا۔ انشاء اللہ۔ لیکن ہمیں نہ صرف ایسے اداروں میں اضافہ کرنا ہے، بلکہ عام اداروں میں منظم کوشش کے تحت بڑی تعداد میں داخل ہونا ہے۔ اس کے لئے ہمیں سر جوڑ کر کوشش کرنی چاہیے۔

# علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں
# صدر جمہوریۂ ہند کی تشریف آوری

عالیجناب صدر جمہوریۂ ہند! — جناب والا میں آپ کے خیر مقدم کے لئے اپنے دل میں خوشی، فخر، اطمینان اور امید کی ملی جلی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔ خوشی آپ کی تشریف آوری پر، فخر اس بنا پر کہ ہمیں اپنے وزیٹر کی زیارت کا موقع مل رہا ہے۔ اطمینان اس لئے کہ آپ کا وسیع قلب اور کشادہ شانے اس عظیم ملک کی ذمہ داریوں سے غیر جانبداری اور انصاف کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور امید اس بات کی کہ آپ کے قدم مسلم یونیورسٹی کے استحکام، توسیع اور ترقی کے لئے نئی راہیں کھولیں گے۔

محترم! ایک سو آٹھ سال قبل سر سید احمد خاں نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنا ڈالی تھی جو ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کے مرتبے پر پہنچ گیا۔

سر سید احمد خاں کا شمار جدید ہندوستانیوں کے بانیوں میں ہے۔ انھوں نے اس قوم کو جو حکومت کر چکی تھی، جو زندگی سے بیزار اور انصاف سے مایوس اور امید سے محروم ہو چکی تھی، پھر سے زندہ کیا، اُسے جینے کے گر سکھائے اور نئے علوم حاصل کرنے کے لئے اُسے تیار کیا۔ سر سید نے وہ طریقہ اختیار کیا جو ملک و ملت دونوں کے لئے یکساں سود مند تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے سے ملک کی ترقی کی رفتار خود بخود تیز ہو جائے گی۔

سر سید احمد خاں نے مسلم یونیورسٹی کی بنیاد وطن دوستی، انسانیت نوازی، اور غیرتِ ملی پر رکھی۔ انھوں نے ایم۔ اے۔ او کالج کا مطمح نظر فراخ دلانہ رواداری اور آزاد تحقیق و جستجو کو بنایا تھا اور یہی ان کا مسلک رہا ہے۔ ان کے تعلقات برادران وطن کے ساتھ نہایت شگفتہ تھے اور انھوں نے کالج کے دروازے اس حسین دلہن کی دلربا آنکھوں کی طرح جس کا نام ہندوستان ہے اور جس کی ایک آنکھ ہندو ہے اور دوسری مسلمان، ہر مذہب و ملت کے لئے کھلے رکھے۔

ابھی چند روز ہوئے پروفیسر اقبال نرائن وائس چانسلر بنارس ہندو یونیورسٹی اپنی فٹ بال ٹیم لے کر علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ انھوں نے یہاں سے جا کر مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی شائستگی، انہماک، اور خوشدلی کو خراج تحسین ادا کیا اور اس بات پر خوشگوار حیرت کا اظہار کیا کہ یہاں لائبریری صبح آٹھ بجے سے رات کے دو بجے تک کھلی رہتی ہے اور کچھا کھچ بھری رہتی ہے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی دراصل ہندوستان کی ملی جلی نمائندگی ملک کی دوسری یونیورسٹیوں سے

بہتر کرتی ہے۔ یہاں کی فضا فرقہ واریت' ذاتیت' اور علاقائیت' کے زہر سے محفوظ ہے۔ اس کے فرزندوں کی فہرست طویل اور درخشاں ہے۔ اس میں ایک سرے پر ظفر اقبال ہیں جو ہندوستان کی مایہ ناز ٹیم کے کپتان ہیں اور دوسرے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ہیں جنھوں نے ملک کے جہاز کی کپتانی اپنی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر وقار کے ساتھ کی جیسا کہ فی زمانہ جناب والا کر رہے ہیں۔

سر سید نے علیگڑھ کو جس تعلیمی تحریک کا مرکز بنایا تھا، اس کو اردو سے اور اُردو زبان و ادب کو اس تحریک سے بڑا فروغ ملا۔ علیگڑھ کا شمار اردو زبان و ادب کے اہم مرکزوں میں ہے۔ اُردو زبان ہندوستان اور ایشیائی زبانوں کا ایک دلنواز سنگم ہے۔

ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے جو لڑائی لڑی گئی اسی زبان کے نعروں اور نظموں کی دھنوں میں لڑی گئی۔ اقبالؔ کا "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور بسملؔ کی غزل کا مطلع:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے ؎ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

آج تک وطن عزیز کی فضاؤں میں گونج رہا ہے اور ہندوستان کے اندر متحدہ قومیت کا تصور پیدا کرنے میں اُردو زبان کا کردار عہد آفریں رہا ہے۔ یہ ہندوستان کا سب سے بڑا لسانی سرمایہ ہے۔ اُردو زبان تاج محل سے زیادہ حسین، خوشنما، اور معنی خیز ہے۔ مجھے امید ہے کہ رواداری کی روایت اور قومی شعور بیدار ہوگا اور یہ مشترک میراث بالآخر مسند اقتدار و اختیار پر بٹھائی جائے گی۔

سر سید احمد خاں نے اس یونیورسٹی کو اپنی عدیم المثال بصیرت کی روشنی میں تحصیل کمال علم کے لئے وقف کیا تھا اور آزادی کے بعد ہمارے ماہرین و منتظمینِ تعلیم نے اس مسلک پر مُہر لگا دی۔ چنانچہ اب اس کا شمار ان قومی یونیورسٹیوں میں ہے جو تعلیم کے قافلے کے کارواں سالار ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ تقسیم کی لائی ہوئی دشواریوں اور سراسیمگی اور اس کے بعد خود مختاری اور کردار کی بازیابی کی مہم اور اس کے بعد داخلی انضباط کے خلاف ایجی ٹیشن کے دَور اب ختم ہو چکے ہیں۔ آپ کی حکومت نے ۱۹۸۱ء میں اسے خود مختاری اور اس کا اقلیتی کردار واپس دیدیا ہے۔ اب علی گڑھ میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا ہے۔ یہ دَور سنجیدگی' ریاضت' انضباط اور انہماک کا دَور ہے۔ گویا طیارہ اب پرواز کے لئے پر تول رہا ہے۔ محترم وزیر سے میری گزارش ہے کہ اپنی خصوصی توجہ سے ہمارے عزم پرواز کو محکم بنا دیں۔ ہمیں اس وقت بھرپور امداد کی ضرورت ہے۔ اداروں کی زندگی میں بعض لمحات غیر معمولی توجہ کے طالب ہوتے ہیں۔ ہم اپنے

معزز محترم وزیر کو اپنے مطالبات سے گراں بار نہ کرنا چاہیں گے۔ ہم ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے یونیورسٹی کے وقار کو بحال کیا اور اساتذہ کو میرٹ پروموشن اسکیم کے ذریعے آگے بڑھنے کا موقع دیا۔

عالی جناب! اس یونیورسٹی کا اک فریضہ یہ بھی رہا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر غور و خوض کرے اور ان سے ملک کو روشناس کرائے۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہندوستانی مسلمان پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔ ملازمتوں اور روزگار میں ان کا تناسب تیزی کے ساتھ گھٹ رہا ہے۔ ان کی تعلیمی حالت زبوں ہے۔ اس میں قصور ایک حد تک ان کا بھی ہے۔ کیا ہمارا ملک انھیں ان کی حالت پر چھوڑ کر مطمئن ہو سکتا ہے؟ یا آگے بڑھ سکتا ہے؟

جناب والا! اس وقت ملک میں انضباط شکنی، تشدد اور فرقہ واریت کی فضا روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہ بات انتہائی تشویشناک ہے کہ خوں ریزی کا جواز مذہب میں تلاش کیا جا رہا ہے، حالانکہ: "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" اس وقت جو ہمارے ملک میں انتشار، اور علیحدگی پسندانہ ماحول پیدا کر رہے ہیں، ان کے خلاف ایک محاذ بنانا ہوگا اور اس کے لئے ہماری یونیورسٹی کے طالب علم جو اعتماد، محبت اور رواداری کے لئے معروف ہیں، اس ضمن میں ملک کے صالح عناصر کے ساتھ حکومت کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

کاش کہ ہم علم کے ساتھ تحقیقی اور سائنسی مزاج بھی پیدا کر سکیں، تاکہ ہم مسائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا سیکھ جائیں۔

●●

# زندہ دلانِ پنجاب

آج ہم ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ اس حسرت کے ساتھ کہ اس کا آغاز پہلے ہی کیوں نہ ہوا۔ ہمارا روئے سخن ان سفروں کی طرف ہے جو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو وقتاً فوقتاً کرنا پڑتے ہیں۔ نیت خدانخواستہ سفرنامہ لکھنے کی نہیں۔ ارادہ صرف یہ ہے کہ ان اطلاعات میں جو معنی خیز یا دلچسپ ہوں، تہذیب الاخلاق کے قارئین کو شریک کر لیا جائے۔

۲۷ جون کو پنجاب کی قومی یکجہتی کانفرنس (PUNJAB STATE NATIONAL INTEGRATION COUNCIL) تیسری میٹنگ چنڈی گڑھ میں ہوئی تھی۔ وائس چانسلر کو پہلی میٹنگ میں شرکت کا موقع بھی ملا تھا۔ پہلی میٹنگ بھی تقریباً اسی زمانہ میں ہوئی تھی۔ زادِ راہ میں گرمی اس بار بھی شامل تھی۔ اس دفعہ موسم خوشگوار ہے۔ مانسون کے چھوٹے موٹے ہراول دستے موسم گرما کے قلعہ میں دراڑیں ڈال چکے ہیں۔ گزشتہ سال میٹنگ سے اٹھ کر جمعہ کی نماز کے لئے گیا تھا تو یہ خطرہ لاحق تھا خالی پیٹ ہے کہیں لُو نہ لگ جائے۔ ضعفِ ایمان کا کیا علاج! چنڈی گڑھ کی جامع مسجد نئی وضع کی ہے اور بیحد خوبصورت۔ لیکن جگہ کے استعمال کرنے میں آرکیٹیکٹ نے کفایت نہیں برتی۔ اتنی ہی خوب صورت ایک مسجد میسور میں دیکھنے میں آئی تھی جس میں ارتفاع کا حُسن بھی شامل ہو گیا ہے۔

گزشتہ سال اس میٹنگ میں دارا سنگھ اور پرتھی پال سے ملاقات ہوئی تھی۔ آخر الذکر اب دنیا میں نہیں ہے۔ قاتل کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ پرتھی پال سنگھ ہندوستان کے ہاکی کپتان رہے ہیں اور ان کا شمار دنیا کے بڑے پنالٹی کارنر ماہرین میں ہوتا ہے۔ دارا سنگھ مشہور بلند قامت رُوئیں تن پہلوان ہے۔ جو پردہ سیمیں کی کشش کے آگے سپر انداز ہو گیا۔ ان دونوں کی شرکت سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب میں کھیل عوامی زندگی کا جزو ہیں اور انھیں ہنسی کھیل نہیں سمجھا جاتا۔ مہارت کے سامان فراہم کیے جاتے ہیں اور امتیاز کا اعتراف ہوتا ہے۔ آج کی میٹنگ میں بھی ایک صاحب نے ان پنجابیوں کا ذکر کرتے ہوئے جنھیں بین الاقوامی شہرت ملی ہے۔

ہرگوبند سنگھ کھورانہ کے ساتھ اشونی کمار کا نام لیا جو غالباً اولمپک ایسوسی ایشن کے نائب صدر مُچنے گئے ہیں۔ ایک شہرۂ آفاق سائنس داں کے ساتھ کھیلوں کے ایک ممتاز منتظم کا نام لینا انسنگت اور ناموزوں لگتا ہے۔ لیکن اس قسم کی لغزش پانیوں کی ایک بڑی برکت یہ ہے کہ اس کی بدولت ہمیں دلوں کے اندر جھانکنے کا موقع مل جاتا ہے اور ایک پوری جماعت کی ترجیحات، رجحانات اور طرزِ فکر کے عوامل اور انداز سمجھ میں آجاتے ہیں۔ پنجاب نے تندرستی اور اس کے لوازمین کھیل کود، کسرت اور غذا کو ہمیشہ اہمیت دی ہے۔

صحت کے ساتھ ایک جلوس چلتا ہے جس میں آپ جینے کے ذوق، بھرپور زندگی بسر کرنے کی "اُمنگ"، ولولہ، اقدامیت اور آگے بڑھنے اور بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے جذبے، جفاکشی اور خطر جوئی اور جرم طلبی کو پہچان سکتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی راہ میں کسی کو حائل نہیں ہونے دیتے، خواہ وہ سستی ہو، یا تذبذب، یا خطرہ، یا وسائل کی کمی، یا رکاوٹوں کی زیادتی، یا اصول اور اقدار کا احترام۔ جو بھی سامنے آیا، "ہٹا دیا جائے گا" یا کچلا جائے گا۔ ان کی قوت بازو موانعات کو قبول ہی نہیں کرتی۔ یہ لوگ ڈنکے کی چوٹ کماتے ہیں اور دھڑلّے سے صرف کرتے ہیں۔ یہ جہاں پہنچ جائیں، اصلی مالک راہِ ہزیمت اختیار کرلے۔ اسی طرح ہر کام جو بابوبل مانگتا ہو، اُسے دوسروں سے بہتر کریں گے۔ فٹ بال کے کھیل سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس میں بھی آگے بڑھ گئے، چاول سے انھیں کوئی نسبت نہ تھی۔ اس کی پیداوار میں ہاتھ ڈالا، تو بنگال کے کان کاٹنے لگے۔ غرض یہ کہ کہیں بند نہیں۔ ملکِ خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست کی اس سے زیادہ موزوں مثال تصور میں نہیں آتی۔ یہ لوگ لڑتے جھگڑتے ہیں تو بھی کام کی لگن اور ترقی کی رفتار دھیمی نہیں پڑتی۔ اس وقت اکالیوں کے ایجی ٹیشن نے ریاست کو دو نیم کردیا ہے، تشدد کا بازار گرم ہے۔ انتہاپسندوں اور نشانہ بازوں اور قاتلوں کی بن آئی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مجلس میں ایک صاحب زورِ بیان کی رَو میں کہہ گئے کہ پنجاب کی اقتصادیات تباہ ہوگئی ہے۔ وزیراعلیٰ دربارا سنگھ نے جو بہت ٹھنڈے مزاج کے ہیں اور ہر طرح کی بات کو طمانیت کے ساتھ سنتے ہیں، "فوراً" احتجاج کیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ باوجود انتہاپسندوں کی تشدد آزمائی کے ریاست میں اقتصادی ترقی کی رفتار مدھم نہیں ہوئی۔

ایک پمفلٹ میں جسے افتخار نامہ کہیے اور جو کانفرنس میں بانٹا گیا تھا یہ بات بتائی گئی ہے کہ پنجاب دوسری ریاستوں سے کتنا آگے نکل چکا ہے۔ اس میں دیے ہوئے مندرجہ ذیل اعداد و شمار پر غور کیجیے:-

| فی کس آمدنی | پنجاب | ہندوستان |
|---|---|---|
| (روپیوں میں) | ۲۶۴۲ | ۱۵۳۷ |
| زمین اور فصلوں کا تناسب | ۱۶۱ | ۱۲۳ |
| سینچے ہوئے رقبہ کا مزروعہ رقبہ کے ساتھ تناسب | ۸۱ | ۲۷ |
| ایک ہیکٹر (ڈھائی ایکڑ) میں گیہوں کی زیادہ سے زیادہ پیداوار (کلوگرام میں) | ۲۷۸۴ | ۱۴۳۷ |
| ایک ہیکٹر میں چاول کی زیادہ سے زیادہ پیداوار (کلوگرام میں) | ۲۷۳۶ | ۱۰۸۲ |
| مرکزی بھنڈار کو گیہوں کی زیادہ سے زیادہ فراہمی فیصد | ۷۳ | ۰ |
| مرکزی بھنڈار کو چاول کی (زیادہ سے زیادہ) فی صد فراہمی | ۴۸ | |
| ٹریکٹروں کی سب سے زیادہ تعداد | ۱،۱۰،۰۰۰ | |
| فی کس دودھ کی زیادہ سے زیادہ یومیہ فراہمی (کلوگرام میں) | ۵۴۱ | ۱۰۶ |
| سال میں فی کس زیادہ سے زیادہ بجلی کا استعمال | ۲۱۴ | ۱۳۰ |
| زراعتی مزدوروں کی زیادہ سے زیادہ یومیہ اجرت | ۱۴ روپیہ | |
| سو مربع کلومیٹر میں پکی سڑکوں کا تناسب | ۵۶ کیلومیٹر | ۱۲ |

اس دوڑ میں ہریانہ پنجاب کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور گاؤں گاؤں میں بجلی لگنے کا جہاں تک تعلق ہے، ہریانہ پنجاب سے جیت بھی گیا۔ شمال مغرب کی ان دو ریاستوں نے غذائی خود کفالت کے میدان میں ہندوستان کی لاج رکھ لی۔

ان ریاستوں کے برعکس حال یوپی اور بہار کا ہے، جہاں زندگی کی رفتار یوں ہی بہت دھیمی ہے؛ اور اختلافات اور ذات پات نے اسے اور بھی دھیما کر دیا۔

آج کے جلسہ میں بہت سی تجاویز آئیں۔ کھیل ان میں بھی سر فہرست نظر آئے۔ جسم کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے۔ دماغ سے کچھ عرصے کام نہ لیجیے، زنگ نہ لگے گا۔ جسم کو تھوڑی مدت کے لئے ڈھیلا چھوڑ دیجیے، کام سے جائے گا۔ منگول جنھوں نے چشم زدن میں ساری دنیا کو زیر و زبر کر دیا، جن کی جفاکشی اور سخت کوشی اور سخت جانی ضرب المثل بن گئی ہے، جب وہ ہندوستان آئے تو وہ خود سلطان غیاث الدین بلبن کو خراج دیے بنا نہ رہ سکے۔ جس نے اپنی فوج کو کبھی نچلے بیٹھنے نہ دیا اور جو اس پر برابر لشکر کشی، ورزش اور مہم جوئی

سان رکھتا رہتا تھا۔ کسی جماعت کی ترقی کا راز مقصد کی لگن اور مسلک پر اعتماد کے علاوہ، صحت اور تعلیم بھی ہے۔ افراد کی صلاحیت ان ہی دونوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھتی ہے۔ صحت کے گُر کو اہلِ پنجاب نے پا لیا ہے گرہ میں سختی سے باندھ لیا ہے۔ صحت اور مہم جوئی نے انھیں ملک کے دفاع میں دخیل بلکہ شریکِ غالب بنا دیا ہے اور کھیلوں کے میدانوں میں بھی اُن ہی کا سکّہ چلتا ہے۔ پنجاب نے کسان ایسے پیدا کیے جو بنجر زمین کو گلزار بنا دیں۔ دھرتی سے سونا اگلوا دیں اور صنعت کار ایسے جنھوں نے گھر گھر کو کارخانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ شہد کے چھتّے کا سا عالم ہے۔ یہ لوگ خوب کماتے ہیں، خوب کھاتے ہیں اور (والے قسمت) خوب پیتے ہیں۔ محنت بھی کرتے ہیں اور عیش بھی اور ایک کو دوسرے کی راہ میں نہیں آنے دیتے۔

کھیلوں کا ذکر آیا تو لگے ہاتھوں ایک شکوہ بھی کر دیا جائے۔ ہاکی کو جو ہندوستان کی کلاہ میں بڑی حیثیت رکھتی تھی، اہلِ پنجاب کے تصرف سے نقصان پہنچا۔ اُنھوں نے ہماری ہاکی کو طاقت دی، دم دیا، لیکن وہ ذہن نہیں دیا جو ان دونوں کو سلیقہ سے فن کارانہ اور فتح مندانہ کام میں لا سکتا۔ ایسے کلائی اور کمر کا وہ جادو نہ دے سکے۔ جس میں اس کھیل کا جمال اور کمال چھپا ہوا ہے۔ اور اپنے نقطۂ عروج پر شکور مرحوم کی نقاشی سے پہنچا تھا۔ بہر حال مرحوم ہاکی کا ماتم کب تک کیا جائے۔ اب تو کرکٹ کا جشن منانا چاہیے۔ ہم نے ایک روزہ کرکٹ کے عالمی کپ میں آسٹریلیا، انگلستان اور ویسٹ انڈیز جیسے سورماؤں کو شکست دے کر ٹرافی جیتی ہے۔ بہتوں کے گھمنڈ ٹوٹ گئے اور ہمارا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

"کھیل کے تذکرہ سے اتنے صفحات سیاہ کر دیے"۔ ہمیں قارئین کے خاموش احتجاج کا احساس ہے لہٰذا ہم کھیل کے میدان سے کانفرنس روم میں واپس ہوتے ہیں۔ دبی زبان سے یہ کہتے ہوئے کہ کوئی قوم جسم پردازی اور جفاکشی اور مہم جوئی اور گوے وچوگاں کے بغیر نہ صحت مند رہ سکتی ہے۔ نہ تیز رو زمانہ کی ہم قدم۔

کانفرنس کی تجاویز ہمہ گیر تھیں۔ ان میں سے بعض آرام کرسی والی بھی تھیں۔ لیکن اہلِ پنجاب ارضی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں، بلند پروازی اور نازک خیالی، یادہ گوئی اور ژولیدہ فکری کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر پاتے، برمحل ٹوک دیتے ہیں۔ چنانچہ بات جہاں نہج سے ہٹی اور دور رس اور دور از کار باتیں ہونے لگیں، وہیں کوئی سردار اٹھا اور کہا جس مقصد سے جمع ہوئے ہو، اس کی باتیں کرو۔ تعلیم اور پرچار ہوتا رہے گا۔ یہ طے کرو کہ جو آگ اس وقت لگی ہوئی ہے، اُسے کیسے بجھائیں۔ پچھلی مجلس کی روداد پر بحث

ہونے لگی، تو معززین نے کہا، روداد کو چھوڑیے۔ کام کی باتیں کیجیے! چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایک صاحب نے تو یہ بھی جسارت کی کہ جب وزیر اعلیٰ اپنا خطبۂ صدارت پڑھنے لگے تو کہا کہ تقسیم تو ہو گیا ہے، پڑھ کے کیا کیجیے گا۔ آخر میں جب سابق وزیر اعلیٰ گفتگو کو پایان پر پہنچا رہے تھے، تو بیچ بیچ میں لوگ بے محابا اعتراض کرتے جا دہراتے تھے اور یہ کسی مخالفت کی بنا پر نہ تھا (مساواتی جمہوریت کے بعض دلکش مظاہرے دیکھنے میں آئے)۔

ایک صاحب نے کہا کہ پنجاب میں ۹۰ فی صد کاشتکار سکھ ہیں۔ اور ۸۰ فی صد تاجر اور دکاندار ہندو ہیں۔ ان کی تجویز تھی کہ ان دونوں کو روپے کی امدادی دادوستد کے ایک زرّیں سلسلے میں اس طرح باندھ دیا جائے کہ باہمی اختلاف دب کر رہ جائیں۔ اس پہلو پر زور دیا گیا کہ اکالیوں اور ہندوؤں کا حالیہ اختلاف مذہبی اختلاف نہیں ہے۔ اس کی جڑیں اقتصادی ہیں اور برگ و بار سیاسی۔ غور کیجیے، ہندو مسلم فسادات میں بھی سیاست اور اقتصادیات گھس آتی ہیں۔

ایک سن رسیدہ خاتون ہمارے برابر بیٹھی تھیں۔ وہ آریہ سماجی ہیں اور اس تحریک کے بانی لالہ لاجپت رائے کے بہت قریب رہ چکی ہیں۔ ان کی لے پالک بیٹی کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ ان کی روایت ہے کہ لالہ لاجپت رائے نے انھیں ۱۹۲۵ء میں بتایا تھا کہ "کمبخت" (کمبخت تو ہم نے لکھ دیا ہے۔ اُنھوں نے کوئی زیادہ سخت لفظ کہا تھا۔ جو راویہ کی زبان پر نہ آیا، تو ہمارے قلم سے کیسے نکل سکتا) انگریز اور یہاں (اُنھوں نے ایک اور نام لیا تھا۔ جس کو حذف کرنا موصوفہ نے قرینِ مصلحت سمجھا) ہمارے ملک کو کوڑھی بنا کر چھوڑیں گے۔ اس کے ٹکڑے ہو کر رہیں گے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ تقسیم سے ۲۲ سال پہلے لالہ لاجپت رائے کو اپنی سیاسی بصیرت کے تحت ایک نئے ملک کے وجود میں آنے کا یقین ہو گیا تھا۔ محترمہ نے مجھ سے سرگوشی میں یہ بھی کہا کہ پنجاب میں جو بھی ہنگامہ اس وقت ہو رہا ہے، اس کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ ہے۔ سوءِ ظن کی اس کار فرمائی پر میں مسکرا کر رہ گیا۔

●●

# اسْتحصَال

استحصال یا کمزوروں کا ناروا استعمال اس قدر عام ہے کہ اکثر اوقات ایسا کرنے والوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ فطرت میں خون آلود پنجے اور دانت کا قانون رائج ہے۔ بات "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" سے بڑھ کر "میرا چاقو تیری گردن" تک پہنچ گئی ہے۔

انگریزی میں اس کے مقابل EXPLOITATION کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ حصول مقصد کے لیے جائز استعمال کو بھی اکسپلوائٹیشن کہہ سکتے ہیں۔ لیکن "گریشم کے قانون کے مطابق جس طرح کھوٹے سکے بتدریج اصلی یا خالص سکوں کو نکال باہر کرتے ہیں؛ اسی طرح اکثر ایک لفظ کے برے معانی اس کے اچھے معانی کو بیدخل کر دیتے ہیں۔ رائج اگرچہ دونوں معانی ہیں تاہم اکسپلوائٹیشن سنتے ہی ذہن برے معانی یا ناروا استعمال کی طرف جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا ضروری نہیں کہ انسان کی فطرت اچھائی کے مقابلے میں برائی کی طرف زیادہ جھکی رہتی ہے۔

اردو میں استحصال برے مفہوم میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ تحصیل، حصول، حاصل کرنا، استحصال ایک ہی مادے سے نکلے ہیں۔ گویا "استحصال" حاصل کرنے کا وہ ڈھنگ ہے جو دوسرے کو محروم کر دے، یا نقصان پہنچائے۔ یعنی کسی کی قبر پر قصر تعمیر کرنا، کسی کے گھر کو جلا کر ہاتھ سینکنا؛ ایک قوم، دوسری قوم، ایک نسل دوسری نسل، ایک فرقہ، دوسرے فرقے، ایک جماعت، دوسری جماعت، ایک گروہ، دوسرے گروہ کا استحصال کرتا ہے۔ اس قسم کے ناروا اجتماعی استحصال کی بات بعد میں آئے گی۔ شروع میں ہم بتائیں گے کہ ایک فرد، دوسرے فرد کو کس کس طرح اپنی منفعت کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو استحصال دو خانوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک استحصال بالجبر (اگر یہ اختراع جائز ہو) استحصال بالمکر۔ آخر الذکر کی بابت تجربہ کار لوگ کہہ گئے ہیں کہ:

تا احمق در جہاں باقیست کس مفلس نمی ماند

(دنیا میں جب تک بیوقوف بستے ہیں، کوئی غریب نہ رہے گا)

گویا سادہ لوح انسان وہ زمین ہیں جس میں چالاک انسان کھیتی کرتا ہے، یا سونے چاندی کی وہ کانیں ہیں جنھیں اہلِ دانش کھود کر تحصیلِ زر کرتے رہتے ہیں۔ "سادہ لوح" کی ترکیب پر غور کیجیے۔ انسان اپنی بات کو کس طرح ادا کرتا ہے، اس پر منحصر ہے کہ اس کی بات قبول کی جائے گی، یا رد کر دی جائے گی۔ کسی کو آپ برملا احمق کہہ دیجیے، آپ کی جان کا دشمن ہو جائے گا۔ اور اگر بازو اسی قدر مضبوط ہیں جتنی عقل ناتواں ہے، تو وہیں آپ سے حساب چکا لے گا۔ بیوقوف کہہ دیجیے تو بھی آپ کو معاف نہیں کرے گا۔ سادہ لوح کہیے تو انگیز کر لے گا۔ بہ شرطیکہ خود کو افلاطون نہ سمجھتا ہو۔ اور اگر "نیک نہاد" یا "بھلا مانس" یا "بہت ہی شریف" کہہ دیجیے تو بُرا سرے سے مانے گا ہی نہیں، کیا عجب کہ خوش ہو جائے۔ حالانکہ "احمق" سے "بہت ہی شریف" تک آپ نے جتنی لغات صرف کیں انھیں آپ متبادل اور مترادف سمجھتے ہیں۔ بڑی بات کو اچھے پیرائے میں کہنا ایک ضروری ہنر ہے۔ انگریزی نے تو اسے ایک اچھا سا نام دے دیا ہے: (EUP-HEMISM) یوفی مزم۔ "سادہ لوح" کے اجزائے ترکیبی پر غور کیجیے۔ سادہ یا بے لکھی ہوئی تختی، ایسی تختی جس پر آپ جو چاہیں لکھ دیں، صاف پڑھا جائے گا۔ ایسا معلوم ہوگا کہ وہ تختی بنی ہی اسی تحریر کے لیے تھی۔ وہ لوگ جن کے دل و دماغ کی تختی پر تجربہ اور سوجھ بوجھ کی تحریریں ہیں، سادہ لوح نہیں کہلاتے۔ اُس پر کوئی چالبدست لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو عبارت جمنے نہیں پاتی۔ حرفِ غلط کی طرح یوں مٹ جاتی ہے جیسے پانی کی سطح پر لکھے ہوئے حروف۔

استحصال بالمکر کا نشانہ سادہ لوح بنتے ہیں۔ آئے دن خبریں سننے میں آتی ہیں کہ ایک شعبدہ باز سادھو یا فقیر کا روپ دھار کر آیا، دروازہ پر دستک دی اور کہا سائیں بابا آ گئے، گھر میں جتنا زیور ہے لے آؤ۔ اپنی جھنکار سے دوگنا کر دیں گے۔ چمتکار میں شبہ نہیں لیکن اس کا فائدہ سائیں بابا کو ہی پہنچا۔

عطائی دوا فروشوں کا جادو سادہ لوحوں پر اور زیادہ چلتا ہے۔ مہلک سے مہلک مرض سے چھٹکارا دلانے کے وعدوں کو باور کر لیا جاتا ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ اس کی دوا میں اگر یہ تاثیر ہے تو یہ شخص بجائے جوتیاں چٹخانے اور دربدر کی خاک چھاننے کے لکھ پتی بن کر، محل بنا کر بیٹھا ہوتا۔

یہاں یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ سادہ لوحی مطلق نہیں، اضافی اصطلاح ہے۔ اس کا انحصار اس پر ہوگا کہ ضرورت کتنی شدید ہے اور ترغیب کتنی زبردست۔ ضرورت کی آنچ میں تجربہ اور ذہانت کے سارے حروف پگھل جاتے ہیں، تختی صاف ہو جاتی ہے تاکہ فن کار اس پر جو کچھ لکھنا چاہے لکھ دے۔

وہ لوگ جو اپنی ربولیت کو کسر نفسی کے انداز سے دیکھتے ہیں، عطائیوں کے طلسم ہوش ربا میں بہت جلد گرفتار ہو جاتے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں صدیوں تک لوگ اس نسخۂ کیمیا کی تلاش میں سرگرداں رہے، جو مٹی یا تانبے کو سونا بنا دے۔ کچھ خود بیوقوف بنے، کچھ نے دوسروں کو بیوقوف بنایا۔ ترغیب نے انھیں بیوقوف بننے کے لئے اس قدر آمادہ اور مستعد کر دیا تھا جس قدر تیار گرمیوں میں چیڑ کی نوک دار پتیاں (یا سوئیاں) آگ پکڑنے کے لئے رہتی ہیں۔

افراد کا استحصال، زر کی ہوس کے تحت ہی نہیں ہوتا۔ طاقت (ایک سے زیادہ مفہوم میں)، اختیار، اقتدار، نوکری، روزگار، ان سب کی طلب اچھے خاصے ہوشمندوں کو بیوقوف بنا دیتی ہے۔ نوکری دلانے کے بہانے لوگ گھروں کا صفایا کر دیتے ہیں۔ زر نقد کو جب سے فروغ ہوا ہے، ہندوستان میں دھوکہ بازوں کی بن آئی ہے۔ شرح بندھ گئی ہے۔ دس ہزار، پندرہ ہزار، بیس ہزار روپے داخل کر دیجیے، مشرق وسطیٰ میں کام کرنے کے لئے پروانہ مل جائے گا۔ ہزاروں سادہ لوح اس منظم فریب دہی، اس ریکٹ کا شکار ہو گئے۔ بیویوں کا زیور گھر کے برتن بھانڈے بیچے، مہاجن سے قرض لیا تب کہیں اتنا روپیہ جڑا کہ "ہنرمندوں" کی فیس ادا ہو سکے۔ جو پروانہ پا گئے، انھوں نے بھی بساط اور جواز سے کہیں زیادہ روپے ادا کئے۔ اور جو غریب پروانے سے محروم رہے وہ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گئے۔

خیر ان غریبوں کی تو کوئی غرض بھی تھی، ان دانشمندوں کو کیا کہیے جو صرف مستقبل پر جھانکنے کے لئے بیوقوف بننے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ ہاتھ دیکھنے والوں، جوتشیوں اور نجومیوں کا بازار جیسا آج کل گرم ہے، کبھی نہ رہا ہوگا۔ وزیر سے لے کر فقیر تک سب اسی حماقت کے اسیر ہیں۔ ستارے یا ہاتھ دیکھنے والے نے باہر پوچھ گچھ کرکے اور آپ کو، اور آپ کے گرد و پیش کو دیکھ کر کچھ محکم قیاس آرائیاں کیں، اور کچھ معتبر معلومات حاصل کر لیں۔ آپ کے ماضی کے کچھ صفحات آپ کے سامنے الٹ دیے۔ اور آپ نے ہتھیار ڈال دیے۔ آپ سمجھ بیٹھے کہ جو شخص گزری ہوئی باتیں بتا سکتا ہے، وہ آنے والی باتیں بتاتے ہوئے بھی نہ چوکے گا۔ آپ کے یقین کو اور پختہ کرنے کے لئے جوتشی جی آپ کے مزاج اور آپ کی ذہنی افتاد کے متعلق کچھ تبصرہ کر دیں گے جو ہر ہوش و گوش والا تھوڑی سی ملاقات کے بعد کر سکتا ہے۔ مستقبل کے متعلق اس کے پاس ابہام اور تعمیم کا ایسا لچکدار

ذخیرہ ہے کہ اس کی پیشینگوئی کو آپ کبھی غلط بتا ہی نہ سکیں گے۔ اور اگر واقعات کو آپ نے پیشینگوئی کے صریحاً مختلف پایا تو آپ غریب حافظے کو الزام دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ جوتشی جی نے ٹھیک ہی کہا ہوگا، قصور آپ سے یا تو سننے میں سرزد ہوا یا یاد رکھنے میں۔

جوتشی، سادھو، پیر، فقیر، پنڈت، مولوی، ان میں سے بہت سے جہالت اور حماقت کا دل کھول کر استحصال کرتے ہیں، عقیدت اور مال دونوں کی شکل میں چوتھ وصول کرتے ہیں۔ اس گروہ کا نشان امتیاز یہ ہے کہ یہ دھوکا اپنی شبیہ کو اصل سے مختلف دکھا کر دیتا ہے۔ لوگ ان کا فریب یوں کھاتے ہیں کہ انھیں خداشناس یا مستقبل شناس سمجھ بیٹھتے ہیں۔ لیکن فریب وہ لوگ بھی دیتے ہیں جو ایک عام انسان کی حیثیت سے آپ کی ہمدردی اور اعتماد حاصل کر لیتے ہیں ——

ایک بار اعتماد حاصل کر لیا تو میدان ہاتھ آ گیا۔ انسان ذہنی طور پر اسی طرح کاہل اور آرام طلب ہے جیسے شیر ببر جسمانی طور پر۔ کسی شخص نے کسی انسان پر ایک بار اعتماد کر لیا، تو اس کی ہر بات کو مانتا چلا جائے گا اور ذرا دیر کے لئے بھی یہ نہ سوچے گا کہ وہ بات ماننے کے لائق ہے بھی۔ ذہن کو وہ طاق پر بٹھا دیتا ہے کہ آرام کرو۔ کسی دوسرے کا دماغ، تمہاری خاطر جانفشانی اور ریاضت کر رہا ہے۔ پکی پکائی کھانے کو مل رہی ہے، تو ہم کیوں محنت کریں۔ شیر ببر شکار کے لئے شاذ ہی جاتا ہے۔ گوشۂ عافیت میں آرام کرتا ہے۔ شیرنی کو بھیج دیتا ہے کہ شکار کر کے لائے اور دسترخوان اس کے سامنے سجائے اور جب جنگل کے بادشاہ شکم سیر ہو جائیں تو شیرنی اور بچوں کی باری آئے۔ کھا کر ببر شیر پھر سو جاتا ہے۔ گویا آدمی بادشاہ کی طرح اس کے پاس بھی کوئی کام نہیں ہے۔ سوائے موقع موقع سے بڑے سر، فراخ شانے، شاندار ایال، پتلی کمر، اور درخشاں آنکھوں کی نمائش کے۔ ہاں ایک کا ذہن اور دوسرے کا جسم جب حرکت میں آتا ہے، تو باقی مخلوق کو اس کی گرد بھی نہیں ملتی۔

اجتماعی استحصال کی مثالوں سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔ راجہ، مہاراجہ، بادشاہ، امیر، صوبہ دار، والیٔ ریاست، تعلقدار، زمیندار، مل مالک، ٹھیکیدار، مہاجن، سود خوار۔ غرضیکہ ہر شخص جس کے پاس طاقت، اختیار، یا دولت ہوتی ہے انصاف سے آنکھیں بند کر کے ان انسانوں کو جن کے پاس ان تینوں میں سے کچھ نہیں ہوتا، اور جو اس کے چنگل میں آ جاتے ہیں آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ یہ بات آسانی سے بھول جاتا ہے کہ وہ بھی انسان ہیں، اس کی طرح وہ بھی دل، احساس اور خواہشیں رکھتے ہیں۔ ان کا ضمیر ایک کونے میں پڑا ہوا چین کی نیند سوتا ہے

کیونکہ سماج، روایت، رسم و رواج اور عادت نے اسے سُلا دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ظالم خود کو محسن اور خون آشام اور جاں بخش سمجھنے لگتا ہے۔

اکثریت والے اقلیت کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اقلیت کا تحفظ کر رہے ہیں۔ مذہب، رنگ اور نسل کے نام پر استحصال ہوتا ہے۔ اونچی ذات والے نیچی ذات والوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتے چلے آئے ہیں۔ ان کا ضمیر مطمئن رہتا ہے کہ وہ پیدا ہی بالادستی کے لئے ہوئے ہیں۔ بالادستی دیکھتے ہی دیکھتے زبردستی میں بدل جاتی ہے۔ مظلوم انصاف طلب کرتا ہے، حقوق مانگتا ہے، نادم احتجاج ہے تو باغی اور سرکش، احسان فراموش اور محسن کش کہلاتا ہے۔ سماج اور سماج کی پروردہ عقل ہر ظلم اور ناانصافی کو جائز ٹھہراتی ہے، اس کے لئے دلیلیں لے آتی ہے۔

بین الاقوامی استحصال کو استعمار کا نام دیا گیا ہے۔ انگریز تجارت کرنے ہندوستان میں آئے، ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ اسے کنگال کر دیا۔ اس کی صنعتیں تباہ ہو گئیں، اس کی خوش حالی کہانی بن گئی۔ وہ سوچتے رہے اور کہتے رہے کہ ہندوستانیوں کو مہذب بنانے آئے ہیں اور مہذب بنا کر چھوڑیں گے۔ انھیں اور اُن کے ملک کو۔ استحصال اور استعمار، ظلم اور ناانصافی کے تمام میں سب ہی ننگے ہیں، خواہ وہ سرمایہ دار ملک ہو یا اشتراکی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے روس نے افغانستان پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے بہادر اور غیور مجاہدین کو ہولناک جنگی ہتھیاروں کا نشانہ بنا ڈالا۔ اس ننگے حملے کا کوئی جواز نہیں۔ مگر شاطر عقل نے جواز ڈھونڈھ نکالا۔ بھیڑیے نے میمنے پر حملہ کرنے سے پہلے یہی کیا تھا۔

افراد ہوں یا اقوام اپنے سے کمزور فرد یا قوم کا استحصال کرنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ نظر آتی ہیں۔ خود غرضی طغیانی پر آتی ہے تو نہ ضمیر اس کو روک پاتا ہے، نہ عقل، نہ روشن رائے عامہ، نہ سماج۔ اس کو اگر کوئی روک سکتا ہے، تو وہ دین ہے جس کے آگے شاطر عقل کی پیش نہیں جاتی اور جس کے چھونے سے مردہ ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ دین انصاف کا دوسرا نام ہے۔ اس کے بغیر انصاف کا لیبل ظلم پر چسپاں ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔

استحصال داخلی ہوتا ہے یا خارجی۔ داخلی استحصال کی ایک مثال دے کر ہم ان سطور کو پایان تک پہنچا رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو قسمت، حکومت، اکثریت سے شکایت ہے۔ ظلم اور ناانصافی کی شکایات میں کچھ حقیقت ہے، کچھ مبالغہ۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ انھیں گلا اپنوں سے زیادہ ہونا چاہیے، غیروں سے کم۔ مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں ہی سے پہنچا ہے۔ یہ قوم دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک چھوٹا سا خوش حال، تعلیمیافتہ، صاحبِ اقتدار طبقہ، باقی اَن پڑھ، جاہل، مفلس۔ پہلا طبقہ، دوسرے طبقے کے استحصال پر کمر بستہ ہے۔ اس کا نمائندہ بن کر مراعات، امتیاز اور اثر حاصل کرتا ہے اور اس کے حقوق کو نظر انداز کر کے اپنی ذاتی اغراض پوری کرتا ہے۔ انحطاط آمادہ قوموں میں ہمیشہ ایسا ہوا ہے، اگر ہندوستانی مسلمانوں میں ایسا ہو رہا ہے تو یہ عبرت اور افسوس کا مقام ہے، حیرت کا نہیں۔ ●●

# زبان کی اہمیّت

اس زبان سے دُور یا محروم ہو جانا جس کا تعلق آپ کے تمدن، تاریخ اور تہذیب سے ہو بہت بڑا ذہنی، جذباتی اور روحانی افلاس ہے۔ اگر یہ دوری ایک جیتی جاگتی زبان سے ہو تو اس سے زیادہ کربناک محرومی اور مفلسی تصوّر میں نہیں آسکتی۔ بلکہ ایسی زبان سے بھی جو بظاہر زندہ نہیں ہے، جو اب کہیں بولی نہیں جاتی، دُور ہو جانا، ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

امریکہ کے شہر "کنعان نو" میں لاطینی زبان کی ایک معلّمہ نے جن کا نام "کیتھلین کالڈران" ہے، اپنے شاگردوں سے کہا کہ عالمی شخصیتوں کو خط لکھ کر یہ دریافت کریں کہ آیا اس زمانہ میں لاطینی زبان پڑھنے سے کچھ حاصل ہوگا۔

ساتویں جماعت کے طالب علم "کیمسٹن ڈن" کو ڈاکٹر "بارٹ لیٹ گیامائی" کی طرف سے یہ جواب موصول ہوا:

"عزیزم مسٹر ڈن! آپ ہم سے یہ نہ پوچھیے کہ ہم "ایک مردہ زبان کیوں پڑھتے ہیں"۔ لاطینی زبان مُردہ نہیں ہے، یہ جنوبی یورپ کی کئی زبانوں (اطالوی، ہسپانوی، فرانسیسی) کے روپ میں زندہ ہے، خود انگریزی زبان بھی ایک حد تک اسی پر مبنی ہے۔ یہ کلیسا کی زندگی میں جاری وساری ہے اور مغربی دنیا کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ یہ ان اکابر کی تصانیف میں سانس لے رہی ہے جنھوں نے قدیم زمانہ سے "بادلیئر" تک اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار اس میں کیا ہے۔ یہ زبان ہمارے دو ہزار سالہ تمدّن میں سانس لے رہی ہے۔

ہم لاطینی زبان اس لئے پڑھتے ہیں کہ اس کے بغیر ہم اپنی تاریخ اور اپنے ورثہ سے آگاہ نہیں ہو سکتے اور اسے جانے بغیر ہم خود کو بھی نہیں پہچان سکتے۔ ہم لاطینی زبان اس لئے بھی پڑھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ اپنی زبان کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ لاطینی پڑھ کر ہم انگریزی سیکھتے ہیں۔ جب ہم انگریزی الفاظ کے لاطینی مادوں کو کھوجتے ہیں، تو ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ اُن کے معنی کیا تھے اور

کیا ہیں۔ لاطینی زبان کے ذریعہ ہم قواعد بھی سیکھتے ہیں۔ قواعد بیک وقت وہ دیرینہ فن اور سائنس ہے جو ہمیں اپنے خیالات کو اور اس کے نتیجہ میں اپنی حیات کو صفائی وقار اور سنجیدگی کے ساتھ ترتیب دینا سکھاتی ہے۔

اپنے والدین سے میرا سلام کہیے اور مسز کیلڈران سے اور خود آپ کو دعائیں ہی دعائیں۔

ظاہر ہے کہ مسز کیلڈران بہت اچھی استانی ہیں۔ اس پر تعجب ہونا بھی نہیں چاہیے۔ آخر ان کا نام لاطینی ہے، جیسا کہ آپ سے خطاب اور آپکی قدر کرنے والے اس نامہ نگار کا۔

خیراندیش ـــــ الف بارٹ لیٹ گیاماٹی ؎

انگریزی کے سابق پروفیسر حال وائس چانسلر یل یونیورسٹی کا مندرجہ بالا خط زبان کی اہمیت کے بارے میں ایک قابل قدر دستاویز ہے۔ زبان ہمیں سوچنے اور بولنے سمجھنے اور اظہار کرنے کے ڈھنگ سکھاتی ہے بلکہ محسوس کرنے کے آداب بھی۔ لہو کی طرح یہ ہمارے رگ و پے میں جاری و ساری ہے۔ نہانخانۂ دل سے لے کر طلسم خانۂ دماغ تک اسی کا سکہ چلتا ہے۔ حواس خمسہ کائنات سے جو کچھ جذب کرتے ہیں، زندگی ماحول سے جو کچھ حاصل کرتی ہے، انسانی وجود کا پیچیدہ نظام جو خبریں، جو پیغام، جو دھمکیاں یا سندیسے دماغ تک پہنچاتا ہے، وہ سب زبان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ انسانی فکر کا ارتقا ساری اجتماعی ترقی، تمام ذہنی تسخیرات، ایک حد تک زبان کی دین ہیں۔ ہمارے شدید ترین جذبات اور لطیف ترین احساسات زبان کے ساتھ گتھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دماغ نے جہاں کام کرنا شروع کیا، زبان سرگرم عمل ہو گئی کہ ترجمانی، تعبیر اور توضیح پر وہ مامور ہے۔ ٹیلی کمیونیکیشن (جدید ذرائع ابلاغ) کا سارا کاروبار دھرا رہ جائے اگر دوسرے سرے پر کوڈ کو کھولنے اور سمجھنے کا سادھن نہ ہو۔ انسانی وجود کے نظام میں زبان کی اہمیت ایسے ہی سادھن کی ہے۔ انسانی کے حواس کچھ اطلاعات بھیجتے ہیں، ان کے کوڈ کو زبان ہی کھولتی اور ان کے منشا و مفہوم کو زبان ہی سمجھتی ہے۔ نطق (گویائی) اور منطق کا مادہ ایک ہی ہے۔ زبان نہ ہوتی تو نہ صرف فکر بلکہ زندگی، ترتیب، تنظیم، تعدیل، سلیقہ اور استواری سے محروم رہ جاتی۔ زبان انسان کی کائنات میں اس طرح پھیلی ہوئی ہے جیسے بدن میں نسیں۔ کروڑوں، اربوں افراد کے درمیان یہ رشتۂ ارتباط ہے، خدا اسکے فروغ پاتا ہے، جماعت اس سے تشکل پذیر ہوتی ہے۔ وہ لوگ بے غیرت ہیں اور فنا آمادہ جو اپنی زبان کو بھلا دیتے ہیں اور خوف طمع یا ناعاقبت اندیشی یا کاہلی کی بنا پر اپنی زبان کو مٹنے دیتے

ہیں۔ انسانی جسم کا خاصّہ ہے کہ خارجی مادّہ کو رد کر دیتا ہے۔ صالح انسانی ذہن بھی اسی طرح خارجی زبان کو اپنے میں پیوست نہیں ہونے دیتا۔ وہ خارجی زبان سیکھتا ہے۔ لیکن اس کی پذیرائی مہمان کی طرح کرتا ہے اسے غور و فکر، اور ردّ و قبول اور داخلی پیغام رسانی کے کام میں نہیں لاتا۔ ذہن اگر ایسا کرنے لگے تو وہ بے رخ اور بیوا ہے۔ اس کی نہ آبرو باقی رہے گی نہ ساکھ۔ گوشت کا ناخن سے جدا ہونا تصور میں آتا ہے۔ لیکن انسان کا اپنی زبان سے جدا ہو کر زندہ رہنا اور اپنے وجود کو برقرار رکھنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں، جو زبان کو ٹھکرا سکتا ہے، اُسے اپنی ماں کو دُھتکارنے میں بھی کوئی تامّل نہ ہوگا۔

وائس چانسلر کے مذکورہ خط سے زبان کی وسیع اور دلنواز کائنات کے بارہ میں بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ داد و ستد، اشتقاق، خود نگری، خودداری، خودشکنی اور افزائش نسل کا وہ سلسلہ جس سے الفاظ کا سابقہ رہتا ہے، حیرت خیز اور جستجو انگیز ہے۔ الفاظ اپنی صورت اور سیرت، شکل اور معنی صحبت اور سنگت کس طرح بدلتے ہیں، یہ ایک بڑی دلکش داستان ہے۔

ایک آخری جملہ اُس غیر معروف معلّمہ کے بارہ میں جسے وہ شہرۂ آفاق پروفیسر داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اچھے استاد سبق رٹانے کے بجائے اپنے شاگردوں کے ذہن میں جستجو کو مہمیز دیتے ہیں، اُن کے اُفق کو وسیع کرتے ہیں اور انھیں استفہام، تجسس، تحقیق اور تحیّر کے آداب سکھاتے ہیں۔

# علی گڑھ اولڈ بوائز سے دو باتیں

شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ میں تقریر

شبلی نیشنل کالج بھی جیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں علیگڑھ تحریک ہی کا ایک نتیجہ ہے۔ علامہ شبلی سرسید کے دست راست تھے۔ آپ ان کالجوں کی تاریخوں میں جائیں، یہ تو بہت اہم کالج ہے مسلمانوں کے اور کالجز (COLLEGES) بھی ان کا رشتہ بھی کسی نہ کسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے جڑتا ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اپنا وہ کردار بھی ادا کرنا ہے جو کہا گیا ہے کہ اگر کوئی تحریک ادارہ ہو کر رہ جائے تو اپنے نقطۂ انجماد کو پہنچ گئی! تو خدا نہ کرے کہ علی گڑھ محض ایک ادارہ ہو کر رہ جائے! یہ ایک تحریک ہے اور اس تحریک میں آپ اسی طرح شامل ہیں جس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جو ادارہ شبلی نیشنل کالج کو چلا رہا ہے اس کا نام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے۔ یہ بھی سرسید کے منصوبے اور نقطۂ نگاہ کے عین مطابق ہے۔ چونکہ سرسید نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنا اس لئے ڈالی تھی کہ علی گڑھ کے باہر ہندوستان کے گوشے گوشے میں مختلف کالجوں کا قیام ہو اور جو کالج قائم ہیں ان کی امداد اور ان کی رہنمائی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کر سکے۔ آپ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس خدا کے فضل سے کام کر رہی ہے، فعال ہے لیکن آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو اب کروٹ لینی ہوگی۔ کیونکہ بغیر اس کی مدد کے یونیورسٹی کے لئے یہ دشوار ہوگا کہ مختلف کالجوں سے جس قسم کا رابطہ ہونا چاہیئے وہ رابطہ قائم ہو سکے۔ مسلم یونیورسٹی کے ترمیمی ایکٹ میں ایک دفعہ ایسی رہی ہے جو یونیورسٹی پر یہ ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی اصلاح اور پیشرفت کے لئے سعی کرے۔ اس دفعہ میں بہت سے امکانات مضمر ہیں اور خدا نے چاہا تو یونیورسٹی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو ساتھ لے کر ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے گی جو علی گڑھ تحریک کے بانی نے اس کو سپرد کی تھی اور جس کی تائید مزید پارلیامنٹ کے ایوان میں ترمیمی بل کے ذریعہ سے ہوئی۔ یونیورسٹی کے کورٹ کی تشکیل ہونے والی ہے۔ اس میں بھی بڑی ضرورت اس کی ہے کہ ملک بھر میں جو لوگ اہل فکر ہیں، جو لوگ صلاحیت رکھتے ہیں، وہ یونیورسٹی کے انتظام میں دخیل ہوں، یونیورسٹی کے کورٹ کی ممبر ہوں یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر ہوں۔ اس کے لئے علی گڑھ کے اولڈ بوائز

اور ان کالجز کو، جن کا یونیورسٹی سے دیرینہ تعلق ہے، کوشاں ہونا پڑے گا۔ اور میری آپ سے اپیل ہے کہ اس بات کی طرف بھی آپ توجہ کریں۔ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے جو حکومت نے آپ کے مطالبہ پر آپ کو سونپی ہے کہ آپ اپنی یونیورسٹی کا انتظام خود سنبھالیں۔ یہ خوشی کا موقع ہے، تہنیت کا موقع ہے، لیکن یہ آزمائش کا موقع بھی ہے! یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جو ہمیں سونپی گئی ہے اور ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک پُرآشوب دَور سے گزری ہے۔ مجھ کو جب یہ ذمہ داری سونپی گئی تو میں نے صرف اس نیت سے قبول کیا کہ میں اپنی بساط کے مطابق اس کے معیار کو اونچا کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہی میرا مقصد ہے، یہی میرا مدعا ہے اور خدا گواہ ہے کہ میں نے اس مقصد سے کبھی انحراف نہیں کیا اور اس مقصد کو ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں کیا۔ میرے افعال یا میرے فیصلوں کے نتائج کیا ہوئے، یا ایسے نتائج بھی کبھی کبھی ہو گئے جو میرے تصوّر سے پرے تھے! اس کے متعلق میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔ یہ فیصلہ بہرحال آپ کو خود کرنا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یونیورسٹی اس پُرآشوب دَور سے نکل آئی ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ اصلاح کا ہر قدم احتجاج اور بغاوت کو جنم دیتا ہے۔ ایک روش یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انسان اپنا وقت گزار دے، عافیت اس میں سمجھ کر مدت معینہ کے لئے وہ ایک جگہ پر آیا ہے، اپنا وقت گزار دے اور چلا جائے۔ اس میں کوئی دشواریاں نہیں ہیں، راستہ آسان ہے۔ لیکن یہ راستہ جو میں نے اختیار کیا، ایک پُرخطر راستہ ہے۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ ہر آنے والا دن کل سے بہتر ثابت ہو۔ اور مجھے اب بھی یقین ہے اور حالات نے جو کروٹ لی ہے، پچھلے پانچ ماہ میں، جس طرح سے لڑکوں نے جس انہماک سے پڑھائی کی ہے اور جس طرح سے ریڈنگ روم رات رات بھر بھرے رہے ہیں، ایک بڑی نیک فال ہے اور اس سے ہم نہ صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بلکہ تمام ملت کے لئے بہت سی امیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔ یہ لڑکے جو اس محنت، اور اس انہماک اور اس سنجیدگی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، کوئی طاقت ان کو پیچھے نہیں ہٹا سکتی۔ یہ جوش میں آ کے بھٹک تو سکتے ہیں، لیکن جب ان پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ ان کی بھلائی کے لئے کیا جا رہا ہے، تو کوئی طاقت ان کو پیچھے نہیں ہٹا سکے گی۔ یونیورسٹی میں بہت سے ایسے لڑکے ہیں جن کے والدین ان کا اپنا

پیٹ کاٹ کر بھیجتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ وہ یہاں سے کیریئر بنا کر نکلیں گے اور جب وہ یہاں سے باہر جائیں گے تو فخر اور اعتماد کے ساتھ جائیں گے۔ یہی ان کا مقصد ہے یہی آپ کی دعائیں ہوں گی، یہی میرا مشن ہے کہ ہمارے لڑکے، ہمارے طالب علم جب علی گڑھ سے نکلیں تو کسی یونیورسٹی کے طالب علم سے کسی بات میں پیچھے نہ ہوں۔ وہ اپنی لیاقت، صلاحیت اور اہلیت کے بل پر ہر جگہ سرخرو ہوں۔ جس امتحان میں بیٹھیں اس میں کامیاب ہوں اور سرخروئی ان کے قدم چومے! یہی میری تمنا ہے، یہی آپ کی دعائیں ہیں، اور یہی اس عظیم تحریک کے بانی کی نیت تھی۔ سرسید نے جب علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا، تو ان کے ذہن میں یہی تھا کہ ایسے بچے یہاں تعلیم پائیں جن کا رشتہ اپنے مذہب اور اپنے تمدن کے ساتھ استوار ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی افق میں جدید زمانے کے سارے انکشافات اور سارے علوم سما جائیں۔ سرسید نے یہی خواب دیکھا تھا اور اس خواب کی تعبیر اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ایک بات اور عرض کروں: یونیورسٹی کا سیشن کئی سال سے متواتر فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے اور اس سال کچھ اور ہنگاموں کی وجہ سے سیشن کا نظام کچھ برہم ہو گیا ہے۔ یہ نظام انشاءاللہ اگر حالات پرسکون رہے تو ۸۲-۸۳ء سے معمول پر آجائے گا۔ ۸۱-۸۲ء کا یہ سیشن کسی قدر چھوٹا ہوگا لیکن علی گڑھ کے اساتذہ نے جس طرح سے طلبا کے ساتھ تعاون کیا، نصاب کی تکمیل کی، اسی طرح اس سال بھی محنت کرنی پڑے گی۔ کم وقت میں زیادہ نصاب کو طے کیا جائے گا۔ انشاءاللہ ۸۲-۸۳ء میں یونیورسٹی کا سیشن معمول پر آجائے گا اور اگست سے شروع ہوگا۔

مسلم کالجز اور مسلم اسکولس کے متعلق دو کوششیں ہوئی ہیں۔ ایک کوشش تو احمد رشید شیروانی صاحب نے کی ہے جن کے مضامین آپ اخباروں میں دیکھتے رہے ہوں گے۔ وہ مسلم اسکول اور مسلم کالجز کے نتائج کا تجزیہ کرتے رہے ہیں۔ اس سے بہت اہم اعداد و شمار ہمارے پاس آگئے ہیں۔ دوسری کوشش جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے کی ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے ۶۵ کالجز کا سروے کیا ہے۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں ہماری کوشش ہوگی کہ ان کالجز کی ضروریات پر نظر ڈالیں۔ پھر یونیورسٹی جس حد تک مدد کر سکتی ہے اس حد تک خود مدد کرے، جس حد تک حکومت کو توجہ دلا سکتی ہے اسے توجہ دلائے اور جس حد تک عامۃ المسلمین سے اپیل کر سکتی ہے، ان سے اپیل کرے۔ بہرحال یہ بنیادی رول ہوگا جو یونیورسٹی

کو انجام دینا ہوگا۔ اس رول میں یونیورسٹی کے اس نئے کردار میں آپ کی حمایت کی اور آپ کے تعاون کی ہر لمحہ ضرورت ہوگی۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے مجھے یاد کیا، میں ان کا بیحد ممنون ہوں۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی توقعات ہمیشہ زیادہ ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی کے لئے اولڈ بوائز تقویت اور توانائی کا باعث ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ جو لوگ علی گڑھ سے پڑھ کر نکلتے ہیں، ان کی وابستگی ہمیشہ اپنی مادر درس گاہ کے ساتھ باقی رہتی ہے اور یہی وابستگی علی گڑھ کی طاقت کا راز ہے۔

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو ایک کام تو ضرور کرنا ہے، اور کسی اچھے کام میں تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں ہوا کرتی: وہ کام ہے اچھے طلبا کو منتخب کر کے ان کو مقابلے کے مختلف امتحانوں کے لئے تیار کرنا۔ دہلی میں ایک اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی۔ اس نے یہ کام کیا اور اب بھی وہ یہ کام کر رہی ہے۔ میں آسام گیا تھا۔ گوہاٹی میں اس زمانے میں اولڈ بوائز نے یہ ایسوسی ایشن قائم کر دی اور یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اعظم گڑھ میں یہ کام زیادہ بڑے پیمانے پر، زیادہ سنجیدگی اور زیادہ انہماک کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ میں اولڈ بوائز کے صدر محترم سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کام کو اپنی رہبری و سرپرستی عطا کریں اور اولڈ بوائز کو جمع کر کے اس بات کے لئے راضی کر لیں کہ وہ اپنا وقت عزیز طلبا کی تربیت اور ان کی کوچنگ میں صرف کریں گے۔ اس سے بڑا فرق ہوتا ہے: اگر آپ اوسط طالب علم کو لے لیجے اور اس کو باقاعدہ تربیت دیدیجیے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کسی اچھے مقابلے کے امتحان میں کامیاب نہ ہو۔ مقابلے کے جن امتحانوں کے نتائج کا تجزیہ کیا گیا ہے اس میں یہ پایا گیا ہے کہ اوسط قسم کے طلبا جنھوں نے ڈھنگ سے محنت کی ہے، وہی کامیاب ہوتے ہیں اس میں کوئی غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب کوئی اچھی ملازمت بغیر مقابلے کے دستیاب نہیں ہوتی۔ لہٰذا مقابلہ تو کرنا ہے۔ اب یہ بھی ہم پہ واضح ہو گیا ہے کہ انسان معمولی سی، چھوٹی سی ملازمت شروع کر کے سب سے بڑے عہدے تک پہنچ سکتا ہے۔ ایک تو اس زمانہ میں ورٹیکل موبلٹی (VERTICAL MOBILITY) بہت بڑھ گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ چاہے مرکزی حکومت ہو، چاہے صوبے کی حکومت ہو، یہ اجازت دیتی ہے کہ کوئی شخص جو کسی جگہ پر ملازم ہوا ہے وہ بڑے سے بڑے امتحان میں بیٹھ سکتا ہے۔ امتحانات کے لئے یونین پبلک سروس کمیشن کے علاوہ اور بہت سے کمیشن کھل گئے ہیں، جن میں اسٹاف سیلکشن کمیشن بھی ہے جو جونیر ملازمتوں کے لئے ریکروٹمنٹ کرتا ہے۔

پھر کوئی نو کس ریلوے سروس کمیشن ہیں۔ یہی تعداد بنکنگ سروس کمیشن بورڈ (BANKING SERVICE COMMISSION BOARD) کی ہے۔ پھر ایل آئی سی (.L.I.C) ہے اور دوسری پبلک سیکٹر انڈر ٹیکنگ (PUBLIC SECTER UNDER TAKINGS) ہیں، جو اپنے امتحانات کرتی ہیں۔ یہ فرض ہوگا اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا، کہ ان امتحانات، ان امکانات، اور ان مواقع کے متعلق اطلاع فراہم کرے اور اس کو نشر کرے۔ بشبلی کالج میں، دوسرے کالجوں میں، اور ایسے لڑکوں کو چنیں جن کے متعلق امکانات ہوں کہ کسی نہ کسی ملازمت میں وہ کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ بات واضح کر دینی ہے کہ کسی ایک مقابلے کی تیاری دوسرے مقابلے کے امتحان کے لئے ہمیشہ کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ اگر اسسٹنٹ (ASSISTANT) کے لئے تیاری کی تو آئی اے ایس (I.A.S) کے لئے بھی وہ تیاری مفید ہوتی ہے، معاون ہوتی ہے۔ مقابلے کے امتحان کا ایک ڈھنگ ہوتا ہے، تکنیک ہوتی ہے۔ ایک مقابلے کے امتحان میں اگر آپ بیٹھ گئے تو دوسرے مقابلے کے امتحانوں کے لئے یہ تجربہ کام کرتا ہے۔ تو، طالب علموں کو اس کی طرف بڑھانے کی ضرورت ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جب سے ان مقابلے کے امتحانات میں دلچسپی شروع ہوئی ہے، دو بار ایسا ہوا ہے کہ دو لڑکے آئی اے ایس میں ہندوستان بھر میں اوّل آئے ہیں۔ طالب علموں کو اس کی طرف بڑھانے کی ضرورت ہے۔

●●

# خیال کی طاقت

[راقم دولتِ مشترکہ کی یونیورسیٹیوں کی انجمن کی طرف سے دوسرے مندوبین کے ساتھ برمنگھم سے آئرن برج (لوہے کا پل) گیا تھا۔ اس قصبے کا نام لوہے کے ایک تاریخی پل کے نام پر رکھا گیا ہے۔ دنیا میں لوہے کا یہ پہلا پل ہے اور آئرن برج کے قصبے کے ساتھ صنعتی انقلاب کی شروعات کا رشتہ جڑا ہوا ہے۔ آج کل عوام اور حکومت کوشاں ہیں کہ اس تاریخ ساز بستی کو نئے سرے سے اس طرح بسائیں کہ وہ تاریخ ساز عہد زندہ ہو کر نگاہوں کے سامنے آجائے۔

وہاں دوسری عمارتوں اور کارخانوں کے علاوہ ایک پریس بھی دیکھا، جو سترھویں صدی کے مطابع کی طرح آثار قدیمہ کی شان رکھتا ہے۔ پریس جو کچھ چھاپتا ہے لوگ اسے ماضی کا ارمغاں سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ راقم نے اس مطبع میں چھپا ہوا ایک پرچہ خریدا جس میں ایک نظم درج تھی، اس کا عنوان تھا "اگر" (۱۴) اس کا ترجمہ تہذیب الاخلاق کے قارئین کے نذر ہے۔ غالب نے کہا تھا:

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

دراصل انسان کی صلاحیت بیکراں اور اس کے خیال کی تعمیری طاقت گمان و قیاس سے بڑھ کر ہے۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم خود پر اعتماد اور کامیابی کا یقین رکھیں۔

سید حامد (برمنگھم، ۱۷ اگست ۱۹۸۳ء)

اگر تم نے سوچا کہ تم ہار گئے ہو، تو ہار یقینی ہے۔
اگر تم نے سوچا کہ یہ کام تمہارے بوتے سے باہر ہے،
تو یہ کام لازمی طور پر تمہارے بوتے سے باہر رہے گا۔
تم جیت کے خواہاں ہو؛ لیکن تمہارے دل میں
اگر یہ خیال بس گیا کہ تم جیت نہیں سکتے، تو یاد رکھو
کہ تم ہرگز جیت نہیں پاؤ گے۔
جس لمحہ یہ خیال تمہارے ذہن سے گزرا کہ تم

ناکامیاب ہو گے، تو جان لو کہ تم واقعی اسی لمحے ناکامیاب ہو گئے۔

زندگی کا تجربہ اگر کوئی بات بتاتا ہے تو وہ یہ ہے:
کامیابی خیال کی کوکھ سے، ارادے کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔
کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ دل و دماغ کرتے ہیں۔
اگر تم نے کمتری کا احساس کیا،
تو تم واقعی کمتر ہو کر رہ جاؤ گے۔
اگر تمھیں اُونچا اٹھنا ہے، تو خیال اور حوصلے کو بلند رکھو۔
جب تک خود پر اعتماد نہ کرو گے،
تمھارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔
یہ ضروری نہیں ہے کہ زندگی میں وہی لوگ کامیاب ہوں
جو طاقتور اور ذہین ہیں؛
فتح اُسی کے قدم چومتی ہے،
جسے آغاز سے ہی اپنی فتح کا یقین ہوتا ہے۔

••

# شیخ الجامعہ کے الوداعی خط

## طلبا کے نام

وائس چانسلر لاج

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۲۶ مارچ ۱۹۸۵ء

میرے عزیز طالبعلمو!

ایک لڑکا جولائی ۱۹۳۷ء میں اس یونیورسٹی میں داخل ہوا، گویا آج سے ۴۸ سال پہلے؛ اور پانچ سال گزار کر یہاں سے چلا گیا۔ وہ پانچ سال اس کی زندگی کے بہت اہم سال تھے۔ یونیورسٹی نے اسے بہت کچھ دیا، نہال کر دیا۔ لیکن وہ اس تعلیم و تربیت کا عشر عشیر بھی نہ تھا جو اس کے باپ حافظ سید مہدی حسن صاحب (مرحوم) اور اس کی ماں ستارہ شاہ جہاں بیگم صاحبہ (مرحومہ) نے اسے دی تھی۔ باپ نے شعر و ادب اور تاریخ کا ذوق بخشا اور دیانت، ریاضت، جفاکشی و سنجیدگی دی ان کی ہدایت تھی کہ بیٹا کھیل اور نماز نہ چھوڑنا۔ ماں نے استقامت، صبر و تحمل، رافت و شفقت سے نوازا۔

انٹر کالج مرادآباد میں ہاکی کی کپتانی کر کے جب علیگڑھ آیا تو لوگوں کو یہ بات اکھلی لگی کہ ایک لڑکا بیک وقت پڑھائی اور کھیل میں امتیاز حاصل کرے اور یونیورسٹی کی پاکیزہ اور خوبصورت مسجد میں بھی پابندی کے ساتھ حاضر ہو۔ پھر اسے اس کا احساس کبھی نہ ہو کہ خالق نے اس فرومایہ کی ذات میں چند ایسی صفتیں جمع کر دی ہیں جو فی زمانہ ایک ساتھ کم پائی جاتی ہیں۔ اس کی کوشش یہی رہی کہ کسی کا دل اس کے کسی قول یا فعل سے نہ دکھے۔ اس نے وہ پانچ سال اس طرح گزارے کہ پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ جو کسی کا دل نہ دکھائے لوگ اسے برا کہیں کیسے۔ ۱۹۴۲ء میں جب اس نے یونیورسٹی کو خیرباد کہا تو اس کے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک دن یونیورسٹی کو چلانے کے لئے نظر انتخاب اس پر پڑے گی، اور جب اچانک اسے بتایا گیا تو وہ سکتے میں رہ گیا۔

الہٰی خیر! یونیورسٹی بظاہر اس مقام پر پہنچ گئی تھی کہ توازن، صحت، نظم اور روایات کی طرف واپسی ناممکن لگتی تھی۔ یہ دراصل اس ایجی ٹیشن کا ثمرہ تھا جو یونیورسٹی کی خود مختاری اور اس کے اقلیتی کردار کی بازیابی کے لیے چلایا گیا تھا اور اس شکست خوردہ ذہنیت کا بھی جو مایوسی اور پسپائی کے دامن میں پناہ لیتی ہے۔ اس اضمحلال اور انحطاط کے لیے ہم کسی ایک انسان کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ افراد، حالات، حوادث، تنگی اور خود غرضی نے مل کر درس گاہ کے مزاج کو بگاڑ دیا تھا، اور اختیار ارباب حل و عقد کے ہاتھوں سے نکل کر نام نہاد طالب علم رہنماؤں کے ہاتھ میں پہونچ گیا تھا۔ وہ نہ طالب علم تھے، نہ رہنما، وہ علم دشمن تھے اور شرافت و صداقت کے راہزن۔ ان کا مقصد صاف ظاہر تھا جب تک وہ علی گڑھ میں رہیں، طالب علموں کا لہو پئیں اور اپنی مادر درس گاہ سے ناجائز مراعات بزور شمشیر حاصل کریں؛ البتہ اعلان گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ کرتے رہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اسلام کی خاطر اور یونیورسٹی کے کردار کے تحفظ میں۔ ان زور خصلت زور آزماؤں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جسے اسلام، اخلاق یا علم سے دور کا واسطہ بھی ہو۔ ان کا دوسرا اور طویل المدتی مقصد یہ تھا کہ اتنا شور مچائیں، اتنی توڑ پھوڑ کرائیں، اس قدر فتنہ برپا کریں کہ کسی نہ کسی پارٹی کے منظور نظر بن جائیں اور یونیورسٹی میں تخریب کاری کر کے ملک کی تعمیر نو کے اہل شمار ہوں۔ یونیورسٹی کی (خدانخواستہ) قبر پر وہ اپنا محل تعمیر کرنا چاہتے تھے۔

ان دوست نما دشمنوں، راہبر نام راہزنوں کی کوششوں کا نتیجہ کیا ہوا؟ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر، جو شائستگی کے لئے مشہور تھی، یہ دھبہ لگا کہ اس کے طالب علموں نے اپنے شیخ الجامعہ نواب علی یاور جنگ پر کورٹ کی میٹنگ میں قاتلانہ حملہ کیا اور اس کے بعد ایجی ٹیشن کے ذریعہ اس کے علمی نظم اور اخلاقی معیار کو گراوٹ کی انتہا تک پہنچا دیا۔ داخلے نااہلوں کے ہوں، حاضری کی تکلیف دہ بیڑیاں توڑ دی جائیں، امتحان حسب سہولت ملتے رہیں، ہتھیار بند طالع آزمائی کا بول بالا ہو، مقرر وہ سمجھے جائیں جنھیں احساس ہی نہ ہو کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور خود ان کے ہم وطن کس تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، لیکن جو اکسانے بھڑکانے، گمراہ کرنے اور توڑ پھوڑ کرانے کے سارے حربے اپنے زور خطابت میں بھر سکتے ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی بدنام ہو گئی، اس کی شہرت بگڑ گئی، اس کے معیار گر گئے، اس کے اسناد کی ساکھ گرنے لگی۔

سرسید کا خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا اور یہ سب کچھ چند راہ زن طالب علموں، گنتی کے مفاد پرست استادوں اور مٹھی بھر ایمان باختہ اہل کاروں کے سنگٹھن کی بدولت ہوا۔ ملک میں لوگ یونیورسٹی کا نام حقارت کے ساتھ لینے لگے۔ جہاں آئے دن فتنہ و فساد برپا ہوتا ہو، وہاں پڑھائی ہی کیا ہوگی؟ پھر کیا کیا جائے؟ نصاب کا ایک چھوٹا سا حصّہ پڑھا دیا جائے اور امتحان اسی میں سے لے لیا جائے تاکہ طالب علموں کا سال بھی ضائع نہ ہوگا، ڈگری بھی مل جائے گی۔ دماغ پر کوئی ضرب نہیں پڑے گی، نہ وقت عزیز کو جو بے مقصد یاوہ گوئی کے لئے وضع ہوا ہے، تحقیق اور تحصیل علم پر ضائع کرنا پڑے گا، اور اگر کوئی سرپھرا اس اختصار، اس انحطاط کے خلاف لب کشائی کرے، تو یا تو اس کو بے تکلف پیٹ دیا جائے، یا اس کی نیت اور عقاید پر شبہ کی لکیر کھینچ دی جائے۔

میرے عزیز! تم ہی سوچو، ادارے اس طرح بنتے نہیں، بگڑتے ہیں۔ بات کی رَو میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے! وہ لڑکا جو ۱۹۴۳ء میں یونیورسٹی چھوڑ کر گیا تھا اور جس نے ریاستی سول سروس میں عوامی روابط کا تجربہ حاصل کیا تھا، جس نے مرکزی سول سروس میں ملکی اور بین الاقوامی مسائل اور مذاکرے میں بہم حصّہ لیا تھا، وہ لڑکا زندگی کی فولاد آزما بھٹّی سے گزر کر ۳۸ سال بعد اپنی مادرِ علمی کے قدموں میں واپس آیا، اس کے دل میں نہ جانے کتنی اُمنگیں، کتنے منصوبے ہوں گے، اس کی آنکھیں نہ جانے کتنے خواب دیکھ رہی ہوں گی! وہ بیتاب ہوگا کہ جو کچھ زندگی نے اسے دیا ہے، وہ اپنی ماں کے قدموں میں نچھاور کردے۔ ستارہ شاہجہاں بیگم کے بعد اس نے اسے ہی ماں کہا تھا؛ منھ بولی ماں، شفیق باوقار، دُور اندیش ماں۔ اُس نے طے کرلیا کہ اپنی ماں کو رسوائی سے بچائے گا، اس کی گمشدہ حیثیت اور شہرت اسے واپس دلائے گا، آسمان سے تارے توڑ کر لائے گا اور اپنی ماں کی مانگ میں سجائے گا لیکن لوگ اس کی بات کیوں سننے لگے، وہ لوگ جن کی عادتیں بگڑ چکی تھیں، جنھیں طاقت، لذّت اور نخوت کا چسکہ پڑ چکا تھا، جنھوں نے نقار خانے کا شور اتنا تیز کر دیا تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی، وہاں دردمندی کی آواز، طوطی کی آواز بن گئی تھی۔ پھر اس کی عادت دھیمے سروں میں باتیں کرنے کی تھی، ستارہ شاہجہاں بیگم نے اسے تربیت دی تھی کہ بیٹا! دنیا آئینہ خانہ ہے، زنہار تمہاری بات سے کسی کا دل نہ ٹوٹ جائے۔

دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں جو کرکے گداز
شکل شیشے کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ

وہ گلستاں سے جوئے نغمہ خواں بن کر گزر رہا تھا لیکن کوہ وبیاباں سے ٹکرانے والے موقع ہی نہ ملا تھا۔ دنیا کی عادت ہے کہ وہ گفتار کی نرمی کو طبیعت کی کمزوری پر محمول کرتی ہے۔ اس نے جی کڑا کر لیا اور ٹھان لی کہ اسے پرانی روش چھوڑ کر سخت فیصلے کرنا پڑیں گے کہ فساد کے بعد اصلاح سے زیادہ سخت اور پُرخطر کوئی کام نہیں ہے۔ مقصد صرف ایک تھا طالب علموں کا درس مفاد، یونیورسٹی کی نیک نامی اور پیش رفت، ملت کی عزت اور وطن عزیز کی ترقی اور یہ تینوں مقصد آپس میں گتھے ہوئے ہیں۔

اپنے پرووائس چانسلر پروفیسر بہاء الدین اور اپنے رفیقان کار یعنی اساتذہ سے مل کر اس نے سست عنانی کو متروک و منسوخ ٹھہرایا اور ہمہ جہت وہمہ گیر کوشش اصلاح، تصفیہ، تزکیہ، ریاضت اور ارتقائے معیار و انضباط کے لئے کی۔ کوتاہ اندیشوں اور ہوس پرستوں نے اس کوشش کی سخت مخالفت کی اور الزام تراشی، دروغ بافی اور افواہ سازی، وعید و تہدید اور زدوکوب کے سارے امکانات کو شیخ الجامعہ اور صالح اساتذہ وطلبہ کے خلاف بیدریغ استعمال کیا۔ لیکن جھوٹ کی گرد بیٹھ کر رہتی ہے، چنانچہ بیٹھ گئی اور یونیورسٹی نے ڈھیل ڈھال اور ضابطہ شکنی اور ہوس طرازی سے اپنا ناتہ توڑ لیا اور چند سال کے اندر یونیورسٹی کا کھویا ہوا وقار، اور اہل علم کی انجمنوں میں اس کی عزت برقرار ہوگئی اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

یونیورسٹی کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لئے بعض ایسے علم دشمنوں کو یونیورسٹی سے نکالنا پڑا، جو ہر وقت اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں صرف اس لئے لگے ہوئے تھے کہ ان کم نگاہ، کوتاہ قامت، کینہ پرور، نخوت گزیدہ افراد کی اَنا کو تسکین پہنچا سکیں۔ اخراج یافتہ طلبہ میں سے اگر کسی نے ذرا بھی پشیمانی کا ثبوت دیا، تو اس کو واپس بلا لیا گیا۔ لیکن ان میں سے چند ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے اُوپر توبہ کے دروازے کو بند کر لیا تھا۔ ان کے دلوں پر مُہر لگ گئی تھی۔ جہل مرکب کے پیکر، ابوجہل اور ابولہب کا نقش ثانی تھے، جو شقاوت اور دنائت میں نقوش اوّل سے بازی لے گئے تھے صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْن

حق اور انصاف، پاکیزگی اور خیر خواہی، انفعال اور پشیمانی کی طرف ان کی واپسی کی راہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی تھی قانونِ قدرت اور مشیت الٰہی کے تحت!

طالب علموں پر بالآخر یہ بات واضح ہو گئی (جیسا کہ ان کے سرپرستوں پر بہت پہلے ہو چکی تھی) کہ اگر یونیورسٹی میں امن وامان اور نظم وضبط قائم رہتا ہے تو ان کا مستقبل بن جائے گا اور اگر فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے تو ان کا مستقبل بگڑ جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے تخریب کاروں کے بہکاوے میں آنا بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی کا نام ملک بھر میں اونچا ہوا، سوائے ان لمحات کے جب اعدائے جامعہ بعض صحافیوں کو غلط بیانیوں پر آمادہ کر دیتے تھے؛ یا پھر کہیں آتشبازی چھوڑ دیتے تھے۔

طالب علموں کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد دین اور وطن، شائستگی اور تہذیب کے یہ دشمن اپنے "معلمین ملکوت" کے اشارے پر ہتھیار بند مجرموں کو لیکر میدان میں کود آئے اور انھوں نے نہتے استادوں پر گوریلا حملے کر کے انھیں بے عزت کر کے[1] دہشت کی ایک فضا قائم کی اور یہ کہنا شروع کیا کہ پولیس اب تم میں سے کسی کی حفاظت کے لئے کیمپس میں داخل نہیں ہوگی۔ ان گم کردہ راہوں کے مطیعین اور معاونین کون تھے، اس پر سے جلد ہی پردہ اٹھایا جائے گا۔ عبرت ناک انکشافات کے لئے عزیز طالب علموں کو تیار رہنا پڑے گا۔

آخری کوشش ان تخریب کاروں نے یہ کی کہ موجودہ شیخ جامعہ کی سبکدوشی پر زمامِ انتظام ایسے دو بڑے اشخاص میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں چلی جائے جن میں سے ایک صاحب مفاد پرستی کے علاوہ خبث باطن اور کینہ پروری کے لئے پہچانے جا چکے ہیں اور دوسرے بزرگ اصول طالع آزمائی اور اراذل کی طرح دریدہ دہنی اور دشنام طرازی میں امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جس طالب علم کا ذکر میں نے تم سے اس خط کے آغاز میں کیا تھا، اس کے ہاتھوں آخری کام یہ انجام پایا کہ یونیورسٹی کو اس طرح زک پہنچانے، اس کو برباد اور پامال کر دینے کا یہ منصوبہ مسمار ہو گیا! اور تمہاری یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے لئے ایسے تین اکابرین کے نام چُنے گئے جو علم کے آسمان پر مہر و ماہ کی طرح چمک رہے ہیں اور جن میں ہر ایک (جس کا بھی بالآخر

---

[1] یہ تو ضابطۂ اخلاق ہی بتائے گا کہ دراصل بے عزت کون ہوا۔

انتخاب ہو) اس خط کے لکھنے والے سے بدرجہا بہتر ہے اور جو یونیورسٹی کو تیز رفتاری کیساتھ ترقی کی راہ پر لے جائے گا۔ مگر شرط ایک ہے! تم یونیورسٹی کے دشمنوں کے بہکانے میں نہ آنا۔ اس کی مدد کرنا جو تمہاری مدد کرنا چاہتا ہے، اس کو پورا تعاون دینا۔ یہ شرم کی بات ہے کہ چند دہ، سولہ ہزار نوجوان، صداقت پیشہ حوصلہ مند نوجوان، چھ سات ہزار جرائم پیشہ لوگوں سے ڈر جائیں اور بے غیرتی کے ساتھ اپنے استادوں کو بےعزت ہونے دیں۔

اس وقت جبکہ میں یونیورسٹی کا قلمدان اپنے رفیق کار جناب بہاء الدین صاحب کو دینے جا رہا ہوں، میں اپنے عزیز طالب علموں سے اپیل کروں گا کہ انھیں اور ان کے بعد آنے والے وائس چانسلر کو جان و دل کے ساتھ تعاون، ادب، اور احترام دیں کہ یہی راہ اپنے مقدر کو سنوارنے اور یونیورسٹی کو آگے بڑھانے کی ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے بعض فیصلوں میں غلطیاں ہوئی ہوں گی (میں انسان ہوں، فرشتہ نہیں ہوں؛ اس لئے معلم الملکوت بھی نہیں بن سکتا) میں اپنے غلط فیصلوں کے لئے اپنے پروردگار کے سامنے جوابدہ ہوں۔ لیکن مجھے ایک بات کا بفضلہٖ تعالیٰ اطمینان ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے بغیر کسی آمیزش کے یونیورسٹی اور طلبہ کی بہتری کی نیت سے کیا ہے۔ اس میں میری ذاتی غرض کبھی شامل نہیں ہوئی۔

میں نے اپنی کوتاہ قامتی کے باوجود، علیگڑھ تحریک کے احیا کے لئے قدم اٹھائے ہیں؛ ان کی داستان پھر کبھی دہرائی جائے گی۔ میں نے یونیورسٹی کو دوبارہ "سید والا گہر" کی عدیم المثال روایت پر چلتے ہوئے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کا مرکز بنایا ہے، اور میں خوش ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا کام اپنے اس ناتواں اور حقیر بندے سے لیا۔ میں نے یہ کوشش بھی کی کہ مسلمان، وطن عزیز اور عام انسانیت کی خدمت کے لائق اور اس کے لئے آمادہ ہو جائیں، اور ان کے تعلقات سارے طبقوں خصوصاً ہندوؤں کے ساتھ خوش آیند اور شگفتہ ہو جائیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ یونیورسٹی، دن دونی، رات چوگنی ترقی کرے، اور تم میں سے ہر ایک اپنے خاندان اور اپنی درس گاہ کا نام اپنے کردار اور امتیازات اور اکتسابات سے روشن کرے۔ آمین

# (۲)

# اساتذہ کے نام

۲۶ مارچ ۱۹۸۵ء

وائس چانسلر لاج
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میرے محترم رفیق، سلام و نیاز!

پہلے مجھے شکریہ ادا کر لینے دیجیے اس کشادہ دلی کا جس کے ساتھ آپ نے میری پذیرائی کی، اور اس چشم پوشی کا جو آپ نے میری کوتاہیوں کے لیے روا رکھی۔ میں آپ سے مل بھی نہ سکا، اس انداز سے جیسے ملنے کا حق تھا۔ میری محرومی کہ شیخ جامعہ کو اب وہ فراغت میسر نہیں جو اس زمانہ میں حاصل تھی جب یونیورسٹی میں ڈھائی تین سو استاد ہوتے تھے اور چار پانچ ہزار طالب علم اور ڈیڑھ دو ہزار کے قریب غیر تدریسی اور چوتھے درجے کے اہل کار؛ اور جب کم صبحیں ایسی طلوع ہوتی تھیں جو دماغ سوز، اعصاب آزما، اور زہرہ گداز مسائل کو اپنے ساتھ لائیں اور کم شامیں ایسی ہوتی تھیں جنھیں دن کا غبار گرد آلود کر جاتا۔ یہ سب کچھ بھی گوارا ہوتا مگر الجھن اور تشویش میں ڈال دینے والی جو بات صبر آزما اور سکون ربا ثابت ہو رہی ہے، وہ یونیورسٹی کے دور رس مفاد سے بہت سے لوگوں کی بے تعلقی اور کچھ لوگوں کی اس مفاد کے ساتھ کھلی دشمنی ہے۔ صحت مند جسم ایسے خارجی مادے کو خارج کر دیتا ہے۔ ہم نے ایسے مادہ کو انگیز بلکہ جذب کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ہمارا معاشرہ صالح نہیں رہا؛ اس کے لہو میں فاسد مادہ شامل ہو گیا ہے، جو کبھی کبھی پھوٹ بہتا ہے۔

پچھلے نو برسوں میں مجھے یونیورسٹی کے اساتذہ اور دوسرے ارباب علم سے ملنے کے مواقع ملے اور ہر گفتگو اس فیصلے پر ختم ہوئی کہ یونیورسٹی اساتذہ کے دم سے چلتی ہے اور ان کے ہی سانچے میں ڈھلتی ہے۔ اگر اساتذہ رفعت جو اور پرواز خو ہیں تو معیار اونچا ہوگا، اور اگر وہ ہرزہ خو، تن آسان اور شر پسند ہیں تو معیار گرے گا اور جوتیوں میں دال بٹے گی؛ اور شرکت

کی یہ ہانڈی سر بازار پھوٹے گی۔ کسی معاشرہ اور کسی جماعت کے سب افراد اچھے نہیں ہو سکتے۔ انسانی قماش خیر و شر کے تار و پود سے بنی ہے۔ انسانیت باقی جبھی تک رہتی ہے۔ جب تک خیر شر پر غالب رہتا ہے۔ شر چھا جائے تو انسان اور کائنات فنا ہو جائے۔ لیکن رونا اس صورت حالات پر آتا ہے جب اکثریت خیر کے ساتھ ہو لیکن حکم چلتا ہو شر کا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ شر دلیر ہے، پُرزور ہے، سینہ زور ہے اور خیر بزدل ہے عافیت جو ہے، خوفزدہ ہے اور جبر عزت، عیرت اور اقدار کے لئے برسر آزما ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ خیر کا اصل کردار یہ نہیں ہے، اگر یہی کردار ہوتا تو دنیا قائم کیسے رہتی۔ بدی کی بنیاد پر جو دیوار بنے گی، ٹیڑھی ہو گی ٹھہر نہ پائے گی۔ جیت آخر میں سچائی اور انصاف کی ہی ہوتی ہے۔ جھوٹ اور ناانصافی کا ببلہ پھولتا ہے اور پھوٹ جاتا ہے۔

آپ نے ضرور سوچا ہو گا کہ فرد جماعت کے ربط سے قائم ہے اور جماعت کا فائدہ ہی دراصل فرد کا فائدہ ہے۔ جو افراد ذاتی فائدہ حاصل کرنے کے لئے جماعت کے مفاد کے خلاف جاتے ہیں، بالآخر جماعت کے مجروح ہو جانے کی وجہ سے خود خسارے میں رہتے ہیں۔ جماعت شکن خودغرضی، خودکشی کے سوا کچھ نہیں۔ غور کیجیے ہم نے اس یونیورسٹی میں اجتماعی مفاد کو گھائل کر کے بارہا انفرادی فائدہ کا تعاقب کیا ہے۔ زر لفت کی چمک نے ہم میں سے بعض کی نگاہوں کو اس حد تک خیرہ کر دیا کہ ہم بنیادی ترجیحات کو بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ سکے، نہ ان کی صورت پہچان سکے۔ ہم میں سے بعض تدریس و تحقیق کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر ایسے ملکوں کو سدھار گئے جو نہ ہمارے وقار کی ضمانت دیتے ہیں نہ ہمارے علم کو فروغ دینے کے امکانات فراہم کرتے ہیں۔ سامری کی پرستش نے سرسوتی کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور ہم نے اپنے بدیسی قیام کو معمول اور اجازت سے زیادہ طول دیدیا۔ مجھے بتایا گیا کہ دوسری یونیورسٹیاں بیک وقت اساتذہ کی تعداد کے ۱۰ فیصد سے زیادہ کسی شعبہ سے استادوں کو دوسرے ممالک میں عارضی ملازمت کے لئے جانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ ہم بیک وقت بنا آنکھ جھپکائے ۳۲ فی صد کو باہر جانے کی اجازت دے دیتے، بیک وقت تین سال تک اور مدت ملازمت میں پانچ سال تک۔ لیکن ہم نے اس فیاضی کو جو اسراف کی سرحدوں میں داخل ہو گئی ہے، کافی نہیں سمجھا اور اس پر اپنی مرضی سے،

دیدہ دلیری کے ساتھ اضافے کیے۔ اور جب ان ضمیموں کو تسلیم نہ کیا گیا اور ہم میں سے بعض کو اپنی ملازمتوں کو خیرباد کہنا پڑا، تو ایک طوفان بپا ہو گیا۔ کسی نے یہ نہ کہا کہ یہ سب کچھ یونیورسٹی میں تحقیق و تدریس کی فضا بنائے رکھنے اور طالب علموں کی زندگی بنانے کے لئے ضروری تھا۔ ہمدردی کی تو منفعت جوییوں کے ساتھ کی۔

اساتذہ کی انجمن نے کبھی ایسے گنے چنے اساتذہ کی مذمت نہیں کی جو گنڈے دار کلاس لیتے ہیں، جو لیکچر دینے سے پہلے تیاری نہیں کرتے، یا جو ناانصافی اور جانبداری اور جنبہ داری کرتے ہیں، یا طلبہ کو دوسرے استادوں یا انتظامیہ کے خلاف اکساتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ انجمن نے کبھی طالب علموں کے مفاد کی سرے سے کوئی بات کی ہی نہیں؛ جیسے طلبہ اور اساتذہ کے مفادات کہیں ملتے ہی نہ ہوں؛ جیسے دونوں کا مفاد مشترک نہ ہو۔ ہم غور کریں گے تو اس نتیجہ پر پہنچنا لازمی ہے کہ طالب علموں سے الگ ہو کر استاد خسارے میں ہی رہیں گے۔ طالب علموں کو فروغ نہ ہوگا تو استادوں کی علمی بالیدگی رُک جائے گی۔ ان کے تعلیمی ضمیر کا تخل کھلا جائے گا، ان کے ذہن کی دھار کُند ہو جائے گی، ان کے اخلاقی اقتدار پر نشانِ اشتباہ لگ جائے گا۔

صورتِ حالات کا بڑا ستم یہ ہے، بلکہ اسے انسانی فطرت کا المیہ کہیے کہ انسان چند مثالوں کو پھیلا دیتا ہے، اسے عمل تعمیم کہتے ہیں۔ دو چار، پندرہ بیس ٹیچر اگر غلطی کریں تو اسے بارہ سو پر پھیلا کر دیا جاتا ہے۔ ہمیں عمل تعمیم سے بچنا چاہیے کہ یہ کام انصاف کے خلاف ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم ایسا کرتے چلے آئے ہیں۔ زر نفت کی طلب، کلاسوں میں جستہ جستہ حاضری، نتائج میں ناانصافی، عزیزوں اور چاپلوسوں کی پرورش، طلب علموں کے ساتھ بے التفاتی، ہم سب ان گناہوں کے مرتکب نہیں ہیں لیکن بدگمانی برگد کے پیڑ کی طرح پھیلتی ہے اور سب کو اپنے سایہ میں لے لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم اس خوش عقیدگی اور خیراندیشی سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، جو انسانیت اور شرافت کا منبع ہے۔ بدگمانی نے انھیں اقدار آشام اور اخلاق سوز شک اور ارتقاء دشمن بے حسی میں مبتلا کر دیا ہے۔ استاد کی عزت دل میں نہیں رہی اور اس کا حسنِ نیت اور اخلاص مشکوک ہو گیا تو باقی کیا رہا؟ خود غرضی، ہوس، زر طلبی!

میں نے آپ کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے یونیورسٹی سے کوئی شکایت نہیں ہے،

یہاں میرا ایک لمحہ بھی بے کیف نہیں گزرا اور اساتذہ اور طالب علموں نے مجھے عزت دی، سہارا دیا، بڑھاوا دیا۔ اساتذہ اور طلبا کی اکثریت نے میرا ہاتھ بٹایا، میرے ہاتھوں کو مضبوط کیا اور میری پالیسی کے ان حصوں کی تائید کی جنھیں انھوں نے صحیح سمجھا۔ لیکن ایک شکایت ضرور ہے، ذاتی شکایت نہیں۔ ہمارے رفقا نے (اور ان کی دیکھا دیکھی بعض طالب علموں نے) یہ رخ اختیار کر لیا ہے کہ جو استاد یونیورسٹی کے انتظامی امور میں شامل ہو جائے اس کو وہ حلقہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ جس کسی نے انتظامیہ میں جز وقتی کام کر لیا وہ داغدار ہو گیا، استاد رہا ہی نہیں۔ آپ سوچیے کہ اس روش کا نتیجہ کیا ہو گا؟ استاد انتظامیہ میں آنا پسند ہی نہیں کریں گے۔ پھر یونیورسٹی کا انتظام کیسے چلے گا؟ کیا باہر سے منتظمین اس کے لیے بلائے جائیں گے کہ پرووسٹ، وارڈن، رجسٹرار، کنٹرولر، ڈین اور دوسرے انتظامی اور نیم انتظامی عہدے سنبھالیں؟ اور کیا یہ یونیورسٹی کے حق میں اچھا ہو گا؟ کیا اس طرح استاد اور شاگرد کا فاصلہ بڑھ نہ جائے گا؟ آپ جانتے ہیں کہ حال ہی میں بعض بدبخت اور کوردباطن تشدد آمادہ اور اخراج یافتہ طالب علموں نے اپنے جرائم پیشہ اور ہتھیار بند حلیفوں اور گماشتوں کے ذریعہ بعض ان محترم اساتذہ پر حملے کیے جو یونیورسٹی کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے انتظامیہ میں جز وقتی طور پر شامل ہو گئے تھے۔ ان کی تحقیر اور جراحت پر بہت سے اساتذہ نے احتجاج کیا ہی نہیں اور کچھ نے تو بغلیں بجائیں کرتے گئے تا بالآخر ہوش ٹھکانے لگے۔ لطف یہ کہ جب اسی نوع کا نازیبا حملہ ایک ایسے استاد پر کیا گیا، جن کا انتظامیہ سے کوئی سروکار نہ تھا تو ارشاد ہوا کہ "اب حدود سے تجاوز ہو گیا، اس بیچارے کا کیا قصور تھا"۔ ہمیں اس قسم کی جارحانہ تفریق "منتظم" اور "غیر منتظم" استاد کے درمیان کرنی ہی نہیں چاہیے؛ ورنہ ہمارا شیرازہ تو بکھرے گا ہی، یونیورسٹی چلانی دو بھر ہو جائے گی۔

ان استادوں کا تذکرہ کرنا بے سود ہو گا جنھوں نے طلبہ کو اکسایا، بھڑکایا اور تشدد اور تخریب پر آمادہ کر دیا، جنھوں نے وائس چانسلر کے خلاف عدالت اور ایوان اور کوچہ و بازار میں کنونشن اور مراعات سے تشکیل دشنام اور الزام کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ اساتذہ میں سے کسی ایک نے بھی اس جہل اور گمراہی کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی روایتوں کا ادارہ ہے۔ استادوں کے احترام کی دیرینہ روایت

کی بہتی بہتر بہترہ بختیوں نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ یہ بعینہ ذاتی افراد یونیورسٹی کو برباد کرنے کے درپے ہیں۔ تباہ کاریوں کے باوجود انھیں ہمدردیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا بڑا المیہ ہے۔ جب خود کیمپس میں باخبر رائے عامہ نہیں ملتی، تو اس کے باہر کیا حال ہوگا۔ اساتذہ ذمہ دار ہیں کہ صحت مند رائے عامہ بنائیں۔ اساتذہ کی انجمن کے اندر ل کو مطالبہ سے مواخذہ کی طرف موڑنا ہوگا۔ خود سے بازپرس کرنے میں برکت ہے: غلطی کی بروقت اصلاح ہو جاتی ہے اور بھٹکے ہوئے افراد راہ راست پر واپس آجاتے ہیں۔

آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی کی رفتار میں ہوش ربا تیزی آگئی ہے اور علوم تو بجلی کی طرح تیز گام ہو گئے ہیں۔ ہمیں ان کا ساتھ دینا ہے ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ ہماری یونیورسٹی کو علم کے ہراول دستہ میں اپنی جگہ بنانی ہوگی۔ اس وقت عالم یہ ہے کہ جو ایک پل کے لیے لڑکا، وہ صدیوں پیچھے ہو گیا۔

یونیورسٹی کو دوبارہ ایک تحریک کا مرکز بنانے کے جتن کیے گئے ہیں۔ ناخواندگی کو دور کرنے کی تحریک، جہالت کو مٹانے کی تحریک، روشنی اور عقل کو عام کرنے کی تحریک، علیحدگی کو خیرباد کہنے کی تحریک، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور انسانیت کے لیے خیر سگالی کی تحریک۔ یہ چھوٹے چھوٹے قدم ہیں جو اٹھائے گئے ہیں۔ ہمیں یونیورسٹی میں مقید ہو کر نہیں رہنا ہے۔ اتنی لیاقت بہم پہنچانا ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں ہماری پذیرائی کریں، اور وہاں جو کچھ ہم حاصل کریں، تجربہ، علم اور بصیرت کے خزانے جب ہم واپس لائیں تو اپنی درس گاہ کے قدموں میں ڈال دیں۔ بند پانی میں فساد کی بو آتی ہے۔ ہمیں اپنی درس گاہ کو تکرار اور تعفن سے بچانا ہوگا۔ تازہ ہوا کے دریچے اس پر کھول دیجیے کہ اس کی اور آپ کی صحت کے لیے یہ ضروری ہے۔ خاندان میں ہی شادیاں کرتے رہنا، نسل کی بالیدگی اور تندرستی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ دوسری یونیورسٹیاں بھی اس بیماری سے محفوظ نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں یہ کچھ زیادہ ہی زور پکڑ گئی ہے۔

کسی یونیورسٹی کے مزاج کا اندازہ لگانا ہو تو ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ ان باتوں پر کان دھرے جائیں، جو فرصت کے اوقات میں استاد کیا کرتے ہیں۔ اگر یہ قرب و جوار، ملک و ملت، بر اعظم، دنیا، علوم اور انسانیت کے مسائل ہیں جنھیں موضوع بنایا گیا ہے تو سمجھ لیجیے کہ یونیورسٹی مرا طِ مستقیم

پر چل رہی ہے۔ اور اگر یہاں مسائل کی جگہ شخصیات پر بحثیں چھڑی ہوں اور شخصیات بھی یونیورسٹی سے متعلق اور ان شخصیات کو شر انگیز جستجو اور اختراعاتِ فائقہ سے نوازا جارہا ہو تو فیصلہ کر لیجیے کہ یہاں نہ روشنی کا گزر ہوگا، نہ علم پنپ سکے گا۔ اپنا اور اس یونیورسٹی کا مقدر آپ کے ہاتھ میں ہے آپ چاہیں تو اسے علم کا گہوارہ بنا دیجیے چاہے جہل مرکب اور سازش کا۔

جس طرح طالب علموں کے داخلوں میں ہم نے اول و آخر صلاحیت کو تسلیم کیا ہے، اسی طرح استادوں کے انتخاب میں بھی صلاحیت کو بالادستی دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سلیکشن کمیٹی کی سفارشوں پر بعض اوقات احاطہ میں جو ردِ عمل ہوتا رہا ہے وہ منصفانہ نہیں تھا۔ کاغذ اور صلاحیت میں وہ وہ تفاوت دیکھنے میں آئے کہ بعض اوقات استاد کی قدر و قیمت نگاہوں سے گر گئی۔ اگر صرف استاد پر جانا ہو تو سلیکشن کمیٹی کے تام جھام کی کیا ضرورت تھی۔ انسانوں کے انتخاب کا کوئی معروضی یا میکانکی طریقہ آج تک دریافت نہیں ہوا۔ باخبر اجتماعی صوابدید پر انحصار کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

ہم نے کوشش کی ہے، یونیورسٹی کی زندگی کے ہر شعبہ میں اچھے، ذہین اور لائق لوگ اوپر آئیں اور نالائقوں اور بُردوں کی کردی نہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے۔ اچھے طالب علموں کو منظر عام پر لایا گیا، ان کا حوصلہ ہر عنوان بڑھایا گیا، غیر تدریسی کارگزاریوں کو ہر آن شہ دی گئی کہ ان میں تربیت کے بے شمار پہلو ہیں۔ وہ لڑکے جو "داداؤں" کے ظلم سے سہمے ہوئے تھے، انھیں اعتماد کی وہ انمول دولت پھر سے حاصل ہو گئی جو کبھی ہمارے طالب علموں کی پہچان تھی۔ اسی طرح اساتذہ میں ایسے افراد ڈھونڈھ نکالے گئے جو تحقیق کا رجحان رکھتے تھے اور جو ہمت افزائی کے فقدان کی وجہ سے مرجھائے تھے۔ ان جستجو پیشہ تحقیق پر دازوں نے ہماری یونیورسٹی کا نام اونچا کیا اور علم کی سرحدوں کی بادیہ پیمائی کر ڈالی۔ تحقیق کی اس روایت کو مضبوط کرنا ہے۔

میں نے جا بجا الوداعی تقریروں میں کہا تھا کہ میں یونیورسٹی سے مطمئن اور شاد کام جا رہا ہوں۔ مجھے حسرت صرف دو باتوں کی ہے: کاش مجھے آگ بجھانے میں نہ اُلجھایا جاتا، تاکہ تعمیری کام زیادہ ہو سکتا ۔۔۔ دوسری حسرت زیادہ شدید ہے؛ لبا اوقات میرے دل میں

یہ خیال آیا کہ میری وجہ سے بعض رفیق اساتذہ کو خطرات، تشدد، تحقیر اور دشنام کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پر گرد آلود باختہ، اخراج یافتہ، شقاوت پیشہ طالب علموں اور ان کے بھاڑے کے بدمعاشوں نے سفاکانہ حملے کیے اور میں انھیں نہیں بچا سکا۔ ان دونوں حسرتوں کا داغ میں دل میں لے کر جا رہا ہوں۔

ایک بات اور دہراؤں گا، ہماری یونیورسٹی کے پاس وسائل کی کوئی کمی نہیں۔ حکومت کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں کی جاتی۔ یہاں طالب علموں کی اکثریت نظم کی خوگر ہے۔ سارا اختیار ہمارا ہے کہ اپنے اس بیش بہا ادارہ کو سنواریں، نکھاریں، نوک پلک سے درست کریں اور تعلیم و تربیت و تحقیق میں اسے نشانِ امتیاز تک پہنچا دیں۔ اسے اپنے خوابوں اور اس کے عظیم بانی کے منصوبوں اور بصیرت کے مطابق ڈھالیں۔

اگر ہم نے اس زریں موقع کو ہاتھ سے جانے دیا اور اس بیش بہا سرمایہ کو برباد ہونے دیا تو آنے والی نسلیں ہم پر نفریں کریں گی۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ یونیورسٹی کو وہ اخلاص، دیانت، ایثار اور بصیرت دیجئے جس کی اسے ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ادارہ کو مصئون و محفوظ رکھے اور آپ کو اس کی بے غرض اور بیش بہا خدمت کی توفیق اور مواقع عطا فرمائے۔

●●

## (۳)

# سرپرستوں کے نام

وائس چانسلر

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۶ مارچ ۱۹۸۵ء

محترم سرپرست، سلام مسنون!

یہ سطور خدا حافظ کہنے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ آپ نے ہر قدم پر میری یاوری کی، اظہار سپاس کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ہر نازک موڑ پر میں نے آپ سے رجوع کیا اور آپ نے اپنے شایانِ شان جواب دیا، اس وقت بھی جب افواہوں اور دروغ بافیوں سے فضا کو زہر آلود کر دیا گیا تھا! آخر ایک غریب الدیار کے ساتھ اتنی ہم آہنگی کیسی؟ وجہ ظاہر ہے۔ آپ کا اور میرا مقصد ایک ہی تھا یعنی آپ کے بچوں کو اچھی تعلیم اور تربیت ملے اور ان کا مستقبل درخشاں ہو اور زندگی کے عبوری دور کی یہ مدت رزمگاہِ حیات کے لئے تیاری میں صرف ہو، اس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ لوگوں نے طلبا کو بہکایا اور بھڑکایا۔ گرم خون سوچنے سمجھنے اور اونچ نیچ دیکھنے کی اجازت کب دیتا ہے۔ نوجوان بہکانے میں آگئے۔ وہ بھول گئے کہ تیاری کے دور کو برباد کرنا اپنے امکانات کو ختم کر دینا ہے۔ جس نے ۱۶ سال سے ۲۴ سال کی عمر کے دوران پسینہ نہ بہایا وہ باقی تمام عمر آنسو بہاتا رہے گا، اگر اشکباری نہ کرے گا تو فریب کاری میں لگ جائے گا۔

میں نے گرانبار منصب، یہ سنگلاخ راستہ اس لئے قبول کیا تھا کہ یونیورسٹی کو خود غرضی، طوائف الملوکی، تنگ معیاری اور ہنگامہ پروری کے گرداب سے نکالوں اور تربیت کردار اور رفعت معیار کی منزل مقصود تک پہنچاؤں۔ ان نام نہاد طالب علموں نے میرے خلاف ہنگامہ برپا کیا جن کو سنجیدگی، محنت، راست روی اور تحصیلِ علم ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انھوں نے یونیورسٹی کی روایات، اس کے معیار اور شہرت کو برباد کرنے کا تہیہ کر لیا کہ یہی ایک طریقہ

انھیں آتا تھا اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو دوبارہ حاصل کرنے اور مجھے اکھاڑ پھینکنے کا! وہ طاقت اور ہدایت بعض گمراہ محروم اعتبار استادوں سے حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے معصوم لڑکوں کو تصادم کی آگ میں جھونک دیا اور خود قلعہ بند ہو کر تماشا دیکھنے لگے۔

اخراج یافتہ لڑکوں میں سے جس کسی نے بھی زبان سے یا عمل سے ذرا دیر کے لئے بھی پشیمانی کا ثبوت دیا اس کا اخراج منسوخ کر دیا گیا اور اسے داخلہ اور امتحان کی سہولت مل گئی۔ لیکن جو لوگ گھمنڈ اور تباہ کاری میں پکے ہو چکے تھے اور جن کا مقصد تحصیل علم نہ تھا، استحصال اور قیادت اور سیاست تھا، ان کی شقاوت اور دریدہ دہنی دن بدن بڑھتی گئی اور انھوں نے وہ سب کچھ کر ڈالا جو اگر سید والا گہر زندہ ہوتے تو ان کے کلیجے کو چھلنی کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ ان کی روح باوجود ان اعلیٰ مراتب کے جن سے اللہ تعالیٰ نے فردوس بریں میں انھیں سرفراز کیا ہوگا، انگاروں پر لوٹ رہی ہوگی کہ الٰہی یہ تربیت کدہ، یہ تعلیم کا مرکز، یہ خوابوں اور تمناؤں کا محور، کیا اسی دن کے لئے بنایا گیا تھا!

اسلام کے نظام عقوبت پر نئی روشنی والے آئے دن اعتراض کرتے ہیں کہ شریعت میں سزائیں سخت رکھی گئی ہیں، وحشیانہ ہیں! وہ نہیں جانتے کہ سزا کا خوف راست روی کے ذوق سے کہیں زیادہ عام انسانوں کو برائی سے روکتا ہے۔ امریکہ کی نئی نسل تباہ اس لئے ہو رہی ہے کہ وہاں ایک عرصہ تک نوجوانوں کو سنگین جرائم کے لئے بھی سزا سے محفوظ رکھا گیا۔ ایک جائزے کے مطابق وہاں سنگین جرائم ۵۰ فی صد سے زیادہ ان نوجوانوں سے سرزد ہوتے ہیں جن کی عمر ۱۲ اور ۲۲ کے درمیان ہے! جرم کرنے میں طاقت کا احساس ہوتا ہے، جس میں نادانی افتخار کو شامل کر دیتی ہے۔ یہ روکے نہ گھر میں کسی کی سنتے ہیں، نہ باہر۔ سرزنش کے بغیر بچوں اور نوجوانوں کی اصلاح ناممکن ہے۔ عجیب بات ہے کہ جب تخریب کار، تشدد پیشہ، دشنام شعار اور بہتان تراش لڑکوں کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاتی ہے تو ملت اسلامیہ کے کچھ ہمدرد اور اس کے صحافی چلا اٹھتے ہیں کہ بچوں پر بڑا ظلم ہو گیا۔ یہ عمر ہنسنے، کھیلنے، شرارتیں کرنے کی ہے۔ اس وائس چانسلر کے سر میں کیا خناس ہے کہ معصوم شرارتوں پر سزا دیتا ہے، لڑکوں کا مستقبل بگاڑ دیتا ہے۔ وہ بنانے کے لئے مقرر ہوا ہے کہ بگاڑنے کے لئے! ایک شور مچ جاتا ہے۔ یہ نادان دوست یہ نہیں سمجھتے کہ وہ

شریعت کے اصول جزا و سزا سے صریح اور پُرخطر انحراف کر رہے ہیں اور ان اخراج شدہ طالب علموں کو برائی پر راسخ کر رہے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ایک پلڑے میں کوئی ۱۶ ہزار طالب علم اور ان کا قیمتی سال اور سارا کیریر ہے اور ترازو کے دوسرے پلے میں ۸۔۱۰ تخریب کار ہیں۔ جنہوں نے یونیورسٹی کی ہر صالح روایت کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے اور استادوں کی تواضع جوتوں، گالیوں، دھمکیوں اور دھکوں، لاٹھیوں اور آتشزنی سے کی ہے۔ فیصلہ کریجیے ۱۶ ہزار سنجیدہ اور بھلے لڑکوں کی آپ فکر کریں گے کہ آدھی درجن اخلاق باختہ اراذل کی۔ اگر مسلمانوں کے پاس باخبر رائے عامہ ہوتی تو ہر شخص ایک آواز ہو کر ان رہزنوں اور ان کے ہدایت کاروں کی مذمت کرتا۔ میں نے ایک مضمون موقر جریدہ "دعوت" کے لئے لکھا تھا جس میں اپنا کلیجا نکال کر رکھ دیا تھا۔ یہ "دعوت" کے ایک بے بنیاد اداریہ کے جواب میں تھا۔ قاصد سے بار بار کہا گیا کہ وائس چانسلر کا مضمون ضرور چھپے گا، بلکہ اس کے لئے ایک خصوصی شمارہ نکالا جائے گا۔ مہینوں تک وعدہ ہوتے رہے اور بالآخر پتہ چلا کہ وہ مضمون کھو گیا ہے: ع

گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

میں انتہائی ادب سے کہوں گا کہ یہاں ایک ایسے اخبار نے جس کی عزت کرتا ہوں صحافتی ذمہ داری اور امانتی روایت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ الزام لگایا ہے تو ملزم کو صفائی پیش کرنے کا موقع بھی دیجیے۔ یک طرفہ کاروائی کسی منصف مزاج کو زیب نہیں دیتی۔ مجھے شاید ہی اپنی کسی چیز کے کھونے کا اتنا افسوس ہوا ہو جتنا اس مضمون کے گم ہو جانے کا۔ اس میں نہ جانے کتنے امور کی وضاحت تھی، جو میں نے کرب کے عالم میں قلم برداشتہ قلمبند کی تھی۔ اب میں وہ مضمون کبھی نہ لکھ سکوں گا اور کفِ افسوس ملتا رہوں گا۔ ایک بات جو اس مضمون میں لکھی تھی اس کا ذکر کرتا چلوں۔

میں نے اس مضمون میں کہا تھا کہ میں نے اپنے طالب علموں کو ماں کی محبت نہیں دی ہے باپ کی محبت دی ہے۔ باپ کی محبت زبان پر نہیں آتی؛ وہ اظہار کا تحمل نہیں کرتی، وہ دُور اندیش اور سخت گیر اور تربیت پیکر ہوتی ہے۔ وہ اولاد کے لئے سارے ساز و سامان تعلیم و تربیت اور تشکیل شخصیت کے فراہم کرتا ہے، لیکن نگاہ کڑی رکھتا ہے۔ اچھائیوں اور کامیابیوں پر پیٹھ ٹھونکتا ہے؛ لیکن گمراہیوں، بداعمالیوں، غفلتوں، سرکشیوں پر سزا دیتا ہے۔ باپ کی کڑی نگاہ اگر نہ ہو تو ماں کی اُمنڈتی ہوئی محبت بچوں کو بگاڑ دے۔ وہ یا تو گمراہ ہو جائیں، یا نرم پڑ جائیں۔

مزاج چوکھا بن جائیں، چھوئی موئی ہو جائیں۔ ان میں زندگی سے نبرد آزمائی اور زمانہ کے مقابلہ کی طاقت نہ رہے اور وہ اس احساس تناسب سے محروم ہو بیٹھیں، جو دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنے اور ان کو برتنے کے آداب سکھاتا ہے۔

اخباروں اور تقریروں میں یونیورسٹی کے نوجوان طالب علموں کو بار بار بچے کہا گیا ہے۔ ان کو بچے کہنا ان کی توہین کرنا ہے اور اس اعتماد سے انھیں محروم کر دینا ہے جو جوانی جسے اپنے ساتھ لاتی ہے اور جو کردار کو مضبوط کرتا ہے اور حوصلہ کو مہمیز لگاتا ہے۔ نوجوانوں کو شیر خوار سمجھنا وقت کا رخ پیچھے کی طرف موڑ دینا ہے۔ یہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے حال اور مستقبل سے روگردانی کی ہے اور ماضی میں بسیرا لیا ہے۔ نوجوان اپنے اعمال اور افعال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسے بچے کہیے اور امریکن نوخیزوں کی طرح اسے تعزیر اور سزا کے قانون سے بری کر دیجیے، انجام ظاہر ہے۔ یونیورسٹی کے احاطہ میں ان "بچوں" نے وہ سب کچھ کر دکھایا، امریکی نوجوان جس کے لئے بدنام ہیں۔ جو قوم سُست عنان ہو جاتی ہے اس کی پیڑھیاں ایسی ہی اٹھتی ہیں۔ زندگی میں ضرورت ہے ریاضت کی، جانفشانی کی، کمر کس کر میدان میں اترنے کی، حیات کے اکھاڑہ میں خم ٹھونک کر آنے کی۔ ادب اور لحاظ اور نظم و ضبط کی۔ وہ کوئی جوان میں جوان نہیں جن کی ریڑھ کی ہڈی ذرا میں لچک جاتی ہو، جو لجلجے اور تنگ حوصلہ ہوں، جن کی شجاعت کا معیار صرف یہ ہو کر مجرموں کو کرایہ پر لے آئیں اور استادوں اور طالب علموں کو ان کے حوالے کر دیں! جن کی بہادری کا میدان ان کی زبان ہے! بڑھ بڑھ کر کھوکھلے دعوے اور شعلہ افشاں تقریریں! ان سے جب چاہے کرا لیجیے۔ کوئی معقول بات، کوئی چھوٹا سا کام، کوئی غور و فکر، کوئی سوجھ بوجھ ان کے بس کی بات نہیں۔ دعوے کیے اور بارہا کیے کہ ہم حکومت کا تختہ الٹ دیں گے، ہم کانگریسی مسلمان امیدواروں کو انتخاب میں شکست فاش دلائیں گے۔ دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے اور اپنا سا منھ لے کر یہ سورما میدان جنگ سے کان پکڑ کر بھاگ گئے۔ ان کی ساری بہادری اپنے استادوں اور یونیورسٹی انتظام کے خلاف امکان سے وجود میں آتی ہے؛ ضلع کی انتظامیہ کے آگے جا کر یہ سجدہ کرتے ہیں تاکہ ان کو کیمپس میں تہدید و تشدد کے مواقع فراہم رہیں، شاہ کو دعا دیتے رہیں، وظیفہ خوار جو ٹھہرے! کتنے کھوکھلے، کیسے بے پیر ہیں یہ لوگ جو استادوں کو گالیاں دیتے

ہیں، مارتے پیٹتے ہیں اور اقتدار کے آستانہ پر ماتھا رگڑتے ہیں۔ یہ ننگِ ادارہ اسلحے سے ڈرتے ہیں اور ڈراتے ہیں، یہ ننگِ اسلاف یونیورسٹی اور ملتِ اسلامیہ کی عزت اور ساکھ کو مٹی میں ملانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے دور میں کیا کیا اور کیا نہ کرسکا، اس کا فیصلہ وقت اور تاریخ پر چھوڑنا پڑے گا۔ البتہ ہندوستان اب یہ مانتا ہے کہ علی گڑھ میں نظم و ضبط اور تعلیم کی فضا بحال ہوگئی، داخلہ اور پڑھائی اور کھیل کے معیار اونچے ہوگئے۔ اقامت گاہیں طالع آزماؤں اور خنجر آزماؤں سے خالی کردی گئیں۔ رہائشی ہالوں کی زندگی میں کشادگی، ستھرائی اور باقاعدگی آگئی۔ وہ روایتی تقاریب اور جلسے جو زیرِ زمیں چلے گئے تھے، اس طرح ابھرے جیسے موسمِ بہار آگیا ہو۔ طالب علموں نے پھر کمرِ ہمت مقابلہ کے لئے باندھ لی اور اس کے نتائج نکلنا شروع بھی ہوگئے۔ یونیورسٹی نے فکر و نظر کے دریچے کھول دیے، اور ہندوستان کے ہر گوشے سے اس میں تازہ ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ علیحدگی پسندی کو ٹھیس لگی، اور ہمکاری اور تعاون اور ہم آہنگی کو بڑھاوا ملا۔ حاضری، امتحان، تعلیمی سال، طاقِ نسیاں سے اُتر کر مسندِ حقیقت پر بیٹھ گئے۔ اساتذہ کے تقرر میں بعایت انصاف برتا گیا، کوئی سفارش اور کوئی دباؤ قبول نہیں کیا گیا اور اس طرح بہت سے جوہرِ قابل ہاتھ آگئے جو عام حالات میں نامراد واپس جاتے۔

شعبوں کی توسیع ہوئی، نئے نئے شعبے کھلے۔ زراعت میں ایم۔ ایس۔ سی کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اب زراعتی انسٹی ٹیوٹ کھولنے کی تیاری بھی ہو رہی ہے۔ اسکول آف نرسنگ کو کھلے اب تین سال ہوگئے۔ کیمیکل اور پٹرولیم انجینرنگ کا انسٹی ٹیوٹ کھلا۔ کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ نصاب کے دو نئے کورس کھولے گئے۔ بایو ٹیکنولوجی کا ایک کثیر العلوم کورس کھولا گیا جو ہمیں جدید علم کی سرحد تک لے جاتا ہے۔ الکٹرونکس اور کمپیوٹر کی فیکلٹی کو اکیڈمک کونسل نے منظوری دیدی۔ میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے داخلے ابھی تک ۵۰ تھے، اب امید کی جاتی ہے کہ سو (۱۰۰) ہو جائیں گے۔

ایک عرصۂ دراز کے بعد اقامت گاہوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ۵۰۰ طالب علموں کے لئے ہوسٹل ریکارڈ وقت میں بنا۔ اس میں ۷۰۰ طالب علم بہ آسانی رہ سکیں۔ ویمنس کالج میں دو سو (۲۰۰) طالبات کے لئے ہوسٹل کی تجویز منظور ہوئی اور اس کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین ہال میں سو مزید طالب علموں کے لئے تعمیر ہوئی۔ محسن الملک ہال کی گنجائش میں ترمیم کے ذریعہ ۶۰ کا اضافہ

ہوا۔ مختصر یہ کہ گزشتہ تین سال کے دوران ہوسٹلوں میں تقریباً ۱۲۰۰ مزید طلبہ کے قیام کا انتظام کیا گیا۔ میڈیکل کالج اسپتال میں ایک اور عمارت تعمیر ہوئی جس میں ڈیڑھ سو مریضوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہوگا۔

آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ علیگڑھ تحریک کا اس دور میں احیا ہوا ہے۔ تین سال ہوئے سرسید کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" پھر جاری کیا گیا۔ ابھی ۲۰ دن ہوئے اس رسالہ کے ہندی روپ کا اجرا "نشانت" (निशान्त) کے نام سے نائب صدر جمہوریہ ہند نے کیا۔ یہ رسالہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہم آشتی اور ہم آہنگی کی فضا پیدا کرے گا۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی میں بھی دوبارہ روح پھونکی گئی ہے۔ شیخ جامعہ نے کوشش کی ہے کہ وہ بدعت ختم ہو کہ سرسید کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد ہر وہ کام کیا جائے جو ان کے مزاج، روش اور مسلک کے خلاف ہو۔ سرسید کی عظمت اور ان کے بنیادی پیغام سے ملک کو از سر نو روشناس کرانے کی طرف قدم اٹھائے گئے۔ طالب علموں کو تیار کیا گیا کہ ضرورت سوجھ بوجھ، پھٹک اور پرکھ کی ہے۔ جذبات کے دلدل میں لوٹتے رہنے سے انسان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ مسائل شتر مرغ کی طرح ماضی کی ریت میں سر چھپانے سے حل نہیں ہوتے، بلکہ ہر آن بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے سے قابو میں آتے ہیں۔

اسلامی دارالعلوم، جامعات اور مدرسوں سے علی گڑھ کا رابطہ استوار کیا گیا۔ مدارس کی اسناد کو یونیورسٹی میں داخلے کے لئے تسلیم کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے ایک مجلس تسادی (EQUIVALENCE COMMITTEE) قائم کی گئی جو نصاب میں چھان بین کرنے کے بعد سفارش کرتی ہے۔ ناخواندگی دور کرنے کی مہم چلائی گئی۔ علاوہ بریں ہندوستانی مسلمانوں کی صورت حال اور ان کے مسائل پر جائزہ اور تجزیہ کے انداز سے غور و خوض شروع ہوا۔ سوشل سائنسز (سماجی علوم) کی فیکلٹی میں ایک اکائی ایسے جائزوں کے لئے قائم کی گئی۔ علاوہ بریں ان اسکولوں اور کالجوں کی ضروریات اور کمیوں کو دریافت اور ان کا تشرح کرنے کے لئے، جنھیں مسلمان چلا رہے ہیں، سروے کا کام شروع کیا گیا۔ یہی نہیں، اس منصوبے کے تحت ریاضی اور سائنس کے استادوں کو اپ ڈیٹ کیا جائے گا۔

ایک اور اہم توسیعی کام جو یونیورسٹی نے علیگڑھ تحریک کے تحت شروع کیا ہے، وہ ہے

اہل حرفہ کی صورتِ حال کا جائزہ اور ان کی مالی، تعلیمی اور تکنیکی مدد۔ علی گڑھ، مراد آباد، میرٹھ، خورجہ اور فیروز آباد میں اس کام کی ابتدا ہو گئی ہے۔ اس کے نتائج بھی انشاء اللہ دور رس ہوں گے۔

اس طرح ایک طرف یونیورسٹی کے معیار کو اٹھایا اور اس کی شبیہہ کو چمکایا گیا، دوسری طرف اسے اندوری ٹاور سے نکال کر زندگی کے زیر و بم سے آشنا کیا گیا اور خدمت خلق اور اصلاح ملت اور حب وطن کے لئے اسے کمربستہ کیا گیا۔

آپ غور فرمائیں ہم نے جس سمت میں قدم اٹھائے اقلیتی کردار کی طرف وہ لے جائیں گے یا وہ بدکلامیاں، الزام تراشیاں، دشنام طرازیاں، غیر ذمہ داریاں اور بداطواریاں جن کے مظاہرے آئے دن یہ نام نہاد فرزندان و ہمدردانِ علیگڑھ اور مدعیانِ اسلام کر رہے ہیں؟ سر سید علیہ الرحمۃ سر بگریباں ہوں گے کہ یہ لوگ کیسے فاتر العقل ہیں کہ انھوں نے اقلیتی کردار کی بازیابی کے لئے جان کی بازی لگا دی، بغیر یہ جانے کہ اقلیتی کردار ہے کیا! جو بات اپنے بس کی ہو اسے دوسروں سے کیا مانگیں۔ ہمیں اقلیتی کردار کے نام سے کیا ملا؟ ایکٹ میں ایک ایسی ترمیم، جو اپنے اندر یونیورسٹی کو شکست گام کرنے اور پیچھے کی طرف لے جانے کی ساری صلاحیت رکھتی ہے۔ ۱۸۰ افراد پر مشتمل ایک کورٹ جس میں بھلے برے، قابل، نالائق، عالم، جاہل، صلح جو، جھگڑالو، شائستہ، بدزبان، وسیع القلب، تنگ نظر، ہر طرح کے افراد جمع ہیں! جو لوگ نالائق ہیں اور برے ہیں وہ ہر جگہ اچھوں کو دبا کر انجمن پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ میں نے یونیورسٹی کورٹ کے چار جلسوں میں شرکت کی۔ پہلی بار ۱۹۶۵ء میں جب اس وقت کے وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا؛ اور جو پتھر اراکین پر برسائے گئے ان کا کوئی شمار نہیں پھر ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء میں جب گلے پھاڑے گئے، دانت پیسے گئے، ڈرایا گیا، شور مچایا گیا۔ دو سال کے اس عرصہ میں ایک بات بھی ہماری انجمن اعلیٰ نے ایسی نہیں کی جسے اقلیتی کردار سے تعبیر کر سکتے ہیں، یا اقلیتی کردار کی تشکیل یا یونیورسٹی کی پیش رفت میں معاون سمجھ سکتے ہیں اور قانون کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ بادی النظر میں کورٹ کے اراکین یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انھیں یونیورسٹی میں سیاہ و سفید کا پورا اختیار ہے۔ وائس چانسلر اور یونیورسٹی کی دوسری اختیاریہ (AUTHORITY) کے ہر فیصلہ کو وہ الٹ سکتے ہیں، اس پر نظر ثانی کر سکتے ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس طرح

کوئی ادارہ کبھی چلا ہے! کہرام مچ جائے گا! سیلاب آجائے گا! یونیورسٹی باڑھ کی زد پر ہے!! اگر یونیورسٹی کو چلنا ہے تو کورٹ کو اپنے وقار کو برقرار رکھنا ہوگا۔ کورٹ کی حیثیت نگراں، منصوبہ ساز اور راہنما کی ہے۔ وہ اگر روزمرہ میں اُلجھ گیا تو اپنے مقام سے اُتر آئے گا، اور آستین چڑھا کر ہر کس و ناکس کو دعوتِ مبارزت دے گا۔ حاشا کہ کورٹ کا یہ منصب نہیں، یہ مقام نہیں کورٹ، ملک وملت کی نمائندگی کرتا ہے اس سے امید کی جاتی تھی کہ یونیورسٹی کی توسیع و پیش رفت کی طرف دھیان دے گا۔ اس کے خاکے میں اپنے تخلیقی کردار کے آب و رنگ بھرے گا۔ یونیورسٹی کو آگے بڑھائیگا۔ آڑے وقت میں اس کے کام آئے گا۔ ترجمانی کرے گا، رہنمائی کا دم بھرے گا۔ انتظامیہ کو راہ دکھائیگا اس کا حوصلہ بڑھائے گا مداخلت نہیں کریگا، معاونت کریگا۔ حکم نہیں دے گا، ہدایت کریگا۔ ٹانگ نہیں کھینچے گا پیٹھ پر ہاتھ رکھے گا۔ واحسرتا کہ اس نے وہ سب کر ڈالا جو اُسے نہ کرنا چاہیے تھا۔ گذشتہ ماہ مجھے رُڑکی یونیورسٹی سینٹ (SENATE) میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا۔ میں دوسرے کام چھوڑ کر جان کر گیا کہ دیکھیں اس کے اجلاس ہمارے کورٹ کی طرح پُرخروش، ہنگامہ پرداز اور جارحانہ ہیں یا، دل پر چوٹ سی لگی جب اسے اس کے برعکس پایا۔ ساری روداد انتہائی شائستگی کے ساتھ پایۂ اختتام کو پہنچی۔ الٰہی غم اُٹھانے اور پچھاڑ کھانے کے لئے ہم ہی چُنے گئے ہیں! برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!!

ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ یو۔ جی۔ سی کمیٹی نے سینٹ اور کورٹ کو ختم کرنے کی سفارش کی ہے۔ اگر ہمارے کورٹ کا کردار منفی رہا، تو پھر اس کی بقا کی ضمانت کون کرے گا؟ کورٹ ہماری مخصوص صورتِ حالات کی وجہ سے ہمارے لئے ضروری ہے۔ لیکن اگر یہ راہِ راست پر نہ آیا تو یونیورسٹی کو زبردست نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس ایکٹ میں اور بھی کئی دفعات ایسی ہیں جو یونیورسٹی کے مفاد کے خلاف ہیں۔ ان کے تذکرے کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں۔

میں ان الوداعی اور تشریحی کلمات کے بعد آپ سے اجازت لوں گا۔ احساس اخلاق اور اس امید کے ساتھ کہ آپکی باخبر تائید ہمیشہ یونیورسٹی کی شریکِ حال رہے گی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ آپ کی مدد اور ہمدردی اس کو سیلابِ بلا سے بچا سکتی ہے۔ اسے ترقی کے راستہ پر گامزن کر سکتی ہے۔ کھُلے بندے اور دوست نُما دشمنوں سے اس کی حفاظت کر سکتی ہے جو اپنی چھریاں تیز کر رہے ہیں کہ سید جلد ہٹے اور اس ادارے کا گلا کاٹ دیں۔ بیگانے شہ دے رہے ہیں اور حظ اندوز ہو رہے ہیں! اللہ تعالیٰ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے!!

الوداع

# خدابخش تصوّف مخطوطات سیمنار

## علی گڑھ سیشن کا خطبۂ افتتاحیہ

خواتین وحضرات ــــــ مجھ سے تصوّف اور مخطوطات کے متعلق کچھ عرض کرنے کے لئے کہا گیا، تو مجھے سعدیؒ کا ایک قطعہ یاد آیا: ؎

آن شنیدی کہ صوفئ میکوفت  زیر نعلین خویش میخی چند
آستینش گرفت سرہنگی  کہ بیا نعل بر ستورم بند

میرے خیال میں ہمارے اس جلسے میں جو حضرات شریک ہیں ان کے لئے اس کے ترجمے کی کوئی ضرورت نہیں، اور اگر میں اس کا ترجمہ اردو میں کردوں گا، تو عرب ممالک سے جو حضرات آئے ہوئے ہیں، وہ نہ سمجھ سکیں گے۔ میں انگریزی میں اس کا ترجمہ کیے دیتا ہوں:

Sa'di has said (Sa'di, the great Persian poet) that a Sufi (here he means a poor man) was putting some nails in the sole of his shoes. A soldier going that side drove him by his collar and said: Come and fix horseshoe of my horse.

So, I do not claim to be a Sufi, but a ghair-Sufi has been caught by the Sarhangs that were surrounding him and they harassed him to say something about Tasawwuf.

میں آگے بڑھنے سے پہلے اس کو اپنا خوشگوار فرض تصور کرتا ہوں کہ آپ سب خواتین و حضرات کی پذیرائی کروں، خصوصاً ان خواتین و حضرات کی، جو بیرونی ممالک سے یہاں تشریف لائے ہیں اور انھوں نے ہماری عزت افزائی فرمائی ہے، اور معذرت کروں اس تکلیف کے لیے جس سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔

میں سُنا کرتا تھا، بلکہ کہا بھی کرتا ہوں، مجھے ہندوستان کے مختلف گوشوں میں جانے کا موقع ملتا ہے اور تعلیم کے سلسلے میں مسلمانوں سے بالخصوص خطاب کرنے کا، تو میں نے ان سے بارہا کہا ہے اور اتنی بار کہا ہے کہ یہ جملے نوکِ زبان ہو گئے ہیں کہ ——— ہم کبھی علم کے قافلے کے کارواں سالار تھے اور اب ہم گردِ کارواں بن گئے ہیں، تو علم کے قافلے کا استعمال میں ایک مبہم طریقے سے کیا کرتا تھا۔ اب اس ابہام میں صراحت پیدا ہو گئی، کیونکہ یہ علم کا قافلہ ہے جو پٹنہ سے چلا، علی گڑھ آیا، علی گڑھ سے دلی جائے گا۔ یعنی علم کا یہ سلسلہ متحرک ہو گیا ہے۔ اس کو بھی ایک عنوان سے کاروانِ علم کہہ سکتے ہیں۔ علم، سکوت کے منافی ہے؛ سکون کے بھی منافی ہے۔ علم تقاضا کرتا ہے حرکت کا اور یہ سلسلہ جو سیمینار کا شروع ہوا ہے، حرکت پر مبنی ہے۔

مخطوطات کے متعلق جیسا کہ فرمایا گیا، ہمارا رویہ اکثر "مار بر سر گنج" کا سا رہا ہے۔ ایک روایت ہے کہ خزانے پر سانپ بیٹھ جاتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی ہماری خوش فہمی ہے؛ ہم اتنی بھی حفاظت نہ کر سکے جتنی کہ سانپ خزانے کی کرتا ہے۔ ہمارے بہت سے ذخائر، بہت سے خزائن مخطوطات کے تلف ہو چکے اور یہ قدم، دراصل اس کی بڑی افادیت یہ ہے کہ جو مخطوطات ہمارے پاس محفوظ ہیں وہ مندرج ہو جائیں، قلم بند ہو جائیں اور اس کے بعد اہلِ تحقیق اور اہلِ علم ان سے استفادہ کر سکیں۔ سب سے بڑی اہمیت اس سلسلۂ سیمنار کی یہی ہے۔ تصوف کے سلسلے میں ایک کام جو بہت ضروری نظر آتا ہے وہ غالباً یہ ہے کہ ہم کسی طرح ان کیفیات کی ترجمانی بھی کر سکیں، تصوف جن کا حامل ہے (کیونکہ اگر ہم نے چھاننا شروع کیا تو کیفیات ایسی چیزیں نہیں ہیں جو چھلنی میں رہ جائیں)، اور ان کیفیات کے جو رمز شناس ہیں، ان سے رجوع کرنا اور ان سے استفادہ کرنا، اور یہ آسان کام نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ لوگ پہلے تو طلب کی آزمائش کرتے ہیں اور ایسے لوگ اب کم رہ گئے ہیں۔ مگر جو حضرات رہ گئے ہیں، وہ مغتنم ہیں، اور ان سے کیفیات کی پہلی سطح پر، اور اصطلاحات کی دوسری سطح پر ہمیں تشریح لینی ہوگی، اور اس تشریح کو زبانِ قلم سے جس حد تک محفوظ کیا جا سکتا ہے وہ محفوظ کرنا ہوگا۔ لیکن یہ قدم بعد میں اُٹھایا جائے گا۔

اس وقت تو جو کام درپیش ہے وہ خود اتنا اہم ہے کہ وہ وقت کا طالب ہے، توجہ کا طالب ہے۔ کاوش کا، جد و جہد کا، اور انتھک محنت کا طالب ہے۔ ہم نے بالعموم "من حیث القوم" فی زمانہ ریاضت سے جی چرایا ہے، لیکن تحقیق کا کام سرسری نگاہ کو کبھی گوارا نہیں کرتا۔ اس میں تو لگن درکار ہے، عرق ریزی درکار ہے۔ اور میری اپیل آپ سب اہل علم حضرات سے یہی ہے کہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک اس انداز سے پہنچائیں، جو اس مضمون کا حق ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں، تصوّف ظاہر سے باطن، ہیئت سے معنی، جسم سے روح کی طرف سفر کرنا ہے، تو وہ اجسام اور وہ قالب جو ہم تیار کریں، ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ روح سے، معنی سے، باطن سے محروم نہ رہے۔

مخطوطات کے متعلق ایک بات میرے ذہن میں آئی، وہ میں پیش کیے دیتا ہوں، وہ یہ کہ مخطوطات کی حیثیت، میری دانست میں دانے میں بیج کی سی ہے۔ کلام مجید میں آپ نے اکثر ذکر سنا ہوگا، جزائے اعمال کے سلسلے میں، کہ ایک دانہ سے نہ معلوم کتنی بالیاں نکلتی ہیں۔ "سنابل" کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے لئے! تو، مخطوطہ بھی دراصل ایک دانہ ہے، اور جب وہ طبع ہو جاتا ہے تو ہزاروں گنا بڑھ جاتا ہے۔ عمل صالح کی طرح مخطوطہ بھی اس کا طالب ہے کہ اس کی طباعت ہو، اس کی اشاعت ہو، وہ ایک بیج ہے اور فصل آپ جبھی کاٹیں گے، جب آپ کتابوں کی شکل میں اسے عام کردیں گے، منتشر کردیں گے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق جیسا کہ ہمارے معزز مہمانوں نے فرمایا، وہ اس سے واقف ہیں، اس سے وابستگی رکھتے ہیں اور کوئی تعارف یونیورسٹی کا کرانا، ان کے سامنے، میرے خیال میں ان کی وابستگی اور ان کی معلومات کی توہین ہوگی۔ تاہم دو ایک باتوں کا ذکر میں ضرور کروں گا۔

علی گڑھ یونیورسٹی کو ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ وہ کردار ملا، جس کو مختلف انداز سے اقلیتی کردار، تاریخی کردار، روایتی کردار کہتے ہیں۔ اقلیتی کردار کا حق ادا کرنے کے لئے یونیورسٹی کو کوشش کرنی ہوگی کہ مشرقی علوم میں یہ ایک ایسا مرکز بن جائے جس سے دنیا کے سارے اہل علم رجوع کریں اور شاید یہی نقطۂ آغاز بن جائے۔ ہمارے یہاں، جیسا کہ آپ کو علم ہے، ایک اسلامی درسیات کا شعبہ ہے، ویسٹ ایشین اسٹڈیز کا ایک مرکز ہے؛ اس کے علاوہ ہمارے یہاں دینیات کے شعبے ہیں، سنی دینیات، شیعہ دینیات، اور ہمارے یہاں تاریخ کا شعبہ ہے جو قرون وسطیٰ پر غالباً دنیا

-

میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ ہمارے یہاں ہندی اور سنسکرت کے شعبے بھی ہیں۔ ہمارے پاس سارے وسائل، سارے ذخائر ہیں کہ ہم اسلامیات پر اور مشرقیات پر ایسا کام کر سکیں جو سارے عالم میں ممتاز ہو۔ اور میں اپنے رفقا سے اپیل کروں گا، جو میں نے پہلے بھی کی ہے کہ اس کام کو وہ اپنے ذمّہ لے لیں۔ ہمارے پاس وسائل کی کوئی کمی نہیں، اور کوئی علمی مہم، کوئی تحقیقی مہم جو ہمارے ذہن کے احاطے میں آ سکتی ہے اس کی مالی امداد پہلے ہی سے فرض کی جا سکتی ہے۔ اس میں نہ تو یو۔جی۔سی کو کبھی تامل ہوگا اور نہ وزارت کو، اور ان امور میں کسی قسم کی مداخلت کسی حلقہ سے آج تک نہیں ہوئی ہے۔ سارے وسائل فراہم ہیں، آگے بڑھنے کی دیر ہے، قدم سے قدم ملا کر اور سر جوڑ کر اگر آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو جائیں، تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ ہم پیچھے مڑ کر نہیں دیکھیں گے۔

اس یونیورسٹی نے ابھی چند ماہ سے ایک کام اپنے ذمہ لیا ہے کہ اہل حرفہ کی ترقی، پیشرفت اور خوشحالی کے لیے کوشش کرے۔ پہلے تو سات اضلاع میں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یعنی علی گڑھ، مرادآباد، میرٹھ، فیروزآباد، خورجہ، مئو، بنارس جہاں اہل حرفہ کی بڑی آبادی ہے۔ اور، اہل حرفہ کا شعار یہ ہے، اور وہ یہ کرتے ہیں کہ جب ہمارا بچہ ہمارا کام کرکے ہر دفتر میں کام کرنے والے سے زیادہ کما سکتا ہے تو کیا ضرورت ہے کہ ہم اس کو تعلیم دلائیں۔ ان حضرت کے ذہن سے اس خیال کو دور کرنا ہے تو جوئے شیر لانا، لیکن جوئے شیر کی جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ باتیں سُن رہے ہیں۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اس جائزے میں، اس سروے میں، لگے ہوئے ہیں اور اُن کے نتائج بھی برآمد ہونے لگے ہیں۔ نتائج برآمد ہونے سے میری مراد یہ ہے کہ بیداری کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ ہم نے انتظام کیا ہے کہ ان کاریگروں کو، ان اہل حرفہ کو، جن کے پاس وسائل نہیں ہیں ان کو بینکوں کے ذریعہ روپیہ دلایا جائے۔ اور، بینکوں نے ہمارے سروے کو، ہماری رپورٹ کو، تسلیم کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یونیورسٹی جس کے بارے میں یہ کہہ دے گی کہ یہ آدمی اس لائق ہے کہ اس کو مشینیں دی جائیں ہم اس کو دلا دیں گے۔ چنانچہ علی گڑھ میں ایسا ہوا ہے، میرٹھ اور مرادآباد وغیرہ میں بھی ہم یہ کریں گے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی ان کی صحت، ان کی تعلیم کا بندوبست بھی حکومت کے تعاون کے ساتھ کرے گی۔

میں نے ذکر کیا تھا یونیورسٹی کے کردار کا۔ یونیورسٹی کے کردار کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کا رشتہ اس کے عظیم بانی کی پالیسی، ان کی حکمت عملی کے ساتھ جوڑ دیا جائے، اور علی گڑھ تحریک کا احیا اسی

عنوان ممکن ہے!

دوسرا اہم جو کیا گیا وہ ہے مسلم اسکول اور کالجوں کا ایک سروے، جو اس وقت ہو رہا ہے اور ان کے لئے وہ تربیتی کلاس جو ریاضی اور سائنس کے استادوں کے لئے منعقد کیے جا رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان مضامین میں جہاں کچھ زیادہ کمزوری محسوس کی گئی، ہم ان اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کو جدید ترین معلومات سے لیس کر دیں۔

یونیورسٹی کو اب کسی حصارے میں بند نہیں رکھ سکتے۔ یونیورسٹی کو اپنے فیض کو نہ صرف اپنے حدود کے اندر عام کرنا ہے، بلکہ معاشرے تک براہ راست پھیلانا ہے۔ اور اس کی طرف قدم اٹھائے جا چکے ہیں! یہ جان کر، میں سمجھتا ہوں آپ کو اطمینان ہوگا۔

آغاز میں ذکر انفعال کا آیا تھا۔ میں اپنی گفتگو کو اسی پر ختم کروں گا۔ اقبالؔ کے بعض اشعار زبان زد خاص و عام ہیں اور ان میں سے ایک مصرع یہ بھی ہے: "اگر نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی" لیکن یہ مصرع ہمیشہ پڑھا جانا چاہیے، اقبالؔ ہی کے دوسرے شعر کے ساتھ: آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ یہ مٹی نم کیسے ہوتی ہے، اقبالؔ نے ہی کہا تھا:

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے
موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے

اور یہ مٹی اگر نم ہوگی تو عرقِ انفعال سے ہوگی۔

معذرت چاہتا ہوں، میں اپنے مضمون سے کچھ بہک گیا، لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ یونیورسٹی کے توسیعی کام سے آپ کو روشناس کرا دوں۔ میں اس سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں اور فخر بھی، اور میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کی مساعی مشکور ہوں۔

●●

# ہندی 'تہذیب الاخلاق'

## 'نشانت' کے اجراء کے موقع پر

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اپنے عظیم المرتبت بانی کی تعقل نواز، ترقی پسند اور لچک دار روایات کی امین ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کبھی کبھی بعض لوگوں کی قیادت میں جو بانیِ درسگاہ کا سا اندازِ فکر نہیں رکھتے تھے یہ درسگاہ اپنے معینہ اصولوں سے دور ہو گئی اور عقلیت کا راستہ چھوڑ کر جذباتیت کا شکار ہو گئی لیکن اس حالت پر زیادہ وقت نہیں گزرا کہ یونیورسٹی نے اپنے دل کی توانائی سے کام لے کر کھوئی ہوئی منزل کو دوبارہ پالیا، یقین اور تعقل کی گہرائیوں کا سہارا لے کر یادہ گر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری رائے میں یونیورسٹی کو صرف تدریس، تحقیق اور تبلیغ علم ہی کا مرکز ہونا چاہیئے جس کی بدولت اس کے گرد و نواح اور اس کے زیرِ اثر حلقوں کی اصلاح ہو سکے، انھیں روشنیِ فکر مل سکے اور وہ بلند سے بلند تر ہو سکیں ورنہ وہ اپنے مقصد کا ایک بڑا حصہ کھو دے گی۔

نشانت دوسرے رسائل و جرائد کی طرح محض ایک رسالہ نہیں ہے بلکہ اس میگزین کے ساتھ ایک مقصدیت، ایک تاریخ اور ایک علامت نما عظمت وابستہ ہے۔

تہذیب الاخلاق کی روز افزوں کامیابی سے متاثر ہو کر ٹرسٹ نے ارادہ کیا کہ اس کے اغراض و مقاصد کی مزید نشر و اشاعت کے لئے اس کا ہندی اڈیشن بھی پیش کیا جائے۔ اس کے ذریعہ ہندو اور مسلمانوں میں پھیلی ہوئی مستقل غلط فہمیاں بھی دور ہوں گی اور ابلاغ کا خلا بھی پُر ہو گا۔ اکثریتی جماعت اس کے صفحات کے ذریعہ مسلمانوں کے میلانات و مسائل اور افکار و احساسات سے باخبر ہو سکے گی۔ اس میگزین کا نام خاص طور سے نشانت رکھا گیا ہے جس کے معنی ہیں اندھیرے کا خاتمہ —— جہالت، مجبوری، بے حوصلگی اور بے اعتمادی کا اندھیرا —— رسالے کے رہنما اصول میں، جیسا کہ اس کے اردو ایڈیشن سے بھی ظاہر ہے کہ باہمی ہمدردی قومی استحکام اور رواداری کو فروغ ہو۔ ہر ایسی چیز جس سے کسی بھی طبقہ کی دل آزاری ہو ممنوع ہے۔ تلخی اور خشونت سے پرہیز کیا گیا ہے۔ جو کچھ اس میں کہا جائے گا ترغیب کا انداز لئے ہو گا نہ کہ جارحیت اور تلخی کا۔ اس کو پڑھنے کے بعد قاری ہندوستان کی مشترکہ میراث پر بجا طور سے فخر کر سکے گا اور اس کے دل میں انسانیت کے لئے جذبۂ محبت پیدا ہو گا۔

# مطبوعات خدابخش لائبریری، پٹنہ

قیمت

۱۔ ایک مشرقی کتابخانہ: خدابخش لائبریری کا تعارف از اسکاٹ اوکونار (انگریزی) 15/-

۲۔ خدابخش: خدابخش لائبریری کے بانی کی ایک مختصر مگر جامع سوانح از سرجدو ناتھ سرکار اور صلاح الدین خدابخش (انگریزی) 15/-

۳۔ مصوری کا تاج محل: خدابخش لائبریری میں محفوظ عہد مغلیہ کے ایک نادر مخطوطہ "تاریخ خاندان تیموریہ" کا تعارف اور نمونے کی ۱۲ رنگین تصاویر۔ (انگریزی) 15/-

۴۔ مجموعہ مقالات پروفیسر سید حسن عسکری، پہلی جلد: گنج ارشدی، شرف الدین یحییٰ منیری، زین بدر عربی اور ملک بیو پر مضامین۔ (انگریزی) 15/-

۵۔ تدوین متن کے مسائل: خدابخش سیمنار کے مقالات اور مباحثے (اردو) 15/-

۶۔ پنڈت موتی لال نہرو کا خطبہ صدارت: انڈین نیشنل کانگریس کی یوپی کی پہلی صوبائی کانفرنس (۱۹۰۷ء) میں: ایک اہم دستاویز (اردو) 15/-

۷۔ فرہنگ آصفیہ مولفہ سید احمد دہلوی پر تبصرہ عظیم محقق قاضی عبدالودود کے قلم سے (اردو) 15/-

۸۔ بہار اردو لغت جلد اوّل: فرہنگ مجی از یوسف الدین احمد بلخی (م ۱۹۶۱ء): بہار میں عام طور پر بولے جانے والے الفاظ اور محاورات کی ایک اہم لغت (اردو) 15/-

## • ترتیب و تدوین

۹۔ مجمع النفائس از سراج الدین علی خان آرزو (م ۱۱۶۹ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعراء کا ایک اہم تذکرہ (فارسی) 15/-

۱۰۔ باغ معانی از نقش علی (م ۱۱۴۷ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعراء کا دوسرا اہم تذکرہ (فارسی) 15/-

۱۱۔ صحف ابراہیم از علی ابراہیم خان خلیل (م ۱۲۰۸ھ) بارہویں صدی ہجری کے شعراء فارسی کا تیسرا اہم تذکرہ (فارسی) 15/-

۱۲۔ مثنوی تصویر محبت از میر شمس الدین فقیر (م ۱۱۸۳ھ) عظیم آباد کی ایک داستان محبت جو میر کی شعلۂ عشق کا ماخذ بنی (فارسی) 15/-

۱۳۔ شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان از مرزا جان طپش (م ۱۲۲۹ھ): شاہ عالم کے عہد کی محاورات اردو کی لغت 15/-

۱۴۔ تاریخ ہائے پیدائش و وفات معاصران: قطعات حسرت از شمس العلماء محمد حسرت عظیم آبادی (م ۱۳۰۴ھ) (فارسی) 15/-

۱۵۔ کنز تواریخ: شاہ غلام یحییٰ عظیم آبادی (م ۱۳۰۲ھ) کے قطعات تاریخی (فارسی) 15/-

۱۶۔ تذکرہ کاملان رام پور: مرتبہ حافظ احمد علی خان شوق (م ۱۹۳۳ء) (عکسی اشاعت) امیر مینائی کی "انتخاب یادگار" کے بعد اہم رامپور کے مشاہیر اور روہیلوں کی تہذیبی تاریخ کا تنہا ماخذ۔ تقریباً ۵۳۱ مشاہیر رامپور کا تذکرہ تصحیح و اضافہ کے ساتھ۔ (اردو) 50/-

## • رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت

۱۷۔ جلد اوّل: ادیب الٰہ آباد: نوبت رائے نظر کے ماہنامہ 'ادیب' الٰہ آباد کے مکمل فائل (۱۹۱۰-۱۳ء) سے ادبی، علمی، تہذیبی، لسانی اور سیاسی مضامین کا ایک انتخاب۔ 45/-

۱۸۔ جلد دوم: العصر لکھنؤ: پیارے لال شاکر کے ماہنامہ 'العصر' لکھنؤ (۱۹۱۳-۱۷ء) کے تمام دستیاب اٹھارہ شماروں کا انتخاب جس میں ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ فلسفہ، سائنس اور صنعت و حرفت پر بھی مضامین شامل ہیں۔ ۳۲ مشاہیر کی نادر عکسی تصاویر کے ساتھ 45/-

۱۹۔ جلد سوم: صبح امید لکھنؤ: برج نراین چکبست کے ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ (۱۹۱۸-۲۱ء) کے مکمل فائل سے ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ تحریک آزادی کی معاصر دستاویزات اور انقلاب روس کے ہندوستان پر اثرات سے متعلق مضامین کا انتخاب 45/-

قیمت

۳۰- ۱۹۳۶ء میں قاضی عبدالودود کا معیار: قاضی عبدالودود کے مشہور اردو ماہنامہ 'معیار' پٹنہ (۱۹۳۶ء) کے مکمل فائل کی عکسی اشاعت: ایک بھرپور تجزیاتی اشاریہ کے اضافہ کے ساتھ — 45/-

۳۱- جدید غزل گو: ۱۹۴۱ء کی ایک دستاویز نیاز فتح پوری کے ماہنامہ 'نگار' ۱۹۴۲ء کے خاص نمبر کی عکسی اشاعت ۱۹۳۰ء تک کے غزل گو شعراء کا خود انتخاب کردہ کلام، خود نوشت سوانح، شعراء کی اسی عہد کی تصاویر اور خود نوشت تحریریں۔ — 35/-

## • خدابخش سلسلۂ خطبات

۲۲- عہد سلطنت (۱۲۰۶-۱۵۲۶ء) کے صوفی ادب پر ایک طائرانہ نظر از ڈاکٹر بروس لارنس (امریکہ) (انگریزی) — 15/-

۲۳- عہد نبوی کی تقویم کی تشکیل نو: از ڈاکٹر ہاشم امیر علی (انگریزی) — [illegible]

۲۴- فارسی اور ہندوستان: از پروفیسر نذیر احمد (اردو) — 10/-

۲۵- میری تنقید: ایک بازدید از پروفیسر کلیم الدین احمد (اردو) — 10/-

۲۶- صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات: سماجی سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ از پروفیسر سید حسن عسکری (انگریزی) — 15/-

۲۷- اسلام کی چودہ صدیاں مکمل ہونے کی تقریب میں: ہندو مسلم مسئلہ اور اسلام و عصر جدید کے بارے میں چند خیالات از بدرالدین طیب جی (انگریزی) — 15/-

۲۸- فارسی ادبیات میں ہندوستان کا حصہ: جدید تحقیقات کی روشنی میں از ڈاکٹر امیر حسن عابدی (انگریزی) — 15/-

۲۹- فکر اسلامی: بدلتی دنیا میں از پروفیسر سید وحید الدین (انگریزی) — 10/-

۳۰- مشرق وسطی: ~~[illegible]~~ (شمالی افریقا اور مشرق وسطی) از پروفیسر آصف فیضی (انگریزی) — [illegible]

۳۱- بین المذاہب مفاہمتی مکالمہ: ایک تاریخی چیلنج بھی اور ایک مذہبی واردات بھی از ڈاکٹر آری رویٹ گرڈیسی (انگریزی) — 10/-

۳۲- افکار رومی: از عبدالسلام خاں (اردو) — 40/-

## • فہارس مخطوطات خدابخش

۳۳- مفتاح الکنوز: جلد اوّل — سوم (فہرست مخطوطات عربی) — فی جلد 15/-

۳۴- مرآۃ العلوم: جلد اوّل — سوم (فہرست مخطوطات فارسی) — فی جلد 15/-

۳۵- فہرست مخطوطات اردو جلد اوّل — 15/-

## • توضیحی کیٹلاگ: مخطوطات خدابخش (انگریزی)

۳۶- جلد اوّل و دوم: مخطوطات فارسی (شعر فارسی) جلد ۲۸: مخطوطات فارسی (تاریخ ہند)
جلد ۲۹: مخطوطات عربی (قرآنیات) جلد ۳۰: مخطوطات عربی (حدیث)
جلد ۳۱: مخطوطات فارسی (شعر فارسی، تاریخ، سوانح اور قصص) جلد ۳۲: مخطوطات فارسی (دائرۃ المعارف، سائنس، طب، منطق اور اخلاقیات)
جلد ۳۴: مخطوطات عربی (فقہ اسلامی) — فی جلد 50/-

## • خدابخش لائبریری جرنل (سہ ماہی)

۳۷- خدابخش لائبریری جرنل: اردو، انگریزی، عربی و فارسی چاروں زبانوں میں مضامین شائع کرنے والا ایک سہ ماہی تحقیقی مجلہ، ۱۹۷۷ء سے جاری، اب تک ۳۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

قیمت فی شمارہ: 15 روپے

سالانہ: 60 روپے (ہند) 12 ڈالر (ایشیا)، 24 ڈالر (دیگر ممالک)

# تصحیح اغلاط

۵/۱۱ بتایا گیا ۵/۱۲ بیتسرہ ۵/۲۰ پیڑھیاں ۹/۱ منطق ۹/۱۲ رانی کو پہاڑ اور پہاڑ کو رائی ۱۰/۱۱ حبیب ۱۰/۱۰ ہم ۱۱/۲۲ میں اب
۵/۱۳ امتیاز ______ ۲۰/۱۸ توسط ۲۳/۵ خستہ ۲۴/۱۰ اثر ۲۵/۷ متواتر ۳۰/۳ نقصان دہ ۳۰/۶
یادہ ۳۱/۱۰ دیتے ہیں ۳۳/۱ وسائل کے غلام ۳۷/۲ یہ گویا ۴۱/۲ پہلے ۴۲/۱۳ موجود ہیں! ۴۲/۲۰ محنت کرو ۴۳/۱۱ تیری ۴۵/۲ ذہن
ہے ۴۰/۹ ہے ۴۰/۱۴ خود ۴۳/۱۸ امروز نہ شاعرم ۴۷/۱۰ زائندہ ۴۷/۱۹ معنی خفتہ ۴۸/۲ خیط ۴۸/۶ خود بین ۴۹/۵ پر اغافل ۴۹/۱۰ عمل
۴۹/۱۰ کرتے ۵۱/۷ رہا ارادہ / بھائے جوے! ۵۱/۱۳ کر سکتے ہیں ۵۲/۱۶ اے تخلیقی ۵۲/۱۳ مستغنی ۵۳/۱۲ جائے ۵۳/۱۰ ضابطہ ۵۳/۱۰
حسب مقدور ۵۳/۲۰ تربیت گئیں ۵۴/۲ یہ بات ۵۵/۷ اسلام نے! ۵۶/۳ بھی ۵۶/۲ تھا ۵۶/۶ شمار تھا ۵۷/۱۰ اطلاق عمل
چنانچہ بچے ۵۸/۱۵ تمثیل ۶۰/۵ دنیا ۶۴/۱۸ اختیارات ۶۶/۱۰ دینی تعلیم ۶۸/۵ جماعت ہے ۶۸/۳ حرکت ۶۹/۶ نقطہ نگاہ (بجائے
'نقطہ') ۶۹/۹ زود احساس ۶۹/۱۵ تو اس سے (بجائے 'میں') ۶۹/۱۶ یہ نام (بجائے 'کیا نام') ۶۹/۱ اور ہمدردی کا برتاؤ ۶۹/۱۱ کچھ
تھا ۷۰/۲۲ شعلوں ۷۱/۲ گرد (بجائے 'گرد') ۷۲/۴ پرکھے ۷۲/۶ احسان ناشناسی ۷۳/۱۴ کافر قوم (بجائے 'کا فرد قوم') ۷۳/۲۱ نمونے
۷۳/۴ ہوکر دینا ۷۵/۱ بھی ۷۵/۲۰ بشرطیکہ ۷۶/۲ ہر عنوان ۷۶/۲ شبیہ ۷۶/۱۲ تھی کیا یونیورسٹی (بجائے 'تھی کہ یونیورسٹی') ۷۶/۱۶ لکھو لکھے ہیں
۷۹/۱ عاملی (بجائے 'عاملی') ۷۹/۱۱ باتیں ہوتی ہیں ۸۰/۵ بخل (بجائے 'بخیل') ۸۵/۹ دوست ۹۱/۵ یا تو دنیا ۹۲/۲ دہالیتی میں ۹۳/۲۰
نگاہ میں ۹۹/۵ پہنچانے کی طرف ہو ۱۰۱/۵ بے غیرتی کے منہ چھپاتا ۱۰۲/۱ رشتے کو جو سود و زیاں ۱۰۶/۳ ناموس (بجائے 'ناموس') ۱۰۶/۱ سمجھ رائی
تیگ ۱۰۹/۲۰ لڑکیوں کی شادی ۱۱۰/۵ نکاح کرنے سے صاف انکار کر دیں ۱۱۰/۱۶ احکام ماننا اور ماں ۱۱۱/۹ مرتے ۱۱۴/۵ اپنی (بجائے 'اپنے')
۱۱۴/۱ ساتھ دیتی ہے۔ تربیت جلد ۱۱۷/۹ آگیا تھا) اور کچھ مقدر ۱۱۷/۱۰ جو مقدر ۱۲۲/۵ دھمکرا (بجائے 'ٹھکرا') ۱۲۲/۶ ٹھکراؤ (بجائے
'ٹھکراؤ') ۱۲۲/۱۲ ذہنی ۱۲۳ ساتھ ۱۲۳/۷ کہاں (بجائے 'کیوں') ۱۲۵/۸ مارنا جائز ۱۲۷/۱۶ بھی ہو چلا ہے ۱۲۸/۱۹ نہ سوچ (بجائے 'سوچ')
۱۲۹/۶ صرف اس لیے کر ۱۲۹/۷ مذہب ۱۲۹/۹ فقروں (بجائے 'فرقوں') ۱۲۹/۲۰ جسد ۱۳۰/۱ یکساں میں۔ المنک ۱۳۱/۹ یا بات
۱۳۱/۹ ہے ۱۳۱/۱۴ تارد (بجائے 'اترنہ') ۱۳۲/۶ آپ (بجائے 'آپکا') ۱۳۲/۱۳ انکسار ۱۳۳/۱۱ ہے۔ احساس ۱۳۵/۱۹ ذہن ۱۳۰/۱۱ میں
جو ۱۳۷/۱۳ خوشی ہوگی آپ ۱۳۷/۱۵ خضر ۱۴۳/۷ ہے اندر ۱۴۳/۲ سمجھے گا۔ جو ۱۴۳/۲ رکھا جو ۱۴۷/۸ فیصلہ کیا ہوا در کب ہو
۱۵۴/۱ پتے (بجائے 'پتا') ۱۵۴/۱۱ ذاتی ۱۵۵/۱۲ تبدیل (بجائے 'تبدیلی') ۱۶۲/۲ گڑگڑاتے ۱۶۳/۲۰ جاری ہے۔ یہ مختلف بستیوں میں بکھرے
ہوئے ہیں جنھیں تباہ ہونے سے بچائے ہیں ۱۶۵/۷ کام لینا۔ ۱۶۵/۷ عقل کا کام ہے ۱۶۵/۱۰ گری تھی ۱۶۶/۳ دریا میں ۱۶۹/۲
پنپ جائیں ۱۶۹/۹ پذیرا (بجائے 'پائی') ۱۷۳/۱۱ ہندوستانی (بجائے 'ہندوستان') ۱۸۰/۱۶ آزاد (بجائے 'آزاد') ۱۸۴/۲۲ حرف (بجائے
'حرفو') ۱۹۵/۹ دلائے گا ۲۱۲/۶ موقع (بجائے 'مواقع') ۲۱۶/۵ صفت ۲۲۶/۷ کی زیادہ (بجائے 'کا زیادتی') ۲۲۸/۱۳ انگریز ۲۲۹/۸
میں ناہم ۲۳۲/۷ عام (بجائے 'عالم') ۲۶۳/۵ درجہ … ۲۶۴/۲ … ۲۶۵/۲ نہیں با کورٹ ۲۶۹/۱۰ دانے یا بیج ••

A rational interpretation of the essential tradition, the need for *ijtihAd* and the understanding and appreciation of the role of *muAmlAt* (dealings with men) in religion are the basic features of Sir Syed's view of Islam. He differentiated between the essential Islam and historic Islam. If we apply Sir Syed's method today, it is possible to see that Islam enables man to rise to his full stature and move with the times, retaining a moral vision, a feeling for justice among men, and a strangth to control the forces that power over nature has unleashed. Sir Syed aims at turning knowledge into wisdom.

Sir Syed has been criticized for tying to twist religion to suit the needs of his day. The charge is made by those who are afraid of change or opposed to it. The attempt to see what is relevant and what is not, to one's needs, is a perfectly legitimate one. Many of the arguments that Sir Syed advances are not important. What is important is the spirit and the attitude behind them. Iqbal understood this when he said in his lectures, "The claim of the present day generation of muslim liberals to reinterpret the foundational legal principles, in the light of their own experience and the altered conditions of modern life, is in my opinion perfectly justified. The teaching of the Quran that life is a process of progressive creation necessitates that each generation, guided but unhampered by the work of its predecessors, should be permitted to solve its own problems". Sir Syed just tried to do the same. He was bold for his age in his thinking. It is high time that we ponder over the message in his *tahzibul akhlAq* and *tafsir* and face squarely the problems and challenges that confront us today.

---

*(Source : Proceedings Aligarh Seminar • Traditionalism & Rationalism in Islam Feb. '1982*

Sir Syed's main interest was not in religion but in culture and education. But he realized that religion, in this case Islam, was basic to the issue and no significant questions could be posed and answered without looking at things from the religious point of view. For this, a new interpretation was vital, and Sir Syed procceeded to provide it. It is because of Sir Syed's interest in culture and education that Mujib has called him secular. Sir Syed emphasises the secular aspect, but the secular aspect is in keeping with his view of religion. In his Patna speech he said that, "If you discard *Din*, the world is not lost, but if you discard the world, *Din* is also lost". His story of the worldly wise (*dunyAdAr*) and the ignorant man of God (*nAdAn KhudA Parast*) illustrates the point. The former builds a mosque, the latter a school. The former is trying for a berth in heaven, the latter wants to make a heaven on earth. The Prophet did not want to be with God for ever, he preferred to live with men and teach them the right path.

It must be admitted that when Sir Syed visited England he was dazzled by the glory of the west but undoubtedly he was able to see some essentials also. He realized what science and technology had done for the west. He could see the intellectual advance which the west had made. He could sense the forces behind social awareness and economic progress. Hence *tahzibul-akhlAq*, on the lines of spectator and Tatler and hence his zeal for civilizing his people.

*KhutbAt-e-Ahmadia, tahzibul-akhlAq and tafsirul-QurAn* broadly encompass his religious writings. The last two met with bitter opposition, because Sir Syed was attacking the medieval concept of "learning, accepting and repeating". He was questioning old beliefs, rituals, customs and practices. *Wahabism* also stressed essentials, and worked for doing away with accretions of later days. But Sir Syed was a *Wahabi* with a sense of history and an awareness of the laws of change and an acute consciousness of "what science had come to mean for man." Sir Syed is the first of our moderns but he is not a modernist. He believes that continuity is also necessary while changing. For continuity he insists on a basic tradition and interprets this tradition in such a way that it helps to prepare for a change.

The days of nineteenth century rationalism are no more. Science is no longer arrogant. It knows its bounds. With our greater knowledge of man and society and our growing control over nature, we do realize that Sir Syed's rationalism appears a bit naive today, but its great merit lies being in tune with the voice of history, and in his insistence on reason as a guide for human behaviour. Reason has its limitations too but it is mainly through this useful guide that man has progressed. Sir Syed is the first of our intellectuals and without him we cannot think of Shibli, Azad, and Iqbal.

Like Shah Wali Ullah, Sir Syed made a distinction between *Din* and *Shariat*. Maulana Azad amplified the point. The rigidity of *Shariat* gave rise to Sufism. Sufism rendered great service to religion but it degenerated later into what Iqbal calls *mizAje khAnqAhi* (the temper of the monastry). Sir Syed while insisting on a rational interpretation of *Shariat* pleaded for *ijtihAd*. Azad and Iqbal did the same.

Traditionalism is adherence to tradition as authority, specially in matter of religion. In this case all knowledge of religious truth is derived from divine revelation and received by traditional instruction. Tradition is handed down from generation to generation in the form of statements, beliefs or customs, by mouth, practice or writing. There may be an essential earlier tradition, to which later traditions may be added. A traditionalist, may accept some part as essential and regard the rest as not-relevant for him.

Rationalism refers to the principle and habit of accepting reason as the supreme authority in matters of opinion, belief or conduct. Reason alone is the source of knowledge here and is independent of experience. It can guide us to all attainable truth.

Sir Syed did not accept the whole of Islamic tradition; for him the essential and authentic tradition was that of the Quran and the part of the sayings of the prophet which have been accepted as genuine. He believed that the essential tradition is true and there is correspondence between the word of God and the work of God, that is nature.

Sir Syed conveniently interpreted certain incidents, phenomenon or stories in the Quran, as metaphorical or symbolic. This had been done before him also. He insisted that they should not be taken literally. Reference to the sky, heaven or hell, the jinii, the ascent of the prophet to the heavens, miracles, and the like were all placed by Sir Syed in this category.

Sir Syed believed that God is one and eternal and the sole creator of the universe. His word and the word of his prophet cannot be against reality and against nature. The Quran is the word of God and all that is said in it, is correct and true. Anything which appears against nature or contradictory, appears so, due to our lack of understanding. Only the prophet's word and deed are the recognized authority in religious matters. We should make a distinction between those sayings which pertain to religious matters and those which deal with worldly matters. Only the former, found to be authentic, have to be followed. Man is only accountable for those deeds which are in his power.

Religion consists of belief, practices in the light of this belief, and dealings with fellow men (aqAid, ibAdat, muAmalAt). Sir Syed sees the essential tradition of belief and essential religious practices as eminently reasonable but he feels many of the practices sanctioned by custom and the pattern of behaviour that has become hallowed by time, have to be critically examined in the light of reason and their usefulness in changing times.

Sir Syed had been influenced by the *Wahabi* movement. He even called himself a *Wahabi*. His scholarly persuits, his association with the British, his sharp intellect, his great love for his people, his capacity to absorb new ideas, made him initiate a move first for finding common points between Islam and christianity and then arousing his people from the mental lethargy into which they had fallen, so that they could see what was happening in the world. The Scientific Society and the Institute Gazette were intended to open up people's minds and make them aware of the new wave of reason and science.

A. A. SUROOR
Director, Iqbal Institute, Srinagar

Small wonder that the followers of Islam bacame the torch-bearers of knowledge and free inquiry. They studied Greek philosophers and they observed nature. On this amalgam they brought to bear the faith, dynamism and vision imparted by Islam. The result was a massive renewal and effervescence of knowledge which eventually triggered off and got dovetailed into the European Renaissance.

I need not dwell on the development of Islamic thought through the ages. This is in fact the area which the distinguished scholars, whom it is our privilege to have with us, will traverse. But I would like to state the obvious fact that over the last four centuries a steep decline has taken place in the Muslim intellect. It is not as if traditionalism has won over rationalism. In point of fact rationalism completely uprooted from tradition would shrink and wither, and would result in infructuous academic exercises culminating in insecurity, cynicism and non-balance. Similarly, traditionalism completely bereft of the enlivening and broadening influence of rationalism would be frozen into mere dogma divorced from progress.

The situation that we are in is not that of traditionalism but of stagnation. We have to make a concerted effort to lift ourselves from the morass of intellectual lethargy, narrowness and obscurantism. We have to ensure that religion becomes again for us an enlivening, energising, inspiring and emancipating force. To that end we have to shed the capacitating accretions. We have to demonstrate to the world again that Islam brings a message of peace and harmony, good conduct and good neighbourliness, large-hearted tolerance and quest of knowledge. It considers all humanity as the family of God. It is essentially mobile, dynamic and progressive It stands for uplifting rhe weak and the downtrodden It believes in even distribution of resources and opportunities.

I deem it a privilege to welcome the distinguished participants. The seminar, I trust, will spend sometime considering a programme for a well-organised long-range gamut of studies designed to secure a better understanding of Islam not only among its votaries but also among people professing other faiths. Recent times have witnessed world-wide resurgence of interest in Islam. What is cardinally important in such a situation is a coordinated effort so that sporadic and overlapping work is avoided and optimum and integrated use is made of available scholarship and existing research facilities. I would request that the present seminar may also address itself to evolving a mechanism for collection and dissemination of knowledge about the work being currently done on Islam in various parts of the globe gnd its coordination. The next step should be to identify areas where work is yet to be done and make a plan for a coordinated research effort. This endeavour, of necessity, will be of long gestation.

May I also suggest to the distinguised delegates to utilise their visit for an appraisal of the work done so far by our Institute of Islamic Studies. Suggestions about reorientation of sights, removal of deficiencies and restructuring of the teaching and research programme would be received with deference and considered w th earnestness.

---

*Inaugural Address of the Aligarh Seminar on Traditionalism & Rationalism in Islamic Thought, Feb: 1982 (source : Proceeding)*

# RATIONALISM AND TRADITIONALISM IN ISLAMIC THOUGHT

We should at the outset distinguish between Islam and the Muslims. Islam as a creed, as a way of life, is unchangeable. It is enshrined in the Quran and the Traditions. Muslims have, necessarily over the ages, undergone changes. Even at the best of times they have only inadequately reflected their faith. At the worst of time their conduct has been the antithesis of what is enjoined. It would therefore be erroneous to work ? back from the behaviour of the Muslims and make from it inferences about Islam. Therefore, in order to avoid blurring of perspective, the subject of discussion should be divided into two parts : I. Elements of Rationalism and Traditionalism in Islamic thought as embodied in *Quran* and *Hadith*. 2. Rationalism and Traditionalism in the thought of followers of Islam during different periods upto date.

As regards the tenets of Islam, it insists initially on a few basic articles of faith : Unity of God, ultimate Prophethood of Mohammad (Peace be on him), Revelation, Answerability of the individual for his deeds, Day of Judgment. Beyond these articles of faith it leaves the mind of a Muslim free to observe, assimilate, contemplate and draw inferences. It suggests physical and mental mobility. There is no other religion which exhorts its followers categorically and repeatedly to seek knowledge through observation, experimentation and studies It goes, as is well known, to the extent of rating the scholar's ink higher than the martyr's blood. The Quran for its acceptance invokes evidence and argument (*burhAn*), intelligence (*aql* and *hikma*). There are more verses in the Quran stressing the need for observing closely the manifestations of Nature, contemplating them, and finding in them the key to unravelling the Divine scheme of things than on any other subject. Nowhere else the quest of knowledge has been considered as a duty enjoined by religion. Man was declared superior to the Angels because God had taught him "the nature of all things" which remained unrevealed to the Angels :

*"Wa 'allama Adam al-asmA'a kullahA, thumma 'araDahum ala' l-malAikah; fa-qAla anbiUni bi-asmA'i hA'ulA'i in kuntum SAdiqin"* (*al Baqarah : 31*)

Thus, it is knowledge and the quest of knowledge that places man in the top echelon of creation.

*"Inna fi khalqis samAwAti wa l-arDi, 'wa-ikhtilAfi' l-lail w'a'nnahaAri wa'al'fulk al-lati tajri fi'l baHr bimA yanfa'un-nAs wa mA anzal al-lAHhu min-as samA'i', mAinfa-ahyA bihi'l arD ba'da mautihA wa baththfihA min kulli dAbbah wa taSrif ir-riyAHi wa-as-saHAbi -al-musakhkhari bain as-samAi wa al-arD'i la-AyAtun li' qaumin y'aqilUn"* (*Baqarah : 164*)

Behold ! In the creation of the heavens and the earth; in the alternation of the Night and the Day; in the sailing of the ships through the Ocean for the profit of mankind; in the rain which God sends down from the skies and the life which He gives therewith to an earth that is dead, in the beasts of all kinds that he scatters through the earth ; in the change of the winds and the clouds which thev trail like their slaves between the sky and the earth (here) indeed are signs for a people, that have wisdom (that think) – (*al Baqara, II.* 164.)

are gullible; and, what is needed and what Syed Ahmad Khan tried to instil into the Muslims, is a rational approach. That rational approach has alluded the Muslims. They can be excited easily on an issue; but to expect them to be steadfast and work hard for a particular purpose would be asking too much. In fact what is needed is that all the Muslim institutions of education, whether they label themselves as institutions of general educational stream or whether they label themselves as school of *Dini Talim* or whatever institutions exist, they should be encouraged; and what is even more important is that we should ensure that in the, general run of the schools, Muslims should get adequate admission because the most important step which can lift the Muslims out of the morass in which they have fallen is the spread of education. They are perhaps educationally the most backward people in the country; and as long as they remain educationally backward they will not move forward on any other front. So my plea is that every step should be taken to make them move forward educationally.

I would also submit that it has happened a number of times that they have settled down. They settle down, they look forward; they move forward and then suddenly they are disturbed by the incidents of communal riots. It has already been mentioned that I want to impose discipline; but as an administrator I have not the least doubt that if the District authorities want to stop a riot, they can do it in 12 hours. These communal riots have disturbed the confidence of the Muslims; and if they are put an end to ! ( they cannot be put a complete end tc.) There would be disturbances, there would be clashes, but they can certainly be handled; and there are administrators who have demostrated it in recent times also. Even in Aligarh, administrators have demonstrated that riots could not be prolonged beyond a couple of days. This has been done and there should be strict instructions in this regard; and once there is peace and security, the best would come out of the communities including the minority community.

---

*Intellectuals meet on the problems of Muslims, New Delhi, June 5, 1983, organised by AICC. Young Intellectuals Congress.*

administrative level we discover that the benefit of these policies does not reach the minority community to the extent to which it should have reached. Now, this situation can be remedied only by an understan ding between the minority and the majority community and that ought to be developed. This is the second plane on which the minority community should operate. And the third plane is the plane to which we have been addressing ourselves all the time, i. e., Government. We have to intimate to government that there are areas in which we require assistance. You know, as a developing country. we went to the Committee of Nations, we demanded from the advanced countries that we should be helped out. Similarly, within our own country as a backward community we have a right to ask the government and we have a right to ask the more developed communities to help us out. In my earlier incarnation as Chairman of the Staff Selection Commission I went from one corner of the country to the other interviewing candidates and I was shocked to discover that the number of Muslims who qualified for the interview for the junior posts for which I was catering, was minimal It was negligible and in point of interview I discovered that, more often than not, the scheduled caste candidates faired better than the Muslim candidates. This is the present situation. I would not like to be considered as Prophet of Doom, that is not my intention in mentioning this; but I do want to give a jolt to the collective conscience of the nation that Muslims have slided backward and it is incumbent not only on Muslims but on all right-thinking people in the country to try to arrest that slide; because unless we do it, we might come across a situation where Muslims become a great drag on the progress of the nation Look at any sphere of life in the country : we will not discover any eminent person among the Muslims (there are a very few people who have assumed national dimensions) and this situation which I submit has to be fought. Now in respect of education we are backward and the tradition of social work of constructive leadership among the Muslims has withered The tradition was started by tha greatest Indian Muslim that this country has witnessed during the last 200 years. I am refarring to Sir Syed Ahmad Khan; and, after him, no Muslim paid any heed, whatsoever, to the education of Muslims and to their social uplift. They all were drawn into the vortex of politics.

I will just make yet another point and conclude my observations. Muslims are an emotional community. They are excitable and they

# THE DILEMMA OF INDIAN MUSLIMS

The subject is colossal. To compress it within the short span of a few minutes would certainly be very difficult. I would just touch upon a few points.

It is very clear that Indian Muslims are sliding back. The magnitude of the slide-back is unknown. It is impressionistic but it is nonetheless true. But if it were known, the collective conscience of the nation would be jolted and shot into taking some action. To me it seems that action has to be taken on three planes. One is the community's own plane; and I am one of those who believes that the shortcoming is very often from among ourselves. This is due partly to an aftermath of incidents for which we were not responsible and a hang-over of the past and partly to a dearth of leadership among the Muslims. Whenever a community is backward, those who acquire influence and affiuence become exploiters and this is what has happened, by and large, to the Muslims. Those who acquire influence, those who acquire education, those who acquire affluence, they cut themselves aloof from the masses and they establish a sort of exploitative relationship with the masses and get interested in the perpetuation of that relationship. This is one of the major problems. In fact I have been telling my Hindu friends that it is not the problem of Muslims alone and if the Muslims have displayed bankruptcy of leadership and bankruptcy of judgement, it is for Hindus to come forward and help them out.

So the first plane is community's own plane. Any minority that wants to survive and thrive with self-respect has to do three things in my estimation. One is that it should try to preserve its culture and traditions. This is absolutely essential and this is in conformity with the constitution of our country which directs that every community will have the freedom to pursue its goals and to preserve its culture and traditions. This diversity in unity which is the hallmark of our constitution and our country does require that a minority should be in a position to preserve its culture and traditions. That is number one. Number two is that minority should, by dint of hard work, excel other communities in the country. And the third and perhaps one of the most essential conditions is that the minority should have the most cordial relations with the majority community. We are faced with a situation that a government that wants to be fair to all the communities issues directive based on policies and when these policies trickle down to the

of the mystery that still surrounds the decline of the Indian Muslims. They will bring to bear on some of the apparently intractable problems a scientific attitude and an incisive intellect. Now, may I suggest that the learned participants may assume that their papers have been read and bring out in the course of their intervention only the very significant points. This will not only save time but keep the discussion in focus and facilitate the emergence of an integrated plan within a broad framework. We have to avoid generalisation; we have to eschew repetition: we have to exclude platitudes and pious hopes. What is needed is an open-eyed, candid and ruthless appraisal of the situation followed by a plan of action. This last should be specific and down-to-earth. We should resist the temptation of blaming our plight on others and indulging in self-pity. We need do only two things these days :

1. Identify the gaping deficiencies in the information base and suggest selective surveys and studies to remove them;

2. formulate a practical plan comprising—

   (a) collection, tabulation, analysis, storage and retrieval of data;

   (b) action programmes for eradicating, removing or reduing the factors responsible for decline and continued backwardness.

Our action plan should not in fact await the completion of the studies and surveys and analyses that we decide to embark upon. Both should run concurrently. On behalf of my colleagues and my students I renew the pledge of the great founder of this University and consecrate this institution once again to the educational uplift and economic rehabilitation of Indian Muslims within the framework of a secular, progressive and enlightened country, to the inculcation of understanding, amity and goodwil, and to dissemination of sanity, awareness and enlightenmont.

---

and cultural uplift of Indian Muslims. In pursuance of this objective, suitable provisions should be made both in the plan and budget of the University.

The setting up of coaching and guidance and employability improvement centres in various parts of the country should be undertaken. These can attract financial assistance from government.

While concerning ourselves with the problems of Muslims, we should study them against the total national context. There are so many problems that are common to all the communities and the Muslims should endeavour along with their countrymen to resolve these problems. They should not allow insularity to limit their horizon or to alienate their countrymen. Their endeavour should be to strive ceaselessly for the goals that the country has set itself and to bring themselves through the process of education within the mainstream of national progress.

I have no doubt that Dr. A. R. Kidwai, who is known for vision and practical commonsense and who has great achievements to his credit, will set out investigative endeavour on the road to meaningful success and purposive fruition. His wise counsel will certainly save the seminar from lapsing into a mere academic exercise or a talking session, give it direction, thrust and a cutting edge. I also trust that the Chairman of the Minorities Commission will try to convert the Commission into an instrument of recovery and reform. He should be able to make on this momentous occasion, observation which should strike a responsive chord in the mind of Indian Muslims and which should help release a national effort for their uplift. He should be able, in due course, to persuade the Registrar-General to include in the design of the decennial census columns which would yield significant information about the comparative status and progress of the different communities and which could make redundant many of the surveys and studies that the seminar may envisage or the social scientist and the educational planners may hanker for. I do hope that the distinguished participants will make very significant contributions to the unravelling

them better for living successfully in a society where unemployment and under-employment have become endemic but also induce a change in attitude without which no progress is possible. The second important step should be to organise time-bound studies and surveys and data collection which would not only delineate with some precision their educational, social and economic status but also provide clues to factors culminating therein. For creating a stir and triggering reform, it is necessary to identify a few persons in every town who can be depended upon for selfless work. Without such persons nothing can be achieved. Their call evokes immediate response. Very much more important than policy and programme is the availability of dedicated and socially-motivated men.

Reverting now to the task before this seminar, I would suggest that it should address itself to specific areas. The general situation is much too well-known to deserve any but a passing mention. We should have a business-like session where generalities should be tabooed. The areas for survey study, investigation and research should be inensified and assigned to proper agencies and institutions. Impressions should be discounted. A well-coordinated plan of collection of relevant data should be framed and tasks parcelled out. The identifition, collection and analysis of significant data, and the emerging follow-up action should be closely monitored.

The seminar should formulate an action plan and assign a period within which that plan is to be completed. This plan should, on the one hand, aim at removing statistical deficiencies and on the other at crossing the hurdles in the way of the educational, social and economic uplift.

Nuclii should be established in the North and the South for coordinating the statistical and action plans of the various relevant organisations and institutions. One of these could be located in the Aligarh Muslim University and the second in Hyderabad. Incidentally, the Aligarh Muslim University (Amendment) Act of 1981 provides specifically that the University will be concerned with the educational

adequately represented in the corridors of power. They miss the sense of participation. The excitement that the adventure of national reconstruction and development bring eludes them.

(7) Partly because of lack of education, partly because of sulking insularity, and partly because of swollen individuality, many Muslims have lost the sense of proportion. They would wrangle over petty matters, very often non-issues and ignore matters of moment. The entire perspective has got invitiated. If ever there was a tradition of social service among them, it seems to have been completely lost. No society can progress if members grudge effort for its welfare and uplift. Organised and sustained endeavour, also, is far beyond our ken.

(8) At many levels they are discriminated against. This discrimination is against the principles enshrined in the Constitution and the policy laid down by the government. It stems not so much from antipathy as from the general situation of poverty and acute unemployment and caste consciousness in the country.

I should like to reiterate here what I have said on other occasions: For a minority to survive and thrive, three conditions are essential:

(1) It should be steadfast in adherence to its religion, culture and traditions. This is not only permitted but encourged by our Constitution.

(2) It should excel the majority community by dint of hard work.

(3) It should maintain very cordial relations with the majority community, for, the goodwil of the majority community is one ef its greatest assets.

It is, therefore, imperative that the community go all-out to remove its educational backwardness. This would virtually amount to the revival of Sir Syed's great movement. Education will not only equip

(1) Apathy to education as aggravated by poverty. The former is reflected in low enrolment and the latter in high percentage of drop-outs.

(2) Resistance to change and failure to come to terms with the modern age.

(3) There is little in common between the Muslims educated in modern schools on the one hand, and those educated in Madrasas and the uneducated masses, on the other. This gulf has to be bridged and the community, which has a split personality, made whole before any movement of special and educational reform among Muslims can succeed.

(4) We seem to have lost the capacity to work together and to run institutions. Without this capacity no progress in any sphere whatsoever can be achieved.

(5) In a community where the poor and illlterate masses predominate, the small group of educated affluent and well placed persons tend to become exploiters. Thus they are deprived of dedicated and enlightened leadership and the urge to move forward.

(6) The sense of insecurity which dogs the Muslims' psyche muffles ambition, zest and hard work. This sense of insecurity is fueled by the communal riots and by the apprehension that there are threats to religion, language, traditions and culture. It also leads to the persecution complex which stands in the way of resilience and endeavour towards self-improvement. It feeds on itself and induces apathy, listlessness and despair. It can partly be traced to the hangover of the Partition. It is this persecution complex, this alienation from other communities, this retreat into one's shell that has eroded confidence and destroyed among Indian Muslims the spirit of competition. Our Constitution guarantees equality to all Indian citizens. In actual practice, however, Muslims find that they are not

ing their duties to the best of their capacity but the results achieved so far do not appear to have made any dent on the Muslim problems. The central Minorities Commission has often concerned itself with day-to-day problems which have loomed large at a given moment, with the result that the urgent has often elbowed out the important. It seems to me that the most important work which the Commission and Panel should undertake relates to collection of data and commissioning of investigations, surveys and studies. The data available so far is abysmally obscure and inadequate. The reaction of the Muslims to their situation is more often than not, based on impressions. These impressions may eventually turn out to be correct, by and large, but they cannot either be the basis for a plan of action or a foundation on which the fabric of policy relating to Muslims can be raised. If data can be collected, analysed and disseminated, two results would follow :

(1) The collective conscience of the nation would receive a jolt which can well prompt a rethinking among the other communities and government about the Muslims;

(2) It may break the smugness and apathy which plague this community.

I should like in this connection to draw attention to N. G. Saxena's paper on Public Employment and Educational Backwardness among Muslims in India. A glance at the very first table would reveal that the proportion of Muslims (who constitute 12% of India's population). in the I. A. S. and the I. P. S., declined respectively from 4.5% in 1960, to 2.9% in 1981 and 4.05% in 1960 to 2.85% in 1981. The figures given in that paper, on the basis of sample surveys and studies of items picked up at random, such as a share (a) in petrol pumps, and (b) in loans and advances are shockingly low. The paper rightly suggests that the economic backwardness of Muslims stems from their educational backwardness and cites disconcerting figures in support of the latter. Saxena has posed the agonising question why Muslims, in spite of initial advantages, are today far behind non-Muslims.

Anyone who has been concerned about the decline of Muslims cannot fail to notice that it is due primarily to the following factors:

# Problems of Employment & Education of Muslims

There is a general realisation now that Indian Muslims are sliding back. The edge of the realisation was dulled for some time by the increase in the artisans' wages and inflow to some families of remittances from the Middle-Eastern countries. Facts, however, are coming to light which have made a dent, howsoever peripheral, on the apathy and complacence of the Muslims. It is being recognised that their contribution to and share in the development of their country and in its governance is declining at a fast pace.

The Aligarh Muslim University, which was the centre of the movement for modernising Indian Muslims, should concern itself with their problems—this is the assumption which, though not unjustified, remains largely unfulfilled. It can, therefore, be considered a good augury that the Aligarh Muslim University is now poised for making meaningful and purposive studies and investigations into the educational, social and economic status of the Muslims of India. It has entered into a collaboration with the Business and Employment Bureau, founded by Hakim Abdul Hameed Saheb of Delhi who is perhaps the most pragmatic and far-sighted Indian Muslim of the second-half of the 20th century. The first seminar in the series, jointly organised by the Bureau and the University, was held at New Delhi on October 9, 1982. The second seminar is being inaugurated this morning by Dr. A. R. Kidwai, Governor of Bihar. It is going to be addressed also by Mr. Justic M. H. Beg, Chairman of the Minorities Commission. The papers to be read in the seminar cover a sizable range and have been contributed by distinguished scholars from various parts of the country. Although the seminar is concerned with problems of the employment and education of Muslims, the major stress appears to be on employment, and rightly so.

The Central Government set up two High Power Organisations for studying the problems of Muslims and making suitable recommendations, namely, the Minorities Commission and the High Power Panel on Minorities. A number of State Governments have also set up their own Minorities Commissions. These Commissions have been perform-

I should conclude by saying a few words about the Anjuman-I-Taraqqi-i-Muslimin, North-East India. It has evinced sincerity, zest and competence. Its objectives are sound. The Hijra function which it organised and to which it invited people from different corners of the country has heen a success. I would, in all humility, make a few suggestions for the Anjuman's consideration :

1. The Anjuman should concentrate on social and educational work. It should not allow politics to enter its domain. Any attempt to give political overtones to the Anjuman should be scrupulously resisted ; for, the moment politics enters, quiet unified constructive work makes its exit.Politics is ephemeral, transient, evanescent; social work aimed at educational uplift is abiding, enduring, lasting.
2. The initial success registered by the Anjuman may arouse envy, discord, disruptive effort. These should be guarded against.
3. The organisers appear to be a band of self-less workers. All precautions should be taken against vested interests infiltrating. The moment of success is fraught with dangers. Let us fortify ourselves against them.
4. The Anjuman should not strike an aggressive stance. It should aim at amity, cordiality, communal harmony. Its programme is not directed against any coummunity ; it is designed to help the Muslims in the North East of India, move forward educationally, economically, culturally. The Hijra celebrations as well as the turn of the Century is a good starting point. I would therefore, exhort the members of the Anjuman and all those assembled here to take up with all sincerity and earnestness and without fanfare, the programme of removing the educational backwardness of Muslims in the North-East. This should be taken up on the basis of voluntary effort in all towns and villages. I have no doubt that the cumulative effect of modest and unobtrusive efforts made at myriad points will be tremendous. I appeal to you to go out and kindle the torch of learning in each village and in each hamlet. This is the torch that has been bequeathed to you by the Holy Prophet (May peace be on him).

---

*(Speech delivered on November 8, 1981 at a function organised by Anjuman-i-Tarraqi-i- Muslimin, North East India, Gauhati, to celebrate the Advent of Fifteenth Century of Hijra).*

have tasted the fruits of progress continue stepping up the momentum; for another, those who are left behind have no incentive to move forward. Poor and backward parents tend to deprive their children of the means of removing backwardness. Poverty induces them to make their children earn rather than learn. Poverty propagates poverty; ignorance aggrevates ignorance.

The situation in the North-East demands a two-pronged action; *Ulema* should din it into the ears of their followers that pursuit of knowledge is a religious obligation. If they fail to do so they would have made a culpable omission. They would have failed to convey and stress the revealed word. A ceaseless campaign for education should be organised. It should be brought home day after day that it is a sin to remain uneducated. Let us now discuss what concrete steps can be taken.

In the *madrasas* or religious schools, general education should be imparted along with education in religion and in Arabic. Similarly, for the large body of Muslim students who are in the general stream of education, an opportunity should be provided beyond school hours for acquiring religious education. Special arrangements in each village and in each locality should be made for providing part-time education in religion.

Unity in diversity is the motto of our country. It is a matter of pride for India that there is no regimentation, no drab uniformity. Within the frame-work of nationhood a variety of races, religions, castes, languages, cultures do exist, thrive and flourish. These account for the richness of our cultural heritage, for the breadth of the national main-stream. Anyone who objects to this variegated pattern, this adherence to the principle of co-existence, is short-sighted, anti-national, un-patriotic. We cannot be a party to the impoverishment of our heritage or to the narrowing down of the mainstream. Patriotism and national pride therefore demand that Muslims should take necessary steps for adherence to their religion and culture and for their development. Muslims should be in the vanguard of national progress rather than act as a drag on it. The key to this is education and persistent hard work. What is required of them is sweat not blood; endless toil not momentary effervescence. The building has to be raised brick by brick; it cannot be switched into existence. The national fabric has some other strands as well but Hindus and Muslims, the two major communities, are the warp and the woof. Separating the warp from the woof is a totally hurtfull exercise just as trying to make a fabric on warp alone would be a ridiculously futile effort.

Now, adversity can generate two kinds of reactions : first, spur one to a massive effort in order to surmount adversity: second, caving in and succumbing to gloom and despair. The question readily frames itself in a defeatist mind: why make an effort at all if the future is seemingly bleak; why not take things easy ? This is obviously a wrong question to ask. The question to ask is: if the end is ordained, what would one prefer: an ignominious or a valiant end; dying struggling or cringing.

The major cause of the social and economic backwardness of Muslims is that they are lagging behind in education. No other religion has laid as much stress on pursuit of knowledge as Islam. Ironically, it is the Muslims who are the least concerned about education. The relevant traditions of the Prophet (Peace be on him) appear not to have received the attention of *Ulema*. How can one otherwise explain the phenomenon of most of their ardent followers remaining uneducated.

Education cannot be divorced from employment prospects. This suggests that students attending religious schools should, in addition, be provided general and, where possible, vocational education. Otherwise religious education will attract mediocrity and would eventually suffer grievously on that account. These Traditions of the Prophet ought to be highlighted, stressed and implemented. Here a great responsibility rests on the religious leaders.

It is, again, ironical that a religion which has laid the utmost stress on observation, contemplation, experimentation and induction; which has emphasised dynamism, initiative, analysis; which is forward-looking, optimstic and movement-oriented, should have become the refuge of blind imitation and stagnation and despair.

The ringing out of the Fourteenth Century after Hijra provides a point in time for appraisal and stock-taking and planning. The outgoing century could not arrest the decline that set in among the Muslims four centuries ago. Over this period they relapsed from the intellectual leadership of the world to the status of camp-followers. They started reading into Islam the very antithesis of what it stands for. They reduced it to dogma, look wistfully and wastefully backwards instead of bringing it confidently and constructively forward. It is, therefore, essential that Islam is re-interpreted; that our version of Islam is purged of impurities, distortions and accretions; that is, it is freed from bondage.

There is no task more difficult than making a backward country or community catch up with the advanced ones. For one thing, those who

# MUSLIMS & EDUCATION

Allow me at the very outset to express my gratitude for the invitation you were pleased to extend to me. By inviting me you have reiterated the fact that the Aligarh Muslim University continues to occupy a central place—that too not only in the hearts of Indian Muslims but also in the scheme of their educational upliftment.

As you know, ladies and gentlemen, Sir Syed Ahmad Khan holds an eminent position in the galaxy of the builders of modern India. He longed to see India emerge out of ignorance, fatalism and poverty and to take its place among the advanced nations who had benefitted by science and technology. He found that whereas Hindus were taking to modern education and moving forward, Muslims, who were sulking under the crushing blows inflicted on them by the British after the first war of independence of 1857, had slided back into their shell and shut themselves off from modern influences, Sir Syed made a firm resolve to pull them out of the shell and put them on the road to progress; for, he realised that if they remained backward, the progress of the entire country would be retarded. Therefore, an ardent nationalist to the core as Syed Ahmad was, he concentrated his efforts on the social and educational uplift of Indian Muslims. However, the M. A. O. College, which he set up and which later developed into the Aligarh Muslim University, was and has always been open to members of all communities. Jawaharlal Nehru in his *Discovery of India* has endorsed the wisdom of Sir Syed's policy. An ardent patriot, Sir Syed used to call Hindus and Muslims as two eyes of a comely damsel, that is, India.

M A.O. College was only one of the projects on which Syed Ahmad embarked. He established a Scientific Society. He founded the Muslim Educational Conference. He brought out a magazine *Tahzibul Akhlaq*, patterned on the *Tatler* and the *Spectator* of England, for effecting reforms in manners and morals. He reinterpreted religion and waged a fight against fatalism, ignorance, superstition and obscurantism. He triggered off a ferment, a stir, an awakening, a movement of reform and a modernising process. To him India in general and the Indian Muslims in particular owe a deep debt of gratitude. Alas, the momentum of the movement that he had sparked has been lost. Muslims are again sliding back. The aftermath of the partition mauled them. They again sulked; they withdrew. Conservatism has them fully in its grip.

Where are men who could be equal to this task ? Nowhere. The chasm between the temporal and the spiritual in the Muslim world is so wide that the denizens of the two hemispheres do not ever nod acquaintance. Those who are at home in religion appear to be out of place in this modern world. Is it not a tragic irony that the religion which demolished the barrier between the physical and the spiritual world, which recognised and developed the concept of an integrated being in whom the spiritual, the intellectual and the physical are evenly blended, should end up with a totally reversed and fragmented image among those who claim to profess it. Nor can we expect that persons brought up in modern education which is permeated with Euro-Christian concepts, can develop real insights into Islam. They are not equipped to carry out the revaluation and reinterpretation of Islam that the socio-economic complexities of the modern age demand.

It is, therefore, imperative that conditions are created for the emergence of a group of persons steeped in Islam and its social and cultural traditions and literature who are equally at home in the modern world with its complexities, compulsions, attitudes and aspirations. There is no established church in Islam. It is good in so far as no intermediaries are imposed between the individual and his Creator It is also good in that it prevents creation of vested interests in religion. It is not so good where meeting the challenge of the modern age and adjustment to the changed milieu are concerned. In the absence of such an institution a substitute should be devised. It should be in a position to make it worth the while of bright and diligent boys to take up religion as a career. In an age of specialisation it seems all the more necessary.

Will it be possible for Islam to save modern man from lop-sided development to temper progress with morality, to round off the fragmented man, to redeem him from living on the periphery of existence, to take him back to the core of life : resilient vibrant, steadfast ? These are questions which inevitably spring to mind. One is driven to the conclusion that Islam is relevant, cardinally relevant to the modern age but Muslims are not.

---

living force. Islam, soon after its advent, transformed its followers and transformed the world. Did Islam owe its earlier triumph to the people who first embraced it ? It is difficult to find an answer to these questions. Once a religion has descended from the commanding heights can it secure obedience through appeals and exhortations ? Can it again become the mainspring of great deeds and the source of spiritual regeneration and temporal triumphs ? The question which eludes an answer is how to spark the process of change, how to convey again to the world convincingly and dynamically the message of Islam. The last revealed religion is there, for all time to come, enshrined in the Quran and Tradition. But the people who profess the faith are lifeless, stagnant—the very antithesis of what this revolutionary religion stood for.

Islam being the consummation of revealed religion, the concluding and crowning link in the glorious chain comprehends them all. It is in that sense catholic and eclectic : "Acquire what is pure, reject what is polluted "*(khuz ma safa, da' ma kadar)*.

For a Muslim it is an article of faith to revere all the prophets. He expects and finds goodness in other religions. This catholicity, this tolerance, this comprehension and endorsement of the tenets of other faiths, enhances Islam's relevance for our time when the divisions of mankind are faced with the choice between co-existence and non-existence. It inculcates the attitude of tolerance and respect for the other man's point of view.

The process through which religion affects the conduct and attitudes of its followers is complex. It is, the efore difficult to predict to what extent Islam will influence the lives of those who embrace it as well as those who are born to it. Its relevance will consequently depend not only on the two aspects I have had the occasion to discuss viz., (1) shared traits, and (2) principles calculated to correct the dis-tortions and aberrations of our age.

It will also depend on whether it can again acquire its pristine vigour and dynamism, power to enthuse, stimulate, and activise. Is the present generation capable of transforming itself so as to be able to carry Islam's message ? I think not. True, there is evidence of a stir, a ferment in the Muslim world. But is there any one tall enough to canalise this ferment into a mighty heave and a great forward movement? No one is in sight. For the regeneration and expansion of the Muslim world a thaw is essential in attitudes frozen for half a millennium. Islam has to be reinterpreted in the present-day context.

goodness, that power should subserve justice and affection, and to spend wealth in the way of God, i. e., in the service of humanity." (1)

Muslims never deprecated science nor persecuted scientists as Christendom did. Martin Luther reacted to the heliocentric theory of Copernicus by exclaiming "The fool will overthrow the whole art of astronomy. Joshua commanded the sun to stand still and not the earth." It is unfortunate that after rekindling the torch of knowledge the Muslims receded into darkness. Otherwise the advent of science would have found among them its greatest champions.

Islam strikes a balance between the requirements of body and soul, the demands of this world and the Hereafter for which this world is the preparation. According to the Quran life is an unending creative evolution. Every generation, therefore, has the right to resolve its problems according to its lights consistently with the basic tenets of religion. Religion, according to Islam is a perennial spiritual movement. One of Islam's most sign'ficant contributions is the integration of the physical and the spiritual world.

Apropos to the so-called barbarous penalties an assessment is yet to be made whether the reformatory softness is all that good; whether it is vindicated by results, whether in the larger interests of society the element of deterrence in penalties is to be reinforced or eliminated.

The modern age is a critical period. Advances in technology and phenomenal development of mass media of communication have revolutionised society and transformed values, attitudes, and motivations. The Catholic church has been sriving to mitigate the traditional opposition to the world and evolve a philosophy of socio-economic development. This is reflected in the Encyclical letters captioned" The progress of People and Peace on Earth."

Curiously, Muslims have made no effort at re-orientation and adjustment. Far from bringing about revolutionary changes, they have failed to keep pace with them. They have cut themselves off from the main-stream of human progress. A people whose vision and mobility knew no barriers, in a sad reversal of attitude and ideology, withdrew into a narrow shell. Islam continued to influence other people but ceased to influence its own followers.

Here the question arises as to how a religion can continue to be a

1. Syed Abid Husain.

It is generally realised that during the last four centuries the followers of Islam have travelled far from the spirit of their religion. They are flawed mirrors that reflect a grotesque image of Islam, a religion that was unique in respecting and recognising other faiths - 'All creatures belong to God's family *(al-khalq Ayalul-ah)*. Sufficient unto you is your faith, to me mine *(Lakum Dinokum wa liya Din)*. There is no coercion in religion *(la ikraha fi 'd-Din)*.

It is a travesty of facts that fanaticism and intolerance are being ascribed to it. Even the well-meaning critics of Islam tend to commit one mistake : They confuse Muslims with Islam and, from the former's degenerate state, derive inferences derogatory to the latter. But for the label, there is nothing Islamic about the vast majority of present-day Muslims. They have reduced their concept of religion to dogma and ritual.

A perusal of the Quran reveals that its appeal is primarily addressed to reason. Accept the axioms; thereafter the entire trend of the Book is ratiocinative. What is sought to be proved is argued out. Illustrations from history and nature are drawn upon to drive home a point. The burden often reads like: 'Will you not contemplate', 'will you not give thought', 'will you not ponder'. Questions are frequently asked in order to set in motion the process of thinking. The reader feels all the time that he is being addressed and forgets that it is the people of another age, another clime. The appeal invariably is to reason "Say Call upon other (gods) whom you fancy besides God. They have no power, not the weight of an atom in the heavens or on earth". (*Qul ud'-ul-lazzin-a-za'amtum min dun-i-llah, la yamlikuna misqala zarratin fi's-smawat wa la fi'l-Arz*).

The next step from appeal to reason is the quest of knowledge. It is because of these injunctions that Muslims kindled the torch of learning and released forces which eventually rang out the Dark Ages and ushered in the Modern age. One of the traditions of the Holy Prophet is to the effect that an hour's contemplation is better than sixty years spent on worship.

"The Quran does not consider the world of sense-experience either as illusory or evil : it is true and real' [1] the first link in the chain of life which culminates in the hereafter : 'Our Preserver, thou hast not created this world in vain *(Rabbana ma khalaqta haz batilan)*.

"Man has been directed to acquire knowledge, power and wealth but with the stipulation that knowledge should subserve truth and

1. Alam Khundmiri

3. it threatens the fabric of the economic system by disallowing interest ;
4. it is rigid, conservative and imitative; not flexible, progressive and innovative;
5. it encourages dogma, ritual, fanaticism and intolerance;
6. it is anchored on tradition and neglects reason;
7. it segregates the sexes and takes away the charm of social intercourse. In the process it denies one half of the human race the opportu-nity to grow, lead a full life and contribute to human progress;
8. it prescribes barbarous punishments.

Some of the objections are too trivial to attract attention. If the modern man finds it difficult to bring to bear devotion and obedience on his relationship with religion the loss is his : Regarding paucity of time and energy for religious observances, are we sure that optimum use of time is being otherwise made? If the observance is on the mechanical and superficial plane waste of time is involved. If it is on a plane of sincerity and comprehension, if it leads or points towards communion, then it edifies, ennobles and strengthens; then every moment spent in religious observances is worth it—even in the sense of temporal well being. As regards the ban on interest it seems inconvenient only because the modern civilization has reversed the relationship between man and money. The latter has become the master and the former its slave. Interest is the device for getting unearned money and for concentration of wealth in the hands of the few and deprivation of the many. Investment, where expectation of profit is not offset by fear of loss and where money attracts money without effort, cannot be justified particularly when a large section of the people toil hard and do not get a square meal. Doubts have been expressed whether monetised economy can survive without interest. It has been argued on the other side that it can, and experimens are afoot in support. Their outcome is awaited. In the interest-oriented economy which grips the world, the success of such an experiment, restricted to a few countries, becomes problematic. But that does not take away from the inherent invidiousness of the interest-based economic system. It is generally recognised that Banks' allocative policies are not guided by the society's needs for productive enterprises and its priorities in their regard. What is desirable but seems unattainable is a switch-over from interest to profit-sharing.

dignity of man and insists on his answerability within the confines of compulsions and limitations. *"Man-ya'mal misqala zarratin khairan-yarah; wa man ya'mal misqala zarratin sharran-yarah"*

All Man's deed, the smallest particle of good and of evil, will be accounted for on the Day of Judgment.

For the cynicism, scepticism, disbelief and mistrust rampant in our time there could be no surer remedy than the certitude and contentment that Islam brings. Nothing can be achieved without conviction. Doubt breeds diffidence, it blurs the perspective, it paralyses the will. It leads to inaction and retards the pace. Conviction generates confidence; It breeds the urge to demolish hurdles and move forward. Conviction culminates in conquests.

Never before in history has man as an individual become so insignificant. Ironically, at the very moment when man acquired tremendous powers due to the advances made by science and technology, his status as a man touched its lowest depth. Sandwiched between a ruthless and unsympathetic society and an all powerful and indifferent State, the individual has lost personality, security, self-respect. In fact it was Islam that established unequivocally and proclaimed categorically the dignity of man and freed his mind from superstitious fear and from reliance on intermediaries. It made man keep his head erect. It made him aspire and realise his aspirations. It gave him at once the humility and pride of being in direct contact with his Creator and the consciousness of being his vicegerent on earth. At a time when man has become dessicated, disjointed and fragmented, Islam promises a full-blooded life, a well-rounded personality and an unified, integrated, well-adjusted existance falling in pace in the scheme of the universe. This religion which follows the golden mean; which treats human personality as indivisible, which abolishes duality between the physical and the spiritual, which protects the joy of living from the idea ef sin, which enjoins restraint and moderation, does provide the remedy for the pervading disease of split personality which afflicts our age.

The last revealed religion has been criticised on a number of scores:

1. it expects a degree of devotion and obedience which the modern man finds difficult to offer;
2. it demands spending of considerable time and energy in the discharge of religious observances like *Salat* and *Saum* (prayers and fasting);

nationalities hostile to eech other, deserve to be demolished. Islam accepts patriotism but rejects chauvinism.

True, Muslim countries have fought and at this moment are fighting among themselves. But this is inspite of Islam. When Pakistan was carved out in 1947 its Prime Minister, Mr. Liaqat Ali Khan, had proclaimed "Pakistan for us is a laboratory and we will show to the world how good and effective the 1300 years old teachings of Islam still are." Mercifully, the assassin's bullet prevented him from witnessing how events belied his hope and pledge. As far as living up to Islamic teachings is concerned, Pakistan fared no better than many other Muslim countries in our time. The defect is not in the teachings but in the weak-need and half-hearted adherence to them.

"Meritocracy" would not be an appropriate word in the present context: but the recognition of merit and the rejection of all other considerations is one of Islam's abiding and most significant contributions to social justice. Islam stoutly and explicitly refuses to be swayed by considerations of caste, colour, country, race, social status. It recognizes merit, piety, rectitude.

The consciousness of God's presence, and the belief that on the Day of Judgment everyone will have to render account of his actions in this life, invariably exercises a restraining and chastening influence. This consciousness, this sense of answerability, this feeling of being face to face with the Creator, has been unusually intense and vivid among the followers of Islam. It has prevented genuine Muslims straying from the path of good conduct One of the greatest miracles attributed to religion is the intimate relationship, the constant presence, the perennial consciousness which Muslims secured in respect of an invisible, abstract, formless God. He became for the Believers a greater reality than the physical world, a dearer Being than the dearest kith and kin. They held Him in great awe and yet loved him as they loved no one else. His love inspired and motivated them. His fear restrained them, regulated their actions, and prevented their straying from the straight path. Being face to face with God became the greatest reward, the profoundest bliss to which they could aspire. The consciousness of His immediate presence became the unfailing deterrant from evil doing.

Islam discourages monasticism. It refuses to consider the world as an illusion. It holds man responsible for his deeds and deprives him of alibis. There is no faith which in an equal degree safeguards the

sanctions, the fear of retribution, the consciousness of inexorable answerability. Another corrosive evil which is becoming as fashionable in our age as drinking is gambling. It has assumed a myriad attractive and insidious forms. In Islam it is totally tabooed.

Modern age thus needs Islam also because of its disciplinary bias, its corrective and remedial qualities, i. e., its uncompromising ban on drinking, gambling and permissive sex. These three account for most of the crime that afflict humanity—directly or indirectly.

Yet another evil that plagues our society is the uneven distribution of income and the concentration of economic power in a few hands resulting in exploitation of the poor. This is brought about, *inter alia* by interest on which the modern economic system is based. Islam tabooes interest and deprecates and discourages accumulation of wealth

People wielding political power, bureaucrats and business executives, often exploit their position for personal gain. The line between public and private expenditure often gets blurred. True followers of Islam have set the highest standards of integrity and probity which could very well serve as eternal models for they bowed to God and none else, and believed in His ubiquitious and omniscient presence. A believer can never lose sight of the discrimination between *Halal* (the permitted) and *Haram* (the forbidden). There are instances of several Muslim rulers refusing to draw upon the treasury for their personal needs. They eked out a living by transcribing the Quran or by stitching caps.

Strident nationalism has been responsible for the world wars in the first half of this century. These resulted in colossal devastation. God's land has been parcelled out into warring territorial units and blocks. It has, moreover, led to stock-piling of arms and the diversion of means of production to destructive purposes. In the less developed countries defence-spending has crippled development plans and retarded the progress of projects designed to reduce poverty and alleviate the plight of the vast majority of the people. The world is alternating between hot war and cold war. The latter breeds tension and apprehension, and leads to frayed tempers and to risks round the corner.

Islam strikes at the root of blind nationalism. Brotherhood of man is its motto. It considers humanity as indivisible. "The people are the family of God." Who among the mortals dare divide God's family ? The political barriers splitting up mankind into so many

the Renaissance, in the fourteenth and fifteenth centuries which later culminated in the scientific and technological revolution.

Let us now identify the traits that Islam shares with the modern age, or to put the chronological record straight, which the modern age owes to Islam. One may first mention the concepts of liberty, equality and fraternity; the dignity of man, the stress on acquisition of knowledge, the refusal to believe that the worldly existence is unreal and illusory; the insistence on partaking of the legitimate joys of life, the emphasis on reason and moderation; the urge to move forward, to bring about *change* which according to the Quran is the greatest of all the signs of God. Movement, adventure, dynamism, rationality and mobility at once characterise Islam and the modern age.

But shared characteristics, while establishing affinity and relevance, would not have a remedial thrust. A society that is visibly ill, cries for remedial action. Here the great Islamic taboos, the incomparable devices of self-discipline, swing into operative relevance. Mankind is groaning under the evils of a permissive society. Intemperate and illegitimate sex is eroding the basis of civilized existence. Civilization, having turned full circle, is telescoped into bestiality. Woman has been pulled down from the pedestal of dignified distance, stripped and scorned. Widespread promiscuity is taking a heavy toll of values and jeopardising security, purity, sanctity. The most important social unit, the bulwork of ethics and morality, viz., the family, is in disarray. In societies that are not permissive instances are occurring of women being gang-raped. Islam elevated the status of women, for respect for women is the key to civilized behaviour. It kept the sexes at a civilized distance from each other. Its injunctions gave to society the hallmark of a compact well-knit family unit. Violations of chastity were heavily penalised.

Intoxicating drinks are similarly prohibited. Liquor is rated as the mother of evils. It has ruined countless families. It has been the scourage of mankind down the ages. In our times, addiction to liquor has assumed menacing proportions. Intoxication goes against the principle of restraint and discipline so cardinal to Islam. Islam alone among religions, totally prohibits this source of physical and moral ruination. Bans imposed by the legislature and implemented by the executive have invariably failed. What can be effective is moral

# ISLAM'S RELEVANCE TO MODERN AGE

Religion is facing a crisis of relevance. Is religion outmoded, has it lost its validity for modern man ? these are questions which everyone who can think puts to himself. The answer one gives or gets is very often in the affirmative. The answer is incorrect. It is based on a superficial knowledge and a misconceived notion of religion. It flows from an exaggerated stress on the material advantages accruing from scientific and technological achievements. Overawed by these achievements and inured to material comforts, we tend to forget how miserable and empty a life divorced from religion is apt to become. The consuming greed, the uninhibited passion, the ennui, the frustration, the discontent, the envy, the restlessness, the morbidity, the desperation and defiance that envelope our existence are there because the protective shield of religious feeling has worn away. Mankind is moving towards its own destruction. The inglorious end may come not necessarily from nuclear war, as most of us fear, but from slow self poisoning, from erosion of morality and from the blind disruption of ecology summarised as ecocide. In either case it is the progress of science and technology, and the unrestrained sway over Nature which it has brought in its wake, that may terminate life on earth just as it has determined happiness. Says Barbara Ward: "We have become involved in a new movement of seismic change in the topography of the human race. All of us are moving forward to the modern society based on science and technology. And this change is even greater and far more sudden a break with the past than the shift from nomadic life to the settled life of agriculture millenniums ago".

Of the great world religions Islam is the youngest. Its origin and development are not shrouded in mystery. Its advent took place in the glare of midday sun. It is there for every one to see; it is there for no one to distort. Its sources are there unsullied and unconcealed. Islam's relevance to the modern world rests not only on its chronological proximity It also ushered the modern age. The quest for truth and the passion for knowledge, the need for observation and experimentation, the habit of contemplation and the process of induction which it encouraged, put its earliest followers, the Arabs in the vanguard of learning and progress. It is they who sparked the rebirth of learning.

MR. SAIYID HAMID b. March 28, 1920, Muradabad (U.P.), B. A. 1939, M. A. ( English Literature ), 1947, Aligarh Muslim University. Selected for the State Civil Service 1943 and the Indian Administrative Service, 1950. Held a number of important posts in the Districts, the State Secretariat, the Central Government and Planning Commission. Was Joint Secretary, Industries and Commerce at the Centre. As Joint Secretary, (Co-ordination), formulated the National Fourth Five Year Plan. Attended a number of international conferences. Negotiated trade agreements with some of India's Trading Partners. Organised and headed the Staff Selection Commission. Delivered lectures in a number of Universities on literary topics and on man power planning. Was Secretary, Delhi Higher Education Society, which manages Anglo-Arabic and Shafiq Memorial Secondary Schools. Founded the Crescent Education Society, Delhi, and under its aegis established the Crescent School in Daryagunj on the lines of a public school with religious teaching and Urdu being compulsory. Contributed a number of critical articles to literary magazines. Is an Urdu poet. Took over as Vice-chancellor of Aligarh Muslim University in 1980. Represented India at the UNESCO Conference on Education held in Belgrade in October, 1980. Attended a course on Development planning at the University of Sussex in 1959. Is on the Jury or Nehru Award for International Understanding.

Revived the *Tahzibul Akhlaq* in February, 1982. This fortnightly Urdu journal is pursuing the goals set for it by Sir Syed Ahmed Khan. Represented India at the 1000th Anniversary of Jam'i-i-Azhar, Cairo. Delivered lectures in U. K. and the United States (1982), Completed his term of Vice-Chancellorship of Muslim University on March 26, 1985.

SAIYID HAMID

movement for bringing about an all-out social, economic, religious, educational and cultural revolution in the community: with a view that if a part of the nation lags behind, it would adversely affect the whole and retard the progress of the entire nation.

In the 19th century, Sir Syed, initiated the *movement.* In the 20th, Azad and Iqbal inspired the thinking and, combinedly, produced Zakir Husain who led the *movement* in post-independence period. Syed Hamid, who headed the institution for five years, revived the *movement* with the same devotion Zakir Husain had invested in his own days. His successor, Syed Hashim Ali, now carries the cross.

The series of documents on contemporary Islam, taking up Indian Islam first, starts with the most recent past; and, the latest phase of the Aligarh Movement is being represented through a bunch of writings, mostly selected from its mouthpiece, *Tahzibul Akhlaq*, and occasionally from other sources. Syed Hamid, being the most vocal idealogue of the period, naturally gets the lion's share.

The volume opens, by way of Inaugural, with a beautiful speech by Gyani Zail Singh, President of India. It proceeds with a few relevant extracts from Sir Syed, and from Abul Kalam Azad, which appeared in the Aligarh publications during the last 5/6 years : symbolically signifying the extent of identification, Aligarh has got today, with its Founder, and with one of its *critics.* It follows a selection from the writings of Muizuddin Ahmad, who edited the new series of *Tahzeebul Akhlaq*, and other old boys for whom Aligarh is still a live inspirational-force. Tyabji, a former Vice-Chancellor, and Hashim Ali, the present VC are also included in the volume: the former passionately 'converted' to, and won over by, the movement, during his two-years historic sojourn; and, the later now leading the movement.

It is hoped that this volume will go a long way in understanding the currents and cross-currents in contemporary Islam.

—*Editor*

## Foreword

Man has become a mere political animal today. It may, therefore, be surprising to many to see a collection of ideas, by and large socio-cultural, going in the name of *Documents.*

The Arab world, the Turkish and the Persian-speaking West and Central Asia, and the Malay-Indonesian South East Asia are thoroughly documented, so far as their politics is concerned. On non-political plane, however, little is done to understand the mind of contemporary Islam.

And, of all the Islamic regions, the history of the ideas of contemporary *South Asia* is the least known to the world of scholarship. While Arabic, Indonesian, Turkish and Persian languages are widely known even outside their homes, the case of the region using Urdu as its medium of communicating its ideas remains, to a large extent, unrepresented.

In South Asia. Indian Islam, from various points of view, is the most powerful and dynamic current in contemporary Islam. It was therefore thought desireable that the series should give preference to the Indian scene and deal with other regions subsequently.

In Indian Islam, the main custodians of ideas may be categorised into the Ulama (Madrasa-educated, bearded, intellectuals) and the Fuzala (University-educated intellectuals), Aligarh partly representing the latter. Somehow or the other, Aligarh still occupies the central place in the scheme of the priorities of the Muslim community in India. The first of the series is therefore being devoted to Aligarh.

*Aligarh-the-Institution*, was born in 1875/77 as a result of *Aligarh-the-movement* which, in post-1857 India, aimed at enabling the Muslim community to regain its lost confidence. It found itself involved in the same process once again in post-1947 India. (History seldom repeats. But it seems to have repeated itself in case of Indian Muslims). Aligarh movement was a multi-dimensional

# CONTENTS

## Documents on Contemporary Islam : Indian Muslims

Aligarh Movement : 1980-85



---


Printers : Liberty Art Press, New Delhi and Patna Litho Press, Patna

Publisher : Mahboob Husain for Khuda Bakhsh Library, Patna.

Editor : Dr. A. R. Bedar

Annual subscription : Rs. 60.00 (Inland), 12-00 Dollars (Asian Countries), 24 Dollars (other countries) Rs 45-00 per copy

# KHUDA BAKHSH LIBRARY JOURNAL



37-38-39

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

# Khuda Bakhsh Library

# JOURNAL

## 37-38-39

a Bakhsh Oriental Public Library
Patna